سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ معراج رسول

جلد46 • شمارہ 05 مئی 2016 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

راکھ یا دھواں

"ابھی کی بات ہے کہ میں آسمان کی نیلگونی میں کھویا ہوا تھا اور میں اور میرا خیال، دونوں شمال زمردیں کی طرف پرواز کررہے تھے۔ ہم دھول اور دھویں کی نامہربانی سے بہت اوپر، بہت اوپر تیر رہے تھے۔"

"سچ مچ!"

"ہاں ہاں، سچ مچ۔ کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا، اپنے آپ سے۔ اپنے اندر کے یار سے، اپنے اندر کے جوڑی دار سے؟ حد کردی تو نے بھی۔"

"اچھا تو پھر ہوا کیا؟ تُو اور تیرا خیال شمال زمردیں کی طرف پرواز کررہے تھے تو پھر......؟"

"میں نے ایک آواز کو گنگناتے ہوئے سنا۔ نہ جانے وہ مغرب کی آواز تھی یا مشرق کی، شمال کی تھی یا جنوب کی۔ وہ گنگنارہی تھی۔

"ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہوجاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اپنے بال و پر کو کھجاتے ہوئے پرندے دھوپ جلی منڈیروں سے اڑتے ہیں اور گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر جھول کر اور جھوم کر چہچہانے لگتے ہیں۔

"وہ آواز گنگنارہی تھی۔ محبت موسم بدل دیتی ہے، لُو چل رہی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں، بھیگی ہوئی ہوا بہنے لگتی ہے۔"

"پر کیا، ایسا ہوتا بھی ہے؟"

"تو اور کیا! ایسا ہی تو ہوتا ہے اور اسی کو بُھلا دیا گیا ہے۔"

"کسے؟"

"محبت کو۔ محبت کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ کیا نہیں بھلایا گیا ہے؟ دلوں میں کھوٹ ہے اور کیسی! کینے ہیں اور کتنے! میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی رہا تو سب کے سب یا راکھ ہوجائیں گے یا دھواں۔ میں، ہاں میں کہتا ہوں کہ تم سب راکھ ہوجاؤ گے یا دھواں۔ تم نیچے کا بھی گھاٹا ٹھہروگے اور اوپر کا بھی۔

"تم کتنے برے بولنے والے اور کتنے برے سننے والے ہو۔ تم زہر بولتے ہو اور زہر سنتے ہو۔ تم سے تو زبان بھی پناہ مانگتی ہے اور کان بھی۔ تمہاری زبان دلداری سے اور تمہارے کان غم گساری سے محروم ہیں۔ تم تو اب بس وہی کچھ کہتے ہو جو کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ سو اب تم بس وہی کچھ سنتے ہو جو سننے کے لیے ہے ہی نہیں۔ وائے ہو تم پر کہ تمہاری صبحیں اور دوپہریں بداندیشی کی ہوس میں جوتے چٹخاتی ہیں۔ تمہاری شامیں بے حسی کو آنکھ مارتی ہیں اور تمہاری راتیں بدانجامی کا پہلو گرم کرتی ہیں۔

"پھر ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا۔ تم آخر کب تک دلوں کی ویرانی اور خیالوں کی گراں جانی میں دن گزارتے رہوگے؟ کیا اس طرح دن گزار کے تمہاری الجھنیں دور ہوجائیں گی؟ کیا اس طرح زندگی بسر کرکے تمہیں سکون ملتا ہے، کیا تم چین سے ہو؟ ہاں، یہ سوال تو مجھے خوب سوجھا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا تم سچ مچ چین سے ہو؟

"جھوٹ بولنے کی نہیں ٹھہری اور پھر اس کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بول کر اور پھر خود اپنے آپ سے جھوٹ بول کر نہ اپنے حلق سے لقمے اتارے جاسکتے ہیں، نہ اچھو لگے بغیر پانی کے گھونٹ لیے جاسکتے ہیں اور نہ گہری نیند سویا جاسکتا ہے۔ سنو، جھینپو مت! میں تمہارے اندر سے بول رہا ہوں۔ مجھ سے جھینپو مت۔ میں، تم ہوں۔ میں، تم ہوں۔ میں تم سب کے اندر کا تم ہوں۔ تم چین سے نہیں ہو۔ میں چین سے نہیں ہوں۔ ہم چین سے نہیں ہیں۔"

☆...☆...☆....

محترم قارئین!

السلام علیکم!

مئی 2016ء کا دلکش شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ موسم میں گرمی اور آج کل پاناما لیکس کی سرگرمی عروج کی جانب گامزن ہے۔ دنیا بھر کے میڈیا گروپس کے ذریعے پاناما پیپرز کے انکشافات نے عالمی سطح پر جو کھلبلی مچا رکھی ہے اس سے پاکستان کے مختلف حلقوں میں بھی ایک بھونچال سا آگیا ہے۔ یہ خفیہ دستاویزات پاناما کی ایک لا فرم موساک فونیکا نے ظاہر کر کے یہ حقیقت بتائی ہے کہ دنیا بھر کے طاقتور افراد کیسے ٹیکس چوری کرتے ہیں۔ جبکہ تمام ممالک کے عوام کو یہ احساس بھی دلایا کہ یہ جو غریب عوام اپنے کھانے پینے، ایندھن اور اشیائے صرف پر بالواسطہ ٹیکسوں کی چکی میں پس رہے ہیں...... ان کا کیا قصور ہے؟ ان پیپرز نے پاکستان کے سیاسی حلقوں، بالخصوص برسرِ اقتدار فیملی کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ کیونکہ غریب عوام کے لیے ملکی اور غیر ملکی سطح پر امداد، قرضوں اور سرمایہ کاری کی دعوت دینے والوں کا یہ روپ عوام کے لیے حیران کن ہے کہ حب الوطنی کا ترانہ پڑھنے والوں نے اپنے اثاثے ٹیکس کے محکمے اور الیکشن کمیشن پر واضح کیوں نہیں کیے۔ المیہ یہ ہے کہ چھپائی گئی دولت ملک کی تعمیر و ترقی میں استعمال ہونے کے بجائے بیرونِ ملک خزانوں میں محفوظ ہے۔ جس کا خمیازہ عوام کو غربت، بیروزگاری اور مہنگائی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ بہترین روزگار کے مواقع اور معیاری تعلیم اس ملک کی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں۔ مگر افسوس...... آج بھی جگہ جگہ تعلیمی اداروں کے نام پر خالی عمارتیں اندر سے جانوروں کی رہائش گاہیں بنی ہوئی ہیں اور برائے نام اسکولوں میں پرچیوں پر بھرتی کیے جانے والے اساتذہ جنہیں ایجوکیشن کی اسپیلنگ تک نہیں آتی...... وہ گھر میں بیٹھے مستیوں میں گم بچوں کے تباہ کن مستقبل کی نوید دے رہے ہیں۔ یہ کیا غضب ہے کہ سرکاری اسکولوں کو رفتہ رفتہ پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اگر معیارِ تعلیم میں پھر بھی بدلاؤ نہ آیا تو کیا ہوگا۔ اگر یہی پیسا اساتذہ کی بہتر تربیت پر لگایا جاتا تو شاید علم کا یہ حال نہ ہوتا۔ کیا تعلیم سے کھلواڑ کرنے والوں کے لیے بھی ضربِ عضب کی ضرورت پڑے گی؟...... یا پھر شور مچے گا...... دھرنا، دھرنا۔ چپ چاپ ہماری مان لو ورنہ پھر ایک دھرنا...... جانے یہ کس کا کیا دھرا ہے۔ بہرحال دھرنوں کے اس شور سے نکل کر ہم تو چلے اپنی پیاری سی محفل کی جانب...... جہاں نہ کوئی دھرنا ہے اور نہ ہی کوئی ''ورنہ''

✠ **زرین آفریدی**، حیدرآباد سندھ سے محفل کی زینت بنی ہیں ''منفرد سرورق دل کو بھا گیا۔ آئینہ ہاتھ میں ہے اپنی صورت پہ خود ہی نازاں، دوشیزہ ہمیں بھی اچھی لگی۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب، نسخہ کیمیا لیے حاضر ہیں۔ ہم تو اس نسخہ کیمیا سے کب کے محروم ہو چکے اور علم، دانش و جمہوریت کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر کھیل و تفریح بھی مایوس کن آخر یہ پاکستانی قوم جائے تو کہاں جائے۔ اداریہ میں ہر دل عزیز قلم کار جناب کاشف زبیر صاحب اور یمنیٰ احمد صاحبہ کی ہمشیرہ حنا عروج کی اچانک رحلت سے دل بہت دکھی ہو گیا۔ یمنیٰ احمد جی ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ (شکریہ...... بس مغفرت کی دعا کیجیے) اللہ پاک حنا عروج کو جوہر رحمت عطا کرے۔ آمین۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے تو محترمہ عذرا ہاشمی سے ملاقات ہوئی موصوفہ نے صنف نازک کی تعریف جس پیرائے میں کی۔ سرورق کی حسینہ کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی فخر و انبساط محسوس ہوا۔ یہ بھی اچھا لگا کہ ہماری سسپنس ڈائجسٹ کی برادری میں کیسے کیسے گوہر نایاب چھپے ہیں۔ ان کا تبصرہ واقعی صدارت کے لائق تھا۔ مبارک باد، ہمارا شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ رضوانہ قریشی کی محبتیں رسول فیملی کے ساتھ پسند آئیں۔ ادریس احمد، صفدر معاویہ ہمارے سینئر تبصرہ نگار ہیں۔ اس بار بشریٰ افضل جی شکر ہے اچھے موڈ میں تھیں۔ عمران جونانی، آپ نے میرے تبصرے کو کلاسک تبصرہ قرار دیا، شکریہ۔ تبصرے تو آپ کے بھی اے ون ہوتے ہیں جناب۔ ہماری سوئٹ ڈش، بلقیس خان، محمد خواجہ جی، ابرار وارث، اشفاق شاہین، سید محی الدین رونق محفل بڑھا رہے تھے۔ گریہ پیم، الیاس سیتاپوری صاحب سب سے پہلے تو ادارہ سسپنس ڈائجسٹ کی بہت شکر گزار ہوں کہ تاریخی کہانیوں میں یہ اچھی تبدیلی لائے، دل سے خوشی ہوئی کہ اپنے پیغمبروں کے متعلق اتنے وسیع اور نئے انداز سے ہمیں روشناس کروایا۔ حضرت یعقوبؑ کے حالات زندگی کے بارے میں جان کر ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان کے بچوں کی تعداد اور نام معلوم ہوئے۔ ان کی پیاری بیوی راحیل کنعان نہ پہنچ سکیں بیت لحم میں مدفن ہوئیں۔ کاشف زبیر کی قیمت بھی بیسٹ رہی۔ صبا نے اچھا کیا جو کالے جادو پر یقین نہ کیا اور اس بات پر زندگی نئے طور پر شروع کی کہ سب اچھا برا اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے۔ ابراہیم جمالی صاحب نے تو اس بار کمال کر دیا بہروپیا کی صورت میں، اس اسٹوری میں آج کل کے تمام سیاست دانوں کا عکس تھا۔ ایک سے ایک بہروپیا بیٹھا ہے ہمارے ملک میں۔ فقیرے کے بیٹے ملنگی کو فخر تھا کہ وہ سب سے بڑا بہروپیا ہے۔ انجام نا آشنا، ناہید سلطانہ اختر جی ویلڈن، ہمارے معاشرے کی بے اعتدالیاں، جذباتیت، بے قدری اور برائی کا انجام بھی کچھ سمو دیا، ان آخری صفحات میں۔ ماہ نور نے غلط راستہ چنا، ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ عاقب اور اس کے ہمدردوں کا بہت برا انجام ہوا۔ افسوس صد افسوس سبق آموز داستان تھی۔ دام، علی اختر صاحب، مغربی معاشرے کی مفاد پرستی اور خود غرضی کی زندہ مثال اپریل جیسی عورتیں رشتوں کا تقدس پامال کرتی ہیں اور پھر نقصان بھی اٹھاتی ہیں۔ بیچاری باربرا خود غرضی کی بھینٹ چڑھ

گئی۔ شیش محل، اسما قادری صاحبہ کو اللہ پاک عمرِ دراز عطا فرمائے۔ یہ داستان حقیقت کے زیادہ قریب اور دلچسپ ہے جس کو پڑھتے ہوئے ہمیں بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔ اس قسط میں بھالیہ کا اضافہ اور چاند بانو کی دوبارہ انٹری مزہ آ گیا۔ فلمی دنیا کے نشیب و فراز زبردست رہے۔ اب جولیٹ اور اس کے لاکٹ پر کہانی آگے بڑھے گی۔ ویلڈن جی۔ شیخ نظام الدین کے حالاتِ زندگی اور کرامات کے بارے میں پڑھ کر دل پرسکون ہو گیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی جزائے خیر۔ اس بار مراسلے بہت ہی اعلیٰ اور مزے دار تھے، محفلِ شعر و سخن کا تو جواب ہی نہیں۔'' (لگتا ہے کافی چٹخارے لے لے کر پڑھا ہے یہ شمارہ آپ نے)

✠ **وارث علی ملاح** کا سندیلیانوالی سے محبت بھرا انداز۔ ''سسپنس اس دفعہ 18 کو ملا۔ ٹائٹل گرل کا ڈریس کلر ذرا بھی نہ بھایا...... محترم جون ایلیا سے نسخہ کیمیا لے کر دوستوں کی محفل میں پہنچے نئی آنے والی محترمہ عذرا ہاشمی آئیں اور چھا گئیں۔ بہت اچھا لکھا بس یہی کہوں گا کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ سید عبادت کاظمی دلی دکھ اور افسوس ہے کہ آپ کے والد بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے خاندان کو صبر و ہمت عطا فرمائے (آمین) عمران جونانی کی رائے قابلِ تحسین ہے۔ مرحا گل جی! اس دفعہ تو کاشف زبیر کی خبر بھی افسردہ کر گئی، کاشف صاحب بھی ہمارے لیے کئی نامور اور سبق آموز تحاریر چھوڑ گئے، اللہ ان صاحبان کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ ہاں مرحا جی دل چھوٹا نہ کیا کریں ہماری غیر حاضری کی وجہ سے کسی اور کو آنے کا موقع تو مل جاتا ہو گا نا۔ کہانیوں میں اپنی من پسند ناہید سلطانہ کو پڑھنا شروع کیا۔ انجام ناآشنا بہت سبق آموز کہانی تھی۔ ماہ نور نے صرف ایک غلطی کی جو گھر سے نکل آئی۔ باقی اس نے کسی جگہ غلط نہیں کیا۔ اس نے ہر جگہ اس للو (عاقب) کو سرخرو کیا لیکن اس بے غیرت نے مرد ہو کر نامردی ہی دکھائی، مردانگی تو تب تھی کہ ہر حال میں نبھا کر دکھاتا۔ مجھے ان لوگوں سے شدید نفرت ہے جو دوسروں کے کہنے پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے ہیں۔ یہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے سبق آموز کتھا تھی۔ کاش کہ ہم لڑکے دوسروں کی طرف دیکھنے سے پہلے تھوڑا سا سوچ لیں کہ اس کا انجام کیسا ہو گا تو شاید ایسے حادثات نہ ہوں۔ ملک صفدر حیات کی راز ماضی پڑھ کر بھی حیرت ہوئی ان ماں باپ پر جن کا بیٹا چار سال سے لاپتا اور ان کو معمولی سا دکھ ہوا کیوں؟ اور نہ ہی موسیٰ کو منظرِ عام پہ لایا گیا شاید بہتر یہی تھا۔ کاشف زبیر کی دل دہلاتی اسٹوری میرے لیے تو ٹاپ آف دی منتھ تھی۔ یا خدا! کیا آج کے دور میں بھی یہ سب ہوتا ہے؟ صفیہ نانی نے جو کیا آخر کار اس کو اس کی قیمت دینی ہی پڑی۔ اللہ تعالیٰ سب بے اولاد جوڑوں کو اپنے کرم سے صالح اولاد عطا فرمائے (آمین) شکر ہے کہ منظر امام نے اس دفعہ دکھی نہیں کیا۔ بچے کیا تھے آفت کے پرکالے تھے، شکر ہے انور بیچارے کی جان چھوٹ گئی۔ شیش محل کا اسٹارٹ تو بہت زبردست تھا، پر اب یہ کیوں اتنی بور ہو رہی ہے۔ پلیز اسما قادری جی کچھ تیزی لائیں اس میں...... اور خدا کے لیے...... فاروق کی بیماری سے جان چھڑائیں۔ گریہ پیہم الیاس سیتاپوری کی ماضی کے آئینوں سے ایک زبردست قصہ تھا، شکر ہوا کہ لیاہ اور راحیل بالآخر مل ہی گئیں۔ حضرت یوسفؑ کے پیدا ہونے کے بعد کی داستان بھی بیان کر دیتے۔ ویسے پڑھی ہوئی تو کافی دفعہ ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ کی طرح تکالیف کو نمایاں کرتی مختصر داستان بیان کر گئے۔ دام اور شناخت بھی زبردست تھیں پلیز ایک درخواست ہے کہ یہ میرے لفظ حذف نہ کیے جائیں کہ مجھے پوچھنا ہے اپنے شہر والوں سے اپنے سندیلیانوالی کے لوگوں سے اور اپنی تحصیل پیرمحل کے لوگوں سے کہ تم لوگ جاسوسی اور سسپنس میں کبھی کیوں نہیں لکھتے مجھے چھ سال سے زیادہ عرصہ جاسوسی و سسپنس سے جڑے ہوئے گزر رہا ہے لیکن میرے کسی بھی بہن بھائی نے میرے ان پیارے شہروں سے کبھی تبصرہ کیوں نہیں لکھا؟ حالانکہ اتنی بڑی تعداد میں یہ ڈائجسٹ ان شہروں میں آتے ہیں اور آپ ایڈیٹر سے التجا ہے کہ طاہر انکل یا اسما قادری کو آخری صفحات پر لائیں پلیز......'' (تبصرے کا شکریہ...... آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے)

✠ **صادق معاویہ سعیدی** کی خان پور، ضلع رحیم یار خان سے حوصلہ افزائی ''اپریل کا سسپنس 20 کو ملا۔ سرورق کی دوشیزہ کو میک اپ میں مصروف چھوڑ کر اداریہ پڑھا اور دل دہل گیا کہ تحریر کا بانکپن کاشف زبیر بھی جنت کو سدھار گئے۔ بے شک جو ماں کے پیٹ سے آیا ہے اس نے ضرور قبر کے پیٹ میں اترنا ہے۔ رب تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ عادت، روایت سے ہٹ کر کاشف کی کہانی کا صفحہ نمبر دیکھا اور برستی آنکھوں سے قیمت پڑھنا شروع کی۔ کہانی کے خیال میں ڈوب کر اتنی گہرائی سے لکھنا کاشف کا ہی خاصہ تھا۔ کہانی کا اختتام پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ کاشف زبیر کو کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ پھر دل کا بوجھ کم کرنے کو بزمِ یاراں میں آئے عذرا ہاشمی کی پہلی انٹری اور صدارت کی کرسی مبارک باد قبول فرمائیں۔ بہت لکھا اور خوب لکھا۔ عذرا جی اب غیر حاضری نہ ہو۔ غیرت نسوانی نیا جملہ پڑھنے کو ملا۔ کہانیوں پر تبصرہ بھی خوب کیا آپ نے۔ رضوانہ قریشی، کوئی یوں بھی دیوانہ ہوتا ہے۔ ادریس احمد خان، بشریٰ افضل، عبادت کاظمی، معراج محبوب، ابرار وارث، رمضان پاشا، محی الدین اشفاق مختصر مگر پُراثر تبصروں کے ساتھ رونقِ محفل تھے۔ رانا حبیب الرحمان، برادر خیریت ہے اتنی غیر حاضری۔ محمد صفدر معاویہ، واقعی بجا ارشاد کہ امیر، امیر تر، غریب، غریب تر ہو تو جرم اور ظلم ہی ترقی پاتے ہیں۔ نامور جرائم پیشہ لوگوں کو دیکھا جائے تو اکثر ہمارے اس استحصالی نظام کا شاخسانہ ہی نظر آتے ہیں، حضرت قائداعظم اور شہید لیاقت علی کے بعد تو شاید کسی نے بھی پاکستانی بن کر پاکستان کے لیے خلوص سے سوچا تک نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور صراطِ مستقیم ہمارا مقدر بنائے۔ آمین۔ بزمِ یاراں کے لیے مختص سسپنس کے صفحات دوسرے یارانِ محفل کے لیے خالی چھوڑتا ہوں۔'' (مہربانی مگر...... کہانیوں پر تبصرہ کیوں غائب ہے بھئی؟)

✠ **رمضان پاشا** گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''فہرست کی ترتیب بہت سادہ تھی۔ انشائیہ حسبِ معمول کڑوا سچ تھا، خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ عذرا ہاشمی صاحبہ کو مبارک باد، موصوفہ کا تبصرہ بھی بہت دبنگ تھا۔ تاریخی کہانی گریہ پیہم، پڑھ کر حضرت یعقوبؑ

کے بارے میں وہ سب معلوم ہوا جو پہلے معلوم نہیں تھا۔ قیمت، بڑی پُراسرار کہانی اور اچھی تھی۔ شیش محل کی یہ قسط بہت ہی شاندار اور جاندار تھی۔ شناخت، بہت اچھی کہانی تھی بہت پسند آئی۔ رازِ ماضی، اس بار صفدر حیات کی کہانی میں سسپنس کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا، بڑا مزہ آیا۔ مسیحا، ڈاکٹر نے ڈاکو کو خوب الّو بنایا، کہانی پُرلطف تھی۔ استحقاق سید شیر شاہ سید صاحب نے ایک بار پھر آنکھیں نم کردیں۔ بچے برائے فروخت میں مزہ نہیں آیا۔ ماروی کی یہ قسط بڑے دکھوں کے ساتھ پڑھی گئی، نواب صاحب یاد آتے رہے۔ دام، چھوٹی کہانیوں میں سب سے عمدہ کہانی تھی، بہروپیا ارے یہ تو ہمارے سیاست دانوں کا کچا چھٹا ہے، اختتام پر بڑی ہنسی آئی۔ انجام نا آشنا، ویسے تو یہ خواتین کی دلچسپی کی چیز ہے لیکن اس کہانی کا پلاٹ نیا اور اچھوتا تھا، اس لیے ہمیں بھی مزہ آیا، کافی عرصہ یاد رہے گی۔ محفل شعروسخن میں ملائکہ حریم، شیخ خرم ریاض، سید عبادت کاظمی اور روزیر محمد خان کے اشعار قابل داد تھے۔''

✠ **سہیل شہزاد**، ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ سے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں ''میں سسپنس اور جاسوسی بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس میں تمام کہانیاں بہت مزے کی اور سبق آموز ہوتی ہیں جیسے اس دفعہ اپریل میں بچے برائے فروخت ہے۔ اس کے علاوہ ماروی اور شیش محل بھی بہت اچھی جارہی ہیں۔ میں بھی جیل میں ہوں تقریباً 20 ماہ سے اور بیس ماہ سے ہی ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، یوں سمجھ لیں کہ ابھی نیا نیا پڑھنا شروع کیا ہے۔ خطوط کی محفل میں بھی محبت بھری نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ پر مشتمل خط پڑھ کر خوشی ملتی ہے اس لیے پہلی دفعہ محفل میں آیا ہوں۔ (خوش آمدید...... اب بریک نہ آنے پائے) اگر مجھے خوش آمدید کہا گیا تو آئندہ ضرور آتا رہوں گا۔ ورنہ بے وفا اور محبت سے عاری لوگ تو دنیا میں ختم نہیں ہوتے وہ پہلے ہی کافی ہیں جو صرف سامنے ہونے پر ہی یاد رکھتے ہیں ورنہ نہیں۔ محفل شعروسخن میں بھی تمام لکھاریوں کے انتخاب اچھے ہوتے ہیں، اسے بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ کہانیوں پر تبصرہ مجھے ویسے کرنا نہیں آتا۔ اس لیے میں آئندہ بھی تبصرہ کرنے سے قاصر رہوں گا۔ میری عمر بھی 19 سال ہے۔'' (خوش آمدید تو ہم کہہ ہی چکے ہیں مگر اتنی کم عمری میں یہ کیا غضب کیا جو جیل میں ہیں)

✠ **رانا حبیب الرحمٰن**، ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ سے حاضر ہیں ''یمنیٰ احمد کی ہمشیرہ حنا عروج کی وفات پر اظہار افسوس۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور باقی رشتوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔ ہم بھی یمنیٰ احمد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اپریل 2016ء کے شمارے کا سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ باقی میری ناراضگی پورے ادارے سے ہے (ارے ارے بھئی کیوں...... اور کاہے کی ناراضگی؟) اس لیے رسالے پر تو تبصرہ بالکل نہیں کروں گا۔ اس ناراضگی کی وضاحت کروں تو انجام نا آشنا جتنے صفحات بھی کم پڑ جائیں گے۔ (چلیں مختصر ہی بتادیں) اپنی غلطی تو ہر انسان کو پتا ہوتی ہے اور جو جان بوجھ کر کی جائے تو...... ماروی اور قیمت پر بھی تبصرہ نہیں کیا جاسکتا اور منظر امام کی لکھی ہوئی اسٹوری بچے برائے فروخت اس جدید دور کی کہانی تھی...... مزہ دے گئی۔ دام اور بہروپیا بھی پسند آئیں، مسیحا بھی اچھی کہانی تھی۔ پہلے نمبر پر ماریہ چودھری کا شعر دوسرے نمبر پر ماہین فاطمہ، تیسرے نمبر پر ایم یوسف کا انتخاب پسند آیا۔ اس کے بعد آتے ہیں خطوط کی محفل میں۔ عذرا ہاشمی صاحبہ آپ کا سرورق پر تبصرہ اچھا لگا بلکہ آپ کی محفل میں آمد بھی بہت اچھی لگی۔ ویلکم۔ لگتا ہے خوب جمے گی اور ہاں دیکھو ہماری باتوں سے بھاگ نہ جانا ڈٹی رہنا ہمیں خوشی ہوگی۔ بشریٰ افضل صاحبہ آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ بھی ہمیں...... ابرار وارث اب تو غلطی کی معافی دے دو۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ غموں اور دکھوں میں عقل کام نہیں کرتی، غلطی ہوجاتی ہے۔ طاہرہ گلزار، رضوان تنولی، روشنی رشید سمیت کئی ایسے دوست ہیں جنہیں ہم دل سے دوست سمجھتے ہیں اس لیے محفل میں شامل ہوجاتے ہیں۔'' (اچھے دوست ہمیشہ دوستی کا بھرم رکھتے ہیں)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ''جون ایلیا کا نسخہ کیمیا کے نشتر کی چبھن سیدھا دل پہ لگتی ہے۔ مسلمانوں کے عروج اور زوال کو ایسا پُراثر تاثر دیا کہ الفاظ ہی نہیں مل رہے ہیں بیان کرنے کو خاص کر آخری پیرا بار بار پڑھا۔ اپنے دوستوں کی پیار بھری محفل خطوط کی شکل میں، آپس میں پیار بانٹنے کا ہنر اس ماہنامہ نے سکھایا ہے۔ دلفریب تبصرے، ہلکی پھلکی نوک جھوک اور ایک دوسرے کی تحریر پر بھی خوب صورت تبصرے۔ اس دفعہ تو ایڈیٹر صاحب کا ہر خط پر پروقار اظہار خیال نے لکھنے والے کا حوصلہ بڑھا دیا (پسندیدگی کا شکریہ) اس محفل کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ پورے پاکستان کے ہر خوب صورت شہر سے ادب اور پڑھنے والوں کا دلی اظہار اور نمائندگی۔ ہر شہر، ہر محلہ حتیٰ کہ اسیران جیل بھی اردو ادب سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ عذرا ہاشمی کو صدارت مبارک ہو اور آپ کی تحریر بہت نفیس ہے۔ قدرت اللہ بھائی کا میری آنکھوں کے آپریشن اور صحت کی دعاؤں کا شکر گزار اور دعاؤں کا طالب یہ آپ کا بھائی۔ کاشف زبیر کی وفات پر دلی افسوس بہت عرصہ تک اپنے قلم کا جادو جگا کر ہم سے جدا ہوگئے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔ گریہ پیہم، حضرت یعقوبؑ کی داستان حیات بڑی تحقیق اور جستجو سے تحریر کی گئی۔ کئی رازوں اور کئی سوالات کے جواب مل گئے کہ ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کا حسن، ان کے بھائیوں نے جو ظلم کیا۔ حضرت یوسفؑ کے متعلق تو بہت پڑھا لیکن اس مضمون نے ان کے ماضی کے تمام حالات کو آئینہ کی طرح شفاف کرکے دکھا دیا۔ آفرین۔ شیش محل، آٹھویں قسط جہاں بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ وہیں مصنفہ نے اس میں کچھ غیر ضروری حالات، سیاحت، کھانے، چاٹ مسالے کی تفصیلات سے کہانی کو کھینچ کر لمبا کرنے کی کوشش کرتی نظر آئی ہیں۔ شناخت، ایک پُرتجسس کہانی۔ ابتدا سے انجام تک دلچسپ معما۔ رازِ ماضی، ملک صفدر کے اعلیٰ کارنامے کی انتہائی دلچسپ کہانی۔ ایک افسوس ناک قتل۔ انسپکٹر نے کڑیوں کو اتنی عمدہ ترتیب سے ملایا کہ قاتل سامنے آیا اور انصاف کے تقاضے پورے ہوئے۔ مسیحا، ایک فرض شناس ڈاکٹر اور قانون کے مجرموں کے درمیان گھمسان کا رن لیکن آفرین ہے ایک ذہین اور قانون کے فرض شناس ڈاکٹر نے اپنی جان بھی بچائی اور مجرموں کو بے وقوف بنا کر یہ جنگ جیت لی۔ استحقاق، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی دردناک کہانی، وہ ہمیشہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے معاشرے کے سنگین مسائل پر نشتر زنی

کرتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک اعلیٰ کردار کے مالک مگر بے بس انسان کا ذکر ہے۔ بچے برائے فروخت، کیا غضب کہانی۔ بدفطرت کاروباری نرم فطرت کو کس کس ڈھنگ سے لوٹتے ہیں۔ دو بچے اور کمین فطرت باپ جو بار بار بچوں کو فروخت کر کے رقم بٹورتا رہتا ہے۔ دام، ایک جوان ماں اور اس کی نوجوان بیٹی جس کے باپ کا پتا نہ تھا۔ دونوں ماں بیٹی کی ایک ہی شخص سے محبت کی پُرفریب داستان۔ شیخ نظام الدین، ایک ولی کی داستانِ حیات، خدا کی قربت حاصل کرنے کی جستجو اور فیضِ عالم، انسانیت کی حفاظت کرنے والے اعلیٰ مرتبت اولیا میں سے ایک ولی۔ بڑی ایمان افروز تحریر۔ بہروپیا، آج کے معاشرے میں جنم لینے والے بہت سے بہروپیوں اور سیاست دانوں میں سے ایک۔ بڑی معنی خیز اور سمجھنے والی داستان۔ انجام نا آشنا، ہمارے معاشرے کی بھرپور عکاسی۔ ماضی کے ایک ذمہ دار شخص کا ستایا ہوا کنبہ اور حال کے تعلیم یافتہ اور کامیاب کہلانے والی نسل نے کس طرح کنبے کا شیرازہ بکھیر دیا۔ پرانی نسل نے کس طرح معاشرے کی سدھاری اور گھر کو بسایا اور نئی نسل نے اپنی تہذیب اور اقدار کا بٹوارہ کر دیا۔ بڑی سبق آموز کہانی۔ ایک معصوم اور انجام سے بے پروا لڑکی کی داستانِ عبرت۔ اشعار کی محفل اور کترنیں رسالے کو رنگین بنا دیتے ہیں۔ ان میں معلومات، عمدہ اشعار اور لطائف۔ اس ماہنامہ کو بہت پُرلطف بنا دیتے ہیں۔ اگلے شمارے کا ابھی سے انتظار شروع۔‘‘

(رسالے سے آپ کی محبت کی ہم قدر کرتے ہیں)

✠ **ایس زیڈ آفریدی** کا پشاور سے ’’سسپنس کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے (خوش آمدید) اپریل کا شمارہ 19 مارچ کو ملا۔ سرورق بس ٹھیک ہی تھا، محفل کے کرسیِ صدارت پر عذرا ہاشمی موجود تھیں آپ کا تبصرہ کافی مکمل تھا۔ بشریٰ افضل، اشفاق شاہین اور محمد قدرت اللہ نیازی کے تبصرے اچھے تھے۔ یہ حنا عروج وہی تھیں ناں جو کبھی کبھی سسپنس میں تبصرہ کرتی تھیں۔ (جی بالکل...... یہ وہی حنا عروج ہیں۔ جو کافی عرصے سے بیمار تھیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین) کہانیوں میں آغاز سب سے پہلے آخری صفحات کی کہانی انجام نا آشنا سے کیا، بہت ہی زبردست اسٹوری تھی ناہید سلطانہ اختر کی، ہر کہانی کا پلاٹ بہت اچھا ہوتا ہے۔ بہروپیا میں ملنگی خود کو استاد کہتا تھا مگر اس سے بھی بڑا استاد شیخ کا بیٹا نکلا بہت اچھی اسٹوری تھی۔ ماروی کا پلیز جلد ہی اینڈ کریں۔ بچے برائے فروخت میں باپ بیٹوں نے خوب بزنس شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جب بھی قلم اٹھاتے ہیں انتہائی تکلیف دہ موضوع پر لکھتے ہیں۔ رازِ ماضی میں جو قربانی کا بکرا تھا وہ بچ گیا۔ اس کے دوست کو قربانی دینی پڑی، گریہ نیم میں حضرت یعقوب کا نوجوانی سے لے کر آخر تک واقعہ بہت ہی اچھا لگا۔ بہت معلوماتی تحریر تھی۔ شیش محل میرا فیورٹ ناول ہے۔ فاروق کا کردار مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہانی کے آخر تک تجسس ہی رہتا ہے۔‘‘ (آپ کی آمد اور سسپنس سے محبت کا بہت شکریہ)

✠ **رانا بشیر احمد ایاز**، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں ’’سسپنس میں پہلی دفعہ خط لکھا ہے اور امید ہے کہ آپ اس محفل میں خوش آمدید کہیں گے۔ (جی جی بالکل...... دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید) سب سے پہلے تو بڑا صدمہ اپنے محبوب مصنف جناب محی الدین نواب کی وفات کا پڑھ کر ہوا۔ دو تین دن تک اداسی چھائی رہی۔ محفل دوستاں میں پہنچے تو موڈ گڑھ سے محترمہ عذرا ہاشمی کو کرسی صدارت سنبھالے دیکھا۔ بہت بہت مبارکاں عذرا صاحبہ، کافی دلکش اور جامع تبصرہ لکھا آپ نے۔ ویلڈن۔ سب سے پہلے گریہ نیم پڑھی۔ حضرت یعقوب کی داستانِ حیات بہت اچھی لگی۔ خاص کر راحیل اور لیاہ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ دوسرے نمبر پر جناب کاشف زبیر مرحوم قیمت کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ پڑھ کر دنیا مکافاتِ عمل ہے ہونے کا یقین اور بھی گہرا ہو گیا۔ ملک صفدر حیات ماضی کے راز کھولتے نظر آئے اچھی کہانی تھی۔ شیش محل کافی اچھی جا رہی ہے۔ فاروق اور ربن دادا اب کھل کے سامنے آ رہے ہیں۔ جولیٹ کافی جدوجہد کر رہی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے وہ دلدار آغا سے انتقام لینے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں اور ادھر چاند بانو فاروق کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہے۔ آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ماروی پڑھ کر نواب صاحب پھر یاد آ گئے، کافی تیز رفتار رہی اس دفعہ کی قسط۔ شیخ نظام الدین پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ویلڈن جناب ضیا تسنیم بلگرامی بچے برائے فروخت منظر امام نے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر ڈالا۔ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ منظر امام سے درخواست ہے کہ استاد صاحب کو دوبارہ منظر عام پر لائیں۔ کافی عرصہ ہو گیا ہے ان کی جناتی فارسی کو پڑھے ہوئے اور آخر میں ادارے سے گزارش ہے کہ محی الدین نواب کا انٹرویو شامل کر دیں پرانا ہو تو۔‘‘

✠ **مرحا گل**، ورابن کلاں سے شریک محفل ہیں ’’ٹائٹل گرل کی کچھ کھوجی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر اندر پہنچے تو ایک بیڈ نیوز ہماری منتظر تھی۔ کاشف صاحب اینڈ نواب صاحب کا صدمہ نہ بھولنے والا غم کیا کم تھا جو ایک بہترین تبصرہ نگار، معصوم تبصرے کسی پہ طنز نہ کرنے والی حنا عروج ہم سے بچھڑ گئی رب انہیں ہر مسلمان کے ساتھ جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔ حنا صاحبہ وہی ہے ناں جن کا ہم نے مارچ میں لکھا تھا کہ آپ لیٹرز پر تبصرہ کیوں نہیں کرتی ہیں۔ (جی بالکل یہ وہی حنا عروج ہیں) ہمیں جواب دیے بغیر ہی چلی گئیں۔ کاشف زبیر تو جیسے صاحب ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتے تھے۔ فہرست پر بھی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ محمد سانول بھیا آپ کی خواہش پوری ہوتی رہا کرے گی اگر ادارے والے ساتھ دیں تو ویسے برادر عزیز آپ کا تبصرہ بھی بہن مرحا سے کم نہ تھا۔ تعلق جو اتنا پیارا ہے بہن بھائی کا۔ ایم عمران جونانی صاحب! حیرت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے آپ کو کس طرح پتا چلا کہ ہم ایک رات میں رسالہ ختم کرتے ہیں حالانکہ ہم نے تو یہ بات اپریل کے شمارے میں لکھی ہے کیا آپ دفتر آتے جاتے ہیں؟ فلک شیر

سانحۂ ارتحال

ماہنامہ سسپنس سے وابستہ اطہر حسین کے والد اختر حسین 2 اپریل 2016 کو رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ لواحقین کو صبرِ جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

کی کمی محسوس ہو رہی ہے کہاں ہیں موصوف۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ پسند آیا۔ کاشف زبیر کی کہانی پڑھی ہی نہ گئی۔ دل چاہتا ہے ہر نئے دن ایک لفظ پڑھیں اور کبھی ختم نہ ہوں۔ آخری تحریر ناہید اختر کی ایک بھیانک تحریر تھی۔ معاشرے کی سنگ دلی پر افسوس ہوا۔ ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا مرد حیوانیت لیے ہوئے ہیں۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی......راز ماضی صفدر حیات کی ایک گرماہٹ دینے والی تحریر تھی ادھر بھی ایک لڑکی کو اتنی بڑی سزا ملنے جارہی تھی مگر...... دل اتنا اداس ہے کہ پڑھنے کے باوجود ہم کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرسکتے۔ کاشف صاحب نہ ہوں اور ہم دوسروں کی تحریروں کی تعریف کیے جائیں ناممکن...... کہتے ہیں زندگی جب کچھ لینا شروع کردے تو سانس تک نہیں چھوڑتی ہمیں کیا پتا تھا کہ کاشف صاحب کی سانسیں تنگ کردے گی۔'' (آپ کا بہترین تحفہ مرحومین کے لیے مغفرت کی دعا ہے)

✠ **محمد فیاض ایوب** کا محبت نامہ ضلع اٹک سے ''1992ء ورلڈ کپ جب جیتی ہماری ٹیم اس وقت سے ٹی وی، ریڈیو، اخبار، رسالے، تاریخ، تفسیر، دیکھنے، سننے پڑھنے کا شغل جاری ہوا۔ جو ابھی صرف مطالعے تک محدود ہوگیا ہے۔ کبھی کچھ تحریر نہیں کیا۔ آپ کے ادارے کے تمام رسائل سسپنس، جاسوسی، دلکش، سرگزشت، پاکیزہ پڑھے۔ سسپنس و جاسوسی ابھی تک جاری و ساری ہیں۔ محی الدین نواب کو دیوتا سے جانتا ہوں۔ اللہ ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں ایک باغ بنائے، کاشف زبیر صاحب کو بھی جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ لوگوں کی انتھک محنت کا نتیجہ اتنے بلند پایہ شمارے ہر ماہ بنا کسی تعطل کے مل رہے ہیں۔ اللہ آپ کو اس محنت پر اجر عطا فرمائے۔ الیاس سیتاپوری صاحب کا کام اب بھی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اللہ ان کو بھی درجات عظیم سے نوازے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے جناب اسحٰق و اسماعیلؑ۔ ان میں سے فرزند عظیم جناب یعقوبؑ جن سے ایک پوری قوم ان کی بعثت سے ہے۔ ان کے حالات تو جان لیے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ اسماعیلؑ کی اولاد کے بھی حالات لکھیں۔ شکر گزار رہوں گا۔ شیش محل، اسما قادری صاحبہ نے بہت خوب کام کیا۔ اللہ اور زور قلم کو زیادہ کرے۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کیا خوب لکھتی ہیں۔ اپریل کا شمارہ کچھ دیر سے ملا۔ پھر بھی مکمل مطالعہ کرنے کے بعد آج کچھ تحریر کرنے کو دل چاہا تو سوچا آپ کو محبت نامہ لکھ دوں (خوش آمدید) سسپنس کی خصوصیت الیاس سیتاپوری صاحب کی تاریخی کہانی، ضیا تسنیم بلگرامی...... کی اولیا، انبیا کی سیرت سے متعلق مضامین، مرزا امجد بیگ صاحب (ایڈووکیٹ) ملک صفدر حیات صاحب کی کہانیاں، ماشاءاللہ۔ اس کے علاوہ مختلف سلسلہ وار کہانیاں۔ اللہ جون ایلیا صاحب کی مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی مختصر کہانیاں۔ اللہ اور بھی زور قلم دے۔ اچھے لکھاری، بہترین منتظمین، یہی انفرادیت بھی ہے، خصوصیت بھی۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **محمد صفدر معاویہ،** تحصیل و ضلع خانیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''سرورق پر ایک خوب صورت ماڈل ایک عدد غالباً شیشہ پکڑے ہوئے ہے، اس کی بیک سائڈ پر خوب صورت سا دل بہت عمدہ۔ محترم جون ایلیا نسخہ کیمیا لے آئے۔ ایسے خوب صورت اور اعلیٰ الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے اندر اتر جاتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا اللہ پاک مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ دوستوں کی محفل میں محترمہ عذرا ہاشمی اپنے بہترین طویل ترین اور خوب صورت الفاظ کی وجہ سے صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئیں۔ مبارک ہو جی بہت ہی اچھا تبصرہ کیا آپ نے۔ رضوانہ قریشی کی رسول فیملی کے لیے عمدہ کاوش، ادریس احمد خان بھی محفل کی رونق، بشریٰ افضل کی حاضری اچھی لگی، آتی رہا کریں۔ میرے بھائی قدرت اللہ کہیں نہ کہیں ایڈجسٹمنٹ کر ہی لیتے ہیں۔ کہانیوں میں الیاس سیتاپوری کی گریہ پیہم سے شروع کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی کے ایک باب کے بارے میں جاننا بہت عمدہ کاوش تھی مصنف کی۔ محترم کاشف زبیر کی تحریر قیمت پڑھی۔ انسان اپنے مقصد کے لیے کسی اور کی اولاد کو سولی پر چڑھوا دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے یہاں ڈھونگی پیروں کی کمی ہے نہ جاہل لوگوں کی۔ دل اب بھی نہیں مان رہا کہ کاشف زبیر ہم میں نہیں رہے۔ شیش محل میں پہنچے یہ قسط نسبتاً نارمل رہی۔ جولی اپنی ماں اور باپ کے ماضی میں کھوئی ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی ماروی تک پہنچے۔ مراد اور ہمزاد سے نادیدہ ہونے کی طاقت واپس لے لی گئی۔ اب وہ اپنے دماغ سے عمدہ چالیں چل رہا ہے تو دشمن بھی نچلا نہیں بیٹھا۔ ناہید سلطانہ اختر انجام ناآشنا لے کر آئیں جب انسان اور خصوصاً نوجوان لڑکی کے قدم لڑکھڑا جائیں پھر وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ کوئی قسمت والی ہوتی ہے جسے کوئی اچھا انسان مل جائے ورنہ سارے گدھ ہی نظر آتے ہیں۔ آج کل کے حالات پر بہت بہترین تحریر تھی۔ ابراہیم جمالی کی بہروپیا میں شیخ کے بیٹے نے صحیح معنوں میں بہروپیا بن کر دکھایا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے شیخ نظام الدین جیسی بزرگ ہستی کے حالات و واقعات سے دل کو منور کیا۔ علی اختر کی دام میں طریقہ تو بڑا اچھا اپنایا پر کبھی کبھی قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ منظر امام کی بچے برائے فروخت بہت اچھا طریقہ ڈھونڈا پیسا کمانے کا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی استحقاق بہت اعلیٰ تحریر ان نوجوانوں کے لیے جو پیسے کی خاطر ماں باپ کو چھوڑ کر پردیس میں بسیرا کرتے ہیں۔ کبھی ایک بار تو سوچو کہ ماں باپ کیسے تم کو جوان کرتے کرتے خود بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ محفل شعر و سخن بہت عمدہ اشعار سے مزین رہی۔ سلیم انور کی مسیحا میں ڈاکٹر نے بالکل ٹھیک حساب کیا ان ڈاکوؤں کے ساتھ مزہ آگیا۔ ملک صفدر حیات راز ماضی لے کر آئے ایک قتل سے شروع ہونے والی کہانی میں کتنے ٹوئسٹ آئے۔ ملک صاحب نے بہترین دماغ پایا ہے۔ کڑی سے کڑی ملا کر آخرکار قاتل تک پہنچا۔ کام تو موئی نے بھی ٹھیک نہیں کیا تھا، قربانی کا بکرا بنا اس کا دوست۔ تنویر ریاض کی شناخت بھی اچھی رہی، کترنیں بھی اچھی رہیں۔ مجموعی طور پر اپریل کا سسپنس بہت ہی عمدہ رہا۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✠ **تحریم شاہ،** لاہور کینٹ سے محفل کی رونق بنی ہیں ''ٹائٹل کے رنگ ہمیشہ کی طرح زبردست تھے اور حسینہ آئینہ دیکھنے میں مصروف نظر آئیں۔ اس لیے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً اپنی پسندیدہ کہانی ماروی تک پہنچی لیکن اس بار پڑھنے کا وہ مزہ نہ آیا کیونکہ بار بار یہ خیال آرہا کہ اس شاہکار کو لکھنے والے اسے مکمل کیے بغیر ہی ہم سے رخصت ہوگئے محی الدین نواب صاحب کی خبر صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ میری والدہ

کے لیے بھی انتہائی افسوس اور تکلیف کا باعث تھی کیونکہ انہوں نے 33 سال ان کی شاہکار کہانی دیوتا شوق اور جنون سے پڑھی تھی یہاں تک کہ میرے بڑے بھائی کا نام بھی اس کے ہیرو کے نام پر رکھا۔ پھر ان سے پڑھنے کا شوق مجھے وراثت میں ملا اور میں نے نواب صاحب کی آخری سلسلہ وار کہانی ماروی پڑھنا شروع کی لیکن اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ اتنا لمبا تعلق اس طرح اچانک ختم ہو جائے گا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔ اب آتے ہیں تبصروں پر۔ ماروی پڑھ کر ایسا لگا کہ اب جلد ہی ہم زاد اپنے رنگین مزاج کی وجہ سے خود بھی پھنسے گا اور مراد کو بھی پھنسائے گا اور آئندہ یہ جاننے کا انتظار رہے گا کہ مراد اپنے نئے دشمنوں سے کیسے سامنا کرتا ہے۔ گریہ پیم سے اچھی معلومات حاصل ہوئیں۔ قیمت نے تو اتنا ڈرایا کہ نیند ہی اڑادی۔ اگر میری مرحومہ نانو زندہ ہوتیں تو میں یقیناً ان کے پاس جانے سے ڈرتی۔ بے شک کاشف زبیر صاحب لاجواب تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے (آمین) تنویر ریاض کی شناخت، ہمیشہ کی طرح کمال تھی یقیناً ماریا کی کوئی غلطی نہیں تھی اس سے صرف سیلف ڈیفنس میں قتل ہوا تھا۔ راز ماضی میں پولیس افسر نے اہم کردار ادا کیا۔ حالانکہ آج کل کے زمانے میں پولیس اتنی مہلت دیتی نہیں ہے۔ مسیحا بھی اچھی لگی ڈاکٹر صاحب جتنے بے وقوف دکھتے تھے اتنے تھے نہیں۔ ادھر منظر امام صاحب کی بچے برائے فروخت پڑھ کر افسوس کم ہوا اور ہنسی زیادہ آئی کیونکہ ایسے بچوں کو تو بیچ ہی دینا چاہیے۔ دام اور استحقاق عام سی کہانی تھی۔ انجام نا آشنا بے شک سبق آموز تھی ہمیشہ کی طرح لیکن میری نظر میں سب سے پہلی اور بڑی غلطی ماہ نور کی تھی اور عاقب کو بھی بیوی کے ساتھ برا سلوک کرنے کی سزا ملی۔ البتہ ماہ نور نے جو کچھ سہا وہ صرف عاقب کا ظلم نہیں تھا بلکہ اس کی اپنی غلطیوں کی سزائیں بھی تھیں۔ محفل شعر و سخن زبردست تھی لیکن معاویہ مغل، ملائکہ حریم اور سید محی الدین اشفاق کے اشعار سب سے زیادہ اچھے لگے۔ عذرا ہاشمی صاحبہ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ پہلی ہی کوشش میں صدارت حاصل ہوگئی۔ مرحا گل کے تبصرے پڑھ کر مزہ آجاتا ہے کافی دلچسپ لکھتی ہیں آپ۔ صادق معاویہ بھی میرے ہی جیسے ہیں دو، تین دن میں رسالہ پڑھ کر باقی دن انتظار فرماتے ہیں۔ بشریٰ افضل تو محفل کی رونق ہیں۔ رمضان پاشا انکل کا تو نام بہت اچھا لگتا ہے۔ آج پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔'' (خوش آمدید اب غائب مت ہو جایئے گا)

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں'' 20 مارچ کو اپنا سوئٹ محبوب سسپنس ملا۔ فہرست کہانی میں کاشف زبیر کی تحریر قیمت اور نواب انکل کی تحریر ماروی پڑھ کے دل میں درد ہوا اور یہ سوچ کر آنسو تواتر سے بہنے لگے کہ سسپنس کے گلدستہ کے دو پھول جواہرات کے دو ہیرے غم دنیا سے نکل کے سفر آخرت پر نکل گئے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ نواب محی الدین کو اور ہمارے سوئٹ بھائی کاشف زبیر کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کریں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی تاریخی اور دل سوز باتیں ایک بار پھر پڑھ کے یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ ہمارے آبا و اجداد کی تاریخ کتنی شاندار تھی۔ علم کا شہر بغداد ایک بار پھر برباد کیا گیا۔ ہم بے حس اور کمزور پتلے ہیں، موت سے ڈرتے ہیں۔ معراج انکل یہ سال واقعی بہت ہی منحوس نکلا۔ میں نے آج تک زندگی کے ہر تکلیف اور دکھ کا مقابلہ کیا ہے۔ اللہ ان دونوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کریں۔ آمین۔ چلتے ہیں کہ تبصرہ نگار دوست آج کون کون سے طنز کے تیر لائیں ہیں میرے لیے کسی نے یاد بھی کیا ہے کہ نہیں۔ واہ اس بار پھر پہلے نمبر پہ صنف نازک اپنی عذرا ہاشمی رہیں، مبارکاں ڈیئر۔ اپنے خط کا آغاز صنف نازک کی تعریف سے کیا، اچھا لگا۔ رسول فیملی کی پرستار رضوانہ قریشی کا خط بھی انوکھا اور اچھا رہا۔ بھائی معاویہ آپ کا تبصرہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ واہ اس بار تو ہماری سویٹ سی بشریٰ افضل بھی حاضر تھیں، ویلڈن بشریٰ۔ بشریٰ جی وہ اپنے چیکو بابر عباس اور آغا فرید خان آف سکھر کو بھی لائیں ناں۔ چلو بابر عباس کا تو مجھے پتا ہے کہ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اللہ ان کو شفا دیں۔ سسپنس میں تو اب میرا تبصرہ شائع ہی نہیں کیا جاتا۔ (اچھا تو جناب...... پھر یہ کیا ہے) سید عبادت کاظمی کے والد صاحب 19 مارچ کو طویل علالت کے بعد فوت ہوگئے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔ مرحا گل بہت کھٹے میٹھے اور کچھ روٹھے روٹھے انداز میں تبصرہ لائیں۔ ایک وظیفہ آپ اور سب اسٹوڈنٹ کے لیے ہال کے اندر جانے سے پہلے اول و آخر پانچ، پانچ بار درود شریف پڑھو اور 41 بار یا قوی پڑھیں ہر پرچے کے وقت اور سیدھے ہاتھ پر صاف سیاہی سے مطلب انگلیوں پہ یا جبار لکھیں۔ پرچہ ختم ہونے کے بعد انگلیوں کو خوب رگڑ کر صاف کریں اللہ امتحانی پرچوں میں کامیابی دے گا۔ واہ یہ تو اپنے بھائی ابرار وارث بھی حاضر بھائی ذرا ناٹنگل گرل کی تعریف سوچ سمجھ کر کریں ورنہ بھابی کے ہاتھ میں پھر بیلن ہی نظر آئے گا ہاہاہا۔ آخر میں میرے ایک ضدی بھائی قدرت اللہ نیازی بھی حاضر تھے جو بلاوجہ میرے ساتھ بات نہیں کرتے۔ یمنیٰ احمد کی سسٹر حنا عروج صاحبہ کی فوتگی پر ان سے دلی تعزیت یمنیٰ سسٹر اللہ تعالیٰ حنا عروج سسٹر کی بخشش و مغفرت کر کے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔ سب سے پہلے اسما قادری کی تحریر شیش محل پڑھی۔ فاروق پر حسب عادت پھر ایک لڑکی کی نظر التفات دوسری طرف جوزف اور جوزفین کی داستان عشق بہت اچھے انداز میں بیان، چاند بانو چاندنی بن گئی۔ فاروق کا چاند بانو کو خط لکھنا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ ماروی جیسے پڑھنے لگی تو دل دکھنے لگا کہ اب نواب انکل ہم میں نہیں رہے واہ رے کیا زندگی ہے۔ ماروی کی یہ قسط اچھی رہی لیکن اس بار ماروی اس بچے کی طرح لگی جس کی ماں فوت ہوگئی ہو۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر شیخ نظام الدین ہمیشہ کی طرح دل و روح کو سرشار کر گئی اللہ ان کو اس کا اجر دے، آمین...... ابراہیم جمالی کی تحریر بہروپیا پڑھ کے لگا کہ یہ تو اپنے پاکستان کے ہر صوبے ہر شہر کی کہانی ہے۔ ویلڈن ابراہیم جمالی...... اپنے فیورٹ رائٹر منظر امام صاحب کی تحریر بچے برائے فروخت ہر دفعہ کی طرح ایک نیا اور انوکھا موضوع۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر استحقاق بہت ہی سبق آموز تحریر۔ بیٹا جس کو ایک باپ اپنی

معذرت

اپریل کے شمارے میں تاریخی مضمون کے کچھ مندرجات پر ہمارے بعض قارئین نے توجہ دلائی ہے۔ ہم اس نادانستہ سہو پر معذرت خواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شناخت کہتا ہے۔ عامر جیسا بیٹا اللہ کسی کو نہ دے۔ سلیم انور کی مغربی تحریر مسیحا ڈاکٹر صاحب نے ڈاکو کو بہت اچھا سبق دیا اور ہیرے بھی بچا لیے...... اپنے فیورٹ رائٹر کی کہانی قیمت پڑھ کے احساس ہوا کہ کاشف زبیر صرف ایک اچھے رائٹر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ماورائی ذہن بھی رکھتے تھے تبھی تو ایسے ایسے شاہکار اور لازوال تحریریں لکھتے تھے کہ عقل مانتے ہوئے بھی نہ مانے۔ فیورٹ ملک صفدر حیات رازِ ماضی لے کر حاضر تھے، بہت ہی انوکھا، دلچسپ اور پراسرار کیس تھا لیکن اپنی ڈیوٹی سے محبت کرنے والے ملک جی نے یہ کیس بھی حل کر دیا۔ اس بار تو الیاس سیتاپوری صاحب کے قلم نے ایک ایسا شاہکار گریہ پیہم تحریر کیا جس کی تعریف کی طاقت میرے ناقص عقل و قلم میں نہیں بہت ہی عمدہ اور شاندار تحریر ویلڈن...... سسپنس کے آخری صفحات کے لیے ناہید سلطانہ اختر کی تحریر انجام نا آشنا بہت ہی شاندار اور لاجواب تحریر۔ معاشرے کی گندگی اور خاص کر مردوں کی بے حسی پر لکھی گئی یہ تحریر ہمیشہ یاد رہے گی۔ ماہ نور نے کم عقلی میں محبت کے ہاتھوں ایسے کم ذات پر اعتبار کیا کہ یہ بھی بھول گئی کہ جو ذات خدا کی نہ ہوئی وہ عورت کی کیا ہوگی۔ اشعار بھی اچھے تھے اور مراسلے بھی لیکن پھر بھی مراسلوں کے لیے رضوان تنولی اور جاوید بلوچ کو مس کیا۔‘‘

✠ **ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی** سے جلوہ افروز ہو رہے ہیں ’’سسپنس کے درشن بروقت ہو گئے۔ ٹائٹل خوبصورتی کا آئینہ دار تھا۔ اندر جون ایلیا کے گہر آبدار سے مستفید ہوئے۔ اداریہ بھی حسب حال تھا۔ سرفہرست عذرا ہاشمی تھیں۔ دیگر دوستوں کی حاضری بھی نظر آ رہی تھی۔ گریہ پیہم، الیاس سیتاپوری کی حضرت یعقوبؑ کی زندگی کی کہانی تھی۔ الیاس سیتاپوری کی تحریریں پڑھ کر انسان اپنے آپ کو اسی دور میں محسوس کرتا ہے جس دور کے حالات و واقعات بیان ہوتے ہیں۔ کاشف زبیر کی سانحہ ارتحال کے روح فرسا خبر پڑھی دل کو ناقابل بیان تکلیف پہنچی ان کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ کاشف زبیر کی تحریریں منہ بولتی محسوس ہوتی تھیں۔ قیمت کاشف زبیر کی بہترین تحریر تھی۔ اس کے بعد اسما قادری کی شیش محل بہت اچھے انداز میں چل رہی ہے جس کو پوری دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ تنویر ریاض کی شناخت بھی اچھے تاثر لیے ہوئے تھی۔ مسیحا بھی بہتر تحریر تھی۔ شعر و سخن کی محفل بھی خوب صورت اشعار سے سجی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اشعار کا انتخاب بھی خوب تھا۔ کترنوں میں لطیفے اور اقوال بھی اچھے انداز میں پیش کیے گئے تھے۔ استحقاق، ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی معاشرتی زندگی پر ایک پراثر تحریر تھی۔ ڈاکٹر صاحب معاشرت کے پھیلتے ناسوروں پر بہت موثر تحریریں لکھتے ہیں کہ انسان تا دیر تحریر یاد رکھتا ہے۔ معاشرے کے بھی نباض ہیں ڈاکٹر شیر شاہ سید بہت مبارک اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ بچے برائے فروخت منظر امام صاحب کی طنزیہ تحریر تھی۔ وہ ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں اچھا لکھتے ہیں۔ علی اختر کی دام بھی ٹھیک تھی جس میں ماں نے اپنے آشنا کے ساتھ سازش کر کے اپنی ہی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، دولت کی ہوس میں اندھی ہو گئی۔ شیخ نظام الدین اللہ کے برگزیدہ ولی تھے۔ ولیوں کی زندگیاں ہزار ہا انسانوں کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے ان سے قرب حاصل کیا، ان کے لیے ان کو فیض کے چشمے جاری کر دیے۔ بہروپیا پڑھنے میں مزہ آیا۔ واقعی اس دنیا میں وہی کامیاب ہے جو موقع محل کے حساب سے اپنے آپ کو دنیا کے مطابق ڈھال لے۔ وہی دنیا میں کامیاب ہے۔ اس کے برعکس ہوتا ہے تو دنیا بھی اس کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ دوسری کہانی محترمہ ناہید سلطانہ اختر کی انجام نا آشنا بھی بہت خوب صورت تحریر تھی۔‘‘

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال** سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ’’اپریل 2016ء کا سرورق شاید موسم کی تبدیلی کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا، حسینہ ہلکے پھلکے کپڑوں میں ملبوس سنگھار کرتی نظر آئی۔ علم، دانش اور جمہوریت ہی قوموں کے لیے نسخہ کیمیا ہے۔ جون ایلیا انشائیہ میں یہ بتاتے نظر آئے۔ اداریہ میں کاشف زبیر کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ کرسی صدارت پر عذرا ہاشمی کو نفاست سے براجمان پایا۔ پہلی کوشش ہی کامیاب ٹھہری۔ عذرا صاحبہ! آپ کو عبادت کاظمی اور رانا صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے جن کی بدولت آپ محفل میں آنے پر مجبور ہوگئیں۔ تبصرے کی روانی خوب رہی، شاید یہ وہ جذبات ہیں جو اتنے عرصہ قید رہنے کے بعد اچھل اچھل کر باہر آئے۔ ہماری طرف سے خوش آمدید اور مبارک باد۔ وزیر اعظم کی کرسی معراج رسول اینڈ فیملی کی عقیدت مند کے قبضہ میں نظر آئی۔ یہ ان کی محبت ہی ہے کہ وہ اس فیملی کے بارے میں اتنی باخبر ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ معراج رسول صاحب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ ایم عمران جونانی! آپ کا میر محفل کا خطاب اچھا لگا۔ یہ صدارت تو آنی جانی ہے بس دعا ہے اللہ اس محفل کی رونقیں بحال رکھے۔ (آپ کی اتنی محبتوں کے ہوتے ہوئے یہ رونقیں ہمیشہ رہیں گی، انشاء اللہ) مرحا گل! آپ تو شمارہ نگلنے کی کرتی ہیں چبا چبا کر کھایا کریں ورنہ ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔ ابرار وارث! انسان دعا کر سکتا ہے باقی فیصلہ تو اللہ پاک نے ہی کرنا ہے، آپ کی حساسیت نے بہت متاثر کیا۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ سب سے پہلے آخری صفحات پر ناہید سلطانہ کی انجام نا آشنا پڑھی۔ انتہائی سبق آموز تحریر تھی۔ سچ کہتے ہیں انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے۔ فرقان علی پڑھا لکھا بینک کے آفیسرز میں شامل تھا تاہم عاقب کے ساتھ ذرا سے کیے گئے مذاق نے کئی زندگیوں کو تباہ کرنے کی بنیاد ڈالی۔ عورت کی حسد کی عادت راحمہ میں بدرجہ اتم نظر آئی اور یہی بات ماہ نور کی زندگی تباہ کر گئی۔ عاطف، ثاقب اور عاقب تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے جس قسم کا سلوک ماہ نور سے کرتے رہے ہیں اس پر بھی حیرت ہوئی تاہم سزا سے کوئی نہ بچ سکا۔ عاقب کی عام سے انداز میں گھر آنے کی دعوت کو ماہ نور نے جس طرح سنجیدگی سے لیا اس پر دکھ ہوا کہ فلرٹ کو سچا عشق سمجھ کر گھر والوں کی عزت داؤ پر لگا دی، اتنی عمدہ تحریر پر مصنفہ کو ہماری طرف سے مبارک باد۔ اس کے بعد شیش محل پڑھی۔ مصنفہ نے انتہائی خوب صورتی سے چاند بانو اور فاروق کی ملاقات کے اسباب پیدا کر دیے جو یقیناً چاند بانو کے لیے مسرت کا باعث ہوگا تاہم فاروق بدستور جولیٹ کے دیدار سے محروم رہے گا۔ بملا کا کردار بھی دلچسپی بڑھاتا محسوس ہوا۔ جوزف اور جوزفین کی اسٹوری پس منظر کو واضح کرتی چلی آ رہی ہے جو یقیناً جولیٹ کے بارے میں اہم انکشاف پر مبنی ہوگی۔ مارویٰ میں مراد و ہمزاد نادیدہ ہو جانے کی صلاحیت سے محرومی کے بعد دیگر ممالک سے تعلقات بنا رہے ہیں۔ حقیقت ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے اور تن تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ دیکھیں نواب صاحب کی تحریر کہاں تک دستیاب ہو سکے گی۔ کاشف زبیر مرحوم کی قیمت پڑھی، کمزور اعتقاد کیسے کیسے گل

کھلاتا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر احساس ہوا اللہ سب کو آزمائش سے بچائے۔ صفیہ بیگم کے مقدر میں یقیناً اولاد لکھی تھی تاہم اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا، ساری عمر جس کی سزا بھگتنا پڑی اور آخرکار موت بھی حرام اقدام کے باعث ہوئی۔ مرحوم اس قسم کی تحاریر اکثر لکھتے تھے اور مجھ سمیت تمام قارئین پسند کرتے تھے یہ تحریر بھی بہت پسند آئی۔ راز ماضی میں گوگا نے موئی کو مروانے کے لیے زبردست پلاننگ کی۔ ہمارا شک ایک سے دوسرے کردار پر منتقل ہوتا رہا تاہم آخرکار گوگا پہلوان ملک صاحب کے شکنجے میں آ ہی گیا۔ حیدر کی بے گناہ موت پر افسوس ہوا۔ کرتوت کے عنوان سے کترن بہت مزیدار رہی۔ محفل شعروسخن میں سید محی الدین اور معاویہ مغل کا انتخاب پسند آیا۔'' (شکریہ)

✠ حمنا ناز شاہ، آزاد کشمیر سے محفل کی رونق بنی ہیں ''سسپنس ایک بہت معیاری ڈائجسٹ ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے سسپنس اسی طرح کامیابی کی منزل طے کرتا رہے (آمین) اللہ تعالیٰ سب قارئین اور اسٹاف کو خوشیاں اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) اپریل 2016ء کا شمارہ بہت زبردست رہا، پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ عذرا ہاشمی صاحبہ کو صدارت بہت مبارک ہو۔ بہت اچھا تبصرہ لکھا آپ نے۔ ہماری محفل میں بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ خاص طور پر محمد صفدر معاویہ، محمد یوسف سانول، عبدالجبار رومی انصاری، ایم عمران جونانی، محمد قدرت اللہ نیازی، سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ آپ سب محفل کی رونق ہیں۔ آپ کے تبصرے پڑھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے (کمال ہے اکثر قاری کی شرکت پہلی بار ہورہی ہے۔ خوش آمدید) سب سے پہلے کاشف زبیر کی قیمت پڑھی۔ بہت ہی اچھی کہانی، جاہل عورت کے لیے سبق آموز ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی موت کا پڑھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ کہانی پڑھ کر روتی رہی کہ اب کون اتنی پیاری کہانیاں لکھے گا۔ اللہ ان کی مغفرت کریں اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) شیش محل اسماء قادری کی اچھی کہانی جارہی ہے۔ اسٹوری بہت خوب لکھتی ہیں۔ شناخت تنویر ریاض کی بس ٹھیک ہی تھی کیونکہ مجھے مغربی کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔ استحقاق، ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ عامر نے ایک لڑکی کے لیے والدین کو چھوڑ دیا بہت برا کیا۔ اولاد کیوں نہیں سمجھتی کہ والدین نے ان کو بڑی مشکل سے پالا ہوتا ہے خدا کے واسطے عامر جیسا نہ بنو۔ بہروپیا ابراہیم جمالی کی کہانی میں مجھے یہ جملہ بہت پسند آیا۔ ''یار وجس کا گبرو جوان بیٹا سودائی ہوجائے اس کا کیا حال ہوگا۔'' باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ 15 اپریل کو میری برتھ ڈے ہے خط شائع ہوگیا تو سمجھوں گی کہ آپ نے مجھے بہت بڑا گفٹ دے دیا ہے۔'' (ارے واہ مبارکاں بھئی...... اب تو خوش ہیں ناں)

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، لاہور سے تبصرہ کررہے ہیں ''خشک سی زلفیں سنوارتی دوشیزہ اچانک پُرسوچ خیالوں میں کھو گئی آہ، بیچاری کو پتا نہیں کس کی یاد نے آگھیرا ہے۔ اگر اسے بھی کوئی نسخہ کیمیا مل گیا ہوتا تو ضرور خوشی سے چلا اٹھتی۔ خیر علم و دانش اور جمہوریت قوموں کا نسخہ کیمیا تو ہے۔ اگر اسے ٹھیک طرح استعمال کیا جائے ورنہ بغداد کی طرح ایسے نسخے وہیں تباہ و برباد ہوجاتے ہیں جہاں کبھی وہ سرسبز و شاداب ترقی کی منازل طے کررہے ہوتے ہیں۔ راز ماضی سے پردہ اٹھا تو گوگا پہلوان کا انتقام سامنے آیا اور بے چارہ حیدر بے موت مارا گیا۔ ملک صاحب کی تفتیش زبردست رہی اور آج کے زمانے کی تفتیش کی بات کی جائے تو لگتا ہے اس کی نوبت ہی نہیں آتی، بس مک مکا سے کام چل جاتا ہے۔ شیش محل فاروق کی بملا کے ساتھ انجوائے منٹ تو ٹھیک رہی پر طبیعت خراب کرلی، دوسری طرف چاند بانو ہی شملہ میں اپنے محبوب کو ملنے کے لیے بے تاب نظر آئی۔ ربن دادا بھی اپنی سلطنت میں واپس آ گیا۔ اپنے اصولوں کا پکا ربن دادا کا کردار زبردست ہے۔ انجام نا آشنا عاقب تو تھا ہی۔ ساتھ اس کے بھائی بے رحم بن گئے۔ سب پڑھے لکھے جاہل آدمی تھے جو ایک معصوم صنف نازک ماہ نور کو تحفظ نہ دے سکے۔ خدا کی لاٹھی بھی بے آواز ہوتی ہے۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ واہ کیا بات ہے مراد کی کہیں تو وہ ماروی کے علاوہ لڑکیوں کو چھونا بھی گناہ سمجھتا ہے اور کہیں ایک نظر دیکھ کر زیب النساء جیسی لڑکی کو ملکہ عالیہ تک بنالیتا ہے۔ دوسرا مراد کو حکمرانی کیا ملی اس نے تو ہمارے حکمرانوں کی روش اختیار کرلی۔ ماروی تو دن بدن دلچسپ ہورہی ہے۔ قیمت میں نانی نے جو گناہ کیا تھا اس کی تلافی بھی چاہتی تھی تبھی ننھے عمیر کو سرخ سوٹ کیس کے بارے میں بتادیا اور پھر وہ سب پُراسرار مکافات عمل کی زد میں آنے سے بچ گئے۔ کاشف زبیر کی کہانی کی قیمت بہترین تھی۔ بچے برائے فروخت، ہنستی مسکراتی تحریر۔ جس میں بچوں کے باپ نے پیسے کمانے کا ڈھنگ بنایا ہوا تھا۔ گریہ پیہم میں حضرت یعقوبؑ کی زندگی پر تحریر نہایت اثرانگیز رہی۔ راحیل اور لیاہ کا ایک دوسرے سے مقابلہ دلچسپ تھا جو آخر میں محبت کی شکل اختیار کرگیا تھا اور حضرت یوسفؑ کے پیدا ہونے پر راحیل جانبر نہ ہوسکی اور خالق حقیقی سے جا ملیں۔ آزمائشوں پر پورا اترتے حضرت یعقوبؑ کی زندگی کے واقعات پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ بابا ہم درویش لوگ اپنی کٹیوں میں ہی اچھے لگتے ہیں محل تو نوابوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔ نگاہ ولی میں وہ تاثیر دیکھی...... بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی، حضرت شیخ نظام الدین کے ایمان افروز حالات و واقعات بہت متاثر کن تھے۔ جن سے اللہ پر توکل اور سخاوت کا درس ملتا ہے۔ جو لوگ رزق حلال کو ملحوظ رکھتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ماسٹر صاحب نے استحقاق کے فارم پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور ایسا بہت کم لوگ سوچتے ہیں، استحقاق بہترین کہانی رہی۔ محفل شعروسخن میں اس دفعہ معراج محبوب عباسی، جنید احمد ملک اور مرحا گل اینڈ رضا گل کے اشعار بہترین رہے۔ خطوط کی محفل میں عذرا ہاشمی کا شاعرانہ انداز اور پیش گوئیاں زبردست رہیں۔ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ رسول فیملی کی پرستار رضوانہ قریشی کی بے ڈی پی سے محبت قابل تحسین ہے، اس کی محفل میں شریک رہ کر آپ اور بھی مستفید ہوسکتی ہیں اور اپنی قیمتی آرا سے نواز بھی سکتی ہیں۔ آخر میں سب قارئین سے التماس ہے سانحہ گلشن اقبال پارک لاہور کے شہدا کے لیے اور پاکستان کی سلامتی کے لیے دعا ضرور کریں۔'' (بے شک)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

نورین ممتاز، حیدرآباد۔ فیصل جہانگیر، کراچی۔ شگفتہ نواب، فیصل آباد۔ ظہیر الدین، کراچی۔ محمود احمد، راولپنڈی۔ مدثر اعجاز، اسلام آباد۔ احمد جہانزیب، نواب شاہ۔ جنید احمد ملک، کراچی۔ عابد خان، پشاور۔ کوثر ادریس، سیالکوٹ۔

بہشتِ زار

الیاس سیتاپوری

منگول قلعہ الموت کا رخ کرتے ہیں... تاریخ اسلام کے زبردست لوگ جو فدائی کہلاتے تھے اور جن سے بڑی بڑی طاقتیں خوفزدہ رہتی تھیں، ان کی داستان ... جن سے نہ تو مسلمان محفوظ تھے، نہ عیسائی ... ان کی بہشتِ ارضی میں جنت کی آسائشیں اور نعمتیں یکجا کردی گئی تھیں۔ ایک لائق ترین انسان نے اپنی استطاعت، ذوق اور وسائل کو بروئے کار لاکر ایک ایسا نظام اور سامان مہیا کرکے اس کی مدد سے انسانی نفسیات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا اور کام میں لیا ..... لیکن اس طلسم کو متمدن دنیا کی کوئی طاقت بھی نہ تو دبا سکی اور نہ ان کا مقابلہ کرسکی ان تمام معاملات کو وحشی جبلت کے چالاک اور ذہین منگولوں نے صفحہ ارض پر داستان پارینہ کی صورت رقم کردیا۔ تاریخ کا عجیب و غریب دور، ماضی کے انوکھے اور حیرت انگیز لوگوں کی کہانی

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات
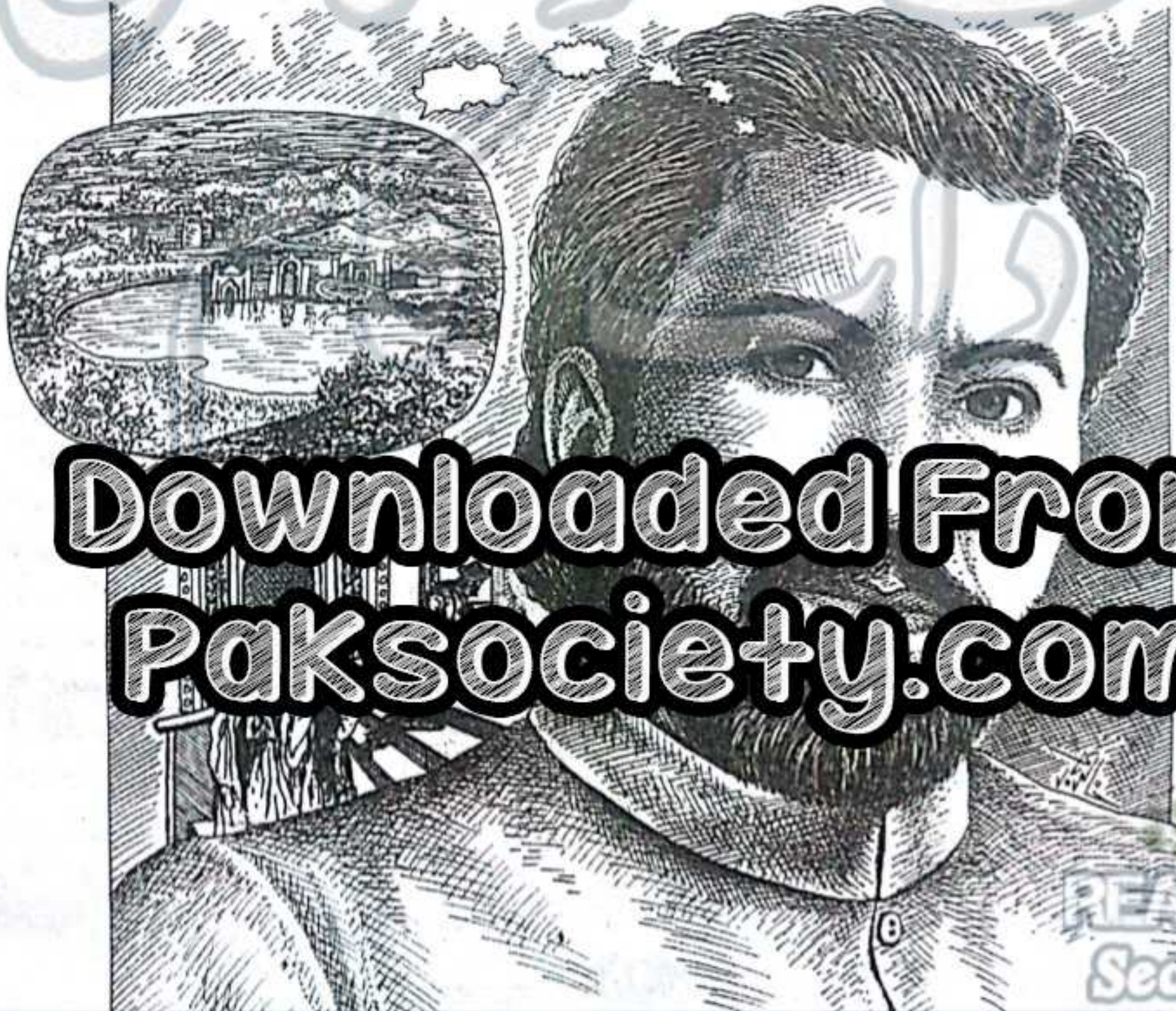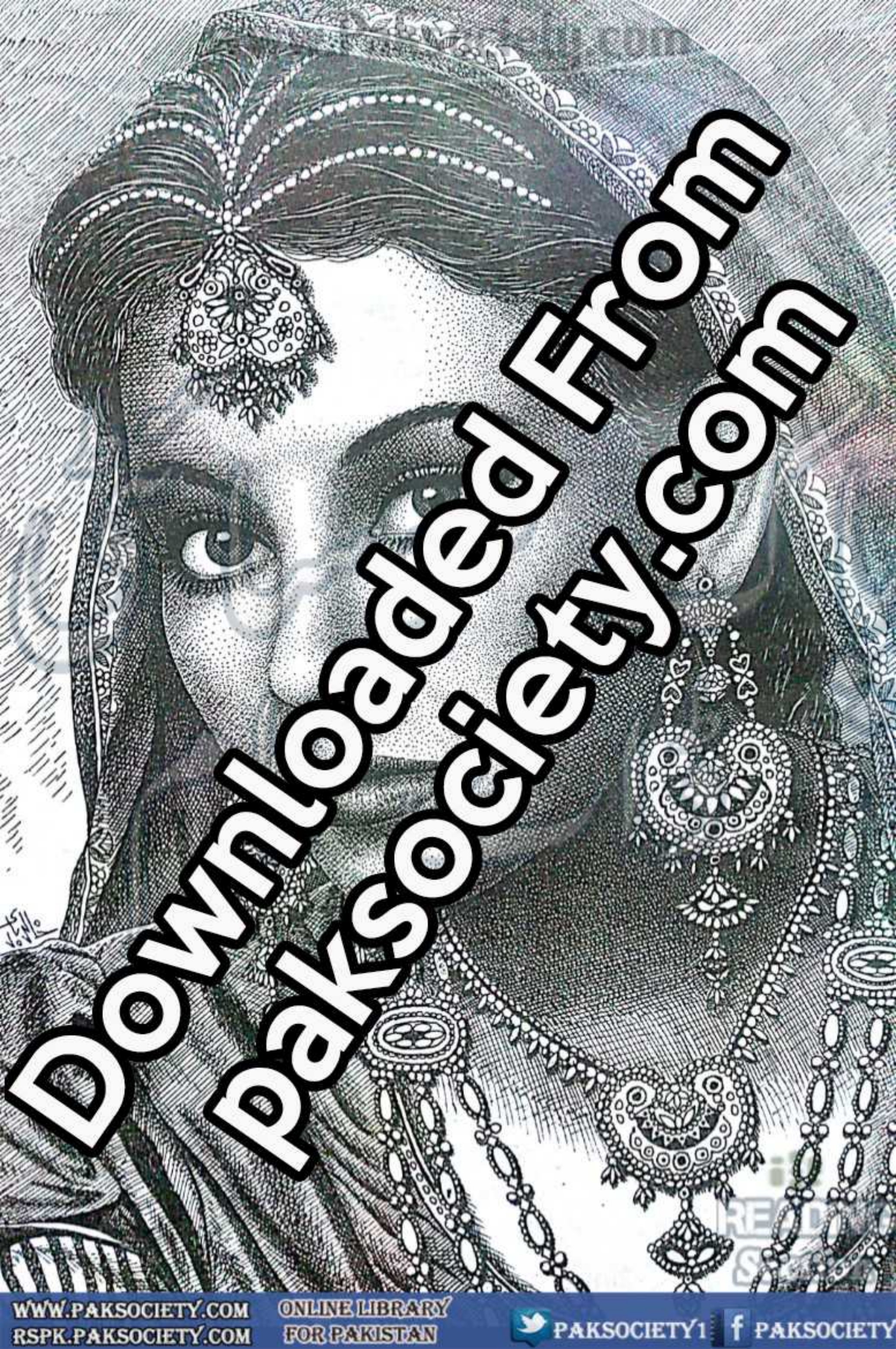
ہلاکو خان کو خاقان کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی۔ ''پوری دنیا کے آقا خاقان منگو خان کی طرف سے ہلاکو خان کے نام فرمان۔ تو جانتا ہے کہ تجھے اپنے ممالکِ محروسہ میں کون سی خدمات انجام دینا ہیں۔ تیرے سامنے سمرقند سے مصر کے آخری سرے تک کی وسیع و عریض دنیا ہے۔ تو اس دنیا میں چنگیزی قوانین رائج کردے۔ پھر جو تیرے آگے سر جھکا دیں ان کے ساتھ فیاضی سے پیش آ اور جو سرکشی کریں، انہیں ذلیل و خوار کردے۔''

ہلاکو کے ساتھ اس کی چہیتی بیوی دوقوز خاتون اپنا لکڑی کا گرجا گھر لیے مصروفِ سفر رہتی۔ وہ عیسائی ہوچکی تھی اور اس کے پاس راہبوں اور پادریوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ دوقوز خاتون ہلاکو خان کی بیوی بننے سے پہلے اس کے باپ تولی کی بیوی تھی۔ تولی اسے بہت پسند کرتا تھا مگر جب اس کا انتقال ہوگیا تو دوقوز ہلاکو خان کو پسند آگئی اور اس نے اسے اپنی بیوی بنالیا۔ دوقوز غیر معمولی ذہین عورت تھی۔ ہلاکو اس کی باتیں بہت غور سے سنتا اور ان پر عمل بھی کرتا۔

جب دوقوز خاتون کو خاقان کے فرمان کا علم ہوا تو اس نے ہلاکو کو سمجھایا۔ ''آگے بڑھو اور مسلم دنیا کو زیر کرلو کیونکہ تمہارے سامنے ایک وسیع دنیا ہے اور اس دنیا کو اپنے زیرِ نگیں لاکر اپنی اولاد کو یہاں کا آقا بنانا ہے۔''

دوقوز خاتون جانتی تھی کہ خاقان اور اس کے دونوں بھائی متمدن ہوچکے ہیں اور عیش و آرام نے انہیں سست اور کاہل بنادیا ہے۔ اپنے بھائیوں میں ہلاکو خان تنہا ایسا تھا جو اپنے قوتِ بازو سے اپنے اقتدار کی حدود بڑھاتا جارہا تھا۔

ہلاکو خود بھی حرکت میں رہنا چاہتا تھا۔ خاقان کی ہدایت اور دوقوز خاتون کی نصیحت نے اسے خاصا فکرمند کردیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی مہم کا آغاز کہاں سے کرے؟ ابھی وہ کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ قاضی شمس الدین نامی ایک مسلمان زرگر نے قراقرم میں خاقان سے ملاقات کی اور خاقان نے ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور قاضی صاحب کو حکم دیا کہ ہلاکو خان کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ پہلے وہ شیخ الجبال اور اس کے پیروؤں کی خبر لے، اس کے بعد کسی اور طرف کا رخ کرے۔

قاضی شمس الدین نے ہلاکو کے دربار میں شیخ الجبال اور اس کے پیروؤں کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں اور ہلاکو خان کو اس کی گوشمالی پر آمادہ کرلیا لیکن قاضی شمس الدین یہ بھول چکے تھے کہ جو طاقت شیخ الجبال اور اس کے پیروؤں کی گوشمالی کرسکتی ہے، وہ بغداد، مصر اور دوسرے مسلم علاقوں پر حریصانہ نظریں بھی ڈال سکتی ہے۔

قاضی شمس الدین ہلاکو سے دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب باتیں ختم کرکے ہلاکو خان کے خیمے سے باہر نکلے تو انہوں نے ایک طاقتور نوجوان کو ایک مسلمان تاجر سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا۔ یہ نوجوان نہایت خوب صورت اور صحت مند تھا۔ قاضی نے دیکھا اس اجڈ نوجوان نے تاجر اور اس کے کئی ساتھیوں کو عاجز کردیا ہے۔ تاجر اپنے آدمیوں کی مدد سے اس نوجوان کو پکڑتا تھا اور وہ نوجوان ان سب کو ایک جھٹکے سے گرادیتا تھا۔ کچھ لوگ تماشائی بنے اس منظر سے خوب لطف اندوز ہورہے تھے۔ قاضی ہجوم کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نوجوان تک پہنچ گئے اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے...... تو اتنا ناراض کیوں ہے؟''

نوجوان نے ذرا سکھ کا سانس لیا اور اپنے آس پاس دیکھ کر بولا۔ ''مجھے کیوں کسا ہوا ہے، ان سب نے مجھے اپنے گھیرے میں کیوں لے رکھا ہے؟''

قاضی شمس الدین نے جواب دیا۔ ''تیرا دماغ جو خراب ہوگیا تھا......''

ابھی فقرہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ نوجوان نے برق رفتاری سے جھپٹ کر قاضی شمس الدین پر حملہ کردیا۔ اس نے قاضی شمس الدین کا گریبان پکڑ کر کئی جھٹکے دیے اور چیخ کر بڑبڑایا۔ ''میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ تو مجھے پاگل کہتا ہے، میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''

قاضی شمس الدین بوکھلا گئے۔ گھبرا کر بولے۔ ''تم سب اس کے پاس سے ہٹ جاؤ، یہ ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ میں اس سے بات کرکے اس کا دکھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

لیکن کئی طاقتور آدمیوں نے قاضی جی کو رہا کرادیا اور اس اجڈ نوجوان کو بے بس کرکے باندھ کر ڈال دیا۔ تاجر نے اس نوجوان کو باندھنے والوں کی مدد سے اپنے خیمے میں پہنچا دیا۔ قاضی شمس الدین کو اس نوجوان سے بڑی دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ بھی تاجر کے خیمے میں پہنچ گئے اور پوچھا۔ ''کیا آپ میں سے کوئی اس نوجوان کی بابت کچھ بتانا پسند کرے گا؟''

قاضی نے دیکھا، بندھا ہوا نوجوان ان سب کو قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ تاجر نے کہا۔ ''جناب! اب کیا بتائیں مجھ سے ہی غلطی ہوگئی تھی، اسی غلطی کو بھگت رہا ہوں۔''

قاضی نے کہا۔ ''پھر بھی کچھ معلوم تو ہو، ممکن ہے میں اس کا کوئی حل نکال لوں۔''

تاجر قاضی کو دوسرے خیمے میں لے گیا اور وہاں

سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”جناب والا! مجھے تو یہ نوجوان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیا اس کا دماغی توازن درست ہے؟“

قاضی حیران تھا کہ جو سوال اس کو تاجر سے کرنا تھے، تاجر خود کر رہا تھا۔ قاضی نے کہا۔ ”تاجر! معلوم نہیں تو کیسا آدمی ہے۔ بات کو خوامخواہ طول دے رہا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، اگر تو کسی وجہ سے اس نوجوان کی بابت کچھ نہیں بتانا چاہتا تو نہ سہی، میں تو چلا۔“

لیکن تاجر نے قاضی کو روک لیا، بولا۔ ”محترم قاضی! اس وقت میں اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا ہے، میں آپ کو کس طرح مایوس کرسکتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس نوجوان کو اصفہان سے خریدا ہے، تقریباً دو سال پہلے۔ اس وقت یہ سیدھا سادہ ہوا کرتا تھا۔ یہ کھانے پینے کا بڑا شوقین ہے، یہ خوب صورت بھی بہت زیادہ ہے۔ میں نے یہ سوچا تھا، اسے کسی حکمران کے ہاتھ اچھی قیمت پر نکال دوں گا لیکن اب ادھر کچھ دن سے یہ عجیب وغریب حرکتیں کر رہا ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ مجھے مایوس کردے گا۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”یہ کیا عجیب وغریب حرکتیں کرتا ہے؟“

تاجر نے جواب دیا۔ ”ایک تو یہ کہ اس کو بھوک بہت لگنے لگی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگتا رہتا ہے۔ دوسری اہم اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ میری ایک کنیز پر عاشق ہوگیا ہے۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”وہ کنیز کہاں ہے؟“

تاجر نے ایک تیسرے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں، اس خیمے میں۔“

اس کے بعد تاجر اٹھا اور قاضی کو کنیز والے خیمے میں لے گیا۔ اس میں دس گیارہ کنیزیں سامان کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ اس میں جگہ بہت کم تھی۔ کنیزوں نے تاجر کو دیکھا تو مسکرانے لگیں۔ ایک کنیز نے قاضی سے کہا۔ ”حضرت! ادھر میری طرف، مجھے خرید لیجیے میں بہت کام کی ہوں۔ آپ میری جتنی قیمت ادا کریں گے، میں اس سے زیادہ قیمتی ہوں۔“

تاجر نے اس کنیز کو ڈانٹا۔ ”لڑکی! تو کیا پٹر پٹر زبان چلا رہی ہے، بند کر بکواس اپنی۔ یہ قاضی شمس الدین ہیں، کوئی خریدار نہیں۔“

لڑکی نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھی یہ خریدار ہیں۔“

تاجر نے قاضی کے کان میں کہا۔ ”یہی وہ لڑکی ہے جس نے اس نوجوان کو پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔“

قاضی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کنیز کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔ کنیز سے پوچھا۔ ”ہاں تو جناب آپ ہیں وہ جسے دیکھنے کے لیے میں اس خیمے میں آیا تھا۔“

کنیز نے ایک بار پھر وہی سوال کیا۔ ”کیا آپ مجھ کو خریدنا چاہتے ہیں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں خریدنا نہیں چاہتا۔ شاید تجھ کو نہیں معلوم کہ ایک نوجوان تجھ پر عاشق ہوگیا ہے۔“

کنیز نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ نوجوان؟ کہاں ہے وہ نوجوان؟“

تاجر نے دور ہی سے آواز دی۔ ”قاضی صاحب! دیکھ لیا آپ نے، اب آجائیے۔“

کنیز نے آہستہ سے اصرار کیا۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ کون ہے وہ نوجوان؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”ایک دوسرے خیمے میں بند ہے، بے چارہ باندھ کر ڈال دیا گیا ہے۔“

کنیز چپ ہوگئی اور قاضی تاجر کے پاس چلا گیا۔

تاجر نے کہا۔ ”قاضی صاحب! آپ ہی مشورہ دیجیے میں اس نوجوان کا کیا کروں؟ وہ تو پاگل ہو رہا ہے۔ اگر وہ کسی طرح آزاد ہوگیا تو اس کنیز کی خیر نہیں۔ میرا بہت نقصان ہوجائے گا۔“

قاضی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”تجھ کو دو میں سے ایک کام فوراً کرنا ہے۔“

تاجر نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کون سے دو میں سے ایک کام؟“

قاضی نے کہا۔ ”یا تو، تو اس نوجوان کو فوراً کسی کے ہاتھ بیچ دے یا پھر اس کنیز کو فروخت کردے۔“

تاجر نے بے بسی سے کہا۔ ”لیکن اتنی جلدی گاہک ملے گا کہاں؟“

قاضی نے کہا۔ ”یہ اجڈ وحشی نوجوان تیرے لیے کئی پریشانیاں کھڑی کرسکتا ہے اور تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں جھیل سکے گا۔“

تاجر بہت پریشان تھا، پوچھا۔ ”کون کون سی پریشانیاں پڑسکتی ہیں مجھ پر؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر یہ نوجوان چھوٹ گیا تو تیری کنیز کی خیر نہیں اور اگر ہلاکو خان کو اس نوجوان کے پاگل پن کا علم ہوگیا تو وہ اسے فوراً قتل کردے گا۔“

تاجر اور زیادہ سہم گیا۔ اس نے کنیز کو چھپا کر نوجوان کی نگرانی شروع کردی لیکن نوجوان میں قوت عمل

کی ذرا بھی کمی نہیں تھی۔ اس میں یہ خصوصیت غیر معمولی تھی کہ جس بات کا ارادہ کرلیتا اسے ہر قیمت پر کر کے رہتا تھا۔ اسے کنیز اچھی لگی تھی اس لیے اس کو حاصل کرنا اپنا مقدر بنالیا تھا۔ وہ بے دھڑک تاجر کے پاس گیا اور پوچھا۔
''وہ کہاں چلی گئی؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، میں اسے جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

تاجر نے اسے ڈرانا چاہا۔''اس کنیز کو ہلاکو خان نے پسند کرلیا ہے، تجھ کو اس کا خیال تک اپنے دل سے نکال دینا چاہیے۔''

نوجوان کو اس حال میں بھی ہلاکو خان کی حیثیت کا اندازہ تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ ہلاکو خان قہر و ہلاکت اور بربادی و تباہی کے ایک خونی پیکر کا نام ہے، اس نے کہا۔
''میں اس کو حاصل کر کے رہوں گا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں، میں خود بھی ہلاکو خان بن سکتا ہوں۔''

تاجر کی روح فنا ہوئی جارہی تھی، وہ ڈر رہا تھا کہ نوجوان کی یہ باتیں کہیں ہلاکو خان کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔ نوجوان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن نوجوان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آرہی تھیں، وہ بولا۔''جناب والا! میں تو بس ایک ہی بات جانتا ہوں، وہ کنیز اگر مجھے نہ ملی تو میں کسی کو نہیں ملوں گا۔ وہ میری زندگی ہے، میری روح ہے۔''

تاجر نے جواب دیا۔''ذرا صبر سے کام لے، تحمل سے۔ کیا تو نے نہیں سنا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''

نوجوان بالکل ماؤف الدماغ ہوا جارہا تھا، پھر معلوم نہیں کیوں اور کس طرح اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا کہ اگر ان لوگوں میں ایک دو دن اور رہ گیا تو تاجر اور اس کے ساتھی اسے ہلاک کردیں گے۔ وہ فرار کی بابت سوچنے لگا۔ رات کے پچھلے پہر وہ چپ چاپ اٹھا اور دبے قدموں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلے تو وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے چلتا رہا لیکن جیسے جیسے وہ ان لوگوں سے دور ہوتا گیا، اس کی رفتار میں تیزی آتی گئی۔

جب وہ ان لوگوں کے درمیان سے نکل گیا تو اس نے ایک طرف بھاگنا شروع کردیا۔ اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس کو تلاش ضرور کیا جائے گا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک پہاڑی کی ترائی میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے پہاڑی سڑک تھی، یہ سڑک نیچے سے اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ اس نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کردیا۔ کئی فرلانگ چڑھ جانے کے بعد اسے ایک چھوٹا سا غار دکھائی دیا۔ غار کے منہ پر چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ پتھر خاص طور پر رکھے گئے ہوں۔ اس نے ان پتھروں کو ہٹایا اور غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے اندر جانے کے بعد اس نے ہٹائے جانے والے پتھروں کو ان کی جگہ دوبارہ رکھ دیا۔

اندر بہت اندھیرا تھا، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ کئی بار ٹھوکریں لگیں۔ اس کو سانپ بچھوؤں کا بھی ڈر نہ تھا۔ یہاں رات ہی رات کا گزر تھا، دن کا کہیں پتا تک نہ تھا۔ نوجوان اس میں دبک کے بیٹھ رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کو ہلاکو خان بھی نہیں پاسکتا تھا۔ وہ ہر طرف سے بے فکر اور بے نیاز ہوکر لیٹ گیا۔ ہلکی ہلکی ہوا جسم میں فرحت و تازگی پیدا کرنے لگی اور نوجوان لیٹے ہی لیٹے دنیا سے بے خبر ہوگیا۔ وہ کتنی دیر سوتا رہا، اس کو کچھ پتا نہ تھا۔ کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو بھوک نے ستانا شروع کردیا۔ شاید غار میں داخلے سے پہلے اس نے بھوک پیاس کی بابت سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ جتنی دیر برداشت کرسکتا تھا، کرتا رہا۔ لیکن جب بات برداشت کی نہیں رہی تو وہ آہستہ آہستہ غار سے باہر نکلا اور کھانے...پانی کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک جگہ اس نے پانی گرنے کی آواز سنی تو ٹھٹک کر مڑا اور اس آواز کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ آگے جا کر راستہ ختم ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا کھڑا پانی تک پہنچنے کی راہ تلاش کرتا رہا پھر اچانک اس کی نظر ایک چھوٹے سے شگاف پر پڑی...... وہ اس شگاف سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہاں ایک آبشار تھا اور آبشار کا پانی اوپر سے نیچے تک دھار کی شکل میں گر رہا تھا۔ یہ اسی دھار کی آواز تھی جو دور سے سنائی دیتی تھی۔ اس نے جی بھر کے پانی پیا اور قریب ہی سبزے پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ یہاں تصور میں بار بار ایک ہی شکل آرہی تھی، تاجر کی کنیز کی شکل۔ وہ سوچتے سوچتے ایک دم غصے میں اٹھا اور سختی سے کہا۔''میں تجھ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟''

وہ دیر تک خیالوں میں باتیں کرتا رہا۔ بھوک نے ایک بار پھر اسے پریشان کرنا شروع کردیا۔ اس بار وہ اس طرح جوش و خروش سے اٹھا گویا وہ کھانا حاصل کر کے رہے گا۔ اس کو آبادی کی تلاش تھی، کسی گھر کی تلاش جس سے وہ کھانا مانگ سکتا۔ لیکن یہاں کہیں گھر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ ایک چٹان کے نیچے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

یکا یک اس نے انسانوں کی آوازیں سنیں، شاید دو آدمی کسی طرف سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ اسی کی طرف آرہے تھے۔ ان کی آواز دم بدم قریب آتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے سر پر آگئے، تو

اسے ہوش آیا۔ ان دونوں نے اس سنسان جگہ پر ایک مرد کو تنہا بیٹھا دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ''دوست! کمال ہے اس شخص پر۔ یہ یہاں کیسے آ گیا۔ یہاں تو اس طرح کوئی آتا بھی نہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''بات چیت کر کے دیکھ لو، اگر مفید مطلب ہو تو اپنے ساتھ لے چلو ورنہ یہیں پڑا رہنے دو۔''

نوجوان نے ان دونوں کو جو دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

دونوں اجنبی اس نوجوان کے پاس پہنچے اور پوچھا۔ ''خدا کی شان ہے جو تو یہاں تنہا بیٹھا دکھائی دے رہا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، اس قسم کے سوال تو کیوں کر رہا ہے اور میں ان کے جواب کیوں دوں؟''

دوسرے اجنبی نے کہا۔ ''اچھا بھائی غلطی ہو گئی۔ تو یہ تو ضرور بتائے گا کہ کہیں تو بھوکا پیاسا تو نہیں ہے؟''

یہ بات نوجوان کے دل کی کہی گئی تھی، فوراً جواب دیا۔ ''ہاں یہ سوال تو نے مزیدار کیا ہے۔ میں پیاسا تو بالکل نہیں کیونکہ میں نے ابھی ابھی اس آبشار کا پانی پیا ہے، مزے دار میٹھا مگر تلاش اور جستجو کے باوجود میں کھانا نہیں پا سکا جبکہ میں بڑی دیر سے کھانے کی تلاش میں ہوں۔''

ایک نے پوچھا۔ ''کیا تو بھوکا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیا میرے چہرے پر تیرے اس سوال کا جواب موجود نہیں ہے؟''

دونوں اس کے اس جواب پر ہنسنے لگے، ایک نے کہا۔ ''بہت مزیدار ہے یہ نوجوان۔''

نوجوان نے کہا۔ ''مزے دار صرف کھانا ہوتا ہے۔ میں کیوں مزیدار ہونے لگا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہم تجھے کھانا کھلائیں گے، ضرور کھلائیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آ میرے ساتھ چل۔''

نوجوان ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔ نوجوان نے ان دونوں کی وضع قطع پر جو غور کیا تو بڑی حیرت ہوئی۔ ان دونوں کا لباس ایک جیسا تھا۔ یکساں سفید پوشاک، لال دستار، سرخ کمربند، اپنی وضع قطع سے وہ تاجر معلوم ہوتے تھے۔ یہ دونوں نوجوان لوٹ کر پہاڑی کے دوسری طرف چلے گئے۔ نوجوان چپ رہا اور راستوں پر نظریں جماتا رہا۔

ارشادات نبی کریم ﷺ

☆ جو شخص سلام کرنے سے پہلے بات کرے اس کا جواب مت دو جب تک وہ سلام نہ کرے۔

☆ شرک کے بعد بدترین گناہ خلقِ خدا کو تکلیف پہنچانا ہے اور ایمان کے بعد افضل ترین نیکی خلقِ خدا کو آرام پہنچانا ہے۔

☆ پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔

☆ زندگی کو غنیمت جانو، یہ بہت جلد تم سے لی جائے گی۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

ایک نے گھوم کر نوجوان سے پوچھا۔ ''مگر یہ تو نے بتایا ہی نہیں کہ آخر تو آیا کہاں سے اور جائے گا کہاں؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''مجھ کو ان دونوں سوالوں سے چڑ ہے۔ اس لیے میں ان کا جواب نہیں دوں گا، چاہے تم مجھے کھانا کھلاؤ یا نہ کھلاؤ۔''

ایک نے دوسرے کو سمجھایا۔ ''یہ نوجوان دکھی معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اس سے کوئی ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے جس سے اس کو اذیت ہو۔ اس کا دکھی ہونا ہمارے لیے مفید بات ہے۔''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

یہ دونوں اس نوجوان کو لے کر ایک درّے میں پہنچے۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔ یہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پھل دار درخت چشمے اور گھاس، یہاں دس بارہ خیموں کی ایک بستی سی نظر آ رہی تھی۔ بستی کو دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل کود میں مشغول تھے۔ وہ ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ کئی عورتیں چشموں سے پانی بھر بھر کر لیے جا رہی تھیں۔ چند بوڑھے اپنے خیموں کے باہر مصروفِ گفتگو تھے۔ بڑے میاں نے اس نوجوان کو دیکھا تو چپ ہو گئے، کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''نوجوان تو مجھے بھوکا نظر آ رہا ہے۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک!''

دونوں نے اسے بڑے میاں سے باتیں کرتے جو دیکھا تو خوش نہیں ہوئے۔ ایک نے بڑے میاں کو نہایت

احتیاط سے سمجھایا کیونکہ وہ اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا، بولا۔ ''اول طعام بعدہ، کلام۔ میرا یہ دوست بہت بھوکا ہے اس لیے میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کو سوالوں میں الجھادوں۔''

دونوں اس نوجوان کو خیمے میں لے گئے۔ اس خیمے میں کوئی بھی نہیں تھا، بالکل خالی پڑا ہوا تھا لیکن اس میں سازوسامان نہایت قیمتی رکھا ہوا تھا، کہا۔ ''اس خیمے میں تجھ کو آرام بہت ملے گا۔''

ان دونوں نے اس نوجوان کو اس خیمے میں چھوڑ دیا اور کہا۔ ''دوست! اگر چاہو تو یہاں کچھ دیر آرام کرلو، کھانا بس آیا ہی چاہتا ہے۔ ذرا سی دیر میں۔''

نوجوان اس طرح بولا، جیسے وہ اس کا حق ہے اور کھانا کھلا کر اس پر کوئی احسان نہیں کیا جا رہا ہے، بولا۔ ''میں کھانا کھائے بغیر کیونکر سو سکتا ہوں، بھوکا ہوں، پہلے کھانا بعد میں کچھ اور۔''

دونوں اس کی باتوں پر مسکرا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کھانا آگیا۔ نوجوان کھانے پر اس طرح گرا، جس طرح گدھ کسی مردار پر گرتا ہے۔ وہ جلدی جلدی کھانے لگا۔ اس کے قریب ہی پانی بھی رکھ دیا گیا۔ سارا کھانا کھا چکنے کے بعد پانی کا برتن منہ سے لگالیا اور ایک ہی سانس میں سارا چڑھا گیا پھر ایک زوردار ڈکار لے کر ان دونوں سے کہا۔ ''صاحبان! آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔ بھوک کی وجہ سے میرا دم لبوں پر آگیا تھا۔''

دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''شکریہ کس بات کا۔ ہم نے تو اسے اپنا فرض سمجھا تھا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہم نے جو کچھ کیا، اپنا فرض ادا کیا۔ خدا ہر شخص کو اس نیکی کی توفیق دے۔''

کھانے کا نشہ دل ودماغ پر طاری ہونے لگا۔ سستی نے نوجوان کو مضمحل کر دیا تھا۔ دونوں نے دیکھا نوجوان کی آنکھوں میں خمار سا چڑھ رہا ہے، پوچھا۔ ''کیا نیند آرہی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، بڑی زور کی نیند آرہی ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا، پھر ایک نے نوجوان سے کہا۔ ''اب تو سو سکتا ہے، ہم دونوں چلتے ہیں۔''

نوجوان نے نیم غنودگی میں اونگھتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''ہم جائیں گے کہیں بھی نہیں، باہر موجود رہیں گے۔ اس دوران اگر کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو ہمیں آواز دے کر بلا لینا۔''

وہ دونوں باہر چلے گئے اور یہ بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ کتنی دیر سوتا رہا، اسے کچھ پتا نہ تھا لیکن جب وہ بیدار ہوا تو اس نے اپنے پائینتی دونوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ باتیں بھی کر رہے تھے مگر بہت آہستہ آہستہ۔ نوجوان نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں، ایک کہہ رہا تھا۔ ''نوجوان بہت دکھی معلوم ہوتا ہے اس لیے جیسے ہی یہ جاگے، اس سے اس کا دکھ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''مگر بہت احتیاط سے، کیونکہ یہ چڑچڑا اور نازک مزاج انسان بہت جلدی برا مان جاتا ہے۔''

نوجوان صبر نہیں کرسکا فوراً بول دیا۔ ''تم دونوں ادھر میرے پاس میرے سامنے آجاؤ۔''

دونوں یہ جان کر گھبرا گئے کہ نوجوان جاگ رہا ہے اور اس نے ان دونوں کی باتیں بھی سن لی ہیں۔ دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔

نوجوان نے ان سے پوچھا۔ ''آخر تم دونوں میرا دکھ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ اس کا کوئی خاص سبب ہے؟''

وہی شخص نوجوان کو سمجھانے لگا۔ ''میرے دوست! اس کا کوئی خاص سبب نہیں ہے مگر جب میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت میں نے اپنے دل میں یہ رائے قائم کرلی تھی کہ تو زمانے کا ستایا ہوا دکھی انسان ہے اور ہم نے اسی وقت اس کا علاج بھی سوچ لیا تھا۔''

نوجوان حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

نوجوان نے کہا۔ ''میں اپنے بارے میں کسی کو بھی کچھ بتانا پسند نہیں کرتا لیکن آپ دونوں کی غیر معمولی محبت اور ہمدردی نے مجھ کو مجبور کر دیا ہے۔ اب میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔''

ایک نوجوان نے جواب دیا۔ ''بہت بہت شکریہ، کرم، نوازش، مہربانی۔''

نوجوان ان دونوں کے چہروں پر نظریں جمائے گھور رہا تھا۔

ایک نے پوچھا۔ ''تو آیا کہاں سے ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں جہاں سے بھاگ کر آیا ہوں اگر اس جگہ کا نام بتادوں گا تو تم ڈر جاؤ گے اور مجھ سے بھی پریشان ہو جاؤ گے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں، ہم لوگ خدا کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔''

نوجوان نے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ آپ دونوں بہت بہادر انسان ہیں۔ جناب والا! میں ہلاکو خان کے لشکر

سے بھاگ کر آیا ہوں۔"

ایک نے پوچھا۔ "تو ہلاکو خان کے لشکر سے بھاگ کر آیا ہے؟" ہلاکو خان کا نام سن کر وہ دونوں واقعی ڈر گئے تھے۔

اس نے جواب دیا۔ "ہاں اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے ہلاکو خان کے آدمی مجھے ہر طرف تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔"

دونوں اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ ایک نے پوچھا۔ "اگر وہ تجھ کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور وہ یہاں تک آ بھی گئے تو اس وقت وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

جواب ملا۔ "وہ وہی سلوک کریں گے جو آج تک کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ تمہارے پورے کنبے کو موت کے گھاٹ اتار کر خوشی کے گیت گائیں گے کیونکہ کسی کو دکھ اور اذیت میں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔"

ایک نے پوچھا۔ "دوست! تم نے نام نہیں بتایا ابھی تک۔"

اس نے جواب دیا۔ "میرا نام جبار ہے جس کا مطلب ہے گردن توڑ دینے والا۔ میں اپنے دشمنوں کی گردنیں توڑ دیتا ہوں۔"

دونوں اس نام سے بہت خوش ہوئے۔ ایک نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ "تمہارا نام تو بہت اچھا اور زبردست ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اچھا جناب اب تم یہ بتاؤ کہ ہلاکو خان کے لشکر سے تم بھاگے کیوں؟"

جبار نے سرد آہ بھری۔ "میں ہلاکو خان کے لشکری تاجر کی ایک کنیز پر عاشق ہو گیا تھا۔ مجھے خوشامد درآمد اور عاجزی وانکساری تو آتی نہیں، میں نے اس تاجر سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس لڑکی کو میرے حوالے کر دے ورنہ میں زبردستی قبضہ کر لوں گا۔ اس نے میرے خلاف ایک مجمع اکٹھا کر لیا۔ ان میں ایک قاضی بھی تھا۔ اس قاضی نے تاجر کا ساتھ دیا اور مجھ کو بے بس کر کے رسی سے باندھ کر ایک خیمے میں ڈال دیا گیا، لیکن تم جانو میں کوئی معمولی نوجوان تو ہوں نہیں، رات کے اندھیرے میں، میں رسی توڑ کر فرار ہو گیا۔ میں چاہتا تو اس حسین لڑکی کو بھی اپنے ساتھ نکال لاتا لیکن میں نے سوچا کہ ہلاکو کے لشکر میں مجھے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اگر ہلاکو مجھ سے ناراض ہو جاتا تو اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر میرے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہوتی۔"

ان دونوں نے جبار کو بڑی تسلیاں دیں، کہا۔ "جبار! ہم نے اس حسین کنیز کو نہیں دیکھا۔ جب تم اس کی تعریف کرتے ہو تو وہ حسین ہو گی، اس تاجر کا نام کیا ہے؟"

جبار نے جواب دیا۔ ''تاجر کا نام خیرالدین ہے اور وہ تاتاریوں کے لشکر میں بہت معزز اور نامور تاجر ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''اللہ سے مایوس نہ ہو۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ بگڑے کام چشم زدن میں بنا دیتا ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''تیرے قول کی سچائی یا جھوٹ بھی دیکھ لوں گا ورنہ میرا خدا پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔''

انہوں نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے۔ ''نہیں صاحبزادے! ایسی بات نہیں کرتے۔ خدا تیرے یقین کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہے اور ہمیشہ رہے گا، انسان فانی ہے فنا ہوجائے گا۔''

جبار ان دونوں سے دیر تک الجھتا رہا اور بحث کرتا رہا۔ وہ دونوں جبار کو سارا دن گھیرے رہے۔ جبار بات بات پر گرمی دکھاتا رہا۔ اس نے کئی بار ان پر حملہ بھی کر دیا لیکن وہ دونوں معلوم نہیں کس مٹی کے بنے تھے، جبار کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔ ہاں وہ دونوں جبار کی اس بات پر بہت ہنسے تھے کہ جب وہ اتنا طاقتور اور سرکش ہے تو اس نے تاجر سے اپنی محبوبہ کو جبراً کیوں نہ حاصل کر لیا؟

جبار ایک دم مشتعل ہوگیا۔ اس نے ان دونوں کو جی بھر کے گالیاں دیں اور کہا۔ ''تو گویا تم دونوں مجھے بزدل اور کمزور سمجھ رہے ہو لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔ میں نے کہہ جو دیا کہ اگر مجھے ہلاکو خان اور اس کے خونخوار منگولوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اپنی محبوبہ کو تاجر کی گردن توڑ کر حاصل کر لیتا۔ میں کتنا ہی طاقتور اور بہادر سہی لیکن ہلاکو خان کی فوج سے تو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اس امید پر جان بچا کے بھاگ آیا کہ اگر زندہ رہا اور وہ حسینہ بھی زندہ رہی تو میں ایک نہ ایک دن اسے ضرور حاصل کر لوں گا۔''

ایک نے کہا۔ ''چھوٹا منہ بڑی بات۔ میں کچھ اور تو نہیں کر سکتا مگر پھر بھی اگر چاہوں تو تم اپنی محبوبہ حاصل کر سکتے ہو۔''

جبار بے چین ہوگیا، بے چینی سے کھڑا ہوگیا۔ ''کس طرح، کہاں اور کب؟ مجھے وہ ترکیب بتادو، بس بقیہ سارا کام میں خود انجام دے لوں گا۔''

رات کو ان دونوں نے جبار کو کھانا کھلایا تو اس نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ ڈکار لی اور ان دونوں سے کہا۔ ''دوستو! معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑھاپے میں لوگوں سے زیادہ نہیں کھایا جاتا اور جوانی میں لوگ پورے پورے مویشی کھا جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک میں بھی ہوں۔ خدا نے میرے معدے میں جانے کتنی گنجائش رکھی ہے کہ بھرتا ہی نہیں۔ میں قناعت پسند کبھی نہیں بن سکتا۔''

ان دونوں نے کہا۔ ''بھائی جبار! ہم دونوں ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو کل ملاقات ہوجائے گی۔''

جبار نے کہا۔ ''بھائی میں تو پریشان ہوجاؤں گا۔''

لیکن وہ دونوں نہیں رکے اور رات بھر کے لیے کہیں غائب ہوگئے۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد اس کے پاس کئی دوسرے آدمی آگئے اور یہ سب جبار سے شرافت کے ساتھ پیش آئے لیکن جبار تو آدم بیزار تھا۔ اس کا یہاں کے شور و غل اور غل غپاڑے میں نسبتاً زیادہ دل لگ گیا مگر وہ ان سب سے تعلق قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رات کے پچھلے پہر تک اس کی آنکھ نہیں لگی۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور اپنے خیمے سے نکل کر باہر ٹہلنے لگا۔ باہر سردی بھی غضب کی تھی۔ اس نے دیکھا، باہر کئی جگہ آگ کے الاؤ روشن ہیں اور ان کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم ہے اور وہ سب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ جبار کو حیرت ہوئی...... اس نے سوچا، یہ آدمی ہیں یا جن جو اتنی ویران جگہ پر رات گئے بھوتوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ ایک الاؤ کی طرف بڑھا۔

الاؤ کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے جبار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بہ آواز بلند کہا۔ ''دیکھو، وہ عجیب و غریب، تندخو، بلانوش، بسیار خور اور جدوجہد کا پتلا۔''

جب یہ ان کے سر پر پہنچ گیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ وہ سب جبار کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہے تھے، ان میں کئی خوب صورت عورتیں بھی تھیں۔ ایک بوڑھے مرد کو جبار کی آمد پر اعتراض ہوا، بولا۔ ''مہمان! تمہیں بلا اجازت یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

جبار الاؤ پر ہاتھ سینکنے لگا، تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا۔ ''کیوں؟ مجھے یہاں کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''تم کو میرے گھر بلا اجازت نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ میرا گھر ہے، میرا کنبہ، ہم لوگ سرد راتیں اسی طرح الاؤ کے گرد بیٹھ کر گزار دیتے ہیں۔ تم ہمارے مہمان ہو، ہم نے تمہیں اپنے خاندانوں سے دور دور رکھا ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''یہ دور دور کیا چیز ہوتی ہے۔ میرا دل گھبرایا تنہائی سے تو میں آگیا۔ میں اپنی مرضی کا مالک

ہوں، جہاں چاہوں رہوں، مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔''
بڑے میاں تن کر کھڑے ہو گئے۔ ''کیا بکواس کیے جارہا ہے تو؟ تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟''
جبار نے بڑے میاں کا گلا پکڑ لیا، بولا۔ ''بتاؤں میں کیا سمجھتا ہوں تمہیں!''
نوجوان مرد جبار پر جھپٹے لیکن جبار نے بڑے میاں کو دھکا جو دیا تو وہ دور جا گرے۔ اس کے بعد جبار نے ان نوجوانوں پر حملہ کر دیا اور ہر ایک کو مار گرایا، بولا۔ ''تم لوگوں نے دیکھ لیا مجھے؟ میرا نام جبار ہے۔ تمہاری گردنیں توڑ دینے والا۔''
اپنے مردوں کو پٹتے دیکھ کر عورتوں نے جبار پر حملہ کر دیا۔ ایک عورت نے الاؤ میں سے ایک جلتی لکڑی کھینچی اور جبار پر دے ماری۔ جبار ہٹ گیا۔ لڑکی کا وار خالی گیا۔ جبار کو اس لڑکی پر غصہ تو بہت آیا مگر کرتا کیا؟ وہ پھرتی سے لڑکی کے پاس گیا اور ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا، بولا۔ ''تو، تو خود بھی نازک ہے اور عورت ذات بھی۔ یہ تجھ کو کیا سوجھی تھی جو مجھ پر خوامخواہ الاؤ کی لکڑی کھینچ ماری۔''
لڑکی نے جواب دیا۔ ''تو نے میرے باوا کا گریبان کیوں پکڑا تھا اور پھر تو نے میرے بھائیوں کو بھی تو مارا تھا ابھی۔''
جبار نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی! میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی میں رعایت کا قائل ہوں۔ میرے ساتھ جو جیسا سلوک کرے گا، ویسا ہی میں جواب بھی دوں گا۔''
لڑکی نے غصے میں کہا۔ ''اب تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں چند طاقتور نوجوانوں کو بلوا کر تیری پٹائی کروا سکتی ہوں۔''
جبار کو ہنسی آگئی، بولا۔ ''نہ نہ...... کہیں ایسی حرکت نہ کر گزرنا، ورنہ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔''
لڑکی نے پھر وہی بات کی۔ ''بس تو یہاں سے چلا جا۔ اسی میں تیری خیریت بھی ہے۔''
جبار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا اور ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ''خاتون! تم عورت ہو اس لیے خاموش ہوں ورنہ اگر یہی باتیں کسی مرد نے کی ہوتیں تو اس کو ایسا جواب دیتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔''
لڑکی وہاں سے بھاگ کر کسی طرف غائب ہو گئی۔ جبار ہاتھ سینکتا رہا۔ بڑے میاں اور اس کے لڑکے اسے حیرت اور غصے سے دیکھتے رہے۔ جبار نے طنزاً کہا۔ ''آپ لوگ دور کیوں کھڑے ہیں یہاں آجائیے الاؤ کے پاس۔ بڑی سخت سردی ہے اس وقت۔''
بڑے میاں نے کہا۔ ''افسوس نوجوان، جو بات میں نہیں چاہتا تھا وہی ہونے والی ہے۔ اب بھی اسی میں عافیت ہے کہ تو یہاں سے چلا جا ورنہ تجھے قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔''
جبار نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے قتل کیا جا سکتا ہے...... کون قتل کرے گا مجھے؟ خوب۔ وہ نازک اندام لڑکی؟''
اتنے میں لڑکی ایک نوجوان مرد کو لیے ہوئے واپس آتی دکھائی دی۔ جبار نے دیکھا مرد کے ہاتھ میں ایک چھرا تھا۔ جبار ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جب وہ دونوں قریب آگئے تو جبار بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لڑکی نے مرد کو جوش دلایا۔ ''اس نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا تھا، کر دے اس کے ٹکڑے۔''
مرد نے نرمی سے سمجھایا۔ ''نوجوان! تم یقین کرو میرے ایک ہاتھ کے بھی نہیں ہو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ رشید اور وحید نے تیری بابت ہمیں کچھ بتایا تھا، چلو اس بہانے ملاقات تو ہو گئی۔''
وہ مرد آگے بڑھا اور جبار کو گلے لگانے کی کوشش کی لیکن جبار نے اس کو دھکا دے دیا، وہ گرتے گرتے بچا تو جبار کو ہنسی آگئی، بولا۔ ''میں نے یہاں ایک مرد میں بھی ویسی طاقت نہیں پائی۔''
گرنے والا مرد سنبھلا اور بلند آواز سے جبار سے کہا۔ ''لے سنبھل، میرا داؤ، میری طاقت بھی دیکھ لے۔''
جبار سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص دور سے دوڑتا ہوا آیا اور اچھل کر دائیں لات جبار کے سینے پر رسید کر دی۔ حملہ اتنا سخت تھا کہ جبار خود کو سنبھال نہیں سکا۔ دور جا گرا۔ وہ جیسے ہی اٹھا، اس پر اسی انداز سے حملہ ہوا اور جبار ایک بار پھر گر گیا۔
جبار کو اپنی زندگی میں کبھی بھی اس جیسے حملہ آور سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ الاؤ کے چاروں طرف جو لوگ کھڑے تھے، وہ ہنس رہے تھے۔
لڑکی نے ایک بار پھر مشورہ دیا۔ ''تو یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا؟''
اور اسی لمحے جبار کے سینے پر چوتھی لات لگی اور جبار دور جا گرا۔ لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھی مرد کو منع کیا، کہا۔ ''اب بس بھی کرو۔''
مرد خاموشی سے جبار کے پاس جا کھڑا ہوا۔
جبار نے کہا۔ ''او شخص! تو نے ایک کرتب دکھا کر مجھے پریشان کر دیا۔ یہ کون سا طریقہ ہے لڑائی کا؟ میں اگر چاہوں تو مچھر کی طرح مسل کر رکھ دوں تم لوگوں کو۔''
لڑکی نے کہا۔ ''بس بس، ہم نے دیکھ لی تیری

بہادری۔''
لڑکی کے ساتھ جو مرد آیا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دوست! لڑائی ختم۔''
جبار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ایک جھٹکا جو دیا تو مرد جبار کے قدموں میں منہ کے بل آن گرا۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ کسی نے اس منظر کو دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔ جبار نے اس مرد کے منہ پر پاؤں رکھ دیا، بولا۔ ''تیرے داؤ تو دیکھ لیے، یہ میرا داؤ بھی دیکھ لے۔''
مرد نے بڑی کوشش کی کہ چھوٹ جائے لیکن نہیں چھوٹ سکا۔ آخر جبار نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔ ''ہم دونوں کا حساب کتاب برابر ہو گیا۔''
مرد چھوٹتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جبار کو بڑے غور سے دیکھتا رہا، جبار بھی دیکھتا رہا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ مرد نے کہا۔ ''تو واقعی مرد ہے۔ شیر کی طرح۔''
جبار نے کہا۔ ''تو بھی شیر نر ہے چست چالاک، جست لگا کر حملہ کرنے والا۔''
لڑکی کھسیائی ہوئی تھی، پاؤں پٹخ کر جانے لگی تو مرد نے کہا۔ ''روشنک کہیں مت جا، اس نوجوان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے، کیونکہ یہ شیر ہے۔''
لڑکی لوٹ آئی۔ بڑے میاں اور ان کے بیٹے بھی الاؤ کے پاس دوبارہ آ گئے۔ اب ان سب میں جذبۂ خیر سگالی پیدا ہو چکا تھا۔
جبار نے کہا۔ ''لڑکی! تو مجھے اچھی لگنے لگی ہے، تیری عادتیں البتہ خراب ہیں.... تو جھگڑالو معلوم ہوتی ہے تنک مزاج اور شعلہ خو۔''
مرد نے کہا۔ ''بس جناب! بات یہیں تک رہنی چاہیے۔ کیا نام ہے تیرا؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''جناب! بات یہیں تک کیوں رہنی چاہیے۔ مجھے یہ لڑکی اچھی لگی ہے۔ میں نے اس کا اقرار کر لیا۔ اس میں بری بات کیا ہے؟''
مرد نے جواب دیا۔ ''اس میں بری بات یہ ہے کہ یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس سے میں شادی کرنے والا ہوں۔''
جبار نے کہا۔ ''تیری ہونے والی بیوی ہے، ہو تو نہیں گئی بیوی...... میرے لیے بس اتنی سی بات کافی ہے۔''
مرد کے چہرے پر غصے اور جھنجلاہٹ کے آثار پیدا ہوئے بولا۔ ''جبار! تم ہم سب کے مہمان ہو اس لیے ہم لوگ تیری کڑوی کسیلی باتیں بھی برداشت کر رہے ہیں۔ یہ لڑکی میری ہونے والی بیوی ہے۔ تجھ کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''میں یہ بات کیوں ذہن نشین کر لوں، جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہو جاتی، اس پر کوئی شخص بھی اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ لڑکی کل مجھ کو چاہنے لگ جائے۔''
مرد نے لڑکی سے کہا۔ ''روشنک! آؤ گھر چلیں۔''
روشنک نے جواب دیا۔ ''میں پھر آ جاؤں گی۔''
جبار مسکرانے لگا۔ مرد پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ روشنک سر جھکائے الاؤ کے پاس بیٹھی ہاتھ سینکتی رہی۔ وہ کسی کسی لمحے جبار کی طرف دیکھ بھی لیتی۔ لڑکی کے باپ نے اس کو سمجھایا۔ ''روشنک! اسمٰعیل ناراض ہو گیا ہے تو جا اور اس کو منانے کی کوشش کر۔''
روشنک نے جواب دیا۔ ''بابا جان! وہ بہت روٹھنے لگا ہے۔ میں اس کو مناتے مناتے تنگ آ گئی ہوں۔''
روشنک کے ایک بھائی نے کہا۔ ''پھر بھی وہ تیرا ہونے والا شوہر ہے۔''
روشنک نے جواب دیا۔ ''ہونے والا شوہر ہے، ابھی شوہر ہے تو نہیں۔''
جبار ان کی باتیں سن سن کر مسکرا رہا تھا۔ ان سب کی باتیں سننے کے بعد جبار نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ ''صاحبان! میں دوسرے قسم کا انسان ہوں مجھ کو جو چیز پسند آ جاتی ہے، میں اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اگر وہ چیز مجھ کو بہ آسانی نہیں ملتی تو میں اس کو زبردستی حاصل کر لیتا ہوں، دوسروں سے چھین لیتا ہوں کیونکہ میں لڑائی جھگڑے سے نہیں ڈرتا۔''
باپ نے روشنک کو ڈانٹا۔ ''روشنک! اب تو آرام کر جا کر۔''
لیکن روشنک نے باپ کی بات نہیں مانی۔ پھر روشنک کے باپ اور بھائی طیش میں اٹھے اور الاؤ کے پاس سے اٹھ کر اپنے اپنے خیموں کی طرف جانے لگے۔ ان کو جاتے دیکھ کر روشنک بھی کھڑی ہو گئی لیکن جبار نے اسے دوبارہ بٹھا لیا، بولا۔ ''روشنک! یہی نام ہے نا تیرا؟ تو کہاں جائے گی، ابھی بیٹھ ذرا دیر۔''
روشنک نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے خیمے میں جانا ہے، اگر میں اس وقت نہیں گئی تو پورے کنبے کی مخالفت مول لے لوں گی۔ اس وقت تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔''
جبار نے اس کی ٹھوڑی کو انگوٹھے سے اوپر اٹھایا،

بولا۔ ''کیا تو نے میری بات سن لی ہے؟ وہ بات جو میں نے تیری بابت کہی تھی تیرے ہونے والے شوہر اسمٰعیل کو مخاطب کرکے۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''میں نے کسی کی بھی کوئی بات نہیں سنی۔''

وہ پھر جانے لگی تو جبار نے زبردستی اس کا چہرہ اپنے سامنے کر دیا، کہا۔ ''اگر نہیں سنی تھی تو اب سن لے۔ میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ مجھے روشنک پسند آگئی ہے اور میں جس چیز کو پسند کر لیتا ہوں زبردستی حاصل کر لیتا ہوں۔''

روشنک نے کہا۔ ''بکواس، فضول بات۔''

وہ چلی گئی۔ اب الاؤ کے پاس جبار کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ بھی کچھ دیر بیٹھ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ جبار کو زیادہ سوچ بچار کرنے کی عادت نہیں تھی مگر اب اس کو کچھ سوچنا بھی پڑ رہا تھا۔ وہ روشنک اور بعض دوسرے اہم آدمیوں کی بابت سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ ہیں کون لوگ؟ کرتے کیا ہیں؟ اور اس پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ یہ لوگ اس سے چاہتے کیا ہیں؟

دوسرے دن حسبِ وعدہ دونوں ساتھی بھی جبار کے پاس پہنچ گئے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، انہوں نے آتے ہی جبار کو یہ خوشخبری سنائی کہ تو خوش قسمت ترین انسان ہے، تو جس چیز کی بھی خواہش کرے گا، وہ تجھ کو مل جائے گی۔

جبار نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ خوش قسمتی کیا ہوتی ہے اور بدقسمتی کسے کہتے ہیں۔ میں تو بس ایک بات کا قائل ہوں کہ جو چیز حاصل نہ ہو اسے برباد کر دو۔''

دونوں کچھ دیر چپ، جبار کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر ایک نے ذرا شکایتی انداز میں کہا۔ ''بھائی جبار! ہمیں آپ سے ایک شکایت پیدا ہوگئی ہے کیا اس پر غور کریں گے آپ؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''پہلے بات تو کرو، وہ خاص بات جو اس وقت کرنے آئے تھے۔''

ایک نے کہا۔ ''جبار! کیا یہ درست ہے کہ تم نے رات پچھلے پہر مردوں اور عورتوں کو بہت تنگ کیا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے کسی کو بھی نہیں ستایا۔ یہ مجھ پر اتہام ہے۔''

دوسرے ساتھی نے کہا۔ ''اور وہ روشنک والی بات؟ کیا تم نے روشنک کے ہونے والے شوہر سے ایسی ویسی باتیں نہیں کیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں جس چیز کو پسند کر لیتا ہوں، اسے آخرکار حاصل کر لیتا ہوں۔''

ایک نے کہا۔ ''لڑکی یا عورت کی بابت تمہارا اندازِ فکر کیا ہے مجھے نہیں معلوم لیکن روشنک کو دیکھ کر جو کچھ تم نے کہا، وہ اچھی بات نہیں ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''آخر آپ دونوں مجھ سے کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''دیکھ جبار! پہلی بات تو یہ کہ ہم دونوں اپنا تعارف کرا دیں۔ میرا نام رشید ہے اور میرے ساتھی کا نام وحید...... ہم دونوں دن رات خدمتِ خلق کرتے رہتے ہیں چنانچہ جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ تجھ کو ایک مسلمان تاجر کی کنیز بہت پسند ہے تو ہم دونوں اس کی حصولیابی کی کوشش کرنے لگے۔''

جبار نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم دونوں اس کو کس طرح حاصل کرو گے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''بس، یہ نہ پوچھو۔''

وحید بولا۔ ''ہمارا ارادہ تو یہ تھا کہ ہم دونوں جب اس لڑکی کو حاصل کر لیں تب پھر تمہیں خبر کریں۔''

جبار کی سمجھ میں یہ دونوں اور ان کا پورا قبیلہ نہیں آرہا تھا۔

وحید نے کہا۔ ''ہم دونوں تمہارے لیے حسین ترین لڑکی کی جستجو کر رہے تھے، اچانک ہمیں یہ معلوم ہوا کہ تم روشنک کو چاہنے لگے ہو۔''

جبار نے پوچھا۔ ''تو اس میں خاص بات کیا ہوئی؟''

رشید ناراض ہوگیا، بولا۔ ''خاص بات کیوں نہیں ہوئی، روشنک اسمٰعیل کی ہونے والی بیوی ہے اور تم اس لڑکی کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتے ہو، یہ کوئی اچھی بات ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''دیکھو دوستو! تم دونوں نے مجھے رہنے کا ٹھکانا دیا ہے، کھانا کھلایا ہے میری دلجوئی کی ہے۔ یہ سب کیا ہے میں نہیں جانتا اور نہ ہی تم دونوں میں سے کسی نے کچھ بتایا ہے اس کی بابت۔''

رشید نے پوچھا۔ ''ان باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو؟''

رشید اور وحید ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

آخر وحید نے کہا۔ ''ہم لوگوں نے ایک ایسی تنظیم قائم کی ہے کہ...... بس، پھر کسی وقت اس کی بابت صاف صاف کھل کر بتا دیں گے۔''

جبار نے کہا۔ ''ادھر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ روشنک

کو تو میں اسمٰعیل کے لیے چھوڑ دوں گا اور میں خود اپنی پسندیدہ کنیز کے تاجر کے پاس چلا جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ وہ میری نرم گرم گفتگو کے جواب میں اس کنیز کو میرے حوالے کر دے۔''

وحید نے کہا۔ ''لیکن جبار! تم اس کنیز کی حصولیابی کے لیے کچھ بھی نہ کرنا۔ جیسا کہ ہم دونوں کچھ دیر پہلے بتا چکے ہیں کہ اس کو حاصل کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ اس کو ہم دونوں عنقریب تمہارے حوالے کر دیں گے۔''

جبار پر حیرتوں نے یلغار کر دی۔ وہ ایک بار پھر سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ اس کے لیے اتنی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے ان دونوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی، بولا۔ ''ہلاکو کے آدمی مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اگر وہ میری تلاش میں یہاں تک آ گئے تو؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''ہم بس کل تک یہاں اور ہیں اس کے بعد جگہ بدل لیں گے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''پھر کہاں چلے جائیں گے؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''کسی ایسی جگہ جہاں ہلاکو یا اس کے آدمی نہ پہنچ سکیں۔''

جبار نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں ہلاکو خان کے لشکر میں تاجر کے پاس دوبارہ جاؤں گا اور اس کنیز کو کسی بھی طرح حاصل کر کے فرار ہو جاؤں گا۔''

رشید نے کہا۔ ''پھر وہی احمقانہ بات۔ ہم نے کہہ جو دیا کہ اس کنیز کی حصولیابی ہماری ذمے داری ہے۔ میں تمہیں ایک ایسے مقدس اور باکمال شخص سے ملاؤں گا کہ اس کے بعد تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی۔ ہر خواہش پلک جھپکتے میں پوری ہو جائے گی۔''

جبار نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''اب میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اس مقدس شخص کی کسی بات سے ناراض ہو کر اس کا سر نہ پھوڑ دوں۔''

وحید نے جلدی جلدی ہولے ہولے اپنے گالوں پر طمانچے لگائے۔ ''توبہ کر توبہ۔ یہ کیسی ناشائستہ اور نازیبا باتیں کر رہا ہے تو؟''

رشید نے کہا۔ ''جبار! تو نہیں جانتا میں تجھ کو کس ہستی سے ملانے والا ہوں۔ زمین پر خدا کی نمائندہ ہستی۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ اور حاکم اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ محروم انسانوں کی محرومیت دور کرتا ہے، مایوسوں کی مایوسی ختم کرتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہر وہ بات ہے جو فانی انسانوں کے بس میں نہیں ہوتی۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا وہ میری محبوبہ کو مجھ سے ملا سکتا ہے؟ کیا وہ ہلاکو خان کا مقابلہ کر سکتا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''ہاں اگر وہ چاہے تو تیری محبوبہ کو چشم زدن میں تیرے قدموں میں ڈال سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ چاہے تو تیری محبوبہ جیسی شکل وصورت کی دوسری لڑکی سے ملوا سکتا ہے۔ اس کے اختیار میں بہت کچھ ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کا ایک معمولی جاں نثار ہلاکو خان کا کام تمام کر سکتا ہے۔''

اتنی تعریفیں سننے کے بعد جبار کو اس غیر معمولی ہستی کی بابت کچھ سوچنا پڑ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''میں اس عظیم ہستی سے کب اور کس طرح مل سکتا ہوں؟''

دونوں کے چہروں پر خوشی کی تابانی پیدا ہو گئی۔ رشید نے جواب دیا۔ ''تم جب چاہو، ہم دونوں ملوا دیں گے۔''

جبار کو ان دونوں کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''کیا اس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اتنی زیادہ طاقت اور خصوصیت رکھتا ہو کہ جو چاہے حاصل کر لے اور کسی چیز کے مماثل دوسری چیز پیدا کر دے۔''

وحید نے جواب دیا۔ ''بھائی رشید نے جو کچھ کہا، اس میں مبالغہ ذرا سا بھی نہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لو گے۔ میں تجھے عنقریب ایک ایسی دنیا میں پہنچاؤں گا جو دوسروں کے لیے نادیدہ ہو گی مگر تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا۔''

جبار کو جب یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنی محبوبہ سے مل سکے گا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور امید نے اس کے دل میں کچھ زیادہ ہی ولولہ اور جوش پیدا کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''تب پھر مجھے اس ہستی سے جلد از جلد ملواؤ۔ میں زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔''

رشید اور وحید مذکورہ مقدس اور عظیم ہستی سے ملاقات کرانے کا وعدہ کر کے خاموش ہو گئے۔ گویا وہ اپنا وعدہ بھول چکے تھے۔ وہ جبار سے نظریں چرانے لگے اور جبار کے اشتیاق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو تلاش کرتا پھر رہا تھا لیکن دونوں ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ اس نے ان دونوں کا پتا بعض دوسرے لوگوں سے بھی پوچھا۔ ''کیا آپ لوگ رشید اور وحید کا پتا بتا سکتے ہیں؟''

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ''برخوردار! وہ بہت مصروف رہتے ہیں اس لیے کچھ پتا نہیں کہ وہ کن خدمات کی انجام دہی میں کہاں گئے ہوئے ہیں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''ان دونوں کے سپرد کس قسم کی

خدمات ہیں اور وہ کس کی خدمات انجام دیتے ہیں؟''
بزرگ نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ میں جو کچھ بتا سکتا تھا، بتا چکا۔ اب اور ٹرٹر نہ کرو، ورنہ اپنا سر گھوم جائے گا۔''
جبار نے کہا۔ ''سر تو اپنا بھی گھوم جاتا ہے، میں تم لوگوں کا مہمان ہوں اس لیے خیال کر رہا ہوں۔ بڑے میاں جاؤ، میں نے معاف کر دیا تمہیں۔''
بڑے میاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جبار کے ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ یہ ہاتھ اتنا سخت تھا کہ جبار چکرا کے گر پڑا۔ جبار میں سویا ہوا وحشی جاگ گیا۔ وہ پھرتی سے اٹھا اور بڑے میاں کو ایک مکا رسید کر دیا۔ یہ مکا بڑے میاں نے اپنے ہاتھ پر روک لیا اور جبار کو دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ بڑے میاں کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ جبار نے ان پر تابڑ توڑ حملے کیے مگر بڑے میاں نے ہر وار خالی جانے دیا۔ جبار حیران تھا کہ یہ کیسا بوڑھا ہے جس میں جوانوں سے زیادہ چستی، پھرتی اور چالاکی ہے اور اسے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ بڑے میاں کے چہرے پر پریشانی یا گھبراہٹ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ جبار نے جب بڑے میاں کو زیر کرنے کی ہر کوشش کو ناکام پایا، تو بڑے میاں نے ہنس کر پوچھا۔ ''صاحبزادے! بس یا اور کچھ؟''
جبار کو اپنی ناکامی کی خجالت نے بہت زیادہ مشتعل کر دیا تھا۔ وہ چیخنے لگا۔ ''بوڑھے! میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''
بڑے میاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جب میں اپنا خون پینے دوں گا، تب تو تو پیے گا۔''
جبار نے شاید آخری بار بڑے میاں پر بھرپور وار کیا۔ اس نے جھک کر بڑے میاں کے پیٹ پر مکا مارنا چاہا لیکن بڑے میاں فوراً ہی پیچھے ہٹ گئے۔ جبار کا وار خالی گیا اور وہ اپنی جھونک میں خود ہی گر گیا۔ بڑے میاں کو ہنسی آگئی، بولے۔ ''جب میں تیرے جیسی عمر میں تھا، میں بھی اتنا ہی جذباتی اور اجڈ تھا۔ میں اپنے آگے کسی کو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا، کسی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میں نے وہ کام کرنا شروع کر دیا جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بہرحال صاحبزادے زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں، زندگی میں ہار جیت کا سلسلہ لگا ہی رہتا ہے۔ ہمیشہ جیت ہی جیت رہے تو زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اس میں ہار کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ جیت کی لذت بہت مزے کی ہوتی ہے لیکن ہار میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے۔ تکلیف دہ مزہ، کسک، افسوس اور کرب کی لذت ہوتی ہے اور ہر ہار آدمی کی صلاحیتوں، ولولوں اور حوصلوں میں اضافہ کرتی ہے۔''
جبار کو یہ احساس ہو گیا کہ بڑے میاں کو زیر کرنا ناممکن ہے۔ اسے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا بڑے میاں کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ سے کہا۔ ''بڑے میاں! تم بھاگ جاؤ میرے سامنے سے ورنہ پتھروں سے تمہارا سر توڑ دوں گا۔''
بڑے میاں ہنسنے لگے۔ ''جب تو ہاتھ پاؤں سے نہیں جیت سکا تو پتھروں کی بات کرنے لگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تو مجھ سے کسی طرح بھی نہیں جیت سکتا۔''
جبار کو اپنی شکست کا بڑا احساس تھا، وہ بڑے میاں کے پاس سے ہٹ آیا۔ جب وہ اپنے خیمے میں داخل ہوا تو دیکھا رشید اس کا انتظار کر رہا ہے۔ جبار نے پوچھا۔ ''میں نے تم دونوں کو بہت تلاش کیا، کہاں چلے گئے تھے؟ میں تو یہاں سے تھک چکا ہوں۔''
رشید نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو اس مقدس ہستی سے ملانا چاہتا ہوں، بس اس مقصد سے......''
جبار نے پوچھا۔ ''پھر کب ملواؤ گے؟''
''شاید کل ہی، امید تو یہی ہے۔'' اس کے بعد رشید اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا اور گھما پھرا کر پوچھا۔ ''جبار، ذرا ایک بات تو بتاؤ۔''
جبار نے کہا۔ ''پوچھو کون سی بات جاننا چاہتے ہو تم؟''
رشید نے پوچھا۔ ''میں تجھ کو ہلاکو خان کے لشکر میں لے جانا چاہتا ہوں۔''
جبار نے کہا۔ ''مگر کیوں؟ وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''میں وہاں تنہا نہیں جانا چاہتا۔ میرے ساتھ تم بھی ہو گے اور شاید وحید بھی ہو گا۔''
جبار نے پوچھا۔ ''مجھے وہاں کیوں لے جاؤ گے؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں تاجر کی اس حسین کنیز کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے میرے شیخ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں جبار کی محبوبہ کو جلد از جلد وہاں سے نکال لاؤں۔ آج میں اس تاجر کے پاس جانا چاہتا تھا۔''
جبار نے کہا۔ ''اگر میں تمہارے ساتھ ہلاکو خان کے لشکر میں جاؤں گا تو پہچان لیا جاؤں گا۔ اس لیے میرا وہاں جانا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔''
رشید نے جواب دیا۔ ''بہرحال میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں اور میں اپنے فیصلوں سے پھرنا نہیں جانتا۔''
جبار نے پوچھا۔ ''کیا وحید بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟''
رشید نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، ابھی میں خود بھی نہیں جانتا

کہ وہاں کون کون جائے گا۔''
جبار رشید سے اس خطرناک بوڑھے کا ذکر کرنا چاہتا تھا مگر اپنی شکست کا سوچ کر چپ رہ گیا۔
رشید نے کہا۔ ''تو تیار رہ، ہوسکتا ہے ہمارا آج ہی ہلاکو خان کے لشکر میں جانا ہوجائے۔ اس لیے تو ہر وقت تیار رہ۔''
رشید یہ کہہ کر چلا گیا اور دو گھنٹے بعد پھر آیا۔ اس وقت تک جبار نے جانے کی تیاری نہیں کی تھی۔ رشید کو اس کا یہ تساہل پسند نہیں آیا، بولا۔ ''میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے مگر تو معلوم نہیں کیوں بہت سست ہوگیا ہے۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''رشید! معلوم نہیں تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تاجر مجھ کو پہچان لے گا اور پھر میں کبھی بھی وہاں سے واپس نہیں آسکوں گا۔''
رشید ہنسنے لگا۔ ''تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہم تجھے جس لباس اور وضع قطع میں لے جائیں گے اس میں تاجر تجھ کو پہچان ہی نہیں سکے گا۔''
جبار نے تھک ہار کر کہا۔ ''اچھا، اگر تم بضد ہو تو میں تم دونوں کے ساتھ چلوں گا لیکن...... لیکن......''
رشید نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا اور خود آگے آگے چلتا رہا۔ یہ دونوں خیمے سے نکل کر ایک ساتھ چلنے لگے۔ دونوں بستی سے نکل کر پہاڑی راستوں پر چلنے لگے۔ پُر پیچ لہراتے ہوئے راستوں پر۔ یہاں تک کہ یہ ایک سنگین عمارت میں داخل ہوگئے۔ اس کی دیواریں بڑی موٹی موٹی چٹانوں سے کھڑی کی گئی تھیں۔ عمارت کا دروازہ اتنا بڑا اور مضبوط تھا کہ اس کو ایک آدمی نہیں کھول سکتا تھا۔ جب یہ دونوں اس عمارت کے دروازے پر پہنچے تو وہ کھلا ہوا تھا۔ جبار اندر داخل ہوا اور یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ یہاں ہر طرف وحشت اور ویرانی برس رہی تھی۔ عمارت کے اندر چھوٹے چھوٹے حجرے نما مکانات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ دونوں ان سلسلوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے جہاں اس عمارت کا واحد شاندار مکان سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مکان کا سیاہ دروازہ دو ستونوں کے درمیان ایسا لگتا تھا، گویا انہوں نے دروازے کو اپنی آغوش میں دبا رکھا ہے۔
جبار نے پوچھا۔ ''یہاں کوئی رہتا نہیں ہے؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''یہاں لوگ رہتے کیوں نہیں لیکن یہ لوگ بنا ضرورت اپنے حجروں سے نکلتے نہیں ہیں۔''
جبار نے پوچھا۔ ''مگر ہم لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ ہلاکو خان کے لشکر میں جانے سے پہلے اپنا حلیہ بدل لیں۔''
جبار نے سوچا۔ ''یہ کس مصیبت میں پھنس گیا میں۔''
مکان میں داخل ہونے کے بعد رشید آوازیں دینے لگا۔ ''قاسم کہاں چلا گیا تو، کدھر ہے تو...... ارے کہاں تلاش کروں تجھے؟''
کسی نے جواب میں کہا۔ ''میں اِدھر ہوں، اِدھر...... اس جھاڑ فانوس والے کمرے میں۔''
رشید آواز کی سمت بڑھا اور جھاڑ فانوس والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہاں ایک عمر رسیدہ شخص دو نوجوانوں کو بنا سنوار رہا تھا۔ جبار کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ عمر رسیدہ شخص دونوں نوجوانوں کو بچوں کی طرح کپڑے کیوں پہنا رہا ہے۔ دونوں میں سے ایک نوجوان کا لباس طالب علموں جیسا تھا اور دوسرے کا مزدوروں جیسا۔ جبار کو شاید پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جن لوگوں میں پھنس گیا ہے، وہ بڑے پُراسرار لوگ ہیں، یہ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کچھ پتا نہیں۔ رشید نے عمر رسیدہ شخص سے کہا۔ ''ہم دونوں ہلاکو کے لشکر میں جانا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں تاجر بنا دو۔''
عمر رسیدہ شخص نے جواب دیا۔ ''آپ کو ذرا انتظار کرنا ہوگا، ان دونوں کی تیاری میں تھوڑا سا وقت اور لگے گا۔''
رشید جبار کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور جبار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تم کہتے ہو کہ تاجر تمہیں پہچان لے گا۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں وہ مجھے پہچان لے گا کیونکہ میں اس کے ساتھ کافی عرصہ رہ چکا ہوں۔''
رشید نے کہا۔ ''میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے، اب وہ تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔''
جبار نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ ہم وہاں تاجروں کے بھیس میں چلیں گے۔ جس طرح یہ دونوں طالب علم اور مزدور کے بھیس میں جارہے ہیں۔''
جبار نے پوچھا۔ ''مگر یہ دونوں کہاں جارہے ہیں؟''
رشید نے جواب دیا۔ ''کہیں جارہے ہیں، مجھے پتا نہیں۔''
جبار نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا، بولا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں اور کن لوگوں میں آگیا ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ خدا کے لیے کچھ بتا دو، ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔''
رشید نے کہا۔ ''جبار! تم جہاں کہیں بھی ہو بہت اچھی جگہ پر ہو۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ اب تم ناآسودہ نہیں رہو گے، جو

چاہتے ہو پالو گے۔ محرومیوں سے نجات مل جائے گی۔''

عمر رسیدہ شخص دونوں نوجوانوں کو تیار کر چکا تھا۔ اب اس نے رشید اور جبار کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

رشید نے جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کو جلد از جلد تاجر بنا دو۔ اس کے بعد مجھے تاجر بنا دینا۔''

عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے وحید بھی تاجر بن کر کہیں گیا ہے۔''

رشید نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس کو بھی ہمارے ساتھ ہی جانا ہے۔''

عمر رسیدہ شخص نے ان دونوں کو تاجر بنانا شروع کر دیا۔ لمبی عبا پر نہایت قیمتی قسم کی پگڑی پہنا دی اور اس پگڑی کے اوپر قیمتی موتیوں کی لڑیاں پھنسا دیں۔ ایک قیمتی رومال شانے پر ڈال دیا اور پاؤں میں قیمتی چپل پہنا دی۔ بالوں میں تیل ڈالا اور پوشاک کو خوشبویات سے تر کر دیا۔ تقریباً یہی لباس اور چیزیں رشید کو بھی دے دی گئیں۔

دونوں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا اپنا حلیہ دیکھا تو خود کو پہچان نہ سکے۔ جبار کو اپنا تبدیل شدہ حلیہ دیکھ کر زیادہ حیرت ہوئی لیکن وہ بار بار ایک ہی سوال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس کے پاس اپنے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔

تیاری کے بعد یہ دونوں اس پتھریلی عمارت سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہاں ایک طرف کچھ دور ایک شخص دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ رشید نے جبار سے کہا۔ ''یہ دونوں گھوڑے ہم دونوں کے لیے آئے ہیں۔ آؤ ان پر بیٹھ کر سیر و تفریح کریں چل کر۔'' رشید نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وحید ہمیں ہلاکو خان کے آس پاس کہیں مل جائے گا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اگر ہمیں تاجروں کے بھیس میں ہلاکو خان کے لشکر میں چلنا ہی ہے تو اس کے لیے اتنا طویل راستہ کیوں؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ ہم لوگ احتیاط کا دامن کبھی اور کہیں بھی نہیں چھوڑتے۔''

رشید کے بعد جبار بھی گھوڑے پر بیٹھ گیا اور پھر یہ دونوں ہلاکو کان کے لشکر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہلاکو خان نے مشرق کے ایک وسیع و عریض میدان میں خیمے نصب کرا رکھے تھے۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد جب یہ دونوں ہلاکو خان کے لشکر کے سامنے پہنچ گئے تو یہیں پر وحید بھی مل گیا۔ اس کا لباس اور وضع قطع بھی تاجرانہ تھی۔

رشید نے پوچھا۔ ''وحید! تم نے یہاں پہلے آکر کچھ فائدہ اٹھایا یا ہمارا ہی انتظار کرتے رہے؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''میں نے یہاں آتے ہی اس تاجر کا پتا چلا لیا ہے جس کے پاس جبار والی کنیز ہے۔''

وہاں منگول بلا تکلف اِدھر سے اُدھر گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔ وحید نے ایک منگول کا راستہ روک لیا اور اس کو ایرانی ساخت کی دو خوب صورت پلیٹیں رشوت میں دیں۔ منگول بہت خوش ہوا، بولا۔ ''کیا بات ہے؟ کسی نے تم تینوں کو ستایا ہے کیا؟''

وحید نے کہا۔ ''میں ایک اصفہانی تاجر سے ملنا چاہتا ہوں، میں سے میری مراد ہے کہ ہم تینوں۔''

منگول نے ہنس کر جواب دیا۔ ''وہ اصفہانی تاجر جو عورتوں اور لڑکیوں کی خرید و فروخت کرتا ہے اور اس وقت اس کے پاس کئی کنیزیں ہیں؟''

وحید نے کہا۔ ''ہاں ہاں وہی۔''

منگول نے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔ دور کافی دور...... جہاں ایک برساتی نالے پر چھوٹا سا لکڑی کا پل تعمیر کیا گیا تھا اور جس کے سامنے ایک مسجد بھی تھی۔ یہاں تاجر کا شاندار خیمہ تھا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی جبار پہچان گیا، ایک بار وہ یہیں سے بھاگ کر وحید اور رشید کے پاس پہنچا تھا۔

منگول نے ان تینوں کو اصفہانی تاجر کے خیمے کے سامنے کھڑا کر دیا، بولا۔ ''اب اپنا کام ختم، تمہارا شروع۔''

وحید نے خیمے کے در پر دستک دی۔ اندر سے ایک غلام نمودار ہوا اور پوچھا۔ ''آپ کس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''اصفہانی تاجر سے، میں نے سنا ہے اس کے پاس خوب صورت ترین کنیزیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان میں سے چند کنیزیں میں بھی خرید لوں۔''

غلام نے جواب دیا۔ ''ہاں، بس میرا آقا آنے ہی والا ہے۔ اس وقت تک ایک ملحقہ خیمے کے سائبان تلے بیٹھ جائیے۔''

تینوں بے تکلف ہو کر بیٹھ گئے۔ غلام ان کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ وحید نے غلام سے پوچھا۔ ''بیٹے! ذرا ایک بات تو بتانا۔ جیسا کہ تم خود بھی جان چکے ہو۔ ہم تینوں کنیزیں خریدنے آئے ہیں۔ کہیں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔''

غلام نے جواب دیا۔ ''یہاں تو ایک سے ایک کنیز موجود ہے۔ آپ لوگ اگر ان کو دیکھنا چاہیں تو میں دکھا سکتا ہوں مگر کاروباری باتیں انہی سے ہوں گی۔''

رشید نے کہا۔ ''اچھا پہلے دکھا تو دو۔ جب تک بیکار بیٹھے ہیں یہی کام ہو جائے۔''

غلام نے ان تینوں کو کنیزوں والے خیمے میں پہنچا دیا۔ رشید اور وحید نے جبار کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔ ''کہاں ہے وہ تیری پسندیدہ کنیز؟''

جبار ان کنیزوں میں اپنی محبوبہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اچانک ایک کنیز دوسری کنیزوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتی ہوئی ان تینوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے ان تینوں کو بڑے غور سے دیکھا، پوچھا۔ ''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

رشید نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''ہم تینوں تجھے خریدنے آئے ہیں۔''

اتنے میں جبار نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور رشید کے کان میں چپکے سے کہا۔ ''دوست! یہی ہے وہ لڑکی۔ میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔''

رشید نے لڑکی سے پوچھا۔ ''لڑکی! کیا تو بتا سکتی ہے اب تیری کیا عمر ہے؟''

لڑکی نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ ''کسی کی عمر پوچھنا بدتہذیبی میں داخل ہے۔''

رشید کھسیا گیا، بات کو بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو رسماً یہ سوال کیا تھا۔ اگر آپ کو میرا یہ سوال ناگوار گزرا ہے تو میں معافی کا طلب گار ہوں۔''

اتنے میں غلام بھاگا ہوا آیا اور تینوں سے کہا۔ ''آپ تینوں نے انہیں دیکھ لیا۔ اب یہاں سے ہٹ چلیے کیونکہ اصفہانی تاجر بس آنے ہی والا ہے۔''

یہ تینوں وہاں سے ہٹ کر مہمانوں والے خیمے میں چلے گئے۔ اتنے میں تاجر بھی آگیا۔ غلام نے تینوں کا تعارف کرا دیا۔ غلام نے کہا۔ ''تینوں تاجر ہیں اور چند کنیزیں خریدنے آئے ہیں۔''

تاجر نے پوچھا۔ ''پھر انہیں کنیزوں کی شکلیں بھی دکھا دی ہیں یا نہیں؟''

غلام نے جواب دیا۔ ''شکلیں تو دکھا دی ہیں، بات البتہ نہیں ہو سکی۔''

تاجر نے تینوں سے پوچھا۔ ''صاحبان! کیا آپ نے جملہ کنیزوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''ہاں خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ ان میں بس ایک کنیز پسند آئی ہے ہمیں۔''

تاجر اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''پھر چلیے اس کا معاملہ طے کر لیتے ہیں۔''

یہ تینوں تاجر کے ساتھ ایک بار پھر کنیزوں والے خیمے میں پہنچ گئے۔ رشید نے مطلوبہ کنیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہ کنیز پسند آگئی ہے، بس اس کے دام بتا دیجیے۔''

تاجر کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر جواب دیا۔ ''بس یہی ایک کنیز درکار ہے اور کچھ نہیں؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''سر دست تو بس یہی کنیز درکار ہے، بقیہ کے لیے پھر کسی دن بات ہو جائے گی۔''

تاجر نے کہا۔ ''اس کنیز کی قیمت پانچ ہزار درہم ہے۔''

رشید نے زیرِلب دہرایا۔ ''پانچ ہزار درہم یا اس میں کمی بھی ہو سکتی ہے؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''میں نے بالکل مناسب قیمت بتائی ہے۔ اس میں کمی کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔''

رشید اور وحید نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور نظروں ہی نظروں میں کچھ طے پا گیا۔ رشید نے تاجر سے کہا۔ ''مجھے اس بھاؤ میں یہ لڑکی منظور ہے۔ سودا ہو گیا، میں کل اس کو لے جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پچاس درہم تاجر کے ہاتھ میں دے دیے۔ بولا۔ ''یہ بیعانہ ہے، سودا ہو گیا۔ اب یہ کنیز تیرے پاس میری امانت ہے۔ خبردار جو امانت میں خیانت کی کسی نے۔''

تاجر نے پچاس درہم لے تو.... لیے مگر منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''سودا اس طرح نہیں ہوتا۔ جب کنیز خریدنے نکلے تھے تو رقم بھی لے کر نکلے ہوتے۔''

رشید نے جواب دیا۔ ''قبلہ آپ پریشان بالکل نہ ہوں۔ میں اس شہر کا کھرا آدمی ہوں۔ جھوٹ، دغا فریب اور مکر سے کام کبھی نہیں لیتا۔ بس ذرا رقم کی بات تھی۔ مجھے رقم کی فکر تھی اور اللہ نے چاہا تو کل تک آپ سے ہم نمٹ جائیں گے۔''

اچانک تاجر کی نظر جبار پر پڑ گئی۔ وہ شکل دیکھ کر چونکا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ جبار ڈر گیا۔

تاجر نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آپ کا یہ ساتھی بات نہیں کرتا۔ جب سے آیا ہے چپ چاپ بیٹھا ہے۔''

وحید نے جواب دیا۔ ''جناب والا یہ گونگا ہے۔ اس کو تجارت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو ادھر آتے جو دیکھا تو یہ خود بھی میرے پاس آگیا اور ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگا۔''

تاجر نے پوچھا۔ ''کل جب یہ آیا تھا، کل نہیں شاید پرسوں۔''

وحید نے تردید کی۔ ''یہ کل تو کل، کبھی بھی ادھر نہیں آیا۔''

تاجر نے جبار کو چھیڑ دیا۔ ''ارے بھائی تم بولتے کیوں نہیں؟''

وحید نے کہا۔ ''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اس گونگے کو نہ چھیڑیے۔''

تاجر نے کہا۔ ''آپ لوگ یہیں اسی شہر سے آئے ہیں یا کہیں اور سے؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ اسی شہر سے آئے ہیں۔ اچھا پھر اجازت دیجیے۔''

تاجر نے ایک بار پھر جبار پر غور کیا، بولا۔ ''صاحبان! آپ مانیں یا نہ مانیں، میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ بس تھوڑی دیر اور رک جائیے، بڑا کرم ہوگا۔''

تینوں رک گئے، تاجر نے کہا۔ ''میرے پاس ایک نوجوان تھا، معلوم نہیں کس طرح اس کا دماغ خراب ہوگیا اور یہ کنیز جس کا معاملہ آپ نے کیا ہے، وہ اس کنیز پر عاشق ہوگیا۔ ہم لوگوں نے بہ مشکل اس کو قابو میں کیا اور پکڑ کر ایک خیمے میں قید کر دیا اور پھر اللہ جانے، وہ معلوم نہیں کس طرح فرار ہوگیا۔ وہ میرا غلام تھا۔ میں نے سوچا تھا اس کو اچھے داموں بیچ کر کچھ نفع کما لوں گا لیکن وہ تو اصل بھی چلی گئی۔ تو یہ تھا وہ واقعہ۔ آپ کے اس تیسرے ساتھی کو جو میں نے دیکھا تو میں چونک پڑا۔ وہ اس کا ہم شکل تھا ہو بہو اسی جیسا۔ میں تو یہ سمجھا کہ شاید وہی آگیا ہے میرے سامنے۔''

جبار کی حالت ہی غیر ہوگئی، اس کا وہاں کھڑا ہونا دشوار ہوگیا۔

وحید نے کہا۔ ''اچھا جناب! سن لی آپ کی دلچسپ داستان۔ اب تو اجازت ہے؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''اجازت مگر یہ تو فرمائیں کل کس وقت تک تشریف لائیں گے آپ؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''بس اسی وقت تک۔''

تاجر نے کہا۔ ''میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

رشید بولا۔ ''بہتر ہے، اللہ نے چاہا تو ہم وعدے پر پورے اتریں گے۔''

یہ تینوں وہاں سے چلے آئے۔ دونوں نے ایک دم سکوت اختیار کیا۔ جبار بھی خاموش تھا لیکن وہ بولنا چاہتا تھا۔ جبار نے کہا۔ ''میری تو جان ہی نکل گئی تھی، غضب ہوگیا تھا۔''

رشید نے کہا۔ ''تاجر نے تجھے پہچان لیا تھا۔ وہ تو ہم نے تجھے بچا لیا ورنہ آج تیرا کام تمام کر دیا جاتا۔ تاجر تجھ کو پکڑ کر ہلاکو خان کے پاس لے جاتا اور ہلاکو خان تیرا کام تمام کرا دیتا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں اگر اس کو یہ یقین ہو جاتا کہ میں وہی جبار ہوں تو مجھے ہلاکو خان کے دربار میں پیش کر کے قتل کرا دیا جاتا۔''

رشید نے کہا۔ ''کنیز بھی اچھی پسند کی تو نے۔''

وحید نے رشید کو سمجھایا۔ ''اب فضول باتیں نہیں ہونا چاہئیں کیونکہ ہمارے پاس بہت کام ہے۔''

جبار نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے دلوں میں میل آچکا ہے۔ وہ خود بھی ان دونوں سے بیزار بیزار سا نظر آنے لگا۔ راستے بھر کوئی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس کی کئی باتوں کے ان دونوں نے جواب تک نہیں دیے۔

جب یہ تینوں اپنی بستی کے قریب پہنچے تو جبار نے کہا۔ ''ساتھیو! مجھے افسوس ہے کہ تمہارا ساتھ چھوٹ رہا ہے اور اب میں تم سے جدا ہونے والا ہوں۔''

رشید نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر کہاں؟ کیوں؟''

وحید نے کہا۔ ''یہ تو جناب ایک ہی رہی۔ تیری ہی وجہ سے ہم نے اس کنیز کا معاملہ کیا، اس کا بیعانہ دیا اور کل پوری رقم دے کر اس کو اپنے ساتھ لے آئیں گے اور تو ساتھ چھوڑنے کی بات کر رہا ہے۔ آخر کیوں؟ اس کا کوئی خاص سبب، کوئی وجہ؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ محسوس کیا کہ تم دونوں کے دلوں میں میری طرف سے میل آگیا ہے، بس یہ بات میں نہیں برداشت کر سکتا۔''

وحید نے کہا۔ ''جب کئی دوست ایک ساتھ رہتے ہیں تو آپس میں شکایتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔''

جبار ایک بار پھر یہی سوچنے لگا کہ آخر یہ دونوں اس پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟

☆☆☆

وہ کئی دن تک اس انتظار میں رہا کہ دونوں تاجر اس شوخ و شنگ حسینہ کو خرید لائے ہوں گے لیکن ان دونوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ انہوں نے جبار سے اس لڑکی کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ آخر وہ حالات کی یکسانیت سے تنگ آگیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھیس بدل کر تاجر کے پاس جائے اور کسی بھی طرح اس لڑکی کو لانے کی کوشش کرے۔

جب وہ بالکل تھک چکا تھا اور مایوسی نے اسے سست اور کاہل بنا دیا تھا، رشید اچانک آگیا۔ اس نے کہا۔ ''جبار!

تجھے اس مقدس انسان سے ملنا ہے جس کی خوشنودی اور رضامندی کے بغیر تو اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''تم جس سے بھی ملاؤ گے میں مل لوں گا مگر یہ تو بتاؤ کہ تاجر والی کنیز کا کیا ہوا؟''

رشید نے کہا۔ ''میں یہی بتانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، وہ لڑکی ملے یا نہ ملے مگر اب میں جس ذات سے تجھ کو ملاؤں گا وہ اگر چاہے تو اس جیسی کئی لڑکیاں ملوا دے گا۔''

جبار نے تنگ آ کر کہا۔ ''رشید! میں اس شخص کے ذکر سے تنگ آ چکا ہوں، تو مجھے اس سے جلد از جلد ملوا دے۔ میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔''

رشید نے جواب دیا۔ ''کل صبح فجر کی نماز کے بعد تو تیار رہے گا، میں اس عظیم ہستی کے پاس لے چلوں گا۔''

جبار کو اچانک وہ بوڑھا یاد آ گیا جس نے اسے بار بار شکست دی تھی اور پھر وہ شخص جس نے کئی آدمیوں کے بھیس بدل دیے تھے۔ اس نے رشید سے پوچھا۔ ''رشید! تم نے مجھ پر بڑی مہربانیاں کی ہیں، میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ اب تم ایک مہربانی اور کردو۔ میں اس بستی میں جتنے دن سے رہ رہا ہوں، یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہاں کا ہر شخص پُراسرار کیوں ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے معمولی نہیں ہے۔''

رشید نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ابھی دو دن پہلے میری ملاقات ایک بوڑھے سے ہوئی تھی۔ میں اسے کمزور سمجھتا تھا۔ میں نے اس سے تم دونوں کا پتا پوچھا، اس نے ٹال دینے والا جواب دیا۔ میں اس سے الجھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے اس کی بداخلاقی کا ایسا جواب دوں گا کہ وہ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا لیکن میں حیران رہ گیا کیونکہ اس نے ہر مقابلے میں مجھے شکست دی اور ایسی شرمناک شکست دی کہ میں اس واقعے کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ پھر جب میں نے سنگی عمارت میں اس شخص کو دیکھا جو لوگوں کو مختلف بھیس میں بدلتا جا رہا تھا تو اور زیادہ حیران ہوا۔ آخر اس بستی میں کیا ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ کس مقصد سے ہو رہا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''ان سوالوں کے جواب بھی تجھے مل جائیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

رشید گول مول جواب دے کر چلا گیا اور جبار دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ وہ اس رات سو نہیں سکا۔ کچھ دیر اندر بیٹھتا اور پھر کھلے میدان میں نکل جاتا جہاں سے ستاروں کی چال اور ان کے مقام سے رات اور صبح کے درمیان حائل وقفے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ کسی نہ کسی طرح رات بیت گئی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ اس دن جبار کو گہری نیند آ رہی تھی اس لیے وہ بے بس اور مجبور ہو گیا تھا۔ وہ رشید کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ آخر رشید اور وحید دونوں ایک ساتھ آ گئے، انہوں نے کہا۔ ''ہم ٹھیک وقت پر آ گئے ہیں نا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

رشید نے کہا۔ ''اب اٹھو اور ہمارے ساتھ چلو تاکہ بقیہ کام بھی انجام دے لیا جائے۔''

جبار، رشید اور وحید باہر چلے گئے۔ وہاں ایک گاڑی جس میں چار گھوڑے جتے ہوئے تھے، ان تینوں کو لے جانے کے لیے حاضر کر دی گئی۔ رشید، وحید اور جبار اس پر بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ ایک جگہ گاڑی رکوا کر جبار نے کہا۔ ''میں پیاسا ہوں، مجھے شدید پیاس لگ رہی ہے۔ پہلے پانی پلا دو، بعد میں آگے بڑھو۔''

رشید اور وحید ایک ساتھ نیچے اترے اور ایک سبزہ زار کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ ''جبار! تو بھی یہیں ہمارے پاس آ جا۔ یہاں کا منظر بہت دلکش اور حسین ہے۔''

جبار بھی نیچے اتر گیا۔ سبزہ زار پر بیٹھ کر رشید نے ایک برتن میں شربت بنانا شروع کر دیا۔

جبار یہ سب دیکھتا رہا۔ وہ بہت پیاسا تھا، بے چینی سے بولا۔ ''میں اس پانی کا انتظار کر رہا ہوں جو سادہ اور بے ذائقہ ہوتا ہے، میں شربت نہیں پیوں گا۔''

رشید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس شربت میں تو وہ کمال ہے جو تجھے وہاں پہنچا دے گا جہاں کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو لوگ اس شربت کے جادوئی اثر سے واقف ہیں وہ اس کی تمنا کرتے رہتے ہیں۔''

جبار نے کہا۔ ''اچھا لاؤ شربت ہی لاؤ۔ میں بہت پیاسا ہوں۔''

جب شربت تیار ہو گیا تو اسے ایک پیالے میں انڈیل کر جبار کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے بڑی بے تابی سے منہ سے لگا لیا اور غٹاغٹ ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

شربت نے اندر جاتے ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ اس کو ایسا لگا، گویا آسمان نیچے اس کے سر پر گر رہا ہے۔ وہ رشید اور وحید کے بیچ میں ڈھلکنے لگا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وحید نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

جبار نے بہ مشکل جواب دیا۔ ''یہ آسمان میرے سر پر کیوں گر رہا ہے؟''

دونوں اس کی بات پر ہنسنے لگے۔ جبار ہنستے ہنستے سبزہ زار پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جبار کو کچھ پتا نہ تھا کہ بے ہوشی کے دوران کیا پیش آیا لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ سبزہ زار تھا، نہ وحید رشید تھے اور نہ ہی وہ چار گھوڑوں والی گاڑی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی مگر جو کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آیا وہ ایسا نہیں تھا کہ اس کے لیے دونوں آنکھیں کھول دیتا۔

کافی دیر بعد وہ اس لائق ہوگیا کہ اپنے ماحول کی ہر چیز کو دیکھ سکے۔ آنکھوں نے پورے ماحول کا جائزہ لیا تو اس کا برا حال ہوگیا۔

یہاں ایک خوب صورت باغ تھا اور اس باغ میں رنگ برنگی چھوٹی بڑی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ جبار حیرت زدہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔ ''ارے یہاں کوئی ہے؟ میں اکیلا ہی ہوں اور اس معمے کو سلجھانا چاہتا ہوں۔''

آواز سامنے کی پہاڑی سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ دوسری طرف سے بھی کوئی پوچھ رہا تھا۔ ''ارے یہاں کوئی ہے؟ میں اکیلا ہوں اور اس معمے کو سلجھانا چاہتا ہوں۔''

جبار کو غصہ آرہا تھا کہ یہ رشید اور وحید اس کو تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔ اس نے دیکھا، اس کے چاروں طرف میوے دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھیں۔ وہ اپنے ذہن اور حافظے پر زور دے رہا تھا کہ جب وہ رشید اور وحید کے ساتھ سبزہ زار پر بیٹھا تھا تو وہاں دور دور تک اس باغ کے آثار نہ تھے۔ پھر یہ ہوش آتے ہی اچانک کہاں سے نمودار ہوگیا۔

وہ اس باغ میں آدمیوں کو تلاش کرنے لگا۔ کہیں قریب ہی پانی کے گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جبار اس آواز کی طرف بڑھا۔ درختوں کے جھنڈ کے اس پار ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور اس پہاڑی پر سے پانی گر کر نالیوں کے راستے کہیں جارہا تھا۔ یہ نالیاں لہراتی بل کھاتی پہاڑیوں کے نشیب میں کہیں غائب ہوگئی تھیں۔

جبار نے اپنے داہنی طرف رنگ برنگے پھولوں کا تختہ دیکھا۔ اس کھلی ہوئی کشادہ جگہ میں حد نظر تک پھول ہی پھول نظر آرہے تھے۔ جبار حیران اور پریشان یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں آگیا اور یہ جگہ کون سی ہے؟

اس کو ہلکی سی بھوک محسوس ہوئی۔ اس نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ درختوں سے پھل توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ یہیں اسے سازوں کی آواز سنائی دی پھر ساز کی آواز میں نسوانی آواز بھی شامل ہوگئی۔ نہایت پر اثر، مسحور کن اور دل و دماغ میں مستی و کیف گھول دینے والی آواز۔ یہ اس آواز کی طرف چل پڑا۔ وہ پھل دار درختوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ جب وہ پھول دار درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گانے اور ساز کی آواز اسی جھنڈ کے اندر سے آرہی ہے۔ یہاں ہارسنگار کے اونچے اونچے درخت پھولوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں پر سایہ کیے کھڑے تھے۔

جبار درختوں کی لٹکی ہوئی شاخوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا جھاڑی کے اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا یہاں ایک حسین لڑکی جبار کی طرف پشت کیے بیٹھی ایک گیت گا رہی تھی۔ جبار اس گیت کو سنتا رہا۔ لڑکی کے ہاتھ میں عود تھا اور وہ اسے بجا رہی تھی۔ لڑکی فراقیہ گیت گا رہی تھی۔

او میرے محبوب! میں تجھ سے کہاں ملوں؟
میری آنکھیں زندگی بھر تجھے تلاش کرتی رہیں
پھر جب تو وہاں نہیں ملا تو میں تجھ کو تلاش کرتی ہوئی
بہشت زار چلی آئی، سنتی ہوں تو یہاں موجود ہے
اے کاش! اس میں جھوٹ نہ ہو۔
اے کاش یہ سچ ہو۔
اے کاش تو یہاں موجود ہو۔
اے کاش میں تجھ کو پا جاؤں۔
اے کاش تو مجھے مل جائے۔

لڑکی نے عود کو زمین پر رکھ دیا اور اپنی زلفوں کی ایک لٹ کو آنکھ پر سے پرے ہٹا دیا۔ جبار نے پشت کے بعد اس کا چہرہ جو دیکھا تو دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جو ہلاکو خان کے لشکر میں تاجر کے پاس تھی اور جس کی وجہ سے اس نے ہلاکو خان کے لشکر کو چھوڑ کر آوارہ گردی اختیار کرلی تھی۔

یہ برداشت نہ کرسکا اور ایک دم اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی نے جبار کو اپنے سامنے جو دیکھا تو پہلے تو وہ سٹپٹائی اور بھاگ جانا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر جبار کی صورت دیکھنے لگی۔

جبار بالکل اس کے پاس جا کھڑا ہوا، لڑکی نے ذرا سا منہ پھیر کر اپنے کاندھے پر سے جبار کو دیکھنے کی کوشش کی۔

جبار نے والہانہ انداز میں کہا۔ ''لڑکی! ابھی جو تو گا رہی تھی وہ کس کا کلام ہے؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرا اپنا کلام ہے مگر کیوں؟''

جبار کھسیایا ہوا تھا، ہنس کر بولا۔ ''کچھ نہیں بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ تو گویا تم شاعرہ بھی ہو۔''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''ہاں میں شاعرہ ہوں۔ تم یہاں کس طرح آ گئے؟''

جبار نے کہا۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کس طرح آ گیا۔'' پھر اس نے پوری روداد سنا دی، بولا۔ ''میں تو اپنے دوستوں کے ساتھ سبزہ زار پر بیٹھا شربت پی رہا تھا کہ بے ہوش ہو گیا اور آنکھ کھلی تو خود کو یہاں پایا۔''

لڑکی ہنسنے لگی، پوچھا۔ ''جانتے ہو یہ کون سی جگہ ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''بہشت زار۔''

جبار نے پوچھا۔ ''بہشت تو مر کر ملتی ہے انسان کو...... کیا میں مر چکا ہوں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ درست ہے۔ ہو سکتا کہ تم...... خیر یہ بتاؤ تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

جبار نے پوچھا۔ ''لڑکی! تیرا نام کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ذنوبیہ۔''

جبار نے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تھوڑی دیر پہلے تو جو گا رہی تھی وہ گیت کس کے لیے تھا؟''

ذنوبیہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا، پوچھا۔ ''کیا یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا؟ تو خود یہاں کس کو تلاش کرتا ہوا آیا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''تجھ کو...... جب میں نے تاجر کے پاس تیری جھلک دیکھی تھی تو میں تجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ تجھ کو حاصل کر لوں لیکن ناکام رہا، اور اب یہاں میں تجھے اپنے سامنے دیکھ کر اتنا خوش ہوں اتنا خوش ہوں کہ بس۔''

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ''یہاں کس جگہ ٹھہرے ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ابھی مجھے نہیں معلوم کہ کہاں رہوں گا لیکن جب تو مجھے مل گئی ہے تو میں تیرے ہی پاس ٹھہروں گا۔''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے بڑی مشکل سے پایا ہے تجھے۔''

جبار نے ذنوبیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جبار نے پوچھا۔ ''ذنوبیہ! تو یہاں کس طرح آ گئی؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی زہریلا شربت پلا کر ہلاک کر دیا گیا تھا اور جب دوبارہ زندہ ہوئی تو خود کو بہشت زار میں پایا۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔''

جبار نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ''میں اپنے اس رب کا کس زبان سے شکر ادا کروں جس نے مجھے یہ بہشت عطا فرمائی اور یہاں تجھ کو مجھ سے ملایا۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک مکان کی طرف بڑھے۔ یہ مکان پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس کی دیواریں پھولوں میں چھپ گئی تھیں۔ ذنوبیہ اس کو مکان کے اندر لے گئی۔ یہاں جو کچھ بھی تھا، اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے بہترین قالین بچھا ہوا تھا اور منقش میز پر چینی کے برتن سجے ہوئے تھے۔ دیوار سے پیوستہ الماریوں میں بلوری، طلائی اور نقرئی چیزیں نہایت سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ اندر کی دیواروں پر حسین ترین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

جبار یہاں کے حسن میں کھو گیا۔ ذنوبیہ سے پوچھا۔ ''میں یہاں تیرے ساتھ رہ سکتا ہوں کیا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں رہ سکتے۔ جب میں یہاں آئی تھی تو مجھے ملہم غیبی نے بتا دیا تھا کہ عنقریب تیرے محبوب کو بھی یہیں تیرے پاس بھیج دیا جائے گا اور تو اس کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارے گی۔''

جبار ذنوبیہ سے بولا۔ ''بخدا مزہ آ گیا۔ دنیا کی زندگی بھی کتنی اذیت ناک ہوا کرتی تھی۔ وہاں ہلاکو خان تھا، اس کا خونخوار لشکر تھا، اس کے فوجی سردار تھے۔ وہاں تاجر تھا، تیرے خریدار تھے۔ بخدا میں سچ کہتا ہوں، دنیا ایک جہنم کا نام ہے۔''

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ''کچھ کھاؤ گے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں جب یہاں آیا ہوں، اس وقت بھی بھوکا ہی تھا اور یہ کہ......''

ذنوبیہ نے اس کی بات کاٹ دی، بولی۔ ''تو تم یہاں بھوکے آئے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ تیرا مذہب، تیری ملت اور تیرا دین کھانا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''نہیں تو...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تجھ کو دیکھ کر میری بھوک پیاس اٹھ گئی ہے۔''

ذنوبیہ نے تالی بجائی تو چند نوعمر لڑکے شاندار لباسوں میں ان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے بولے۔ ''جو حکم محترمہ! ہم کیا پیش کریں؟''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''کھانے، گرما گرم کھانے۔''

ان حسین ترین لڑکوں کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کھانا آنا شروع ہوگیا۔

جبار نے ان نوجوان لڑکوں کو بہترین لباس میں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھا تو کئی سوالات دل و دماغ میں ابھرنے ڈوبنے لگے۔ وہ ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ذنوبیہ نے اس کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''اگر تو نے ان سے کچھ پوچھا گچھا تو یہ یہاں سے ناراض ہو کر چلے جائیں گے اور میں مشکل میں پھنس جاؤں گی۔''

جبار نے کہا۔ ''اچھا تو یہ کرو کہ میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، اب تجھ سے پوچھ لوں گا۔ امید ہے تو ان کے جواب ضرور دے سکے گی۔''

ذنوبیہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''لیکن یہ ضروری نہیں کہ میں تیرے ہر سوال کا جواب دوں۔ میں کوشش کروں گی کہ تو مجھ سے جو کچھ بھی پوچھے، میں اس کا جواب دے دوں۔''

ذنوبیہ اور جبار نے جب یہ کھانے کھائے تو جبار کو اقرار کرنا پڑا کہ ایسے کھانے پہلے کبھی نہیں کھائے تھے۔

جبار نے ذنوبیہ سے گھومنے پھرنے کی بات کی، وہ جنت کو خوب گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ذنوبیہ آرام کرنا چاہتی تھی چنانچہ جبار کو بھی آرام کرنا پڑا۔ دونوں کئی گھنٹے آرام کرتے رہے۔ دونوں سو کر اٹھے تو ذرا کمزوری سی محسوس کرنے لگے۔ ذنوبیہ نے نل کھول کر اس کے نیچے پیالہ رکھ دیا۔ نل میں سے دودھ نکلنے لگا، پھر دوسرے پیالے میں اسی طرح شہد بھر لیا۔ جبار نے پوچھا۔ ''ذنوبیہ! یہ کیا معاملہ ہے؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''یہ بہشت ہے۔ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں چنانچہ میں ان نلوں کے ذریعے دودھ اور شہد حاصل کر لیتی ہوں اور ایک میں ہی کیا جنہیں بھی اس بہشت میں لایا جاتا ہے اس کے لیے دودھ اور شہد عام ہو جاتا ہے۔''

دونوں نے دودھ میں شہد ملایا اور پی گئے، جبار کو مزہ آگیا۔ کافی دیر بعد جبار ذنوبیہ کو لے کر بہشت کی سیر و تفریح کو نکل گیا اس نے وہاں جگہ جگہ مردوں اور عورتوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ باتوں کے درمیان ان کے مترنم قہقہے۔ وہاں کی عورتوں اور لڑکیوں کی آوازیں بہت زیادہ سحر آگیں تھیں، اس نے ایک جگہ دیکھا، ایک نوجوان کئی لڑکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ لڑکیاں اس نوجوان کو چھیڑ رہی تھیں اور نوجوان ان سے پناہ مانگ رہا تھا۔ ایک لڑکی نے اس نوجوان کو دوسری لڑکیوں پر دھکا دے کر گرا دیا۔ جب وہ زمین پر گر گیا تو لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

جبار ذنوبیہ کا ساتھ چھوڑ کر ان لڑکیوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ''ظالم لڑکیو! یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم اس سادہ لوح نوجوان پر۔ میرے ساتھ اس قسم کا مذاق کرو تو دوں جواب تم کو۔''

یہ کہہ کر جبار ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ان لڑکیوں نے جبار کی طرف دیکھا اور اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔

جبار نے دیکھا ان لڑکیوں میں ہر لڑکی یگانۂ روزگار ہے۔ جبار ذنوبیہ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کا نظارہ کرنے لگا۔ لڑکیاں برابر اس نوجوان کو ستائے جا رہی تھیں۔ ذنوبیہ نے جبار کو وہاں سے ہٹائے جانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں ہٹا۔ جبار نے ان لڑکیوں سے کہا۔ ''لڑکیو! تم میری طرف دیکھو، یہ نوجوان تم سے شرما رہا ہے لیکن میں نہیں شرماتا۔ مجھ سے ملو، مجھ سے مذاق کرو، میں برا نہیں مانوں گا۔ تم مجھ سے مل کر بہت خوش ہوگی۔''

ذنوبیہ نے جبار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جبار! یہاں زبردستی اور من مانی نہیں چلے گی۔ یہاں جس کو جو دیا گیا اسی پر قناعت و اکتفا کرنا ہوگا۔ تم نے مجھے چاہا، میں تمہارے حوالے کر دی گئی۔ اس نوجوان نے دنیا میں چند ایسی نیکیاں کی تھیں کہ اسے یہ دو حوریں بخش دی گئیں۔ اب تم اس نوجوان کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتے۔''

جبار نے ذنوبیہ کی باتوں پر کوئی توجہ ہی نہیں دی اور اس نوجوان کو تنبیہہ کی۔ ''دیکھ، خبردار! جو تو نے میرے معاملے میں مداخلت کی۔ تو سست، شرمیلا اور نکما ہے۔''

ذنوبیہ نے جبار کو خطرے کا احساس دلایا۔ ''جبار! چھوڑ دو ان دونوں لڑکیوں کو اور میرے پاس آجاؤ کیونکہ میں تمہارے لیے ہوں اور تم میرے لیے ہو، یہاں ہرجائی پن نہیں چلے گا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ذنوبیہ! تو میرا انتظار کر۔ میں ان دونوں سے متعارف ہو کر تیرے ہی پاس آجاؤں گا۔''

جو نوجوان ابھی تک شرما رہا تھا، اس نے جو یہ دیکھا کہ جبار دونوں لڑکیوں کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے تو اس کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا۔ بولا تو وہ کچھ نہیں مگر غصے میں ایک مکا جبار کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ مکا اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ جبار چکرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ذنوبیہ کے مکان میں پایا۔ ذنوبیہ اس کے پاس بیٹھی کنپٹی پر کسی دوا کا لیپ کر رہی تھی۔ جبار نے پوچھا۔ ''مجھے کیا ہوگیا تھا ذنوبیہ؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''تم نے امانت میں خیانت

کی تھی۔ خدا نے تمہیں اس کی سزا دی اور اس شرمیلے نوجوان کے مکے میں اتنی طاقت پیدا کر دی کہ تم اس کا ایک مکا برداشت نہیں کر سکے۔''

جبار نے اپنی کنپٹی میں ایک ٹیس سی محسوس کی، کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد کیا ہوا؟ میری کنپٹی پر ایک مکا پڑا اور میں گر گیا، پھر کیا ہوا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''پھر میں غلمان کی مدد سے تمہیں یہاں لے آئی۔''

جبار نے آنکھیں بند کر لیں، پوچھا۔ ''دونوں لڑکیاں کہاں چلی گئیں؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''مجھے کیا پتا دونوں کہاں چلی گئیں۔''

جبار نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور وہ نوجوان۔ وہ نوجوان کہاں چلا گیا؟ میں اس سے بدلہ لوں گا، میں اس سے انتقام لوں گا، میں اس کو کسی قیمت پر بھی معاف نہیں کروں گا۔''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''جبار! یہاں دنیا کے انداز میں مت سوچو۔ یہاں بدلے اور انتقام کی بات مت کرو۔ یہاں فانی انسان کے عزائم اور ارادوں کی ذرا بھی پروا نہیں کی جاتی۔ اگر تم ایسا کرو گے تو پھر تم یہاں سے نکال دیے جاؤ گے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اگر میں یہاں سے نکالا گیا تو کہاں بھیجا جاؤں گا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں کیا جانوں تو کہاں بھیجا جائے گا۔''

کنپٹی کی چوٹ نے اسے ایک دن بہت پریشان کیا مگر دوسرے دن خاصا افاقہ ہو گیا۔ وہ ذنوبیہ کو بتائے بغیر ہی اس نوجوان کی تلاش میں نکل گیا جس نے اس کے مکا رسید کیا تھا۔

وہ ابھی دور نہیں گیا تھا کہ گلابوں کے تختے پر چند حسین عورتوں کو ایک عمر رسیدہ بزرگ کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ جبار ان کے پاس پہنچا اور بڑے میاں کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ ''بڑے میاں! کچھ تو شرم کرو۔ اپنی عمر دیکھو اور عورتوں کی عمر دیکھو، بالکل تمہاری پوتیاں نواسیاں معلوم ہوتی ہیں۔''

بڑے میاں نے حقارت سے جبار کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر دونوں عورتوں سے چہلیں کرنے لگے۔

جبار نے ایک بار پھر بڑے میاں کو ڈانٹا۔ ''تم نہیں مانو گے؟''

بڑے میاں نے پوچھا۔ ''تو کون ہے اور ہمارے معاملے میں کیوں دخل دے رہا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میرا نام جبار ہے اور میں ہلاکو خان کے لشکر میں رہ چکا ہوں۔ میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔''

بڑے میاں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''جا اپنی راہ لے، خوامخواہ کسی کے معاملے میں نہ پڑ۔''

جبار آستینیں چڑھانے لگا۔ ''بڈھے اپنی زبان کو قابو میں رکھ، یہ بہشت ہے، یہاں کے بھی کچھ آداب ہیں......''

بڑے میاں نے بات کاٹ دی، پوچھا۔ ''کیا ان آداب کا تجھ کو علم ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ بہشت زار ہے۔ میں یہاں کے سارے اصولوں سے تو واقف نہیں ہوں۔ اس لیے میں یہاں کی بابت کچھ زیادہ نہیں بتا سکتا مگر عقلاً یہ تو جانتا ہی ہوں کہ تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

بڑے میاں نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''اب تک جو کچھ تم جانتے ہو اس کو حافظے اور یادداشت سے نکال دو۔ یہ جنت ہے یہاں بوڑھے اور جوان میں بالکل کوئی فرق نہیں ہے۔ میں دیکھنے میں بوڑھا ہوں لیکن مجھ میں جوانوں جیسی طاقت موجود ہے۔ جنت میں کوئی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

جبار نے سوچا، شاید بڑے میاں درست ہی کہہ رہے ہیں جنت میں بڑھاپے کا کیا کام؟ پھر پوچھا۔ ''کیا میں آپ لوگوں میں کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں؟''

بڑے میاں نے پوچھا۔ ''کیا تجھے انعام و اکرام میں کچھ نہیں ملا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ذنوبیہ ملی ہے بس ایک ذنوبیہ جبکہ میں یہاں دیکھ رہا ہوں کہ دوسروں کو کئی کئی ملی ہیں۔ مثلاً آپ اپنے ہی کو دیکھ لیں۔ آپ کو کئی ملی ہیں۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''تو نے کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا ہوگا اور جب تک تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کرے گا تجھ کو ایک ذنوبیہ پر ہی قناعت کرنا ہوگی۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا میں کچھ دیر اس محفل میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

بڑے میاں نے عورتوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اجازت دے دی لیکن اشاروں میں...... زبان سے نہیں۔ جبار ان میں گھس کر بیٹھ گیا۔ یہاں شراب اور شہد کا دور چل رہا تھا۔ جبار نے شراب پینے سے انکار کر دیا، بولا۔ ''میں دودھ اور شہد استعمال کر سکتا ہوں۔ شراب نہیں۔''

بڑے میاں نے شراب پی لی اور جبار پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! افسوس کہ تو جنت میں بھی

شراب سے محروم ہے۔"

جبار نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں کیا بات ہے کہ طبیعت شراب کی طرف راغب ہی نہیں ہوتی، ورنہ میں ضرور پیتا۔"

بڑے میاں نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ رقص پیش کریں۔ جبار نے بھی اس میں بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ عورتوں نے بڑے میاں کو ان کی جگہ پر چھوڑا اور خود رقص کے لیے درمیان میں آگئیں۔ انہوں نے دیر تک ہاتھوں پیروں کے کارنامے دکھائے اور جبار کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں جنت میں کس قدر سکون ہے...؟ پھر ان عورتوں نے باری باری جبار کے پاس جانا اور ناز و ادا دکھانا شروع کر دیا۔ وہ رقص کرتی رہیں اور ہنسی ہنسی میں اس کو چھیڑتی بھی رہیں۔

بڑے میاں نے ان عورتوں کو ڈانٹا۔ اس نے کہا۔ "نوجوان ہمارا مہمان ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم لوگ اس گھر میں صرف نوآمدہ زبردستی کے مہمان پر راغب رہو اور مجھ کو بالکل نظرانداز کر دو۔ تم لوگ یہ ظلم تو نہ کرو مجھ بوڑھے پر۔"

لیکن عورتیں شروع سے آخر تک جبار ہی کی طرف راغب رہیں۔

☆☆☆

جبار کئی دن تک اس نوجوان کو تلاش کرتا رہا جس نے اس کی کنپٹی پر مکا مار کر بے ہوش کر دیا تھا مگر وہ نوجوان نہیں ملا۔ جبار گھر سے نکل کر جنت کی دلفریبیوں میں پھنس جاتا اور رنگ رلیاں منا کر واپس آجاتا۔ ذنوبیہ کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جبار سے لڑنا چاہتی تھی مگر لڑ نہیں سکتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے جبار سے صاف صاف کہہ دیا۔ "تم جنت کی سیر و تفریح تنہا نہیں کر سکتے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

جبار نے پوچھا۔ "تم میرے ساتھ کہاں کہاں چلو گی؟ تم تھک جاؤ گی۔"

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ "میں نہیں تھکوں گی۔"

جبار نے جواب دیا۔ "اگر نہیں تھکو گی تو چلو میرے ساتھ، مگر چلنے سے پہلے ایک وعدہ کرو۔"

ذنوبیہ نے کہا۔ "میں وعدہ کرلوں گی، بتاؤ کون سا وعدہ؟"

جبار نے کہا۔ "یہ جنت ہے، ظاہر ہے گناہ اور ثواب کا تصور دنیا ہی میں رہ گیا۔ یہاں تو گناہ ہے نہ ثواب۔ اس

درود پاک کے فوائد

☆درود پاک ساری نوافل عبادتوں سے افضل ہے۔

☆درود پاک پڑھنے والے کے گناہ 3 دن تک فرشتے نہیں لکھتے۔

☆درود پاک کی کثرت کرنے والے کو قبر میں نہ مٹی کھائے گی نہ کیڑے۔

☆درود پاک کی کثرت فتوحات کی چابی ہے۔

معجزہ

مکہ والوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تو کہا محمد ﷺ نے چاند پر جادو کر دیا۔ پتھروں کو کلمہ پڑھتے دیکھا تو کہا جادو کر دیا۔ بدر کے موقع پر فرشتوں کو دیکھا مگر کلمہ نہ پڑھا۔ جنگ بدر میں شکست کھائی مگر ایمان نہ لائے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے بیت اللہ کا دروازہ پکڑ کر فرمایا۔ "جاؤ میں نے تم کو معاف کیا۔" تو سب جوق در جوق کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

معاف کر دینا بہت بڑا عمل اور انبیائے کرام کی سنت ہے۔

مرسلہ۔ اظہر حسین پچار، ہزاری، جتوئی

کیا آپ متفق ہیں...؟

☆ہر شیر کی شہرت و دہشت اسے شیر بنائے رکھتی ہے ورنہ ان میں بھی تو بزدل اور نکمے شیر ہوتے ہیں۔

☆آگ لکڑی میں نہیں اُس ہاتھ میں ہوتی ہے جو اسے لگاتا ہے۔

☆تکبر سے تنی ہوئی بلند "گردن" دشمن کا نشانہ وسیع کر دیتی ہے۔

☆زندگی اور خربوزے میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے کہ یہ پھیکی بھی نکل آئے تو پھینکی نہیں جا سکتی۔

اقتباس۔ مستنصر حسین تارڑ

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

لیے اگر میں یہاں اپنی پسندیدہ عورت یا لڑکی میں دلچسپی لینے لگوں تو برا نہ ماننا۔''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''لیکن جب میں تمہیں انعام میں عطا کر دی گئی ہوں تو پھر کسی اور عورت یا لڑکی پر مائل ہو جانا تمہیں زیب نہیں دیتا۔''

جبار نے ہنس کر کہا۔ ''تم سادہ لوح ہو ذنوبیہ! میرے نیک اعمال کے عوض یہ جنت ملی ہے مجھے اور جنت کا مطلب ہی یہ ہے کہ پوری جنت۔ جنت میں جو کچھ ہے وہ جنتیوں کے لیے ہے اور جنتی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔''

ذنوبیہ لاجواب ہو گئی۔ ''کچھ بھی سہی، میں تمہارے ساتھ چلوں گی، ہر صورت میں۔''

جبار نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا اور ایک طرف نکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے وہ دونوں ایک نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ نہر کا شفاف پانی رکا ہوا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر حد نظر تک سایہ اور پھل دار درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ ان پر خوش آواز اور خوش رنگ چڑیاں نغمہ سرا تھیں۔ درختوں کے غیر معمولی ہرے ہرے اور چکنے پتوں کا نظارہ آنکھوں کو فرحت و تازگی بخش رہا تھا۔

درختوں کے نیچے بیسیوں قسم کے پھولدار پودوں اور درختوں کے چھوٹے چھوٹے چمن زار تھے اور نہر کے دونوں ہی طرف کناروں پر مہوشوں کا جمگھٹا تھا۔ ان کے مترنم اور لطیف قہقہے فضا میں نغمگی بکھیر رہے تھے۔ ذنوبیہ اور جبار سبزہ زار پر بیٹھ گئے۔ جہاں یہ دونوں بیٹھے تھے وہاں سے نہر کا پانی زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔

جبار نے کہا۔ ''ذنوبیہ! میں جنت میں بھی ہوں لیکن خوش نہیں ہوں۔ یہاں بھی تکلیف دہ اور سوہان روح خیالات اور احساسات مجھ کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔''

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ''کون سے احساسات اور کون سے جذبات؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ انسان جنت میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔''

ذنوبیہ نے پھر پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ اس کی کوئی وجہ؟''

جبار نے کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں جنت میں بھیج دیا گیا ہوں اور مجھے تو بھی مل گئی ہے مگر میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے جذبات و احساسات دنیا والوں ہی جیسے ہیں۔ آخر ان میں کوئی تبدیلی کیوں نہیں آئی؟ ان میں انقلاب کیوں نہیں آیا؟ میں یہاں جتنا حسن دیکھ رہا ہوں، اسے دیکھ کر برداشت کر جانا ناممکن ہے۔''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''جو شخص اس قسم کی باتیں سوچنے لگے، اس کو سوچنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھ پر رحم کرے۔''

جبار ہنسنے لگا، بولا۔ ''سادہ لوح عورت! اگر خدا مجھ پر رحم نہ کرتا تو جنت میں کیوں بھیجتا۔''

ذنوبیہ نے عاجز آ کر کہا۔ ''اب میں تم سے کیا بحث کروں، تم مردوں میں یہ عجیب ہوتا ہے صابر ہی نہیں ہوتے۔''

اتنے میں نہر کے کنارے ان دونوں کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی نے گانا شروع کر دیا۔ وہ بالکل تنہا تھی اور بہت اداس نظر آتی تھی۔ اس نے گیت بھی الیہ ہی شروع کیا۔ اس کی آواز کے جادو نے لوگوں کو اکٹھا کر دیا اور وہ سب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس نوجوان لڑکی کا گیت سننے لگے۔ جبار اس کے پاس ہی چلا گیا۔ لڑکی گانے میں مشغول رہی۔

جب وہ گا چکی تو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور اس کو سوالات کی نوک پر رکھ لیا گیا۔

ایک مرد نے پوچھا۔ ''تو یہاں اپنے کس نیک عمل میں بھیجی گئی ہے؟''

دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا تو نے کسی سے محبت کی ہے؟ تیرا محبوب کہاں ہے؟''

لڑکی ان کے سوالات سے پریشان ہو رہی تھی کہ جبار نے سوال کر دیا۔ پوچھا۔ ''لڑکی! تیرا نام کیا ہے؟''

لڑکی نے جبار کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''حمدونہ۔''

جبار کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس نے اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''تو رہتی کہاں ہے؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''قریب ہی۔'' اور ایک ایسے مکان کی طرف اشارہ کیا جس کو عشق پیچاں کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں، اس مکان میں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''تو تنہا رہتی ہے یا کوئی اور بھی ہے تیرے ساتھ؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی ہیں۔ صفورا اور سعدیہ۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا میں تم لوگوں سے ملنے آ سکتا ہوں؟''

حمدونہ نے جواب دیا۔ ''میں تنہائی سے پریشان ہو رہی ہوں۔''

ذنوبیہ ان دونوں کے سوال جواب سے اکتا گئی تھی، اس نے جبار کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ''آؤ، اب گھر چلیں۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔''
ذنوبیہ نے جبار کو زبردستی اٹھانا چاہا۔ حمدونہ نے پوچھا۔ ''یہ تیری کون ہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''دنیا میں میری محبوبہ تھی کیونکہ وہاں میں نے اس سے زیادہ حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی لیکن یہاں جنت میں ہر طرف حسن ہی حسن ہے۔ میں حیران ہوں کہ کس کو چھوڑوں اور کس کو پکڑوں۔''
ذنوبیہ نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ نہیں چلو گے تو میں تمہیں بددعا دوں گی اور تم یہاں سے نکال باہر کیے جاؤ گے۔''
جبار ہنسنے لگا۔ ''سادہ لوح عورت! اب میں دعا اور بددعا کی دنیا سے باہر آچکا ہوں۔ یہ ساری بےکار اور فرسودہ چیزیں ہیں۔''
حمدونہ نے پوچھا۔ ''تم میرے ساتھ چلو گے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''میں ضرور چلوں گا، ابھی اسی وقت۔''
ذنوبیہ نے حمدونہ سے شکایتاً کہا۔ ''تو مجھ پر ظلم کر رہی ہے۔ جبار میرا ہے میری حق تلفی نہ کر۔''
حمدونہ نے جواب دیا۔ ''یہ جنت ہے، یہاں ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔''
جبار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آ حمدونہ...... چلیں گھر چل کر باتیں ہوں گی۔''
ذنوبیہ تلملا کر بولی۔ ''میں بھی تم دونوں کے ساتھ چلوں گی۔''
جبار نے کہا۔ ''چلو، میں کب منع کرتا ہوں؟''
لیکن حمدونہ نے اسے منع کر دیا، بولی۔ ''لیکن میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔''
ذنوبیہ نے سختی سے کہا۔ ''اگر تو مجھ کو ساتھ نہیں لے جائے گی تو میں جبار کو تیرے ساتھ نہیں جانے دوں گی۔''
حمدونہ نے کہا۔ ''اگر تو روک سکتی ہے تو روک لے۔ میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ یہاں ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ یہ دنیا کا تصور ہے اگر تو اس بہشت میں بھی دنیا کی روایات اور خرافات پر عمل پیرا رہنا چاہتی ہے تو یہ تیری غلطی ہے۔''
ذنوبیہ لاجواب ہوتی جارہی تھی۔
حمدونہ نے جبار کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ''آؤ چلیں۔''
ذنوبیہ دیکھتی رہ گئی۔ حمدونہ اور جبار چلے گئے۔ عشق

پیچاں کے سرخ پھولوں میں ڈھپے ہوئے مکان میں خواب جیسی کیفیت پائی جاتی تھی۔ جبار نے حمدونہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ذنوبیہ بھی کتنی احمق اور سادہ لوح ہے۔ بہشت میں اجارہ دار بن کر رہنا چاہتی ہے۔ دوامی اور پُرکیف زندگی کا مزہ ہی کرکرا کردینا چاہتی ہے۔“

یہاں جبار کی ملاقات صفورا اور سعدیہ سے بھی ہوئی۔ یہ دونوں بھی بے حد خوب صورت تھیں۔ جبار نے کہا۔ ”میرا خیال ہے مجھ کو اسی گھر میں مستقل رہنا چاہیے۔“

حمدونہ نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

لیکن صفورا نے کہا۔ ”لیکن میری رائے یہ ہے کہ جبار رہے تو ذنوبیہ کے ساتھ مگر روزانہ آتا جاتا رہے۔“

سعدیہ نے بھی اس کی تائید کی۔ ”میں بھی اس تجویز سے متفق ہوں۔“

جبار کو غصہ آگیا، بولا۔ ”حمدونہ تو اس پر راضی ہے کہ میں یہیں، اس گھر میں رہوں پھر تم دونوں کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ میں تو اسی گھر میں رہوں گا۔“

صفورا نے کہا۔ ”تو اس گھر میں زبردستی کیونکر رہے گا؟“

جبار نے کہا۔ ”میں جس طرح زبردستی رہوں گا اس کا مشاہدہ بھی کرادوں گا۔“

سعدیہ نے کہا۔ ”نہیں جناب! یہ خام خیالی ہے، ناقص خیالی۔ اس کو اپنے دل سے نکال دیں۔“

حمدونہ نے کہا۔ ”کھڑے کیوں ہوگئے؟ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میرا حکم چلتا ہے اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔“

سعدیہ نے کہا۔ ”یہاں میں بھی رہتی ہوں۔ آخر میری مرضی بھی کوئی چیز ہے۔“

حمدونہ نے جواب دیا۔ ”میں تیری مرضی اور خواہش کا احترام کرتی ہوں۔“

صفورا نے سعدیہ کو تسلی دی۔ ”سعدیہ مت گھبرا۔ میں اپنے لیے الگ انتظام کراؤں گی۔“

حمدونہ جبار کو لے کر ایک کمرے میں چلی گئی۔ یہ اس کا اپنا کمرا تھا۔ یہاں بھی دودھ اور شہد نلوں سے آتا تھا۔ یہاں بھی سامان تعیش کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہاں بھی غلمان خدمت گزاری کے لیے موجود تھے۔ شاندار لباسوں میں نوجوان لڑکوں جیسے۔ حمدونہ اور جبار کو کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ جبار کے دل میں ایک سوال کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ یہ حمدونہ اس پر ایک دم کیوں ملتفت ہوگئی تھی۔ اس نے یہ سوال حمدونہ سے بھی کیا، پوچھا۔ ”حمدونہ! میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں کہ تو مجھ پر ایک دم کیوں مہربان ہوگئی؟“

حمدونہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دنیا میں، میں اصفہان کے جس محلے میں رہتی تھی وہاں میں تیرے جیسی شکل کے ایک نوجوان پر عاشق ہوگئی تھی۔ وہ نوجوان مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں چاہتی تھی میری شادی اس سے ہوجائے لیکن میرے حاسد مانع آتے رہے۔ اس دوران میری ملاقات ایک خدارسیدہ شخص سے ہوگئی۔ اس درویش کے پاس دور دراز سے لوگ پہنچا کرتے تھے۔ میں بھی اس سے ملی اور اس کے سامنے اپنا دکھ درد بیان کردیا۔ اس نے ایک دن مراقبے میں جاکر میرے عشق کا انجام معلوم کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ میں اپنے محبوب کو مرنے کے بعد ہی حاصل کرسکتی ہوں۔ میں نے پریشان ہوکر اس درویش سے پوچھا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے؟“

درویش نے کہا۔ ”لڑکی! تو کسی طرح قزوین چلی جا۔ وہاں ایک اور درویش رہتا ہے، مجھ سے زیادہ خدارسیدہ اور صاحب کرامت۔ وہ تجھ کو تیرے محبوب سے ملوادے گا۔ وہ مایوس اور نامراد انسانوں کو جنت میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنے محبوب کو پالیتے ہیں اور خوش وخرم زندگی گزارنے لگتے ہیں چنانچہ میں گھر سے فرار ہوکر قزوین پہنچی اور اس درویش سے ملاقات کی۔ درویش نے کئی دن مجھے ایک مشروب دیا۔ میں نے اسے پی لیا اور مرگئی۔ پھر جب دوبارہ زندہ ہوئی تو خود کو اس بہشت میں پایا اور یہاں اپنے محبوب کو تلاش کرنے لگی۔ آخر بدقت تیری شکل میں پالیا۔ میرا محبوب بالکل تیری ہی شکل کا تھا۔“

جبار، حمدونہ کی داستان سن کر عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ حمدونہ اس کی جانب دیکھے جارہی تھی۔ جبار کو بھی ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ حمدونہ کو کافی عرصے سے جانتا ہے۔ اس نے حمدونہ میں ذنوبیہ سے زیادہ دلکشی محسوس کی۔ پھر حمدونہ کے ساتھ ہی وہ سعدیہ اور صفورا میں بھی دلکشی محسوس کرنے لگا اور انہیں بھی رام کرلیا۔ ان دونوں نے جبار کو ملامت کی کہ تو کیسا احمق مرد ہے کہ جو بہشت میں بھی محض دو ایک پر قانع ہوجانا چاہتا ہے۔

کئی دن بعد جبار کو ذنوبیہ کا خیال آگیا اور وہ حمدونہ کو بتائے بغیر ہی ذنوبیہ کے پاس چل دیا۔ جبار گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر مشتعل ہوگیا کہ جس نوجوان کی اسے تلاش تھی، ذنوبیہ کے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ آلاتِ مے کشی ان دونوں کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ جبار نے ذنوبیہ کو نوجوان کے پاس سے کھینچ کر دور کردیا۔

نوجوان کی آنکھ کھل گئی۔ ذنوبیہ نے وحشت زدہ نظروں سے جبار کو دیکھا اور ترش لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

جبار نے پوچھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، کیا وہ نظر نہیں آرہا ہے؟''

اب وہ نوجوان بھی کھڑا ہو گیا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے جبار کو مخاطب کیا۔ ''تو یہ تم ہو! خوب، تو ایک بار پھر ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''تیری بدقسمتی ہے اور میری خوش قسمتی ہے۔ میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش کیا۔ میری کنپٹی میں اب تک درد ہوتا ہے۔''

نوجوان نے ازراہِ مذاق پوچھا۔ ''کس کنپٹی میں؟ دائیں یا بائیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ تو میں تجھ سے پوچھوں گا کچھ دیر بعد۔''

اس کے فوراً بعد جبار نے اس نوجوان کی کنپٹی پر ایک مکا رسید کیا مگر نوجوان پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور جبار کا وار خالی گیا۔

ذنوبیہ نے شور کیا۔ ''یہ ہنگامہ بہشت میں نہیں ہونا چاہیے۔ تحمل سے کام لو جبار!''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں یہ نہیں برداشت کرسکتا کہ تیرے گھر میں کوئی اور نظر آئے۔''

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ''کیوں؟ یہ تو بہشت ہے یہاں ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔''

نوجوان نے ذنوبیہ کو سمجھایا۔ ''ذنوبیہ! میرا نام اسد ہے، میں شیر ہوں، یہ شخص میرا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''اور میں جبار ہوں، سرکشوں کا سر جھکا دینے والا، سمجھے؟''

یہ کہتے ہوئے جبار نے نوجوان اسد پر حملہ کردیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ جبار میں وحشت تھی، جنون تھا، دیوانگی تھی اور نوجوان اسد میں سلیقہ تھا، داؤ پیچ کی مہارت تھی۔ طاقت تھی۔ اس نے جبار کو کئی بار زمین پر گرا دیا اور جب بھی گرایا جبار کے جنون میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس نے اسد پر تابڑ توڑ حملے کر کے اسے بدحواس کردیا۔ اسد پیچھے ہٹا گیا اور جبار کا مکا دیوار پر لگا، پتھریلی دیوار پر اس کی انگلیاں زخمی ہوگئیں، اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسد نے خاموشی سے راہِ فرار اختیار کی۔

جبار کی انگلیوں سے خون جاری ہو چکا تھا لیکن وہ چیخ چیخ کر اسد ہی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ''میں اس نوجوان کو مار دوں گا، میں اسے قتل کردوں گا۔''

ذنوبیہ نے جبار کی خون آلود انگلیوں پر روئی رکھ دی۔ بولی۔ ''بہشت میں ہنگامے اور قتل وخون کا کیا تصور، یہاں تو جو بھی آتا ہے، ابدی زندگی لے کر آتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو قتل نہیں کرسکتا اور یہ اشتعال اور غصہ یہ حرام ہے۔ تم اس جنت کے لائق نہیں ہو۔ یہاں وہی شخص رہ سکتا ہے جو متحمل اور سرد مزاج ہو، جس میں انتقام کا جذبہ نہ ہو، جو حسد اور رقابت نہ رکھتا ہو، جس کا مزاج مفاہمانہ ہو۔ میرا خیال ہے اب تم یہاں نہیں رہ سکتے۔''

جبار کو غصہ تو اب بھی آرہا تھا مگر ذنوبیہ کی باتوں نے اسے ٹھنڈا کردیا، پوچھا۔ ''میں یہاں کیوں نہیں رہ سکتا؟ میں نے کیا کیا ہے؟ اگر اس بہشت میں غصہ، اشتعال اور حسد و رقابت اور انتقام حرام ہے تو پھر مجھے ان احساسات اور جذبات کے ساتھ یہاں کیوں بھیجا گیا؟ مجھے یہاں کیوں رکھا گیا؟ میں بے قصور ہوں، بے گناہ، میں بس یہیں رہوں گا اس جنت میں، میں کہیں اور نہیں جاؤں گا۔''

ذنوبیہ نے جبار کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آنسوؤں سے رونے لگی۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے کیونکہ مجھے اس بارے میں بتایا جا چکا ہے، میں جانتی ہوں اب کیا ہوگا۔''

جبار نے خود کو ذنوبیہ کی آغوش میں چھپا لینے کی کوشش کی، ننھے منے بچے کی طرح۔ وہ بہت پریشان تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟ کچھ مجھے بھی تو بتا دو ذنوبیہ! میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''یہاں کے منتظم تجھے معلوم نہیں کہاں پھینک دیں گے اور اب تجھ کو میرے پاس آنے کے لیے، مجھ سے ملنے کے لیے آگ اور خون کا سمندر عبور کرنا ہوگا۔ افسوس کہ تو بہشت کی دلفریبیوں میں پھنس گیا اور حد اعتدال سے گزر گیا۔ حمدونہ، سعدیہ اور صفورا یہ سب تیری آزمائش اور امتحان کے لیے نازل کی گئی تھیں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا یہ جو کچھ تو کہہ رہی ہے، درست ہے؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں تجھے وہی کچھ بتا رہی ہوں جس کا مجھے علم ہے اور جو کچھ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں سے نکال دیا جاؤں گا؟ کیا میں اس بہشت سے کہیں اور بھیج دیا جاؤں گا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ جگہ تو جنت کی پرتو

تھی بہشت کا عکس۔ جو لوگ یہاں ثابت قدم رہتے ہیں، انہیں اصل بہشت میں بھیج دیا جاتا ہے اور جو نااہل ہوں انہیں کہیں اور بھیج دیا جاتا ہے۔ کسی اور دنیا میں اپنی نااہلی اور عدم لیاقت کا عذاب سہنے کے لیے۔''

جبار کی انگلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھی، اس نے کہا۔ ''ذنوبیہ! درد سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔ کیا یہاں، اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''علاج ہو سکتا ہے، اس کے لیے یہاں ایک مشروب ہے، اس کو پی لو، تو سارا درد جاتا رہے گا۔''

جبار نے کہا۔ ''وہ مشروب کہاں ہے؟ خدا کے لیے اسے جلدی منگوا دے، درد نے میرا برا حال کر دیا ہے۔''

ذنوبیہ نے نہایت محبت بھری نظروں سے جبار کی آنکھوں میں دیکھا، بولی۔ ''مشروب پینے سے پہلے جی بھر کے مجھے دیکھ لے، مجھ سے باتیں کر لے۔''

وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ جبار کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کی انگلیوں کا درد بڑھ گیا، اس نے ذنوبیہ کی خوشامد کی۔ ''ذنوبیہ! خدا کے لیے درد کا مشروب دے دے، اب درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔''

ذنوبیہ اٹھی اور ایک بلوری صراحی میں سے مشروب انڈیلا۔ جب پیالہ لبالب بھر گیا تو اسے منہ پھیر کر جبار کی طرف بڑھا دیا، بولی۔ ''اسے پی لو اور ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جاؤ۔ افسوس کہ تو نے وقت کی قدر نہیں کی۔''

جبار نے پیالے کو ہونٹوں سے لگا لیا اور پلک جھپکتے ہی سارا پیالہ پی گیا۔ ذنوبیہ اس کی طرف حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جبار کو نشہ سا چڑھتا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو رہا تھا۔ کمرے کی چھت اس پر جھکی چلی آ رہی تھی۔ دیواریں بھی خم ہو گئی تھیں اور ان سب کا جھکاؤ جبار کی طرف تھا۔ وہ سمٹنے لگا۔ وہ چھت اور دیواروں کے دباؤ سے بچنے کی کوشش میں بے ہوش ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ بالکل بے ہوش ہو گیا۔ وہ اتھاہ اندھیروں میں اتر چکا تھا۔

☆☆☆

جبار کو جب ہوش آیا تو اس کے آس پاس رشید اور وحید موجود تھے۔ صبح کا وقت تھا، وہی وقت، جب وہ رشید اور وحید کے ساتھ نکلا تھا اور اسے پینے کے لیے ایک مشروب دیا گیا تھا۔ اب اس کے سامنے نہ تو بہشت تھی، نہ ذنوبیہ اور نہ ہی اس کا بہشتی مکان۔ اس نے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ذنوبیہ کہاں چلی گئی؟ حمدونہ کہاں ہے؟ میں اس مردود کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسد کو جان سے مار دوں گا، آخر وہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟''

رشید نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''جبار! ہوش میں آ، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟''

جبار نے جوش میں اٹھنے کی کوشش کی مگر دونوں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ وحید نے کہا۔ ''جبار! پریشان نہ ہو، ہم دونوں تیری دیکھ بھال کے لیے موجود ہیں، آرام کر۔ اللہ نے چاہا تو تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

جبار نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھ میں کوئی خرابی نہیں ہے، مجھے وہیں پہنچا دو بہشت میں۔''

رشید نے جبار کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا، پوچھا۔ ''جبار! بات کیا ہے؟ تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی میں بہشت میں تھا۔ وہاں ذنوبیہ تھی، حمدونہ تھی، سعدیہ تھی، صفورا تھی، وہ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ چشمے، پھول، پھل دار درخت، خوب صورت مکانات، عشق پیچاں کی بیلوں میں ڈھنپے ہوئے، نلوں میں دودھ اور شہد رواں تھا۔ وہاں ہر طرف حسن ہی حسن تھا۔''

رشید نے وحید کی طرف دیکھا۔ تشویش سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس شخص نے کوئی حسین خواب دیکھ لیا ہے اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔''

جبار چیخ کر بولا۔ ''مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر یقین کرو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں سچا ہوں۔ میں نے بہشت میں کئی دن گزارے ہیں، میں نے وہاں کے مزے لوٹے ہیں۔''

رشید نے وحید کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میں پریشان ہوں کہ اس پاگل کو کیا ہو گیا ہے۔ اب جو ہوش میں آیا تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔'' پھر جبار سے پوچھا۔ ''دوست! ذرا تفصیل سے سچ سچ بتا کہ تو نے خواب میں دیکھا کیا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ بھی دیکھا ہے جاگتے میں، ہوش و حواس کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں اس کو خواب ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔''

وحید نے کہا۔ ''جب تو نے مشروب پیا تھا، ہم دونوں اس جگہ موجود تھے۔ اب جو تو ہوش میں آیا تو ہم دونوں اس سے بہت خوش ہوئے۔ میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم دونوں تیری مدہوشی کے دوران یہاں سے ہلے تک نہیں۔''

جبار نے اپنی پوری داستان سنا دی، آخر میں بولا۔

"میں قسم کھا کر یہ یقین دلانے کو تیار ہوں کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے ہوش وحواس اور بیداری میں دیکھا ہے۔ ذنوبیہ، حمدونہ، صفورا اور سعدیہ میری گواہی دیں گی۔ آپ لوگ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔"

رشید نے پوچھا۔ "یہ جن کے تو نام لے رہا ہے کہاں ہیں؟ ان سے کس طرح پوچھیں؟"

جبار نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے، بولا۔ "ہائے یہ کیا ہوگیا۔ میں نے ذنوبیہ کی بات نہیں مانی ورنہ یہ دن مجھے نہیں دیکھنا پڑتے۔ وہ مجھ سے بار بار یہی کہتی تھی کہ بہشت میں حسد، رقابت، انتقام اور غصے کا کیا کام۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ جہاں رہتا تھا جنت کا عکس تھا۔ پرتو تھا اگر میں وہاں کی آزمائش میں پورا اتر جاتا تو مجھے حقیقی بہشت میں داخل کردیا جاتا لیکن میں اسد سے لڑ گیا۔ میں نے اس کو مکا مارنا چاہا مگر وہ ہٹ گیا اور میری انگلیاں پتھر کی دیوار سے ٹکرا گئیں جس سے میری انگلیاں لہولہان ہوگئیں۔" اس کے بعد اس نے اپنی زخمی انگلیوں کی طرف دیکھا۔ وہ کسی حد تک درست ہوچکی تھیں لیکن زخمی تھیں۔ ان انگلیوں کو رشید اور وحید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو، تم دونوں میری زخمی انگلیوں کو دیکھ سکتے ہو، یہ ایک مقابلے میں زخمی ہوگئی تھیں۔ کیا یہ سب جھوٹ اور خواب ہیں؟"

رشید نے جواب دیا۔ "جبار! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہیں ایک ایسے شخص سے ملوادوں گا جس کے پاس تیری پریشان خیالیوں اور افسردہ خوابوں کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوگا۔"

جبار نے جواب دیا۔ "میں چلا چلوں گا لیکن میں اس کی کوئی ایسی بات ہرگز نہیں مانوں گا جس سے بہشت والے واقعات کی نفی ہو۔"

رشید اور وحید اس کو اپنے گھر اٹھا کر لے گئے۔ جبار پاگلوں کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھتا اور سرد آہ بھر کے آنکھیں بند کرلیتا۔ یکا یک اسے ساری باتیں شدت سے یاد آنے لگیں۔ اس نے اپنی زخمی انگلیوں کو رشید کی آنکھوں کے سامنے کردیا اور بولا۔ "اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ میری انگلیاں زخمی کیوں ہیں؟"

رشید نے جواب دیا۔ "جب تو بے ہوش تھا تو نے جوش میں مکا تان کر زمین پر مارنا شروع کردیا تھا، اس میں تیری انگلیاں زخمی ہوگئی تھیں۔"

جبار نے کہا۔ "میں پاگل تو نہیں ہوں لیکن تمہاری باتیں مجھے ضرور پاگل کردیں گی۔"

وحید نے کہا۔ "اللہ تجھ پر رحم کرے جبار...... تجھ کو معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے۔"

جبار آنکھیں بند کیے بہشتی لمحات کو تصور میں بسائے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دن رشید نے کہا۔ "جبار! اب تیری طبیعت کیسی ہے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "اس دنیا میں دل نہیں لگ رہا، بس یہی جی چاہ رہا ہے کہ کسی طرح دوبارہ بہشت میں چلا جاؤں۔"

وحید نے جواب دیا۔ "مت فکر کر، اگر بہشت نام کی کوئی شے تیرے خواب وخیال کے مانند موجود ہے تو تجھ کو وہاں دوبارہ پہنچا دیا جائے گا۔ یہ میری طرف سے وعدہ رہا۔"

ایک دن رشید اور وحید اس کو لے کر انجانے مقام کی طرف چل دیے۔ انہوں نے سیدھا اور سپاٹ راستہ طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی راستے پر سفر شروع کردیا۔ یہ پیچیدہ اور پُرپیچ پہاڑی آگے جا کر ختم ہوجاتی تھی لیکن جہاں پر یہ پہاڑی ختم ہوجاتی تھی، اس سے پہلے ہی ایک سنگی عمارت شروع ہوجاتی تھی۔ یہ سنگی عمارت ایک قلعہ تھا، شاندار قلعہ۔ رشید اور وحید جبار کو لے کر اس قلعے میں چلے گئے۔ ان دنوں وہاں خورشاہ کی حکومت تھی۔

قلعے کے دربانوں نے انہیں دروازے کے اندر نہیں جانے دیا، باہر ہی روک دیا۔

رشید نے قلعے والوں سے کہا۔ "جاؤ اندر بتا دو کہ ایک مضطرب ولاچار بہشتی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

کچھ دیر بعد اندر سے بلاوا آگیا۔ رشید اور وحید جبار کو لے کر اندر چلے گئے۔ انہیں مختلف طویل راستوں سے گزار کر خورشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ خورشاہ جس تخت پر براجمان تھا وہ بہت ہی سادہ اور معمولی تھا۔ جب جبار کو یہ بتایا گیا کہ یہ خورشاہ ان کا مذہبی پیشوا اور بادشاہ ہے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ خورشاہ کے تخت کے سامنے احتراماً جھک گیا۔

خورشاہ نے وحید اور رشید سے پوچھا۔ "یہ اجنبی جو بظاہر حواس باختہ معلوم ہوتا ہے، میرے پاس کیوں لایا گیا ہے؟"

ایک مصری عقیدت مند نے پوچھا۔ "میرے خیال میں اس وقت یہ شخص اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے اور کیا یہ بات نہیں ہے کہ اس نے عالم اسفل سے......"

خورشاہ نے مصری کو بولنے سے منع کردیا، کہا۔ "جب تک میں کسی کو بولنے کی اجازت نہ دوں خاموش رہے۔" پھر وحید اور رشید سے پوچھا۔ "ہاں تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ

یہ شخص کون ہے اور یہاں میرے پاس کیوں لایا گیا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''یا سیدی و مولائی اس شخص کا تعلق ہلاکو کے لشکر سے رہ چکا ہے۔ ہلاکو خان نے جب فوج کشی کا ارادہ کیا تو اس نے اس کی سیاہ کو دعاؤں کے سہارے آگے بڑھنے سے روک دیا۔''

خورشاہ نے پوچھا۔ ''کیا اس کی دعاؤں میں اثر ہے؟''

وحید نے جواب دیا۔ ''یا سیدی و مولائی...... ہے۔''

خورشاہ نے ایک بار پھر سوال کیا۔ ''پھر یہ میرے پاس کیوں آیا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''یا سیدی و مولائی! یہ کہتا ہے کہ اس نے عالم رویا میں بہشت دیکھی ہے۔ اس بہشت میں اس نے کئی دن گزارے ہیں۔ حالانکہ جب یہ ہمارے ہاتھوں مشروب پی کر بے ہوش ہوا تھا تو ہم دونوں شروع سے آخر تک اس کے پاس اس کے ساتھ رہے مگر کافی دیر بعد جب یہ ہوش میں آیا تو یہ بار بار کسی بہشت کا ذکر کرنے لگا تھا۔''

خورشاہ نے جبار سے کہا۔ ''اب تو بیان کر، میں سب کچھ تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

جبار نے اپنی داستان سنانا شروع کردی اور سب کچھ سنا چکنے کے بعد وہ آنسوؤں سے رونے لگا، بولا۔ ''ذنوبیہ نے مجھ کو منع کیا تھا کہ میں فتنہ و فساد سے بچوں ورنہ وہاں سے نکال دیا جاؤں گا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی اور آخر کار وہاں سے نکال باہر کیا گیا۔ آہ! اب میں وہاں کیسے جاؤں گا؟''

خورشاہ نے کہا۔ ''لوگو! یہ شخص سچا ہے، اس نے بہشت کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے حرف بہ حرف درست ہے۔ یہ بہشت میں رہا ہے لیکن یہ وہاں کے آداب اور رسوم کی پابندی نہیں کرسکا اور نکال باہر کیا گیا۔'' پھر جبار سے پوچھا۔ ''اچھا، اب یہ بتا کہ اب تو کیا چاہتا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں اس بہشت میں دوبارہ جانا چاہتا ہوں۔ میں ذنوبیہ سے ایک بار پھر ملنا چاہتا ہوں۔''

خورشاہ نے سر جھکالیا اور جبار کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''تو جو کچھ بھی چاہتا ہے تجھے دوبارہ مل جائے گا۔ تجھ کو جنت پھر مل جائے گی۔ تجھے ذنوبیہ، حمدونہ، سعدیہ اور صفورا سے دوبارہ ملا دیا جائے گا لیکن اس کے لیے......''

جبار نے خورشاہ کی بات کاٹ دی۔ کہا۔ ''وقت کم ہے اور کام زیادہ، میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے دوبارہ بہشت میں پہنچا دیا جائے۔''

خورشاہ نے ذرا سختی اور بے رخی سے پوچھا۔ ''تو تم بہشت میں دوبارہ داخلے کے لیے میری خدمت کرنے کو تیار ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''بالکل بالکل...... میں آپ کی ہر خدمت کرنے کو تیار ہوں۔''

خورشاہ نے کہا۔ ''آج ہی سے تیری تربیت شروع ہوجائے گی۔ تم تسلیم و رضا کا پیکر بن جانے کے بعد بہشت میں دوبارہ داخل ہوسکو گے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ پہلے تم اپنے غصے، اشتعال اور حسد و رقابت سے پیچھا چھڑا لو کسی طرح کیونکہ ان میں انسان کا کینہ پن موجود ہوتا ہے۔''

جبار نے وعدہ کیا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں غصے، اشتعال، حسد اور رقابت سے کام نہیں لوں گا۔ اگر میں ایسا کروں اور آپے سے باہر ہوجاؤں تو مجھے بہشت میں دوبارہ جانا نصیب نہ ہو۔''

خورشاہ نے کہا۔ ''یہ عہد چپکے چپکے اپنے دل میں کرنا، ورنہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''مجھے تربیت کون دے گا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''ہمارے داعی، ہمارے معلم، وہ تجھے پختہ کردیں گے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اس وقت تک میں کہاں رہوں گا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''یہیں اسی قلعے میں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''ایک بات اور......''

خورشاہ نے کہا۔ ''جب تجھ کو میرے پاس ہی رہنا ہے، تب پھر فضول سوال جواب میں وقت کیوں ضائع کرتا ہے؟''

رشید اور وحید کو رخصت کردیا گیا۔ اب ان کا کام ختم ہوچکا تھا۔ خورشاہ نے جبار کو ایک اور شخص نعیم کے حوالے کردیا۔ نعیم کا کام یہ تھا کہ وہ جبار کو پاک کرے، اس میں جو برے جذبے اور احساسات موجود ہیں، ان سے اسے پاک اور منزہ کرے۔ نعیم فن حرب اور آلات حرب کے استعمال میں بھی ماہر تھا۔ اس نے جبار کو مختلف ہتھیاروں کے استعمال کے طریقے سکھائے اور یہ بتایا کہ کس ہتھیار کو کس وقت کتنی اچھی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے اور کسی شخص پر فیصلہ کن وار کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

ہر روز علی الصباح اسے دینی تعلیم دی جاتی۔ اس کو بتایا گیا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے اور ہر تنزیل کی ایک تاویل ہوتی ہے۔ جبار کے لیے یہ باتیں عجیب تھیں۔ ان خشک باتوں سے اسے الجھن ہوتی تھی لیکن نعیم نے اسے بتایا کہ ان کا جاننا اس لیے بہت ضروری ہے کہ ان کے بغیر ایمان پختہ نہیں ہوتا اور جب تک ایمان پختہ نہیں ہوگا انسان

صراطِ مستقیم پر کس طرح چلے گا اور صراطِ مستقیم پر چلے بغیر انسان جنت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

نعیم نے پوچھا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ وضو کسے کہتے ہیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''نماز سے پہلے اپنے اعضا کو پانی سے پاک کرنا۔''

نعیم نے پوچھا۔ ''میں ظاہری معنی نہیں پوچھ رہا اس کے باطنی معنی بھی ہیں۔''

جبار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

نعیم نے کہا۔ ''وضو کے باطنی معنی ہیں نفس کو آلودگی سے پاک کرنا۔''

جبار کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پوچھا۔ ''زکوٰۃ کی ادائی کا مطلب؟''

نعیم نے جواب دیا۔ ''استاد کا شاگرد کو تعلیم دینا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''ظاہر اور باطن میں آخر فرق کیا ہوتا ہے؟''

نعیم نے جواب دیا۔ ''ظاہر کی مثال ایک خواب جیسی ہے اور باطن اس خواب کی تعبیر ہے۔ تاویل پھل ہے اور تنزیل چھلکا۔ ظاہر میں اختلاف...... اور کجی ہے۔ ظاہر علم کثیف ہے۔ ظاہر تقلید محض ہے بلا دلیل۔''

اسی طرح جبار کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ پھر اسے بھیس بدلنے کی تعلیم دی گئی۔ اس کو بتایا گیا کہ بوقتِ ضرورت وہ کس طرح صوفی، تاجر، طالب علم، خدمت گار بن سکتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ باطل کو مٹا دینا اس کا فرض اولین ہے اور جب وہ باطل کو ختم کر دے گا تو اس کو اس کا اجر بہشت کی صورت میں عطا کیا جائے گا۔

جبار یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گیا کہ وہ باطل کہاں اور کیا ہے جس کو مٹا کر وہ دوبارہ بہشت میں جا سکتا ہے۔ نعیم نے اسے سمجھایا کہ ابھی اس کو اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ جبار پر باطل کی نشاندہی کرے۔

اب نعیم کی ساری توجہ ہتھیاروں کے طریقۂ استعمال کی طرف ہو گئی تھی۔ اب نعیم جبار کو یہ بتا رہا تھا کہ خنجر کو باطل کے کس حصے پر آزمانا چاہیے کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ نعیم نے جبار کو بتایا کہ اگر خنجر کو دل میں پیوست کر دیا جائے تو زخمی آخر کار دم توڑ دے گا اور اگر گردوں میں اتار دیا جائے تو بھی زخمی چل بسے گا۔''

جبار یہ جاننا چاہتا تھا کہ کسی کو قتل کر دینا کیوں ضروری ہے؟ نعیم نے جبار کو سمجھایا کہ قتل کی حیثیت کھیتی باڑی میں ہل چلانے جیسی ہے۔ ہل زمین کو کھود ڈالتا ہے۔ اسی طرح حق کی راہ میں حائل ہونے والوں کا قتل حق کے فروغ میں مدد دیتا ہے ہو جانے کی صورت میں بہشت عطا کر دی جاتی ہے۔

ماں

ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے ملک الموت کو کھڑے دیکھا۔

گھبرا کے پوچھا۔ ''یہاں کیسے؟''

''ملک الموت نے کہا تیری ماں کو لینے آیا ہوں۔''

میں گھبرا گیا، آنکھیں نم ہو گئیں۔

میں نے کہا۔ ''ایک سودا کرتے ہیں۔ مجھے لے جاؤ مگر میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان کی زندگی بخش دو۔''

اس پر ملک الموت مسکرائے اور بولے۔ ''لینے تو تجھے ہی آیا تھا۔ پر تجھ سے پہلے تیری ماں نے سودا کر لیا۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

بہشت کے ذکر نے جبار کو بے چین کر دیا۔ بہشت کی ایک ایک چیز یاد آنے لگی۔ ذنوبیہ، صفورا، سعدیہ، حمدونہ یاد آنے لگیں۔ آبشار، چشمے، پہاڑیاں، غلمان، شہد، دودھ اور جانے کیا کیا...... وہ بے ساختہ چیخ اٹھا۔ ''میں بہشت جانا چاہتا ہوں، مجھے بتایا جائے کہ میں کس کو قتل کر دوں۔ میں تڑپ رہا ہوں حق کے فروغ کے لیے۔ باطل کی بربادی اور تباہ کاری کے لیے۔''

نعیم نے کہا۔ ''صبر کر نوجوان، صبر۔ وہ دن دور نہیں جب تجھ سے ایک انتہائی اہم کام لیا جائے گا۔''

جبار خاموش ہو گیا۔ جبار نعیم کے پاس تقریباً چھ ماہ رہا۔ اب اسے ایک مخصوص لباس عطا کر دیا گیا تھا۔ سفید پوشاک، لال دستار، سرخ کمر بند، ایک چھڑی جو ہاتھ میں رہتی تھی اور کمر میں چھری۔ نعیم نے کہا۔ ''جبار! اب تو فدائی بن چکا ہے اور بہشت تجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔''

جبار کو جو کھانا ملتا تھا، اس میں گوشت کا مزہ عام گوشت سے کچھ مختلف ہوتا تھا اور اس نے جب سے یہ گوشت کھایا تھا، اس کے مزاج میں جھنجلاہٹ اور درندگی سی آ گئی تھی۔ ہر وقت اس کا جی یہی چاہتا کہ وہ کسی کا خون

کردے، کسی کو قتل کردے۔ جبار خود بھی یہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے، اس میں یہ تبدیلی کیوں آگئی ہے۔ وہ درندگی کی طرف کیوں مائل ہورہا ہے؟

جبار نے مطبخ کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ وہ باورچی کا نہایت چالاکی سے جائزہ لینے لگا۔ باورچی بہت سا کھانا پکاتا تھا، کئی فدائیوں کا کھانا۔ ایک دن اس نے مذبح میں جانور ذبح ہوتے دیکھے، یہاں ایک قطار میں دس بلیاں ذبح کی ہوئی دیکھیں۔ پھر قصائی نے ان بلیوں کو بنانا شروع کردیا۔ ان کی کھال اتار کر پیٹ صاف کیا، آلائش دور کی اور بوٹیاں کرنے لگا۔

جب باورچی کھانا پکا رہا تھا، جبار نے بلیوں کے گوشت کو ایک بڑی پتیلی میں ابلتے ہوئے دیکھا۔ جبار نے باورچی کو پکڑلیا اور پوچھا۔ ''میں تجھ سے ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔''

باورچی نے پوچھا۔ ''کیا جاننا چاہتے ہو، پوچھو۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اس پتیلی میں کیا پک رہا ہے؟''

باورچی نے جواب دیا۔ ''گوشت، کیوں؟ یہ سوال کیوں کیا تم نے؟''

جبار نے پوچھا۔ ''کس کا گوشت؟''

باورچی نے جبار کی طرف حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

جبار نے کہا۔ ''یہ کہ میں ایک عرصے سے کچھ محسوس کررہا ہوں، بس اس کی تصدیق چاہتا ہوں۔''

باورچی نے پوچھا۔ ''تم نے محسوس ہی کیا ہے یا کچھ دیکھا بھی ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے محسوس بھی کیا ہے اور دیکھا بھی ہے۔''

باورچی نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''تم نے جو کچھ دیکھا ہے خوب جانتے ہو، پھر یہ سوال مجھ سے کیوں کررہے ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں وہ تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

باورچی نے بات ٹال دی، بولا۔ ''میں اپنی زبان سے کیا کہوں؟ تم لوگوں کے لیے جو کچھ مجھے دے دیا جاتا ہے پکا دیتا ہوں۔''

جبار کے لیے مزید برداشت کرنا مشکل تھا، بولا۔ ''ہر صبح بلیاں کیوں ذبح کی جاتی ہیں؟''

باورچی نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ مجھ کو یہی حکم دیا گیا ہے۔''

جبار مشتعل ہوگیا۔ ''میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں، اگر تم جواب نہیں دو گے تو میں زبردستی حاصل کرلوں گا۔''

باورچی نے بھی آنکھیں دکھائیں۔ ''اگر تم نے مجھ سے زیادتی کی تو میں تمہاری شیخ سے شکایت کردوں گا۔''

جبار نے باورچی کو گریبان سے پکڑلیا، بولا۔ ''تو نے مجھے بلی کا گوشت کیوں کھلایا؟ میں اپنے اس سوال کا جواب چاہتا ہوں، اگر تو نے اب بھی میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''

باورچی اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا۔ جبار نے اس کا گلا دبانا شروع کردیا۔ اس کی انگلیاں باورچی کے گلے میں پیوست ہوتی جارہی تھیں لیکن باورچی کی موت سے پہلے ہی داعی نعیم آگیا۔ اس نے جبار کو ڈانٹا۔ ''جبار! یہ تو کیا کررہا ہے؟ باورچی کو چھوڑ دے۔''

جبار نے مڑ کر نعیم کی طرف دیکھا لیکن باورچی کو نہیں چھوڑا۔

نعیم نے اس کو متنبہ کیا۔ ''جبار! تو جو کچھ کررہا ہے، اپنے لیے برا کررہا ہے۔ تجھ کو نافرمانوں میں شامل کردیا جائے گا اور اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ تو ہمیشہ کے لیے بہشت سے محروم ہوجائے گا۔''

جبار کی گرفت ڈھیلی پڑگئی، اس نے باورچی کو چھوڑ دیا اور بیٹھ کر زاروقطار رونے لگا۔ ''یہ مجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ میں کیا کروں؟ میرے سوال کا جواب کون دے گا؟''

نعیم نے پوچھا۔ ''کیا سوال ہے تیرا؟ مجھے بھی تو بتا۔ شاید میں اس کا جواب دے سکوں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر مجھے بلیوں کا گوشت کیوں کھلایا گیا؟''

نعیم نے کہا۔ ''صرف اس لیے کہ اس کا گوشت کھانے والا حالتِ غضب میں اپنے آپ میں نہ رہے کیونکہ بلی بھی غصے کی حالت میں اپنے آپ میں نہیں رہتی بالکل تیری طرح، اس وقت تو بھی اپنے آپ میں نہیں ہے۔''

جبار نے اپنا سر پکڑلیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ''لوگو! مجھ کو بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

نعیم نے کہا۔ ''افسوس جبار! تو نے ایک بار پھر مشتعل ہوکر خود کو بڑا نقصان پہنچایا ہے تو نے باورچی کا گلا دبایا۔ یہ خبر تھوڑی دیر میں عام ہوجائے گی اور شیخ الجبال تجھ کو طلب کرکے جو فیصلہ سنائیں گے، میں جانتا ہوں۔''

جبار نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کیا فیصلہ سنائیں گے، کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔''

نعیم نے جواب دیا۔ ''وہ کہیں گے کہ تیری بری عادتیں تجھ میں اب بھی موجود ہیں۔ اشتعال اور غصہ۔ جب تک تجھ میں یہ برائیاں موجود ہیں تجھ پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔''

جبار نے جوش میں جواب دیا۔ ''اگر آپ لوگوں نے مجھ کو مایوس کیا تو میں خودکشی کرلوں گا۔''

نعیم نے کہا۔ ''میں یا کوئی اور تمہیں خودکشی کرنے ہی کیوں دے گا۔ دوسرے یہ کہ یہاں کوئی شخص اپنی مرضی یا خواہش سے خودکشی نہیں کرسکتا۔''

جبار نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے غصے اور اشتعال پر کس طرح قابو پاؤں؟ مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ میں پہلے سے زیادہ پُرجوش ہوگیا ہوں، سرکش ہوگیا ہوں۔''

نعیم نے باورچی کی گردن پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس پر جبار کی انگلیوں کے نشانات دیکھنے لگا۔ ناخنوں نے باورچی کو زخمی کردیا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ نعیم نے اس کی گردن کے زخموں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''مت رومت گھبرا۔ تیرے ساتھ میں جو ہوں۔ یہ جبار تجھ کو نہیں، خود کو نقصان پہنچائے گا۔ آج اس نے تیرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، بہت برا کیا ہے۔''

جبار نے خود کو ایک کمرے میں محبوس کرلیا۔ یہاں تک کہ شام تک اس میں بے یارومددگار بند رہا۔ اس کے کمرے میں اندھیرا ہوچکا تھا۔ کسی خدمت گار نے خاموشی سے شمع جلادی اور چلا گیا۔ جبار اپنی آگ میں خود ہی جلا جارہا تھا۔ وہ خلا اور اندھیرے میں معلوم نہیں کس کو تلاش کررہا تھا۔

عشا سے ذرا پہلے ایک شخص جبار کے کمرے میں داخل ہوا اور اعلان کیا۔ ''جبار! تجھ کو شیخ نے اسی وقت طلب فرمایا ہے۔''

جبار کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کمزور آواز میں پوچھا۔ ''آخر میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ سب کیا ہے اور میں کس لیے زندہ ہوں، میں مر کیوں نہیں جاتا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو لینے آیا ہوں، باتیں کم کر، میرے ساتھ چل۔''

جبار میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انکار کردیتا۔ چپ چاپ اس شخص کے ساتھ چلا گیا۔

شیخ نے پوچھا۔ ''جبار! کیا تیرا باورچی تیرا بھائی نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کو ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا ہے۔''

شیخ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ ''تو نے اس کو اپنا بھائی نہیں سمجھا، اس کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا۔''

جبار نے روتے ہوئے کہا۔ ''یا شیخ! میں اپنے محبوب سے بچھڑ کر اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہوں، میں اپنی زندگی سے تنگ آیا ہوا انسان ہوں۔ میں نے باورچی سے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب اس کے پاس تھا مگر وہ نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت میں نے مشتعل ہوکر باورچی کا گلا پکڑ لیا تھا۔ بات اتنی سی تھی جس کو بڑھا چڑھا کر میری برگشتہ قسمت نے کچھ سے کچھ بنادیا۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''کیا تو بہشت زار دوبارہ جانا چاہتا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں وہاں دوبارہ جانا چاہتا ہوں۔''

شیخ نے پھر سوال کیا۔ ''کیا تو نے خود کو حسد، رقابت، اشتعال اور غصے سے منزہ کرلیا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم یا شیخ! حالانکہ میری کوشش یہی رہی ہے کہ میں پاک اور منزہ ہوجاؤں۔''

شیخ نے کہا۔ ''اگر تجھ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ تو پاک اور منزہ ہوا ہے یا نہیں، تو آج ہی تجھے اس کا جواب مل جائے گا۔ تجھ کو معلوم ہے کہ وحشی منگولوں کا لشکر نیہ نامی جگہ پر خیمہ زن ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس جاؤں جبکہ ایسا کرنا شیخ الجبال کے وقار اور تقدس کے خلاف ہے۔ میں نے وحشیوں کے سردار ہلاکو خان سے کہہ دیا ہے کہ تو یہاں سے واپس چلا جا مگر وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ ہلاکو خان کہتا ہے کہ جو بات کرنی ہو میرے پاس آکر کرو لیکن افسوس کہ میں اس کے پاس نہیں جاسکتا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''مجھ کو تو یہ بتایا جائے کہ میں کیا کروں؟''

شیخ نے اپنے گاؤ تکیے کے نیچے سے ایک خنجر نکالا اور کہا۔ ''اب اس خنجر سے کام لینے کا وقت آچکا ہے۔ نیہ چلا جا اور ہلاکو خان یا پھر اس کے نامی گرامی فوجی سالار قط بوغا کے پاس چلا جا اور انہیں کسی بھی طرح قتل کردے۔''

جبار نے پوچھا۔ ''ہلاکو خان کو تنہا یا پھر اس کو قط بوغا کے ساتھ قتل کردوں؟ یہ کام ہے یا کچھ اور بھی؟''

شیخ نے کہا۔ ''ہلاکو خان اور قط بوغا دونوں ہی کو مار دے یا پھر جس پر قابو چل جائے۔''

جبار نے خنجر کو لے کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا، اس کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''یا شیخ! حکم کی تعمیل ہوگی۔''

شیخ کہنے لگا۔ ''یہ دیکھنے کے لیے تیرے دل میں حسد، رقابت اشتعال اور انتقام کے جذبات اب بھی موجود ہیں یا نہیں، تیرے ساتھ ایک شخص کو کیا جارہا ہے۔ تیرے

ساتھ یہ شخص بھی ہلاکو کے لشکر میں جائے گا اور ہلاکو خان اور قطبوغا کو تیری ہی طرح قتل کر دینے کی کوشش کرے گا۔''

جبار نے پوچھا۔''اس کے بعد تو مجھے بہشت مل جائے گی؟''

شیخ نے جواب دیا۔''بیشک، تجھ کو بھی اور تیرے ساتھی کو بھی۔''

جبار نے درخواست کی۔''یا شیخ! میرے ساتھی کو میرے ساتھ کر دیا جائے۔''

شیخ نے ایک نوجوان کو جبار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جبار نے اسے دیکھا تو چونک پڑا۔ اس نے اس شخص کو بہت غور سے دیکھا اور پوچھا۔''یا شیخ! یہ تو اسد ہے، وہی نوجوان جس کی وجہ سے مجھ کو بہشت چھوڑنا پڑی تھی۔'' اس کی زبان کو لکنت سی ہو گئی، پھر بولا۔''اور ایسا لگتا ہے کہ شاید یہی نوجوان ...... شاید یہی نوجوان ......''

لیکن وہ بات پوری نہیں کر سکا، شیخ نے اسد سے کہا۔ ''اسد! یہ شخص جس کا نام جبار ہے عجیب و غریب انسان ہے۔ اس میں جوش و خروش کا ایک طوفان سا چھپا رہتا ہے اور اس نوجوان نے ایک بار......''

لیکن جبار نے دفورِ جوش میں کہا۔''شیخ! تو نے حق داروں کے حق دلوا دیے، تو نے مظلوموں کی دستگیری کی اور پھر حق داروں کو جنت تک جانے کی ترکیبیں بتا دیں۔ کم از کم میں نے یہی سن رکھا ہے۔ اب میں اپنا کام کر کے بہشت کی امید باندھوں گا۔''

لیکن ایک شخص نے جبار کو ملامت کی، اس نے کہا۔ ''یہ تو شیخ سے کس طرح مخاطب ہے؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ خنجر تجھ کو مل گیا اور اب تو کسی حد تک خود مختار ہو گیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، تجھ پر شیخ کا احترام ہر حال میں واجب ہے۔''

جبار ڈر گیا کہ کہیں اس کے سپرد کیا جانے والا کام شیخ کسی دوسرے کے سپرد نہ کر دے۔ وہ شیخ کے پاس زیادہ نہیں ٹھہرا۔ اسد کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ اس کو اسد سے بھی نفرت رہ چکی تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

جب جبار اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو نعیم نے اسے مبارکباد دی اور کہا۔''جبار! تو بہت خوش قسمت ہے جو شیخ نے تجھے معاف کر دیا ورنہ عام حالات میں اس نوع کے واقعات میں شیخ نے کم ہی کسی کو معاف کیا ہے۔''

جبار نے اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی وہ نوجوان ہے جس نے مجھے بہشت سے نکلوا دیا اور پھر خود بھی نکل آیا۔ شیخ نے اس کو میرا ساتھی بنا دیا اور میں نے اس کو اس لیے قبول کر لیا کہ یوں میرے جذبۂ انتقام، اشتعال، حسد، رقابت اور غصے کا امتحان ہو جائے گا۔''

نعیم نے جبار کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ جبار نے اسد کو اپنے ہی کمرے میں ٹھہرایا اور اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس رات وہ بہت سکون سے سویا۔ اس کے قریب ہی اسد سویا ہوا تھا۔

☆☆☆

جبار اور اسد نے تاجروں کا روپ دھارا اور منگولوں کے لشکر کا رخ کیا۔ ان دونوں کے پاس مصر کے نادر کپڑے تھے۔ یہ کپڑے دن میں کئی رنگ بدلتے تھے اور ان کپڑوں کو عام آدمی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ مصری حکومت نے ان کے عام استعمال پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان کپڑوں کے علاوہ مٹی کے شاندار برتن تھے۔ ان شاندار برتنوں کو معلوم نہیں کس ترکیب سے بنایا جاتا تھا کہ ان کے آر پار چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ دونوں تاجران نادر چیزوں کو لے کر ہلاکو خان سے ملنا چاہتے تھے۔

جبار نے اس کو سمجھایا۔''ہم دونوں ہلاکو خان کو دونوں نادر چیزیں دکھائیں گے۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہلاکو خان کو باتوں میں لگائے گا، دوسرا اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہلاکو خان کے سینے میں زہر آلود خنجر اتار دے گا۔''

اسد نے کہا۔''ہلاکو خان کا لباس موٹا اور دبیز ہوتا ہے اگر اس موٹے لباس پر خنجر کا وار اوچھا لگے تو۔''

جبار نے جواب دیا۔''تب پھر ہلاکو خان کے کسی ایسے عضو کو نشانہ بنانا جہاں لباس آڑے نہ آئے اور شاید اس کی ہلاکت کے لیے بہترین طریقہ یہ ہو کہ ہلاکو خان پر یکے بعد دیگرے دونوں ہی حملہ کر کے ہلاک کر دیں۔''

اسد نے کہا۔''بہترین تجویز ہے بیشک یہی تجویز ...... مناسب ہے کہ اس پر ہم دونوں یکے بعد دیگرے حملہ کر دیں۔''

جبار کو اچانک بہشت کا خیال آ گیا کیونکہ ہلاکو خان پر حملہ خود ان کی ہلاکت اور قتل کا باعث بن سکتا تھا۔ جبار کو خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے اور بہشت کے درمیان بس چند دنوں کا فاصلہ رہ گیا تھا جب وہ منگولوں کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا تو سیدھا بہشت میں چلا جائے گا لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ اس کے ساتھ اسد بھی قتل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ وہ بھی بہشت میں پہنچ جائے گا تو اسے ذرا دکھ پہنچا کیونکہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کے رقیب بن کر یکجا ہو جائیں گے۔

جب وہ یہ سوچ رہا تھا، شیخ کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔''جب تک تو حسد، رقابت، اشتعال اور انتقام

سے پیچھا نہیں چھڑائے گا، تو بہشت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔
اسی عالم میں اسے ذنوبیہ کی کربناک آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم نے اپنے سفلی جذبات سے پیچھا نہ چھڑایا تو بہشت میں نہیں رہ سکو گے تمہیں اور کہیں بھیج دیا جائے گا۔''
اس مہیب اور بھیانک سوچ نے جبار کو جھنجوڑ ڈالا۔
اس نے اسد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بڑی محبت اور احترام سے اپنے سینے پر دل کی جگہ رکھ لیا، بولا۔ ''اسد! میں اپنے ماضی پر بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے بہشت میں جو کچھ بھی تیرے ساتھ کیا، وہ میری روح کے لیے اذیت ناک ہے۔''
اسد نے جواب دیا۔ ''میں بھی اپنے اس ماضی پر شرمندہ ہوں۔ میں نے بھی تجھ سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور اسی وجہ سے میں بھی بہشت سے نکال دیا گیا ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔''
جبار نے کہا۔ ''اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھو کہ یہاں بھی ہم دونوں اس طرح یکجا ہوئے ہیں کہ شاید ہمارا انجام بھی ایک جیسا ہو اور موت کے بعد بھی ہم دونوں بہشت میں ایک ساتھ داخل ہوں اور انہی حالات کے شکار ہو جائیں جن میں پہلے بھی مبتلا رہ چکے ہیں۔''
اسد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''لیکن میں اب پہلے جیسی غلطی نہیں کروں گا۔ میں نے حسد، رقابت، انتقام، اشتعال اور غصے جیسے سفلی جذبات سے پیچھا چھڑا لیا ہے، اب میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔''
جبار نے کہا۔ ''میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ تیرے جیسا ہو جاؤں لیکن یہ کام بہت مشکل ہے۔''
اسد نے جواب دیا۔ ''یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے بس، ذرا بے شرم بننے کی ضرورت ہے۔''
جبار نے کہا۔ ''ایسی بات نہ کر اسد، کیسی شرم اور کیسی بے شرمی، یہ اصطلاحیں اس دنیا کی ہیں، اس کثیف دنیا کی لیکن جب ہم عالم بالا میں چلے جائیں گے تو وہاں اس کثیف دنیا کی کثیف اصطلاحیں نہیں چلیں گی۔ لطیف دنیا کی ہر شے لطیف ہوگی، پاک اور منزہ دنیا کی ہر شے پاک اور منزہ ہوگی ہم کو اس دنیا کی بابت کثیف انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔''
اسد نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے، بولا۔ ''توبہ توبہ...... اب میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''
جبار اور اسد دونوں ہی گلے لگ گئے اور قسم کھائی کہ اب وہ دونوں یک جان اور دو قالب بن کر رہیں گے۔

☆☆☆

تبریز کے لق و دق میدان میں ہلاکو خان اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ حد نظر تک خیموں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ رنگا رنگ خیمے۔ ہلاکو خان کو شیخ الجبال کے اس رویے پر بڑا غصہ آیا ہوا تھا کہ اس نے شیخ الجبال کو بار بار بلوایا مگر وہ خود نہیں آیا اور ہر بار اپنے کسی بھائی کو بھیج دیا۔
جب ہلاکو خان کو بتایا گیا کہ دو مسلمان تاجر بوقلموں کپڑا اور مٹی کے برتن لے کر حاضر ہوئے ہیں اور ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو اس نے حکم دیا۔ ''ان تاجروں کو سردست روک لیا جائے، وہ ان سے ضرور ملاقات کرے گا۔'' اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ تاجروں کی خوب خاطر مدارات کی جائے۔
دونوں کو ہلاکو خان کے دارالضیافت میں ٹھہرا دیا گیا اور ان کی خاطر مدارات شروع ہوگئی۔ جبار کو اس بات کا ڈر لگا ہوا تھا کہ اسے پہچان نہ لیا جائے۔ کیونکہ جس تاجر کے پاس وہ رہ چکا تھا، وہ کہیں اسی لشکر میں موجود تھا۔ اس کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں تاجروں کا ذکر سن کے وہ تاجر خود اس کے پاس نہ پہنچ جائے۔ اس نے اسد سے کہہ دیا کہ جب بھی ان دونوں کے پاس کوئی اجنبی شخص ملنے آئے تو اس سے ملنے کے لیے اسد جائے گا اور باتیں کر کے رخصت کر دے گا۔
اسد نے ہامی بھر لی اور ملنے والوں سے خود ملاقاتیں کرنے لگا۔ آخر ہلاکو خان نے ایک تاجر کو اپنا نمائندہ بنا کر ان دونوں کے پاس بھیج دیا اور کہلوا دیا کہ افسوس ان دنوں چونکہ میں بہت مصروف ہوں اس لیے نہیں مل سکتا۔ تم دونوں میرے لیے جو کچھ لائے ہو میرے تاجر کو دکھا دو، وہ تاجر مجھے پہنچا دے گا۔
جبار نے اس تاجر سے اسد کو ملوا دیا اور خود آڑ سے اس تاجر کو دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کہیں یہ اس کا جاننے والا تو نہیں۔ چنانچہ یہ کوئی اجنبی اور ناشناسا تھا، خود بھی تاجر کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ''میں قبلائی خان سے مل کر ہلاکو خان کے پاس آیا ہوں اور ہم دونوں کی یہ خواہش ہے کہ اپنی چیزیں اپنے ہاتھ سے ہلاکو خان کو دکھائیں۔''
تاجر نے جواب دیا۔ ''میں آپ دونوں کی یہ بات ہلاکو خان تک پہنچا تو سکتا ہوں لیکن آج کل ڈر بھی لگا رہتا ہے۔''
جبار نے بوقلموں کا نمونہ تاجر کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ''اس کو دیکھو، اس کو ایسا کپڑا روئے زمین پر نہیں ملے گا اور میں اس کو ہلاکو خان کے لیے لایا ہوں۔''
تاجر اس کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، اس کو یہ کپڑا بہت پسند آیا، بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں یہ ہلاکو خان کو بھی بہت پسند آئے گا۔ اس کا نام کیا ہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''بوقلموں۔''

تاجر نے کہا۔ ”خوب! نام بھی بہت اچھا ہے۔“
جبار نے کہا۔ ”اگر یہ کپڑا ہلاکو خان کو پسند آجائے تو فرما دیجیے گا کہ دونوں غریب الدیار تاجر یہ حقیر چیز اپنے ہاتھوں سے دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“
تاجر نے پوچھا۔ ”دوسری کیا چیز ہے؟“
جبار نے مٹی کے پیالے وغیرہ دکھلائے، بولا۔ ”ان پیالوں اور دوسرے برتنوں میں یہ خوبی ہے کہ ان کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔“
تاجر نے ان برتنوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”خوب! حالانکہ مصر میں یہ صنعت عام ہے اور خاص کر صقلیہ کے مسلمانوں میں، جو مصر کے زیر نگیں رہ چکا ہے مگر ہم سب کے لیے یہ چیز نئی اور بہت خوب ہے۔“
جبار نے خوشامدانہ عرض کیا۔ ”جیسا کہ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ انہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کروں۔“
تاجر نے جواب دیا۔ ”میرا کام ہے تمہاری عرضداشت کو ہلاکو کی خدمت میں پیش کر دینا۔ پھر وہاں سے جو جواب ملے گا عرض کر دوں گا۔“
دو دن بعد تاجر ہلاکو خان سے مل کر آیا اور کہا۔ ”میں نے ہلاکو کو بوقلموں اور برتنوں کی بابت بتا دیا، وہ ان دونوں چیزوں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہے۔ اس نے مجھے برا بھلا کہا اور دھمکی دی کہ یہ کیسا تماشا کر رکھا ہے، دونوں چیزیں لے کر کیوں نہیں آیا۔ پھر تم دونوں کی بابت کہا۔ میں ان دونوں کی لغزش کو نظر انداز کر رہا ہوں کیونکہ انہیں میں نے اپنے مہمان خانے میں جگہ دی ہے۔“
جبار نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہم دونوں ہلاکو خان سے نہیں مل سکیں گے؟“
تاجر نے جواب دیا۔ ”تم دونوں کی خواہش تو اپنی جگہ، لیکن جب ہلاکو خان اس پر تیار نہیں ہوتا تو پھر تمہیں اس سے کس طرح ملایا جائے۔“
جبار نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں لیکن ہماری دلی خواہش یہی تھی کہ اس فاتح کا دیدار کیا جائے اور دونوں چیزیں اپنے ہاتھ سے پیش کی جائیں۔“
جبار نے بوقلموں اور برتن تاجر کے حوالے کر دیے اور ان کی مجموعی قیمت بھی بتا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ان کی قیمت نہ دی جائے تو اس کا بار بار ذکر نہ کرنا۔
تاجر ان چیزوں کو لے گیا اور تین دن تک غائب رہا۔ چوتھے دن واپس آیا اور جبار اور اسد کو یہ خوشخبری سنائی کہ ہلاکو خان نے دونوں چیزیں بہت پسند کی ہیں۔ اس نے دونوں چیزیں پسند کرنے کے بعد تم دونوں کی درخواست قبول کر لی۔ وہ تمہیں عنقریب اپنے دربار میں طلب کرے گا اور شاید اس وقت تمہاری دونوں چیزوں کی مجموعی قیمت بھی ادا کر دی جائے۔“
جبار کو اس خبر سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ اس نے تخلیے میں جا کر خنجر کی دھار پر انگلی رکھ کر اس کی تیزی کو دیکھا اور اسد کے کان میں کہا۔ ”خوشخبری۔ بہشت کے لیے تیار ہو جا، کام بنتا نظر آرہا ہے۔“
ان کے خیمے سے تاجر چلا گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور دونوں ایک بار پھر گلے لگ گئے۔
جبار نے کہا۔ ”اسد! آؤ ہم دونوں آخری بار ہلاکو کو ٹھکانے لگانے کا ایک مشترکہ منصوبہ تیار کریں۔“
اسد نے جواب دیا۔ ”ہاں، بہتر ہے۔“
جبار نے کہا۔ ”خنجروں کی دھار کو اچھی طرح دیکھ لو، یہ موقعے بار بار نہیں آتے زندگی میں۔“
اسد نے ایک بار پھر خنجر کی دھار کا معائنہ کیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جبار سے کہا۔ ”ہاں، اب یہ بتاؤ کہ اس پر ہم دونوں کس طرح حملہ کریں گے؟“
جبار نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہلاکو کے خیمے میں پہلے تو آہستہ آہستہ چلیں گے اور ہلاکو کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے پھر جب فاصلہ قریب رہ جائے گا تو میں ہلاکو پر حملہ کر دوں گا اور تم میری طرف اس طرح بڑھو گے گویا ہلاکو کی جان بچانے کے لیے تم ہلاکو کی طرف جا رہے ہو، پھر ہلاکو خان کو قتل کر دیا جائے گا۔“
دونوں نے اس تجویز کی خوشی میں خوب کھایا پیا اور بہشت زار کے تصور میں سو گئے۔ جبار نے خواب میں دیکھا۔ ذنوبیہ دور آسمانوں میں ہاتھ پھیلائے پوچھ رہی ہے کہ اب تم کب تک آرہے ہو میرے پاس؟ اس نے جواب دیا۔ ”بہت جلد ہلاکو خان کو قتل کر دینے کے بعد۔“
کئی دن بعد ان دونوں کو ہلاکو خان نے طلب کیا۔ ہلاکو خان کے خیمے کے سامنے دروازے کے دونوں طرف الاؤ روشن تھے، ہلاکو خان کے دربانوں نے جبار اور اسد کو دبوچ لیا اور ان دونوں کو نہتا کر کے دونوں الاؤ کے درمیان سے گزار کر ہلاکو خان کے سامنے پہنچایا گیا۔ اندر ہلاکو ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ چوکی پر بھورے رنگ کی سمور بچھی تھی۔ ہلاکو کی چوکی کے سامنے دائیں بائیں اس کے سردار اور رشتے دار بیٹھے تھے۔ بالکل قریب داہنی طرف ہلاکو خان کے بیٹے

اور بائیں طرف اس کے نامی گرامی فوجی سردار ان میں قط بوغاسب سے نمایاں تھا۔

ان دونوں کو ہلاکو خان کے سامنے لے جایا گیا۔ ہلاکو خان کے دربان دونوں کو شانوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ ہلاکو خان نے اپنے ایک درباری کو حکم دیا کہ ان دونوں سے پوچھا جائے کہ یہ دونوں مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟

اس سوال کے جواب میں جبار نے کہا۔ ''ہم دونوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے فاتح کی خدمت میں بوقلموں اور نادر اور عجیب مٹی کے برتن لے کر آئے تھے۔ بوقلموں دن میں کئی رنگ بدلتا ہے اور مٹی کے برتنوں کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے، جیسا کہ آپ نے بھی انہیں ملاحظہ فرمالیا ہوگا۔''

ہلاکو خان نے اپنے ترجمان سے کہا۔ ''ان سے پوچھو ان کی قیمت کتنی ہے؟''

جبار کو یہ بات پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی کہ اگر ہلاکو خان کو قیمت بتادی گئی تو وہ برہم ہوجائے گا، اس نے جواب دیا۔ ''ان کی کوئی قیمت نہیں، یہ دونوں چیزیں آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کی گئی ہیں۔''

ہلاکو خان کو اس جواب سے بڑی خوشی ہوئی۔ خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر ابھر کر غائب ہوگئی۔ ترجمان کے ذریعے دونوں کو جواب دیا گیا۔ ''تم دونوں کو انعام واکرام میں جو کچھ دیا جائے گا، وہ ان دونوں کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہمیں یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ہم سے تجارت کی جائے۔ ہمارے مفتوحہ اور محروسہ ممالک ہماری ملکیت ہیں۔ ان میں جو کچھ بھی ہے، ہمارا ہے۔ پھر کوئی شخص ہم سے تجارت کیوں کرے؟ جو لوگ ہمیں چیزیں دے کر ان کی قیمت بتا دیتے ہیں، ہم انہیں چور اور ڈاکو سمجھتے ہیں۔ جو ہماری ہی چیزیں ہمیں دے کر ان کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں ہم ان چوروں اور ڈاکوؤں کو وہ سزا دیتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہوتی ہے اور بہتوں کو اپنی حیثیت کا صحیح علم صحیح عرفان حاصل ہوجاتا ہے۔''

جبار اور اسد دونوں ہی اپنی ناکامی کے احساس سے اداس ہوگئے تھے، جبار نے خواہش ظاہر کی۔ ''خان محترم! ہم دونوں خاندانی تاجر ہیں۔ تجارت کرتے کرتے ہم دونوں تھک چکے ہیں اور اپنی زندگی کے ڈھچر کو بدلنا چاہتے ہیں۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟ بات صاف صاف کرو۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں اس عہد کے عظیم فاتح کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اس کے قریب رہنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بڑے لوگوں سے وابستہ ہوکر چھوٹے لوگ بھی بڑے بن جاتے ہیں۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''بڑا بننے کے لیے کسی کے سہارے کی نہیں، اپنے دست وبازو کو سہارا بنانا چاہیے۔ غیرت مندی کا تقاضا ہے کہ انسان کسی کے طفیل نہیں، اپنے بل بوتے پر بڑا بن جائے۔''

جبار نے عرض کیا۔ ''جب ہم ناچیز آپ کے قریب رہیں گے، آپ کی بڑائی اور عظمت کا عمیق نظروں سے مشاہدہ کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ بڑائی اور عظمت کے اجزائے ترکیبی سے کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہوجائیں گے اور کسی چیز کی حصولیابی سے پہلے اس کا علم اور اس کا عرفان بہت ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تو ہمارے قریب رہ کر بڑائی کے اجزائے ترکیبی تلاش کرتا رہ۔ حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کس طرح بڑا بن جاتا ہے اس کے لیے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ میرا دادا چنگیز خان کس طرح دنیا کا بڑا آدمی بن گیا؟ پھر ہم منگول دنیا کی عظیم اور بے مثال قوم کس طرح بن گئے، مسلسل جدوجہد، مردم شناسی، اقوام شناسی، بے مثال جرأت، رحم اور مروت جیسی بشری کمزوریوں سے گریز، پرہیز۔''

جبار نے درخواست کی۔ ''بہرحال ہم دونوں کو اپنے قریب رہنے کا موقع دیجیے، ہماری تو بس اتنی سی درخواست ہے۔''

ہلاکو خان نے ان دونوں کی بابت حکم دیا۔ ''ان کو نہتا ہی رکھا جائے اور یہ دونوں جتنی نظریں مجھ پر رکھیں گے، ان سے زیادہ ان پر نظر رکھی جائے۔''

جبار اور اسد کو خیمے کے اندر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا اور ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ''شیخ الجبال کے قاصد منہاج کو حاضر کیا جائے۔''

کچھ دیر بعد ایک مسلمان عالم کو ہلاکو کے تخت کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ ہلاکو نے اس عالم سے پوچھا۔ ''تو شیخ الجبال کی طرف سے کیا پیغام لایا ہے؟''

منہاج نے جواب دیا۔ ''شیخ الجبال نے مجھے اس پیغام کے ساتھ بھیجا ہے کہ میں آپ کو شیخ کی طرف سے یہ اطلاع دے دوں کہ آپ کا کوئی لائق آدمی شیخ کے پاس جاکر شرائط صلح طے کرے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''شرائط صلح کیسی؟ میں نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے تمام قلعے مسمار کردے اور میرے

پاس چلا آئے۔''

منہاج نے عرض کیا۔''جناب والا! آپ کا حکم شیخ تک پہنچ چکا ہے مگر وہ اس کے باوجود یہی چاہتا ہے کہ آپ کا ایک نمائندہ اس سے بالمشافہ بات کرے۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔''کیا تو شیخ کا نمائندہ یا قاصد نہیں ہے؟''

منہاج نے جواب دیا۔''میں شیخ کا نمائندہ ہوں بھی اور نہیں بھی۔''

ہلاکو خان نے حیرت سے پوچھا۔''اس کا کیا مطلب؟ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟''

منہاج نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے عرض کیا۔''کیا یہاں شیخ کا کوئی آدمی تو نہیں موجود ہے؟''

ہلاکو نے جواب دیا۔''یہاں شیخ کا کوئی بھی آدمی نہیں ہے، تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے صاف صاف کہہ دے۔''

منہاج نے عرض کیا۔''خان محترم! میں شیخ کا نمائندہ ضرور ہوں لیکن میں نہ تو اس کا پیرو ہوں اور نہ ان کی کسی ذیلی شاخ کا ہم عقیدہ۔ میں مسلمان ہوں اور شیخ نے زبردستی مجھے اپنا قاصد بنا کر یہاں بھیجا ہے۔''

ہلاکو نے پوچھا۔''اب سچ سچ بتا دے کہ شیخ چاہتا کیا ہے؟''

منہاج نے جواب دیا۔''شیخ چاہتا ہے کہ وہ آپ کے کسی آدمی کے سامنے اپنی قوت اور اپنے جلال کا مظاہرہ کرے اور اس طرح آپ کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے، وہ اپنے قلعے یوں مسمار نہیں کرے گا۔''

ہلاکو نے اپنے ایک فوجی سردار کو حکم دیا۔''اوغدے! تو اس مسلمان کے ساتھ شیخ الجبال کے پاس جا اور اس کو میری طرف سے حکم دے دے کہ وہ اپنے جملہ قلعے مسمار کر کے میرے پاس چلا آئے۔ میں اس کو معاف کر دوں گا اور اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

اوغدے نے اپنی نشست چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔

''بہتر ہے خان محترم!''

اس کے بعد ہلاکو نے دربار برخاست کر دیا۔ لوگوں نے اپنی اپنی نشستیں چھوڑ دیں اور خیمے کے باہر جانے لگے۔ ہلاکو خان نے اشارے سے حکم دیا کہ دونوں تاجروں کو روک لیا جائے اور قط بوغا کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

جب پورا خیمہ خالی ہو گیا تو ہلاکو نے قط بوغا سے کہا۔ ''قط بوغا میں جانتا ہوں کہ شیخ الجبال بہ آسانی اپنے قلعوں کو مسمار نہیں کرے گا۔ وہ مجھ سے شاطرانہ کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ سازشوں میں ماہر ہے، یکتائے روزگار، اس کا خیال ہے کہ میں اس کی چالوں میں آ جاؤں گا مگر یہ اس کی بھول ہے۔''

قط بوغا نے پوچھا۔''پھر محترم میرے لیے کیا حکم ہے؟''

ہلاکو خان نے کہا۔''اوغدے کی واپسی اور شیخ کے جواب پر ہمارے آئندہ اقدام کا انحصار ہے۔ اگر وہ اپنے قلعوں کو مسمار کرا کے خود کو ہمارے حوالے نہیں کرتا تو پھر اس پر فوج کشی کر دی جائے گی اور یہ کام میں خود انجام دے لوں گا۔ میری فوج اس کے جملہ قلعوں کو مسمار کر کے شیخ کو گرفتار کر لے گی۔''

پھر ہلاکو خان اچانک دونوں تاجروں سے مخاطب ہو گیا۔''ابھی ابھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ کو سازش اور شاطرانہ چالیں چلنے میں کمال حاصل ہے۔ شیخ کے بارے میں تم دونوں کی کیا رائے ہے؟''

دونوں گھبرا گئے۔ جبار نے جواب دیا۔''ہمارا شیخ سے کسی قسم کا بھی واسطہ نہیں پڑا، اس لیے ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟''

ہلاکو نے طنز کیا۔''تم دونوں بڑوں سے وابستہ ہو کر بڑے بن جانا چاہتے ہو اور تم یہ بھی چاہتے ہو کہ میرے قریب رہ کر میری بڑائی اور عظمت کے اجزائے ترکیبی معلوم کرو۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم تاریخ کے بڑے آدمی کس طرح بن سکتے ہو اور یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم معمولی سی جرأت اور دلیری سے کام لے کر کس طرح تاریخ کی نامور شخصیت بن سکتے ہو۔''

جبار اور اسد ہلاکو کی صورت دیکھ رہے تھے، انہیں ہلاکو کوئی پاگل دیوانہ سا لگ رہا تھا۔

ہلاکو نے پوچھا۔''تم دونوں کیا سوچنے لگے؟ وہ عرفان اور وہ آگہی جو نیلے جادوائی آسمان کی برکتوں سے انسان کو حاصل ہو جاتی ہے، مجھ کو حاصل ہے۔ اسے تم کہاں سے حاصل کرو گے؟ تم دونوں مجھے نہیں سمجھ سکے، جبکہ میں تم دونوں کو سمجھ چکا ہوں۔'' پھر پوچھا۔''کیا تم دونوں شیخ کی بہشت میں نہیں رہ چکے؟''

جبار اور اسد دونوں سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

ہلاکو کہتا رہا۔''تم دونوں مجھے قتل کر کے تاریخ کے بڑے آدمی بن سکتے ہو اور تم دونوں میرے پاس آئے بھی اسی غرض سے تھے لیکن میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ اپنے چہرے کی آنکھیں بھی اور اپنے دل و دماغ کی آنکھیں بھی۔''

جبار اور اسد کانپنے لگے، جبار نے کہا۔''خان محترم کو ہم پر یہ شبہ کیوں ہو گیا ہے؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔''تم مہذب لوگ جھوٹ بہت بولتے ہو۔''

قط بوغا نے پوچھا۔ ''اگر یہ دونوں آپ کو قتل کرنے آئے تھے تو مجھے حکم دیجیے کہ میں ان دونوں کو قتل کر دوں۔''
ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ان دونوں نے مجھے قتل نہیں کیا۔ اس لیے انہیں کسی ایسے جرم کی سزا دینا جوان سے سرزد ہی نہ ہوا ہو، کہاں کا انصاف ہے۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔''
جبار نے معذرت کی۔ ''خان محترم ہم دونوں بے گناہ ہیں، ہم پر اتنے بھیانک الزام نہ لگایئے۔''
ہلاکو خان نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''میں الزام نہیں لگا رہا ہوں، واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ تم دونوں میرے لیے جو کپڑا اور مٹی کے برتن لائے تھے، ان کا تعلق خاص کر مصر سے ہے اور مصر کا تعلق بنو فاطمیان سے ہے۔ تم لوگ سازشوں میں بے مثال ہو لیکن یاد رکھو یہ سازش تم اپنی دنیا کے لوگوں سے کر سکتے ہو۔ عیسائی، مسلمان اور یہودی ان تینوں کو اپنے ہدف کا نشانہ بنا سکتے ہو لیکن مجھ کو نہیں۔ کیونکہ میں نہ تو تم میں سے ہوں اور نہ ہی بہت زیادہ مہذب۔''
جبار نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''خان محترم! مجھ پر، ہم پر رحم کیجیے۔ ہم بے گناہ ہیں۔''
ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''جاؤ شیخ الجبال کے پاس واپس جاؤ۔ تم دونوں اگر ناموری چاہتے ہو تو جاؤ، تم اپنے شیخ کو قتل کر کے شہرت اور ناموری حاصل کر سکتے ہو۔''
جبار نے عرض کیا۔ ''اگر چھوٹے خان کو ہم پر شبہ ہو گیا ہے تو ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے، واپس چلے جائیں گے۔''
ہلاکو نے جواب دیا۔ ''ہاں تم دونوں واپس جاؤ کیونکہ یہاں تم ناکام رہو گے۔''
ہلاکو خان نے ان دونوں کو اسی وقت اپنے خیمے سے باہر نکال دیا اور خود بھی تخلیہ میں چلا گیا۔ قط بوغا دونوں کے ساتھ باہر نکلا اور ان دونوں کو ہلاکو سے زیادہ سختی سے حکم دیا۔ ''اگر تم دونوں زندگی چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً ہی چلے جاؤ۔''
جبار اور اسد کو ان کے خنجر واپس نہیں کیے گئے، ہاں ہلاکو خان نے ان دونوں کو بوقلموں اور مٹی کے برتنوں کی قیمت انعام واکرام کے نام سے ادا کر دی۔
راستے میں دونوں ہی دل شکستہ اور افسردہ تھے۔ شیخ الجبال نے انہیں جو کام سونپا تھا، وہ دونوں انجام نہیں دے سکے تھے لیکن جبار نے تلافی مافات کو پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ اس کو منہاج کی باتیں یاد آ رہی تھیں جس نے ہلاکو کے دربار میں شیخ کو برا بھلا کہا تھا اور شیخ کے خلاف ہلاکو کو ورغلایا بھی تھا۔ جبار نے اسد سے کہا۔ ''مجھے تو شیخ کو خوش کرنے کا طریقہ القا ہو چکا ہے۔ میں یہاں سے جاتے ہی منہاج کو ٹھکانے لگا دوں گا، بس کھیل ختم ہو جائے گا۔''
جبار اور اسد شیخ کی طرف واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے منہاج کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔

☆☆☆

شیخ الجبال خورشاہ نے منہاج کو اپنے گھر جانے دیا اور اوغدے کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔
خورشاہ نے کہا۔ ''وہ یہاں میرا مطلب ہے کہ خان محترم کو ہم اپنے جذبۂ ایمانی، جوش و خروش، سرفروشی اور بے مثال بہادری کے مشاہدے کرانا چاہتے تھے۔''
اوغدے نے بے پروائی اختیار کی، پوچھا۔ ''میں ہلاکو خان کی طرف سے یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ شیخ ہلاکو خان کے حکم کی تعمیل کب تک کر رہا ہے؟''
شیخ کو اوغدے کا گستاخانہ لہجہ بہت گراں گزرا، بولا۔ ''تیرا کیا نام ہے؟ اوغدے؟...... اوغدے! میں شیخ ہوں، مجھ سے احترام سے بات کر۔ میں ہلاکو خان کی طرح انسانوں پر نہیں، انسانوں کے دل و دماغ پر حکومت کرتا ہوں، مجھے بتا اوغدے کہ ہلاکو خان آخر چاہتا کیا ہے؟''
اوغدے نے جواب دیا۔ ''ہلاکو خان کا حکم ہے کہ شیخ اپنے جملہ قلعوں کو منہدم اور مسمار کرا دے اور خود ہلاکو خان کی خدمت میں پہنچ جائے۔ اگر شیخ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہلاکو خان سے نقصان اٹھا جائے گا تو خان محترم نے اس کا یقین دلایا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔''
شیخ نے پوچھا۔ ''اور اگر میں ہلاکو خان کی بات نہ مانوں، تو؟''
اوغدے نے جواب دیا۔ ''پھر یہ کام ہلاکو خان اپنی فوج سے لے لے گا۔ تیرے جملہ قلعوں کو مسمار کر کے تجھ کو عزت واحترام سے اٹھا لے جائے گا۔''
شیخ غصے سے تلملایا جا رہا تھا۔ شیخ اپنے قلعہ الموت کے بالائی حصے میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے آس پاس سفید جامیان فدائی پہرا دے رہے تھے۔ شیخ نے اپنے فدائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے پرستار ہیں، میرے جانثار، میرے فدائی...... اور یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے باتیں کر رہے ہیں جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟''
اوغدے نے جواب دیا۔ ''یہ سب فضول باتیں ہیں اور میں فضول باتوں سے دلچسپی نہیں رکھتا۔''
شیخ نے کہا۔ ''اس جگہ کا نام ہے الوت۔ یعنی آشیانہ

عقاب۔ ہم لوگ موت سے نہیں ڈرتے اور جو موت سے نہیں ڈرتا، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ ہلاکو خان سے کہو کہ کوئی ایسی درخواست کرے جو قابلِ قبول ہو۔"

اوغدے نے کہا۔ "ہلاکو خان درخواست نہیں کرتا، حکم دیتا ہے۔"

شیخ نے اوغدے کو بطورِ خاص مخاطب کیا۔ "اوغدے! ادھر دیکھ! میرے پرستاروں کی تابعداری اور جاں نثاری دیکھ۔" اس کے بعد شیخ نے ایک فدائی کو حکم دیا۔ "کھڈ میں کود جا۔"

ابھی شیخ کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ فدائی کھڈ میں کود گیا۔

اس کے بعد شیخ نے دوسرے فدائی کو حکم دیا۔ "اپنا گلا کاٹ دے۔"

اس فدائی نے خنجر اپنے گلے پر پھیر دیا اور گر کر تڑپنے لگا۔

شیخ نے تیسرے فدائی کو حکم دیا۔ "دیوار سے ٹکر مار دے۔"

اس فدائی نے دیوار سے اتنی زور سے سر ٹکرایا کہ وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

شیخ نے اوغدے سے پوچھا۔ "کیا تیری فوج میں اتنے بہادر لوگ ہیں؟"

اوغدے نے جواب دیا۔ "یہ بہادر لوگ کہاں تھے۔ یہ تو اندھے اور عقل کے مارے ہوئے لوگ تھے لیکن میری فوج میں دانا اور بینا لوگ ہیں۔ وہ لڑنے میں بے مثال ہیں، وہ خود اپنے ہی ہاتھوں ہلاک ہو جانا پسند نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کو ہلاک کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

شیخ لاجواب اور بے بس ہو چکا تھا، بولا۔ "تب پھر ہلاکو خان سے کہہ دینا کہ الموت کے سوا تمام قلعے مسمار کرا سکتا ہوں اور یہ کہ میں خود نہیں آسکتا۔"

اوغدے نے پوچھا۔ "تو یہ تیرا آخری اور قطعی جواب ہے؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ میرا آخری اور قطعی جواب ہے۔" پھر اوغدے سے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

اوغدے اسی وقت واپس چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی جبار اور اسد شیخ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی ناکامیوں کی روداد سنا کر رونے لگے۔ "اگر ہم سے ہمارے خنجر نہ لے لیے گئے ہوتے تو ہم دونوں ہلاکو خان کا کام تمام کر دیتے۔"

شیخ کو ان دونوں کی ناکامی کا بڑا احساس ہوا، بولا۔ "تو تم بہشتی کام انجام نہیں دے سکے۔ افسوس! اب کیا ہوگا؟"

جبار نے کہا۔ "یا شیخ! آپ کا منہاج نامی قاصد بڑا بددیانت نکلا۔ وہ ہلاکو کے دربار میں آپ کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ اگر آپ حکم دیں تو منہاج کا کام تمام کر دیا جائے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی اس شخص کو زندہ رہنے دو، بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تم دونوں ہلاکو خان کے بارے میں سوچو۔ قط بوغا کے بارے میں سوچو، اس کو ختم کرو، کسی بھی طرح۔ میں نہیں جانتا۔ دوبارہ واپس جاؤ، کسی بھی بھیس میں، کسی بھی شکل میں، ورنہ یہ سیلاب یہاں کا سب کچھ بہا لے جائے گا۔"

جبار نے عرض کیا۔ "شیخ محترم! ہلاکو خان ہمارے بارے میں ہم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ وہاں دوبارہ جانے کا مطلب ہے کہ ہم قتل کر دیے جائیں، ہلاک ہو جائیں۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ جب تک تم شہید نہیں کیے جاؤ گے، بہشت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

جبار نے کہا۔ "تو ہم دونوں ہلاکو خان کے پاس دوبارہ واپس جائیں؟"

شیخ نے سختی سے جواب دیا۔ "ہاں تم دونوں ہلاکو خان کے پاس دوبارہ جاؤ اور جس طرح بھی بن پڑے اس کا کام تمام کر دو۔"

جبار نے نعرہ لگایا۔ "شیخ کا حکم سر آنکھوں پر، اب میں ہلاکو خان کو قتل کر کے ہی واپس آؤں گا۔"

اسد نے پوچھا۔ "اور میں کیا کروں گا؟"

جبار نے جواب دیا۔ "وہی جو میں کروں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چل تاکہ ہم دونوں ایک ساتھ جئیں اور ایک ساتھ مریں اور پھر ایک ساتھ بہشت میں داخل ہوں۔ وہاں ذنوبیہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

ان دونوں نے شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر ہلاکو خان کو قتل کرنے کی نیت سے چل پڑے۔

(جاری ہے)

ماخذات

تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری۔ تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاھد علی۔ طبقات ناصری، منہاج سراج۔ الفخری، محمد علی ابن علی۔ نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان

کفّارہ

تنویر ریاض

اگر کسی کو اپنے من کی غلاظت اور دل پر بوجھ کا احساس ہو جائے تو اپنی غلطیوں کا کفارہ آسانی سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ شاید ایسے ہی ایک گناہ کا احساس اسے بھی بے چین رکھتا تھا جو نہ تو انجانے میں سرزد ہوا اور نہ ہی کسی منصوبے کے تحت اسے کیا گیا لیکن منہ زور جذبات کے طوفان نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اب چاہے جو بھی تھا اسے ہر حال میں اس کا کفارہ تو ادا کرنا تھا کیونکہ وہ سکون کی نیند سونا چاہتا تھا جو اسی وقت آتی جب اس کے دل سے بوجھ ہٹ جاتا... انسان بھی کتنا خود غرض واقع ہوا ہے... صحیح اور غلط کی پہچان بھی اپنے دلی سکون سے منسلک کیے پھرتا ہے۔

جرائم کی دلدل میں اترنے والے ایک معصوم ذہن کی وحشتوں کا عالم

صبح کے ساڑھے سات بجے میں اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ طبیعت بوجھل سی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ کچھ اور سو جاؤں لیکن نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ یکا یک ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں گرتا پڑتا فون تک پہنچا۔ دوسری طرف میرا پڑوسی جم بائل تھا۔ جیسے ہی میں نے ریسیور اٹھایا، وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے مائیک؟ تم فون کیوں نہیں سن رہے؟“

جم بائل دو گھر چھوڑ کر رہتا تھا۔ اس کی عمر باون سال

تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، تنگ پیشانی، پھولی ہوئی ناک، پستہ قد اور فربہ جسم کے ساتھ وہ عجیب سی مضحکہ خیز شخصیت کا مالک تھا اور ان دنوں ڈاکٹر کے مشورے پر باقاعدگی سے صبح کے وقت چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کی پھولی ہوئی سانس بتا رہی تھی کہ وہ ابھی ابھی چہل قدمی کر کے واپس آیا ہے۔

''میں نے اپنا سیل فون بند کیا ہوا تھا۔ جب سے جینی، لیزا کو لے کر گئی ہے، مجھے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی اور اگر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگ جائے تو ٹیلی فون کی گھنٹی ڈسٹرب کرنے لگتی ہے۔ تم سناؤ، سب خیریت تو ہے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

''تم نے رک نکولس کے بارے میں کچھ سنا؟''

یہ نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ ''تم اس رک کی بات کر رہے ہو جو پہاڑی کے دامن میں رہتا ہے؟''

''ہاں ہاں وہی...... اینا کا شوہر۔''

شاید اسے میرے اور اینا کے تعلقات کی بھنک مل گئی تھی۔ اسی لیے اس نے اینا کا حوالہ دینا ضروری سمجھا۔

''اسے کیا ہوا؟'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کل اس کی موت واقع ہو گئی۔''

''کیا؟'' مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''ہاں۔ وہ مارا گیا۔ سیمر نے مجھے ابھی فون کر کے بتایا ہے۔ پورے علاقے میں اس کی موت کی خبر پھیل گئی ہے لیکن تم ابھی تک لاعلم ہو۔ وہ الاسکا گیا تھا جہاں اس کی موت واقع ہو گئی۔''

''الاسکا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟''

''وہ اپنے موکلوں کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا ہوا تھا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ میں خود ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں ہوں۔ میں نے آج تک ایسی ہولناک خبر نہیں سنی۔''

اکتوبر کی سرد ہوا چل رہی تھی اور میں ننگے پیر کھڑا اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک طویل سرد آہ بھری اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''وہ ایک ریچھ کی خوراک بن گیا۔''

''اوہ میرے خدا!'' میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نکولس کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ایک کامیاب وکیل، دو نوعمر لڑکوں کا باپ اور اینا نکولس جیسی خوب صورت بیوی کا احمق شوہر تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ آج تک زندگی میں اینا جیسی حسین عورت نہیں دیکھی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ وہ میری زندگی میں بہار کے جھونکے کے مانند آئی اور خزاں کے آوارہ پتے کے مانند نکل گئی۔

چھ دن بعد میں رک نکولس کی آخری رسومات میں موجود تھا اور برابر میں عنقریب سابقہ ہونے والی میری بیوی جینی بیٹھی ہوئی تھی۔ میری نظریں اپنی بیٹی لیزا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ یقیناً جینی اسے اپنی بدمزاج اور منہ پھٹ ماں کے پاس چھوڑ کر آئی ہو گی تاکہ میں اپنی بیٹی کی شکل نہ دیکھ سکوں۔ یہ بھی مجھے اذیت پہنچانے کا ایک طریقہ تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

''لیزا کیسی ہے؟''

''خاموش رہو۔ دیکھتے نہیں کہ دعائیہ کلمات ادا کیے جا رہے ہیں۔'' اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ ہماری آواز پادری تک نہیں پہنچ رہی ہو گی۔''

''اگر تم واقعی جاننا چاہتے ہو تو سن لو کہ تمہاری بیٹی بالکل ٹھیک ہے۔'' جینی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور اپنے باپ کی حماقتوں کی وجہ سے اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن ہے۔''

''کیا خیال ہے اگر آج کی رات تم اپنے گھر میں گزار لو۔'' میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سیاہ ماتمی لباس میں وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''تم ہوش میں تو ہو۔'' وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں میرے بارے میں اس انداز میں سوچنے کا کوئی حق نہیں، میں تو صرف یہاں اینا، اس کے بچوں اور اپنے دوستوں کی وجہ سے آ گئی ہوں اور دنیا کو دکھانے کے لیے تمہارے برابر میں بیٹھ گئی ہوں لہٰذا مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرو۔ میرے وکیل نے تم سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔''

''اوہ اچھا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے وکیل کو میرا اسلام کہنا۔''

اس تمام تر تلخی اور اختلافات کے باوجود مجھے یقین تھا کہ جینی کو میرے اور اینا کے تعلق کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جو تین سال پہلے مختصر وقت کے لیے قائم ہوا تھا اور اب جبکہ میرے اور جینی کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے،

اس کے وکیل یا دوستوں میں سے کسی نے بھی میرے اور اینا کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جس سے میرا یہ یقین اور پختہ ہوگیا کہ اینا کے ساتھ تین راتیں گزارنے کے باوجود میں اس حوالے سے معاشرے کی نظر میں پاک صاف تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور اس طرح کی ملاقاتیں کھلے عام نہیں ہوسکتی تھیں چنانچہ مجھے اس مقصد کے لیے دوسرے شہر کے انتہائی مہنگے ہوٹل میں کمرا بک کروانا پڑا تھا۔

میں ایک پکا کیتھولک تھا اور کبھی کبھی مجھے اپنے اس طرزِعمل پر بڑی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اینا اس بارے میں کیا سوچ رہی تھی لیکن ہر ملاقات کے بعد مجھے اس کی آنکھوں میں ندامت کا احساس جھلکتا نظر آتا تھا پھر برسات کی ایک حسین شام جب ہم دونوں گارڈن اسٹیٹ پارک وے سے گزر رہے تھے تو اینا نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

”ہمیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسٹیئرنگ وہیل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔

”شاید میں بہت سے لوگوں سے انصاف نہیں کر پا رہی۔ میرا مطلب ہے...... خاندان، بچے اور شوہر...... انہیں میری زیادہ توجہ درکار ہے۔“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے دل کو سمجھالیا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وقتی جذبات کو تسکین پہنچانے کی خاطر اس کی ازدواجی زندگی کو کوئی نقصان پہنچاؤں، چنانچہ ہم بھیگی آنکھوں اور اداس مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے عقب سے جنازے کا جلوس مرکزی ہال میں داخل ہوا اور ہمارے پاس سے گزرتا ہوا مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ تمام حاضرین احتراماً کھڑے ہوگئے۔ جینی نے اپنی دائیں آنکھ پر انگلی رکھی اور بولی۔

”اوہ میرے خدا! اسے کس نے مشورہ دیا تھا ایسی جگہ جاکر مچھلیاں پکڑنے کا جس کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کے گائڈ کے پاس کوئی ہتھیار تو ہوگا۔“ پھر اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اینا کو دعویٰ دائر کردینا چاہیے۔“

”ممکن ہے کہ میرا خون نچوڑنے کے بعد تمہارا وکیل اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہوجائے۔“

”چپ رہو۔ تم نے کبھی رک کی عزت نہیں کی۔“

اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ واقعی میں نے رک کو کبھی اچھا نہیں سمجھا کیونکہ میں اینا کے حوالے سے اسے اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو اینا کبھی مجھ سے دور نہ جاتی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں نے ہی اسے ایسی خطرناک جگہ پر جانے کا مشورہ دیا ہوگا جہاں کسی ریچھ کی موجودگی کا امکان ہوسکتا ہے۔

دو ہفتے بعد دسمبر کے آغاز میں جب اچھی خاصی سردی پڑنے لگی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے رک کی موت کے سلسلے میں اینا سے ذاتی طور پر ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ منگل کی سہ پہر تھی جب میں اس سے ملنے روانہ ہوا۔ میں نے اپنی نقل وحرکت کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر عام راستے کے بجائے جنگل کا انتخاب کیا۔ اس کا مکان پہاڑی کے دامن میں ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جب میں نے نیچے کی جانب اترنا شروع کیا تو ذہن میں رک نکولس کی زندگی کے آخری لمحات کا تصور ابھرنے لگا۔ اوہ میرے خدا پندرہ سو پاؤنڈ وزنی بھورا ریچھ اسے کھینچ کر لے گیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ کیا اس سے زیادہ بھیانک موت کوئی اور ہوسکتی ہے؟ میں شمالی نیوجرسی میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا۔ اس لیے یہ جنگل میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں مکانوں کے عقب سے گزرتا ہوا نکولس کے مکان کے پچھلے حصے تک پہنچ گیا۔ مجھے کھڑکی میں سے اینا نظر آئی جو کچن کے سنک کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور اس کے کان سے فون لگا ہوا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ برتنوں کی صفائی کرتے ہوئے کچھ بیزار سی ہے۔

میں کچھ سوچے سمجھے بغیر باڑھ میں لگے لکڑی کے کھمبے پر چڑھا اور مکان کے اندر کود گیا۔ میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا اور اینا مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ آنے سے پہلے فون ہی کرلیتے۔“

غصے اور تھکن کے باوجود وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا سویٹر، جینز اور براؤن بوٹ پہن رکھے تھے۔ کانوں میں سونے کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔

”ہائے اینا؟“ میں نے اس کی ناراضی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارا دماغ بالکل ہی چل گیا ہے۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”میں فون پر بھی تم سے تعزیت کرسکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ ذاتی طور پر ملنا بہتر رہے گا۔“

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ منہ بناتے

ہوئے بولی پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

''تمہیں کیا ہوا۔ بہت مضمحل نظر آرہے ہو؟''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میرے چہرے کی بے رونقی دیکھ کر کوئی بھی شخص میری حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ دراصل جب سے جینی میری بیٹی کو لے کر گئی تھی، میں نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کئی کئی دن تک شیو نہیں بناتا اور فریج میں رکھا ہوا باسی کھانا کھالیتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ آخری بار تازہ پھل کب کھایا تھا۔ میری نیند غائب ہوچکی تھی۔ رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتا اور سگریٹ پھونکتا رہتا تھا۔ زیادہ جاگنے کی وجہ سے شراب نوشی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ مجھ میں ایسی کیا خامی ہے کہ میں ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ ثابت نہ ہوسکا۔

خوش قسمتی سے میری ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ مجھے روزانہ دفتر میں حاضری دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ٹیکنیکل سیلز آفیسر تھا اور اپنے گاہکوں سے لیپ ٹاپ کے ذریعے رابطے میں رہتا تھا اور گھر بیٹھے اپنے بزنس کی رپورٹ کمپنی کو بھیجتا رہتا اور اسی وجہ سے دفتر والوں نے بھی میری طرف سے چشم پوشی اختیار کررکھی تھی۔ انہوں نے جو ہدف مقرر کیا تھا، میں وہ بہ آسانی پورا کردیتا تھا۔ اس لیے انہیں میرے دفتر آنے یا نہ آنے سے کوئی غرض نہ تھی۔ ہفتے میں دوبار اپنے اوپر آفیسر سے آن لائن میٹنگ یا ویڈیو کانفرنس کرلیتا تھا اور اس طرح ان سے پالیسی کے معاملات اور کام کے نئے پہلوؤں پر گفتگو ہوجاتی تھی۔ میں نے دو دنوں سے شیو بنایا اور نہ ہی غسل کیا تھا۔ شاید اس لیے میرے چہرے پر مردنی کے آثار نمایاں تھے۔ اینا کے گھر تک کا فاصلہ طے کرنے میں بھی مجھے تھوڑی سی مشقت برداشت کرنا پڑی جس کی وجہ سے تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

''دیکھو......'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تجہیز و تکفین والے روز مجھے تم سے اظہارِ افسوس کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ جینی اور دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ بہت ہی اندوہناک واقعہ ہے اور رک کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔ تم لوگوں نے کس طرح یہ صدمہ برداشت کیا ہوگا۔''

اینا نے دروازے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''میں پہلے سے بہتر محسوس کروں گی اگر تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ممکن ہے کوئی تمہیں دیکھ رہا ہو۔''

میں نے گردن موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ قریب ترین مکان بھی سڑک کے دوسری جانب تھا اور مکمل طور پر اندھیرے میں تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا دونوں لڑکے گھر پہ ہیں؟''

''نہیں۔'' اینا اپنے بالوں کی لٹ پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دونوں گھر پر نہیں ہیں۔ جب تم نے گھنٹی بجائی، اس وقت میں جیکسن سے ہی فون پر بات کررہی تھی۔ وہ اور تھیو، باسکٹ بال کھیلنے گئے ہوئے ہیں اور مجھے انہیں لینے کے لیے جانا ہے۔ گوکہ اس وقت بہت زیادہ ٹریفک ہوتا ہے اور مجھے اتنے رش میں گاڑی چلاتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ مجھے جانے اور واپس آنے میں ایک گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں بعد میں آجاؤں گا۔''

''کیوں؟'' وہ بھویں اچکاتے ہوئے بولی۔ ''مزید دکھاوے کی تعزیت کے لیے یا اپنی چھٹی کو خوشگوار بنانے کے لیے۔ شاید تم سوچ رہے ہوگے کہ جینی کے ساتھ تمہاری شادی ختم ہونے والی ہے اور رک منوں مٹی تلے دفن ہوگیا ہے۔ اس لیے تمہارے لیے اچھا موقع ہے کہ ایک بار پھر مجھ پر ڈورے ڈال سکو۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئیں ہو۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ تمہاری ذرا سی غلطی میرے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ بھول جاؤ اس تعلق کو جو کبھی ہمارے درمیان تھا۔''

''میں پرانی باتیں یاد دلانے نہیں آیا۔ جانتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، وہ غلط تھا اور ہم دونوں سے بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی لیکن وہ تین سال پرانی بات ہے، میں تو صرف یہ سوچ کر آیا تھا......''

اینا میرے عقب میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''ایک منٹ......کیا تم پیدل چل کر یہاں تک آئے ہو؟''

''ہاں لیکن میں نے یہاں آنے کے لیے جنگل کے راستے کا انتخاب کیا تھا جو عموماً سنسان رہتا ہے اور وہاں صرف شام کے وقت بچے سائیکل چلاتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ زیادہ محفوظ راستہ ہے۔''

''اور اب تم یہاں میرے دروازے پر کھڑے باتیں کررہے ہو۔ تمہاری ساری احتیاط دھری رہ گئی۔ کوئی بھی تمہیں یہاں دیکھ کر شک میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم فوراً گھر سے چلے جاؤ۔''

''اینا! میری بات سنو۔'' میں جملہ پورا کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ ''رک بہت اچھا آدمی تھا اور میں تمہیں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے تمہارے نقصان پر دلی صدمہ پہنچا ہے۔''

اینا کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تمہاری مصنوعی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ تم رک، میری فیملی یا اس دکھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں۔ تم اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ بھی تمہاری طرح ایک ایسا مرد تھا جو بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ میں کبھی بھی اس جیسے شخص سے دوبارہ شادی کرنا پسند نہیں کروں گی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے مجھے وقت نہ دے پا رہا ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ شہر کا نامی گرامی وکیل تھا اور ہر وقت اپنے موکلوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں مجھے کبھی مالی پریشانی نہیں ہوئی لیکن اب لگتا ہے کہ بیچ منجدھار میں کھڑی ہوں۔ میرے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور انشورنس سے ملنے والی رقم اتنی ناکافی ہے کہ اس سے مکان کی قسطیں بھی ادا نہیں ہوسکتیں۔ لگتا ہے کہ ایک دن یہ مکان بھی ہم سے چھن جائے گا۔ ذرا ٹھہرو...... میں تمہارے لیے ڈرنک لاتی ہوں۔ کچھ بھی ہو، اس وقت تم میرے دروازے پر کھڑے ہوئے ہو۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ رک کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟''

''اوہ میرے خدا! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے دہرا سکوں۔ اس ریچھ نے رک پر حملہ کیا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں کی چیر پھاڑ کی اور اس کا سر اپنے ہمراہ لے گیا۔ پولیس اور ریسکیو ٹیم نے وہ سر تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ مجبوراً اس کی لاش کو سر کے بغیر ہی دفن کرنا پڑا۔''

یہ کہہ کر اینا نے غصے سے دروازہ بند کیا اور اندر چلی گئی، دروازہ میرے منہ پر لگا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے لڑکھڑایا۔ اس وقت مجھے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ میں نے واپس جانے کے لیے اینا کے مکان کے عقبی حصے کا رخ کیا۔ واپسی کا راستہ ڈھلوانی تھا۔ اس لیے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اچانک ہی گیراج کا دروازہ کھلا اور میں جلدی سے ایک دیوار کی آڑ میں ہوگیا۔ اینا نے بڑی تیزی سے اپنی کار نکالی اور گیراج کا دروازہ خودکار طریقے سے بند ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ کار میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں گھر جانے کے بجائے واپس مڑا اور گیراج کا بغلی دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ جانتا تھا کہ یہ جرم ہے۔ میرے اندر سے آواز آئی۔ میں نے اس آواز پر کوئی توجہ نہیں دی اور اندر داخل ہو کر گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے سامنے رک کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ گیراج میں تیل کے ڈبے، پیٹرول کا خالی کین اور مختلف اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر مجھے رک کا خیال آیا۔ ایک ریچھ اس کا پورا سر لے کر چلا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کا سر

تلاش نہ کر پائے ہوں۔ اس تلاش میں رضا کار، پولیس اور شیرف سب ہی شامل رہے ہوں گے۔ کیا وہ بغیر سر کی لاش ورثا کے حوالے کر سکتے ہیں؟ مجھے لگا کہ اینا کی بتائی ہوئی تفصیل نامکمل اور مبہم ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فرش پر میرے قدموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ میں نے کونے میں پڑی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور انہیں صاف کرتا ہوا گیراج سے باہر آگیا۔ اس طرح میں نے ہر وہ ثبوت مٹا دیا جس سے وہاں میری موجودگی کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔ اب میرا رخ مکان کے عقبی حصے کی طرف تھا۔ میں نے دروازے کی ناب کو دو دفعہ گھمایا تو وہ کھل گیا۔ اسے آپ میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شراب نوشی کا اثر کہہ لیں یا میری منتشر ازدواجی زندگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت...... بہرحال اس وقت عقل میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اینا کے ساتھ ہونے والی بحث نے میرے اندر کے مرد کو بیدار کر دیا تھا۔ اینا نے بتایا تھا کہ اس کی واپسی ایک گھنٹے میں ہوگی جبکہ میں صرف ایک نظر دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ اس کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ میں خوفزدہ ہونے کے باوجود محتاط تھا اور اسے کبھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ میں اس کے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ بہ ظاہر مجھے اس میں کوئی نقصان نظر نہیں آیا لیکن بعد میں جو نتیجہ سامنے آیا۔ وہ خاصا مختلف تھا۔

لانڈری سے گزر کر میں بائیں جانب مڑا تو لیونگ روم کی سجاوٹ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کھڑکیوں پر قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے اور وسط میں ایک کرسمس ٹری رکھا ہوا تھا۔ جس میں خوب صورت برقی قمقمے روشن تھے۔ کچن میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ پورا مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی اینا کے گھر نہیں آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ عمدہ ذوق کی مالک ہے اور گھر کی سجاوٹ دیکھ کر یہ خیال درست نکلا۔ قیمتی کرسٹل لیمپ، بھاری لیدر کے صوفے اور ایرانی قالین دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

ہال کی طرف جاتے ہوئے میری نظر دیوار پر لگی تصویروں پر گئی۔ ان میں زیادہ تر بلیک اینڈ وائٹ تھیں۔ ان میں سے اکثر اس کے جڑواں لڑکوں کی تھیں جو مختلف ادوار میں کھینچی گئی ہوں گی۔ کچھ تصویروں میں اینا اور رک خوشگوار موڈ میں نظر آ رہے تھے جبکہ دو چار تصویریں خاندان کے بزرگوں کی بھی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک بار پھر ضمیر نے مجھے بھگانے کی کوشش کی۔ ”بے وقوف! ایسا مت کرو۔ واپس گھر لوٹ جاؤ۔“

اس وقت تک میں اوپری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ گھر کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی تاریکی تھی اور نیچے سے آنے والی روشنیوں کی وجہ سے تھوڑا بہت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب کا رخ کیا۔ اب میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا جو میرے اندازے کے مطابق ماسٹر بیڈ روم ہو سکتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو یوں لگا جیسے یہاں کوئی بم پھٹا ہو۔ کمرے میں سارا سامان بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔ گتے کے ڈبے اور کپڑے قالین پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر ایک بکس کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں رک کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سوٹ اور ٹائیاں وغیرہ شامل تھیں۔ گویا اینا ان چیزوں سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیوار گیر الماری کے اوپر دیکھا۔ وہاں جیولری باکس کے ساتھ اینا اور رک کی جوانی کی فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی جس میں ان کے کچھ دوست بھی موجود تھے۔ لگتا تھا کہ یہ کسی فٹ بال میچ کے موقع پر لی گئی تھی۔ شاید یہ ڈیوک یونیورسٹی کا گراؤنڈ تھا جہاں وہ دونوں پہلی بار ملے تھے۔ اینا کی آنکھوں کی چمک میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قسمت میں کیا لکھ دیا گیا ہے، ایک سرکٹا شوہر، تباہ حال زندگی اور زوال کی جانب سفر۔

اسی کے برابر میں ایک اور فریم شدہ تصویر تھی۔ میں نے احتیاط سے فریم اٹھایا۔ وہ اینا اور رک کی شادی کی تصویر تھی۔ اس پر شادی کی تاریخ بھی درج تھی۔ ان کی شادی جون میں ہوئی تھی جبکہ عام طور پر لڑکیاں اس موسم میں دلہن بننا پسند نہیں کرتیں۔ میری اور جینی کی شادی اپریل میں ہوئی تھی۔ اس روز اس کی سالگرہ بھی تھی۔ لہٰذا اسے بھولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ میں اسے ہر سالگرہ پر پھولوں کا گلدستہ یا کوئی تحفہ ضرور دیا کرتا تھا لیکن اب وہ دن خواب ہو گئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اگلی سالگرہ پر ہم دونوں کہاں ہوں گے۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور فریم شدہ تصویر بڑی احتیاط سے واپس اس کی جگہ پر رکھ دی۔ میں واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ایک نظر لڑکوں کے کمرے کا جائزہ بھی لے لوں۔ گو کہ دونوں بھائیوں کی شکلیں اور چال ڈھال ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ اس کے باوجود کھیلوں کے علاوہ ان کی دیگر دلچسپیاں بالکل مختلف تھیں۔ یہ بات مجھے ایک

دفعہ اینا نے بتائی تھی۔ میں نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ توقع کے مطابق مجھے وہاں وہی کچھ نظر آیا جو کسی نوعمر لڑکے کے کمرے میں ہوسکتا ہے۔ دیواروں پر لگے موسیقاروں اور گلوکاروں کے بڑے بڑے پوسٹرز، فرش اور بستر پر بکھرے ہوئے کپڑے اور ایک کونے میں رکھا ورزش کا سامان۔ میں نے غور سے پورے کمرے کا جائزہ لیا لیکن مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس پر توجہ دی جاسکتی۔ میں سر ہلاتا ہوا باہر آگیا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ پوری طرح بند تھا لیکن میں نے اس کی ناب گھمائی تو آرام سے کھل گیا۔ یہاں کا ماحول بھی کچھ مختلف نہ تھا لیکن اس کے باوجود مجھے کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر میری نظر ایش ٹرے میں پڑے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں پر گئی تو سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ میں بھی اس دور سے گزر چکا تھا اور جانتا تھا کہ ایسی چیزیں کہاں چھپائی جاتی ہیں۔ میں نے کتابوں کی الماری، میز کی درازیں اور کھیلنے کے سامان کی کٹ دیکھ ڈالی لیکن مجھے وہاں سے کچھ نہیں ملا۔ پھر میں نے اس کے کپڑوں کی الماری کھولی۔ وہاں ٹی شرٹس، جوتوں، ویڈیو گیم کے علاوہ ایک گٹار بھی نظر آیا جس کے کچھ تار غائب تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس ناکارہ گٹار کو اتنا سنبھال کر الماری میں کیوں رکھا گیا ہے۔ میں نے اس گٹار کو اوپری حصے سے پکڑ کر ہلایا تو اس کے اندر کوئی چیز زور سے ٹکرائی۔ میں نے اس گٹار کو نکال کر بستر پر لٹایا اور اسے الٹا کر کے دو تین جھٹکے دیے تو اس میں سے نوٹوں کا بنڈل برآمد ہوا۔ میں نے اپنی انگلیاں گٹار کے سوراخ میں ڈالیں جو ایک پلاسٹک کی تھیلی کے سرے سے ٹکرائیں۔ میں نے اس تھیلی کو باہر کھینچ لیا جس میں نشہ آور گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ میرا سانس اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں پہلے بھی اس طرح کی گولیاں دیکھ چکا تھا۔ چند سال پہلے میرے پیر کا آپریشن ہوا تھا تو مجھے ایک مخصوص مقدار میں سکون آور ادویات دی جاتی تھیں۔ آج کل نوجوان کھیلوں کے دوران ایسی گولیاں استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان گولیوں پر کندہ برانڈ پڑھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔

مجھے یاد آیا کہ حال ہی میں اخبارات میں ایک اسکینڈل شائع ہوا تھا جس کے مطابق ایک پرائیویٹ اسکول کے ایتھلیٹس افیون استعمال کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ اس اسکینڈل کا مرکزی کردار اسکول کی ٹیم کا کوچ اور ٹیم میں شامل دو نوعمر کھلاڑی تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور وہ

زبان کی پکی

لڑکا۔ ''تمہاری عمر کیا ہے؟''

لڑکی۔ ''18 سال۔''

لڑکا۔ ''تم نے 3 سال پہلے بھی یہی بتائی تھی۔''

لڑکی۔ ''دیکھا...... لڑکیاں کتنی زبان کی پکی ہوتی ہیں۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

منشیات استعمال کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کی گرفتاری کے بعد بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا اور اس کاروبار کے پیچھے کوئی سرغنہ ہے جس کے کارندے نوجوانوں کو منشیات سپلائی کررہے ہیں اور لگتا ہے کہ نکولس کا ایک بیٹا بھی ان کا آلۂ کار بن گیا ہے لیکن وہ کون تھا۔ تھیویا جیکسن...... فی الحال میرے نزدیک اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ مجھے اس سے آگے کے بارے میں سوچنا تھا۔ میں نے نوٹوں کا بنڈل اٹھا کر ہاتھوں میں تولا۔ اس کا وزن کسی طرح بھی ایک پاؤنڈ سے کم نہیں تھا۔ ایک بار پھر میرے ضمیر نے مشورہ دیا۔ ''اسے یہیں چھوڑو اور چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ۔''

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اینا نے کہا تھا کہ اسے واپس آنے میں ایک گھنٹا لگ سکتا ہے۔ گویا ابھی چالیس منٹ باقی تھے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ٹریفک کم ہونے کی صورت میں وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے وقت سے پہلے واپس آجائے۔ اس لیے میرا وہاں مزید رکنا مناسب نہ تھا۔ میں نے نوٹوں کا بنڈل پتلون کی ایک جیب میں اور گولیوں کی تھیلی دوسری جیب میں رکھی۔ گٹار کو واپس الماری میں اس کی جگہ پر لٹکا دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آگیا۔ بیس منٹ بعد میں اپنے گھر میں کاؤچ پر بیٹھا ان گولیوں کو دیکھ رہا تھا اور میرے سامنے کافی کی میز پر نوٹوں کا بنڈل پڑا ہوا تھا جسے میں نے ابھی تک گننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے فی الحال اس معاملے کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ کرسمس کی چھٹیوں اور سالِ نو کی تقریبات کے شور میں میری آواز دب کر رہ جاتی۔

اس کے بعد میں نے ان لڑکوں کے میچوں کے شیڈول کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور جب اندازہ ہوگیا کہ وہاں پر ان کی ماں سے ٹکراؤ کا کوئی امکان نہیں تو میں بھی

ایک روز میچ دیکھنے چلا گیا۔ وہاں جاکر میں نے ایک لڑکے سے تھیو کے بارے میں پوچھا تو اس نے انگلی سے ایک نوعمر لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا۔ میں اس کی چابک دستی اور پھرتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نہ صرف یہ کہ مخالف ٹیم کی پوسٹ پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا بلکہ اپنی ٹیم کے ڈیفنس کی بھی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ اس کے برعکس اس کے بھائی جیکسن میں وہ جوش و جذبہ نظر نہیں آیا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان نظر آئے۔ انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا ذہن کسی اور طرف ہے۔

کھیل ختم ہونے کے بعد جب لڑکے واپس جانے کے لیے بس میں سوار ہونے لگے تو میں بھی پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیکسن بھی جمنازیم کے عقبی دروازے سے نمودار ہوا۔ اس نے موٹی اونی جیکٹ اور ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ اسے دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ وہی اس دھندے میں ملوث ہے۔ اسے دیکھ کر میں فوراً ہی کار سے باہر آگیا۔ اس وقت میں اس سے کم از کم پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کچھ دور چل کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے کچھ ساتھی اور جڑواں بھائی تھیو، بس میں سوار ہو رہے تھے جبکہ ٹیم کا کوچ ابھی تک جمنازیم سے باہر نہیں آیا تھا۔

میں نے اس کا نام لے کر آہستہ سے پکارا۔ ”جیکسن نکولس!“

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے آثار نمایاں تھے۔

”جیت مبارک ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں اپنے گٹار کی مرمت بھی کروا لینی چاہیے۔“

جیکسن نے سر گھما کر بس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم کس گٹار کی بات کر رہے ہو؟ میرے پاس کوئی گٹار نہیں ہے اور میں تمہیں بھی نہیں جانتا۔ تم کون ہو اور تمہیں میرے گٹار کی فکر کیوں پڑ گئی؟“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور تھوڑا سا نیچے کی جانب جھک کر اپنا کارڈ سڑک پر ڈال دیا۔ اس کی پشت پر میں نے ایک پیزا ہاؤس کا پتا لکھ دیا تھا جو اس کے اسکول کے قریب ہی تھا۔ نیچے ملاقات کا دن اور وقت بھی درج تھا۔ جب میں گاڑی چلاتا ہوا تھوڑا آگے نکل گیا تو میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا کہ جیکسن نے جھک کر وہ کارڈ اٹھا لیا تھا۔

مقررہ وقت پر میں اس پیزا ہاؤس کے ایک کیبن میں گرم چائے کے گھونٹ لے رہا تھا جب جیکسن مجھے پیزا ہاؤس میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سائیکل پر آیا تھا اور سخت سردی کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کیبن میں داخل ہوتے ہی اپنے سر سے کیپ اتاری اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟“

”ایک دوست......!“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا، کیا واقعی تم دوست ہو؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارا تعلق پولیس سے ہوگا۔“

”نہیں۔“

یہ سن کر لڑکا پُرسکون ہو گیا۔ اس نے قیمتی جیکٹ پہن رکھی تھی جو یقیناً کرسمس کے موقع پر اسے تحفے میں ملی ہوگی۔ میں نے دھیرے دھیرے اپنی کارروائی سے اسے آگاہ کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ابھی تک سردی سے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ جھلاتے ہوئے انداز میں بولا۔

”یہ سب کیا ہے مسٹر! تم میرے گھر میں داخل ہوئے اور میری چیزیں چرا کر لے گئے۔ میں تمہیں چور بھی نہیں سمجھ سکتا ورنہ مجھ سے ملنے کیوں آتے...... آخر تم کون ہو؟“

”تمہارا پڑوسی! اسی علاقے میں رہتا ہوں۔“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

”پڑوسی!“ اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ ”لیکن میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ گھر سے باہر بہت کم نکلنا ہوتا ہے۔ ویسے تمہاری ماں مجھے جانتی ہے۔“

”میری ماں!“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ گیا۔ اسی نے تمہیں میری جاسوسی کے لیے بھیجا ہوگا۔“

”نہیں۔ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اسی لیے وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”لیکن تم میرے گھر میں داخل ہوئے۔ میرے کمرے کی تلاشی لی اور میری چیزیں لے کر چلتے بنے۔ اس سے میں کیا سمجھوں؟“

میں آگے کی طرف جھکا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس اتنا وقت اور صبر ہے کہ میں تمہارے منہ سے جھڑنے والے یہ خوب صورت الفاظ سنتا رہوں۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ خاموشی سے میری بات سنو۔“

جیکسن کو بھی تاؤ آگیا اور وہ مضطرب ہوتے ہوئے

ممتا جیسی حدت لیے مئی 2016 کا دلنشیں پاکیزہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

نگہت سیما، دُرِ ثمن بلال اور **انجم انصار** کے سلسلے وار ناولوں کی نئی اقساط......

مدیحہ شاہد نے متعارف کرایا **پتھر کا دیس**......

نایاب جیلانی نے بکھیری خیالات کی کہکشاں...... **دیارِ صبح کے اجالوں میں**

ماں کا پیار...... ہماری مصنفات کا اظہار

رفاقت جاوید نے بڑی خوب صورتی سے کھوجا ایک **معمّا**

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور **اختر شجاعت** کے پُرنور قلم سے دل پزیر مضامین

شیرین حیدر، ثریا انجم، سمیرا یونس ہارون، شمیم فضل خالق، فرحین اظفر، ہاجرہ ریحان، شبینہ گل و دیگر ماہر مصنفات کی پُرکشش تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے مستقل سلسلے آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تمہیں سچ بولنا ہوگا۔ تم ابھی کہہ چکے ہو کہ پولیس والے نہیں ہو اور نہ ہی میری جاسوسی کر رہے ہو۔''
میں اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔
''شاید تم بھوکے ہو؟''
اس نے نیچے کی جانب دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ پتلون پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میں نے بہت دیر سے کچھ نہیں کھایا۔''
میں نے جیب سے اپنا پرس نکالا اور اسے پانچ ڈالر کا نوٹ دیتے ہوئے بولا۔ ''اپنے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر لوں گا۔''
جیکسن کیبن سے نکل کر پیزا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک برگر اور کاغذ کی پلیٹ تھی۔ اس نے مجھے بقیہ پیسے واپس کیے اور اطمینان سے بیٹھ کر برگر کھانے لگا۔
''تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''تم میری چیزیں لے کر چلے گئے جس کی وجہ سے میرے ساتھ یہ سلوک ہوا؟''
''کون تھا وہ؟ تمہارا سپلائر؟''
''ہاں، اس نے مجھے ہی اس کا ذمے دار ٹھہرایا۔ جب میں نے انہیں اس چوری کے بارے میں بتایا تو وہ مشتعل ہوگئے۔ انہوں نے مجھ سے نقصان پورا کرنے کے لیے کہا۔ اس کے لیے مجھے اپنی بہت سی چیزیں بیچنا پڑیں۔ میرا بینک اکاؤنٹ خالی ہوگیا اور کرسمس پر جو پیسے ملے تھے، وہ بھی چلے گئے۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم میرے گھر کیوں آئے تھے؟''
''یہ بتانا اتنا اہم نہیں۔ تم اپنی بات کرو۔ تمہارا حساب صاف ہوگیا یا نہیں۔''
جیکسن کی توجہ مجھ سے زیادہ کھانے پر تھی۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تو جیکسن نے میرا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔
''ایک منٹ۔''
میں اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس تمہارے مسخرے پن کے لیے وقت نہیں ہے۔ شاید تم اسے بھی ایک کھیل سمجھ رہے ہو اور بھول گئے ہو کہ تمہاری گولیاں اور پیسے اب بھی میرے پاس ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ یہ رقم کسی فلاحی ادارے کو عطیہ کر دوں اور تمہاری گولیاں کسی قریبی ٹوائلٹ میں بہا دوں۔''

''یہ مت بھولو کہ تم بھی میرے گھر میں داخل ہونے کا جرم کر چکے ہو۔''
''ٹھیک ہے کہ میں مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا، مجھ پر چوری کا الزام بھی لگ سکتا ہے لیکن جب پولیس کے سامنے یہ چیزیں رکھوں گا تو کس کا جرم زیادہ سنگین ہوگا...... میرا یا تمہارا؟ یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ تم دونوں بھائیوں کی عمر کتنی ہے؟''
''تھیو کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''
''میں نے تمہاری عمر پوچھی ہے؟''
''ہم اگلے مہینے سترہ سال کے ہو جائیں گے۔''
''تم نے اپنے آپ کو ایک بہت مشکل صورتِ حال میں پھنسا دیا ہے۔''
''تم بھی تو میرے گھر میں داخل ہونے کا جرم کر چکے ہو۔''
''بار بار اس کا ذکر مت کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری ماں کو بھی اس معاملے میں گھسیٹا جائے؟ میں اسے جانتا ہوں اور اسی لیے تمہاری بہتری کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری ماں بھی یہ سن کر ناراض ہوگی کہ میں اس کی غیر موجودگی میں تمہارے گھر میں داخل ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ پر کوئی اور الزام بھی لگا دے لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ تم منشیات کے دھندے میں ملوث ہو تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ شاید تمہاری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گی۔''
''میں میگوئل کے پاس چلا جاؤں گا۔''
''یہ غالباً تمہارے سپلائر کا نام ہے۔ ضرور جاؤ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اس نے ایک ذرا سی غلطی پر تمہارے چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ تم نے مجھے اس کا نام بتا دیا ہے تو اس بار وہ تم سے ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ تم مجھ پر بھروسا کرو۔ کیا تم واقعی اس دلدل سے نکلنا چاہتے ہو یا وہ منشیات فروش تمہارے لیے زیادہ اہم ہے؟''
''نہیں۔'' اس نے خوفزدہ انداز میں سر ہلایا۔
''میری طرف دیکھو۔ یقیناً تم نے مستقبل کے بارے میں کچھ خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔ کیا تم کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہو؟''
''ہاں لیکن شاید یہ اتنا آسان نہ ہو کیونکہ میرے ڈیڈی کا انتقال ہو چکا ہے۔''

"پھر تم صحیح راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے؟ اپنے باپ کی روح کو تکلیف مت پہنچاؤ اور یہ دھندا چھوڑ دو۔ اگر میگوئل یا کوئی اور تمہیں اپنی سرپرستی میں لے لیتا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا پوری طرح خیال رکھ سکے گا؟ تم عمر بھر کے لیے اس کے کارندے بن کر رہ جاؤ گے اور اس کے جال سے ساری عمر نہیں نکل سکو گے۔ ابھی تم دلدل کے کنارے پر ہو۔ آگے بڑھے تو اس میں دھنستے چلے جاؤ گے۔ شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہیں رک جاؤ شاید تمہاری قسمت مہربانی کرے اور میگوئل تمہیں بھول جائے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ مت سوچنا کہ تم خطرے سے باہر ہو گئے ہو۔"

"تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"کچھ نہیں...... لیکن اس کی غلطیوں سے ضرور فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔"

جیکسن نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا۔ "کیا اب بھی تم اس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "میگوئل نے مجھے مزید مال دینے سے انکار کر دیا ہے۔ شاید اسے مجھ پر بھروسا نہیں رہا۔ اس لیے اپنے آپ کو چھٹی پر سمجھ رہا ہوں۔"

"تم چھٹی پر نہیں ہو بلکہ نکال دیے گئے ہو۔"

یہ سن کر جیکسن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اسے اپنے نقصان کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ "مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم نے بچ بچا کر یہ کام کیا تھا۔ کبھی کسی سے ٹیلی فون یا انٹرنیٹ پر رابطہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ وہ لوگ بڑے محتاط ہیں اور اس طرح کاروبار نہیں کرتے۔"

"اب جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں، اس کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"مجھے میگوئل سے ملنا ہے۔ اس کا فون نمبر یا ایڈریس بتاؤ۔"

جیکسن کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہلنے لگا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ...... وہ......"

"پھر تمہیں ہی یہ کام کرنا ہوگا۔"

"کیسا کام؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ گولیاں اور پیسے اسے واپس کر دو۔"

"یہ اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میرے گھر سے یہ سامان چوری ہو گیا تھا۔ اب یہ چیزیں لے کر جاؤں گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا پھر میرا جو حشر ہوگا، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

میں حیران تھا کہ مجھے اس لڑکے کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے؟ گو کہ میں نے کبھی اس کے باپ کی عزت نہیں کی اور ماں کے ساتھ راتیں گزاریں لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے رک کا قرض اتار دینا چاہیے لیکن کیا مجھ میں اتنا حوصلہ اور ہمت تھی کہ اس مشکل کام میں ہاتھ ڈال سکوں؟

"تم مجھے میگوئل کا پتا بتاؤ ورنہ میں پولیس کو اطلاع دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

اگر میں یہ کہوں کہ وہ شہر کا بدترین علاقہ تھا تو غلط نہ ہوگا۔ میں اتنی گندی اور غلیظ آبادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں افریقا یا لاطینی امریکا کے کسی پس ماندہ ملک کے چھوٹے سے قصبے میں آ گیا ہوں۔ وہاں قدم قدم پر بڑے بڑے اسٹوریج ٹینک بنے ہوئے تھے جیسا کہ بندرگاہوں پر تیل کا ذخیرہ کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اینٹوں سے بنے ہوئے گوداموں کی قطار نظر آ رہی تھی جس کے اردگرد خاردار تاریں لگا دی گئی تھیں۔ اس کے اختتام پر بائیں جانب مڑتے ہی ناکارہ ٹائروں کا ڈھیر نظر آیا جس کے ساتھ ہی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس پر ایم اینڈ ایم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ اس کمپنی کا گودام تھا۔

میں نے اپنی گاڑی جس پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی وہاں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ میں بمشکل راستہ بناتا عمارت کے دروازے پر پہنچا جہاں شیشے میں سے اندر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ بظاہر یہ جگہ کوئی ورکشاپ معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں ہائیڈرولک لفٹ، چین بلاک اور بھاری قسم کے آلات نظر آ رہے تھے۔ مجھ سے پچاس فٹ کے فاصلے پر چھوٹے قد اور چوڑی چھاتی والا ایک اطالوی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس وقت کسی انجن پر کام کر رہا تھا۔ اس نے کپڑے سے ہاتھ صاف کیے اور میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"مجھے میگوئل سے ملنا ہے۔" میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اس وقت مصروف ہے۔" اس نے بے نیازی

سے جواب دیا۔
''لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا۔''
وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ وہ مصروف ہے۔ تم اسے بعد میں فون کر لینا بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ موسم بہار میں رابطہ کرنا۔''
''میں جس کام کے لیے آیا ہوں، اس کے لیے موسم بہار تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔''
''کیوں...... کیا تم درخت کاٹنے کا کام کرتے ہو لیکن ہمیں درختوں کی ضرورت نہیں۔ البتہ میرا بھائی یہ کام کرتا ہے۔ میں اس کا فون نمبر دے دیتا ہوں۔ تم اس سے بات کر لینا۔ وہ تمہیں اچھے پیسے دے سکتا ہے۔''
''میں درختوں کی بات نہیں کر رہا۔ مجھے صرف میگوئل سے ملنا ہے۔''
اس بھاری بھرکم شخص نے کندھے اچکائے۔ چند قدم پیچھے ہٹا اور میز پر پڑا ہوا ایک بڑا سا پیچ کس اٹھا لیا۔ میں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے واپس اپنی کار کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہسپانوی زبان میں دہاڑا، اس کی آواز سن کر ایک اور دبلے پتلے شخص نے ایک کونے سے اپنا سر باہر نکالا۔ اس کی گردن اور چہرے پر چھوٹے بڑے کئی ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ چوڑی چھاتی والے نے اس ہاتھ سے میری جانب اشارہ کیا جس میں اس نے پیچ کس پکڑ رکھا تھا۔ دونوں کے درمیان ہسپانوی زبان میں جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور وہ مجھے گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔
میں کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں کاغذ کا وہ تھیلا تھا جس میں نشہ آور گولیاں اور جیکسن کے پیسے رکھے ہوئے تھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ اس سارے جھگڑے سے اپنے آپ کو الگ کر کے چپکے سے واپس چلا جاؤں۔ منشیات کی گولیاں کسی گٹر میں بہا دوں اور پیسے اپنے استعمال میں لے آؤں لیکن شاید اب یہ ممکن نہیں تھا۔ میں ان لوگوں کی نظروں میں آ چکا تھا اور وہ مجھے اتنی آسانی سے نہ جانے دیتے۔ ویسے بھی میں اینا کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا تھا اور جیکسن کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے مجھے تھوڑی سی بہادری دکھانے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح میں اینا کی نظروں میں سرخرو ہو سکتا تھا۔
دس منٹ بعد ایک تیسرا شخص گیراج کے عقبی حصے سے نمودار ہوا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس نے سیاہ قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے آنکھوں پر چشمہ لگا رکھا تھا اور لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی کچھ کھا کر آیا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور جب اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے اس کے لہجے پر خاصی حیرت ہوئی۔ وہ بڑی صاف انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔
''صبح بخیر! میرا نام میگوئل ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کام کی تلاش میں آئے ہو۔ اچھی بات ہے گو کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہے لیکن ہم تم سے کاروباری بات چیت کر سکتے ہیں کیونکہ کاروبار تو سارا سال ہی چلتا رہتا ہے۔''
اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ پھر میں نے وہ تھیلا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ تمہارے لیے ہے؟''
''میرے لیے؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس میں کیا ہے؟''
''کھول کر دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چیزیں تمہاری ہی ہیں۔''
''میں تو سمجھا تھا کہ تم کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئے ہو۔'' وہ بے یقینی کے عالم میں بولا۔
''نہیں۔ میں صرف تمہیں یہ تھیلا دینے آیا تھا۔''
اس نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر وہ تھیلا لے لیا پھر اس نے پیچھے مڑ کر گیراج کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ اس تھیلے میں کیا ہے؟''
''گولیاں اور پیسے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ وہی سامان ہے جو جیکسن نکولس کے پاس سے غائب ہو گیا تھا۔''
اس کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور تھیلا کھول کر اس میں جھانکنے لگا پھر اس نے اپنا چشمہ سیدھا کیا اور بولا۔ ''یہ چیزیں تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟''
''غلطی میری ہے۔ اس میں جیکسن کا کوئی قصور نہیں۔ میں کسی کام کے سلسلے میں اس کے گھر گیا تھا تو اس کے کمرے سے یہ چیزیں میرے ہاتھ لگ گئیں لیکن جیکسن اب یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی وہ ابھی بچہ ہے۔''
''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں انہیں واپس لینا چاہوں گا؟''
اس کے لہجے کی سختی نے مجھے دہلا دیا اور میرے قدم زمین پر گڑ گئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر نیچے کیا اور مجھ پر نظریں گاڑ دیں جیسے مجھ سے جواب مانگ رہا ہو لیکن میں خاموش رہا اور جب اس نے تھیلا زمین پر پھینکا تو

میں بری طرح بوکھلا گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور گیراج کی دیواریں میرے گرد گھیرا تنگ کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جیسے میں ایک ڈبے میں بند ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس وقت مجھے لیزا اور جینی کا خیال آیا۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگیں جو میں اپنی زندگی میں کر چکا تھا۔ میں نے اینا کے ساتھ بدفعلی کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے بڑے گناہ کر چکا تھا۔ میں دنیا کو بتانا چاہ رہا تھا کہ ان سب واقعات پر مجھے کتنی شرمندگی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ موت کے وقت ہی آدمی کو خدا یاد آتا ہے۔

''تم جانتے ہو کہ یہ شہر کا بدترین علاقہ ہے۔'' اس کی بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''یہاں دن کی روشنی میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ تم یہ چیزیں لے کر یہاں آئے اور یہ تھیلا مجھے پکڑا دیا۔ اس طرح تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟''

''میں یہاں کچھ ثابت کرنے نہیں آیا۔''

''پھر یہ سب کیا ہے؟'' وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اس لڑکے کے باپ ہو یا کوئی سرپرست؟''

''نہیں۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔''

''مر گیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ''کب...... کس طرح؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ وہ مچھلی کا شکار کھیلنے الاسکا گیا تھا جہاں ایک ریچھ نے اس پر حملہ کیا اور وہ مر گیا۔''

''اوہ میرے خدا!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''اس کی موت کے بعد بہت کچھ بدل گیا ہے۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ جیکسن اب یہ کام نہیں کرنا چاہتا اور اس کی خواہش ہے کہ کالج میں داخلہ لے کر اپنی زندگی سنوارے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ معاملہ صرف میرے، تمہارے اور جیکسن تک ہی محدود رہے گا۔ میں یا جیکسن کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتے۔''

میگوئل نے وہ تھیلا دوبارہ اٹھا لیا۔ اس اثنا میں چوڑی چھاتی والا بھی واپس آ کر اس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں پیچ کس نہیں تھا۔ میگوئل نے تھیلا اسے پکڑایا اور ہسپانوی زبان میں اس سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ موٹے آدمی نے سر ہلایا اور تھیلا لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میگوئل بولا۔

''یہ آلڈو ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میں نے اس سے تمہاری کار کا نمبر نوٹ کرنے کے لیے کہا ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میرے ذہن میں ایک زوردار جھماکا ہوا۔ میں نے کپکپاتی کوکی آواز میں کہا۔ ''اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو۔'' میگوئل طنزیہ انداز میں بولا۔ ''لیکن آج کل ہر کوئی کسی نہ کسی وجہ سے پریشان رہتا ہے۔''

اس کے لفظوں میں جو دھمکی چھپی ہوئی تھی، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میگوئل نے کچھ دیر توقف کیا تاکہ میں اپنی حالت پر قابو پا سکوں پھر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''تم جا سکتے ہو۔ جیکسن سے کہہ دینا کہ مجھے اس کے باپ کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ اوہ میرے خدایا! جو کچھ تم نے بتایا وہ بہت ہی ہولناک ہے۔ اسے سن کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔''

میں نے نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ریچھ نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جو تلاش کے باوجود نہیں ملا۔''

وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''بے چارہ جیکسن! اتنی چھوٹی عمر میں اس کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ اس کی طرف سے بات کرنے آئے ہو۔ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ ورنہ کسی کی ہمت نہیں کہ ایسے جرأت کر سکے۔ اب تم جا سکتے ہو اور یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان کیا طے ہوا ہے۔ ورنہ جانتے ہو کہ یہ شہر کا بدترین علاقہ ہے۔''

میں دروازے کی طرف بڑھا لیکن میں نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ کار تک پہنچنے تک یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی کوئی گولی سنسناتی ہوئی آئے گی اور میرے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو جائے گی۔ گھر واپس آنے کے بعد مجھے دیر تک یقین نہیں آیا کہ میں شیر کی کچھار سے زندہ سلامت واپس آ گیا ہوں۔ میں خود یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی؟ شاید یہ سب کچھ میں نے اینا کے لیے ہی کیا تھا یا میں نے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو ماضی میں اینا کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی صورت میں مجھ سے سرزد ہوا تھا۔ مجھے کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے اس کے بیٹے کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

قسط:9

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان
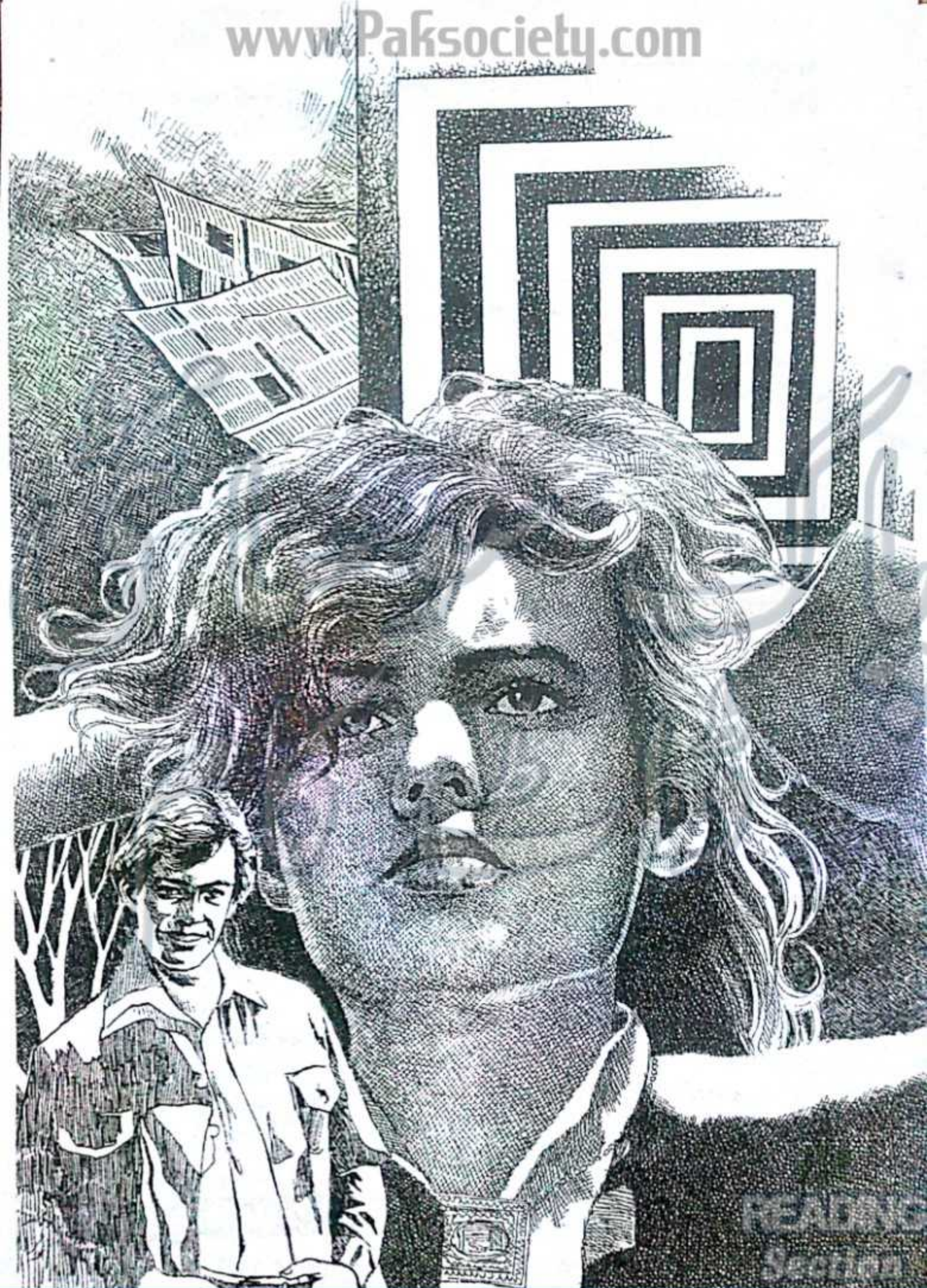
گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہوجائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کرسکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہوجاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جولیٹ کے گلے میں پڑا لاکٹ معمولی نہیں تھا کہ ربن کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ رہ پاتا۔ اس نے بمبئی جیسے شہر میں ایک عمر گزاری تھی اور یہاں کے بڑے بڑے دولت مندوں سے رابطے میں رہتا تھا۔ اس لیے اصل اور نقل میں فرق کرنا بھی خوب جانتا تھا۔ جولیٹ کے گلے میں موجود لاکٹ کو ایک نظر دیکھ کر ہی اس نے جان لیا تھا کہ وہ بہت قیمتی ہے۔ حقیقتاً اس نے اپنے جاننے والے سیٹھوں کی بیگمات کے پاس جو زیورات دیکھے تھے، یہ اسے ان سے بھی زیادہ قیمتی لگا تھا۔ ساتھ ہی اس نے جولیٹ کا گریز بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ شاید جلدی میں بھولے سے اس لاکٹ کو پہنے پہنے دروازے پر آ گئی تھی اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اسے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ ربن کے لیے اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ جولیٹ کے پاس ایسا قیمتی لاکٹ کہاں سے آیا اور نہ ہی وہ اس سے اس سلسلے میں کوئی سوال کرسکتا تھا کہ مبادا اسے گمان گزرے کہ اڈے کا دادا اس کی ملکیت پر بری نظر رکھتا ہے۔ وہ لاکھ اصول پسند اور دیالو مزاج کا بندہ تھا لیکن تھا تو ایک دادا ہی نا جس پر اعتبار کرنا لوگوں کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ بڑا اچھا بدنام برا والی بات تھی چنانچہ اس نے جولیٹ سے کوئی بھی استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا اور نرمی سے بولا۔

''اپن تجھے تیرے باپ کا پُرسہ دینے آئے ہیں۔''
ایک جانب ہوجانے والا جانو بھی ربن کی پشت پر آ کھڑا ہوا کہ اگر جولیٹ جھجک محسوس کر رہی ہے تو اسے دیکھ کر مطمئن

ہوجائے۔ اس نے جولیٹ کو بہن کہا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ جولیٹ اس کی زبان کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر بہت اعتماد کرنے لگی ہے۔

''تھینک یو سوجچ۔ آئیں اندر آجائیں۔'' جولیٹ نے ربن کے پیچھے کھڑے جانی کو ایک نظر دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر ان لوگوں کو اندر آنے کی راہ دی۔ ان لوگوں کے اندر آنے کے بعد اس نے بیرونی دروازہ بند نہیں کیا اور انہیں اپنے ساتھ اندر کمرے میں لے جانے کے بجائے باہر برآمدے میں میز کے گرد رکھی کرسیوں پر ہی بیٹھنے کی دعوت دی۔ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد بہت محتاط ہوگئی تھی پھر اہلِ محلہ کی فطرت سے بھی واقف تھی۔ وہ لوگ پُرخلوص ہونے کے باوجود کھوجی فطرت کے مالک تھے اور اسے اندازہ تھا کہ ربن اور جانی کو یہاں آتا دیکھنے والوں نے اب تک یہ خبر دوسروں کو بھی پہنچانی شروع کردی ہوگی، ساتھ ہی اپنے اپنے طور پر قیاس آرائیاں بھی کی جارہی ہوں گی کہ ربن دادا کیوں اس کے گھر آیا ہے۔ ان قیاس آرائیوں میں سے کوئی سوچ اس کے کردار پر شک کرنے والی نہ ہو اس لیے اس نے ان دونوں کو بالکل سامنے ہی بٹھایا تھا اور ساتھ ہی بیرونی دروازہ بھی کھلا رکھا تھا۔

''آپ لوگ چائے پئیں گے یا سوڈا منگواؤں؟'' ان دونوں کے بیٹھ چکنے کے بعد وہ خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور آداب میزبانی نبھائے۔

''کچھ نہیں۔'' ربن نے زبان کے ساتھ ہی ہاتھ بلند کرکے اشارے سے بھی انکار کیا اور مزید بولا۔ ''اپن بس گھڑی بھر کے لیے ہی تیرے پاس آئے ہیں۔ اپنے لیے تو بیٹی جیسی ہے پر سمجھتے ہیں کہ بھونکنے والے کتے ہر ایک پر بھونکتے ہیں۔ اپنی تو خیر ہے اپنا جا تی ادھر ٹھہرنا تیرے کو بھاری پڑے گا۔'' وہ ایک جہاندیدہ آدمی تھا جو سب سمجھتا تھا۔ جولیٹ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن اس پر ایک متشکرانہ نظر ضرور ڈالی کہ وہ اس کے مسئلے کو سمجھ رہا ہے۔ ربن کے رویے نے اسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے میں بھی مدد دی تھی۔ وہ جس طرح بے نیاز نظر آرہا تھا، اس سے اسے یہی گمان ہونے لگا تھا کہ شاید ربن نے اس کے گلے میں پڑا لاکٹ دیکھا ہی نہیں تھا یا اگر دیکھا بھی تھا تو اس کی گراں قدری کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

''اپنے کو تیرے باپ جوزف کے مرنے کا بہت دکھ ہوا۔ اپن اس سے بمبئی سے باہر تھا۔ تیرے کو شاید معلوم پڑا ہو کہ اپنا شہزادہ فاروق بیمار ہے اور ڈاکٹر نے اسے علاج کے واسطے دوسری جگہ رکھنے کو بولا ہے اس لیے اپن اسے شملہ چھوڑنے کے واسطے گیا تھا۔ ادھر ہی اپنے کو تیرے باپ کے بارے میں خبر مل گیا تھا۔ اپنے کو اس اچھے آدمی کے جانے کا بڑا دکھ ہوا۔ پر دیری سویری ہر اچھے برے کو لوٹنے کا تو ہے ہی۔ پیچھے والے کے پاس صبر کرنے کے سوا کیا چارہ ہوتا ہے۔ اپن تیرے کو صبر کی نصیحت کرنے نہیں آئے ہیں بس اتنا بتانے آئے ہیں کہ جب تک اپن جندہ ہے تو خود کو بے باپ کا نہ سمجھنا۔ تیری ایک پکار پر اپن تیرے ہر اچھے برے میں تیرے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اپن جانتا ہے کہ تیرے لیے ماں باپ کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا پر تو یہ جان رکھ کہ اپن تیرے لیے باپ کا ہر فرض ادا کرنے کو راضی ہیں۔'' ربن کے سیدھے سادے کسی قدر اکھڑ لہجے میں ادا کیے گئے الفاظ نے جولیٹ کے دل پر اثر کیا اور جذبات سے آنکھیں بھیگنے لگیں لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور باوقار لہجے میں بولی۔

''آپ کے اتنا خیال کرنے کا شکریہ۔ گاڈ کی مہربانی سے ابھی تو مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو ضرور آپ سے مدد مانگوں گی۔''

''تو نے اپن کو اپنا سمجھ کر ایسا کیا تو اپنے کو بہت اچھا لگے گا۔'' ربن کا دل چاہتا تھا کہ اس سے اس کے اغوا کے معاملے پر ایک بار پھر بات کرنے کی کوشش کرے لیکن اس کا تجربہ کہتا تھا کہ بات کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ پے درپے بدترین حادثات سے دوچار ہونے والی جولیٹ نے خود پر خول چڑھا لیا ہے اور وہ اپنی مرضی کے بغیر کسی سے کچھ بھی نہیں کہے گی۔

''آپ بتائیں، مسٹر فاروق کی طبیعت اب کیسی ہے۔ میں انہیں دیکھنے اسپتال گئی تھی لیکن پتا چلا کہ میرے پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ان کی چھٹی ہوگئی ہے اور آپ لوگ انہیں کسی ہل اسٹیشن لے جانے کے لیے روانہ ہوگئے ہیں۔'' ربن کا اندازہ درست تھا۔ اس نے اپنی ذات کے حوالے سے مزید گفتگو جاری رکھنا گوارا نہیں کیا اور موضوع بدل ڈالا۔

''شیر مافق جوان ہے۔ جلدی ٹھیک ہوجائے گا۔ تو بھی اس کے لیے دعا کرنا۔ تیری اس سے اسپتال میں

ملاقات ہو جاتی تو دیکھتی کہ وہ تیرے آنے سے کتنا خوش ہوتا۔'' ربن اسے فاروق کی طبیعت کے بارے میں جواب دیتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ گیا جس نے جولیٹ کو چونکا دیا۔ اس نے فاروق کی خود پر پڑنے والی نگاہیں دیکھی تھیں اور بہ حیثیت عورت ان نگاہوں کی زبان بھی سمجھ سکتی تھی لیکن ربن کے جملے سے اسے گمان ہوا تھا کہ شاید وہ بھی فاروق کا واقف حال ہے۔ اس نے ربن کے چہرے کو غور سے دیکھ کر جانچنے کی کوشش کی کہ واقعی اس کی بات کوئی معنویت رکھتی تھی یا وہ محض رواداری میں ادا کیا گیا ایک رسمی جملہ تھا۔ ربن نے اس کا چونکنا اور پھر جانچتی نگاہوں کو شدت سے محسوس کیا لیکن اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔ جولیٹ کی نگاہیں مایوس ہو کر اس کے چہرے سے پلٹ گئیں۔ وہ جو بڑے بڑے زیرک نگاہ رکھنے والوں کو اپنا بھید نہیں دیتا تھا بھلا اس کل کی لڑکی کے آگے کیا کھلتا۔

''اچھا تو بٹیا پھر اپن چلتے ہیں۔ تو اپنے تھوڑے کہے کو بہت سمجھنا اور کبھی خود کو غیر نہ سمجھنا۔ اپن اڈے پر نہ بھی ہوئے تو اپنے سارے لونڈے تیرے بھائی ہی ہیں۔'' ربن اپنے کہنے کے مطابق زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھا اور کام کی بات کر کے فوراً کھڑا ہو گیا۔

''تھینک یو دادا آپ نے میری اتنی پروا کی۔ مجھ پر تو پہلے ہی آپ کا بڑا احسان ہے۔ آپ کے پیچھے برادر جانی اور دوسرے لوگوں نے بڑا خیال کیا۔ مجھے تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ محلے والوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے ہی سب کچھ سنبھالا۔'' جولیٹ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تہِ دل سے شکریہ ادا کیا کیونکہ یہ تو حقیقت تھی کہ مشکل گھڑی میں اڈے والوں نے بڑا ساتھ دیا تھا۔

''احسان وحسان کچھ نہیں، محلے دار ہونے کے ناتے اپن کا فرض بنتا تھا خیال کرنا پھر تو تو اپن کی بٹیا ہے۔ بیٹیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے۔'' ربن نے پل بھر کے لیے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ جانی نے بھی اس کی پیروی کی۔ وہ ربن کے حکم پر اس کے ساتھ آیا تھا اور پوری گفتگو میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی تھی۔ دہلیز پر کھڑی جولیٹ نے جانی کا احترام بھرا وہ رویہ بھی محسوس کیا تھا اور ربن کی اپنے لیے خصوصی شفقت بھی...... اور وہ حیران تھی کہ یہ سب کیا ہے؟ ویسے تو ربن دادا کا یہ تاثر پہلے بھی سامنے آیا تھا کہ وہ غنڈا ہونے کے باوجود ایک مہربان اور خیال رکھنے والا شخص ہے۔ اپنے لیے اس کی شفقت اور مہربانی میں اس نے کچھ الگ ہی بات محسوس کی تھی۔ اس خصوصی رویے کا محرک کیا تھا......؟ کیا فاروق......؟ وہ اس بات پر زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ فاروق تو پہلے بھی اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا اور اب زندگی جس نہج پر چل پڑی تھی، وہاں کومل جذبوں کی پذیرائی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

آلتی پالتی مار کر بیٹھے فاروق نے چہرے کو ذرا اوپر کی طرف اٹھا رکھا تھا اور آنکھیں بند کیے شملہ کی ستھری فضا میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس عمل کے دوران اس نے اپنے ذہن کو ایک نکتے پر مرتکز کر رکھا تھا اس کے باوجود اپنی تیز حسیات کے باعث اپنے سوا وہاں کسی دوسرے کی موجودگی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ کسی کی موجودگی کے احساس کے باوجود اس نے اپنی مشق جاری رکھی کہ اتنا تو اندازہ تھا کہ وہاں موجود شخص کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔ بھمایہ سیٹھ کی یہ رہائش گاہ خاصی محفوظ تھی اور باہر سے کسی بھی شخص کے لیے اندر آنا اتنا آسان نہیں تھا جب ہی تو سیٹھ نے اکیلے کرشن پر یہ جگہ چھوڑ رکھی تھی اور وہ ایک جز وقتی ملازمہ کی مدد سے یہاں کا انتظام وانصرام بخوبی سنبھالے ہوئے تھا۔ باہر کے کام کاج ڈرائیور نمٹا دیتا تھا۔ فاروق اگرچہ اپنی خواہش کے برخلاف یہاں آیا تھا اس کے باوجود اسے بھمایہ سیٹھ کی رہائش گاہ اور شملہ دونوں پسند آئے تھے۔ بمبئی اور یہاں کی فضا میں واضح فرق محسوس ہوتا تھا۔ بلند عمارتوں، تنگ گلیوں اور دھوئیں نے بمبئی کی فضا کو آلودہ کر رکھا تھا جبکہ یہاں جو ہوا تھی وہ بہت خالص اور نکھری ہوئی تھی۔ یہاں کی ہوا میں سانس لے کر وہ خود کو اندر تک تروتازہ محسوس کرتا تھا۔ صبح کی ورزش ایک عرصے سے اس کے معمولات کا حصہ تھی لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ یہاں ورزش کرنے کا الگ ہی مزہ تھا۔ پھیپھڑوں کو گویا چھنی ہوئی ہر طرح کی آلودگی سے پاک آکسیجن ملتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بہت لطف اندوز ہوتے ہوئے سانس کی مشق کر رہا تھا۔ کسی کے اپنے قریب ہی موجودگی کے احساس کے باوجود اس نے اطمینان سے یہ عمل مکمل کیا اور آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ بالکل سامنے ہی بملا نارنجی رنگ کے کرتے پاجامے کے ساتھ چنا ہوا نارنجی دوپٹا گلے میں ڈالے کھڑی تھی۔ فاروق کو اتنا شوخ رنگ کبھی بھی مرغوب نہیں رہا تھا لیکن وہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ شملہ کے شفاف آسمان اور گہرے سبزے کے پیش منظر میں کھڑی بملا پر یہ رنگ جچ رہا تھا۔ اس کی گندمی رنگت میں عجیب سی جاذبیت تھی۔ وہ عموماً خاصے شوخ رنگ پہنا کرتی تھی اور یہ رنگ اس کی شخصیت میں ایسے جذب ہوتے تھے

که برے لگنے کے بجائے آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔

''گڈ مارننگ!'' فاروق کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس نے مسکراتے لبوں کے ساتھ کہا۔ اس وقت اس نے قطعی میک اپ نہیں کر رکھا تھا اور دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ ہونٹوں کی قدرتی گلابی رنگت پر وہ مسکراہٹ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

''گڈ مارننگ...... آج آپ بہت جلدی جاگ گئیں۔'' فاروق بھی جواباً مسکرایا۔

''میں موڈی ہوں لیکن یہ موڈی پن چھٹیوں میں ہی چلتا ہے۔ روٹین میں تو ٹائم پر کالج پہنچنے کے لیے جلدی جاگنا پڑتا ہے۔'' اس نے فاروق کی بات کا جواب دیا۔

اب وہ دونوں وہاں رکھی کرسیوں پر آبیٹھے تھے۔ ان کرسیوں پر بیٹھ کر بلندی سے بڑے مزے سے دور تک کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور وہاں جس قدر خوب صورتی پھیلی ہوئی تھی آدمی کی نظر لازماً اطراف میں بھٹکتی رہتی تھی۔ وہ دونوں بھی باتیں کرتے ہوئے منظر پر نظر ڈالنا نہیں بھولتے تھے۔

''آپ کو کالج میں ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے فادر کی اتنی بڑی جائداد ہے اور آپ ہیں بھی ان کی اکلوتی وارث۔ چاہیں تو مزے سے ساری زندگی بیٹھ کر کھاسکتی ہیں۔''

''لیکن کھانا نہیں چاہتی یا یوں سمجھ لیں کہ میں خود کو ان کا محتاج بنا کر نہیں رکھنا چاہتی۔ کالج کی اس چھوٹی سی نوکری نے اس وقت میرا بڑا ساتھ دیا تھا جب وہ اپنی بے شمار دولت میں سے مجھے ایک دھیلا بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پسند کی شادی کو انہوں نے میرے لیے آزمائش بنا دیا تھا لیکن میں نے بھی ہار نہیں مانی اور انہیں اس آزمائش میں پورا اتر کر دکھایا۔ اب ان کی ناراضگی کا کارن ختم ہوگیا ہے لیکن میں اپنی جاب چھوڑنے کی غلطی نہیں کرسکتی۔ ان کا کچھ پتا نہیں کہ کب دوبارہ موڈ بگڑ جائے اور وہ مجھے پائی پائی کا محتاج بنادیں اس لیے اچھا ہے کہ میں جاب کرتی رہوں۔ ویسے بھی میں اپنی جاب سے خوش ہوں۔ مجھے پڑھانے میں مزہ آتا ہے اور جاب کی وجہ سے بہت سارے فرینڈز بھی ملے ہوئے ہیں ورنہ ڈیڈی کے شیش محل میں تو میں تنہائی سے ہی گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گی۔''

فاروق کے تبصرے کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے باپ سے خاصی نفا ہے۔ فاروق کو اس کی شادی کے قصے کا علم تھا۔ بھاٹیہ نے خود بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے منوہر سے کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی مرضی سے کسی چھوٹے سرکاری افسر کا انتخاب کرلیا۔ بعد میں اس کا شوہر ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تو بھاٹیہ نے دوبارہ اسے بھتیجے سے بیاہنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر بھی راضی نہیں ہوئی۔ آخرکار بھاٹیہ پر بھتیجے کی حقیقت کھل گئی کہ وہ اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے چکر میں ہے۔ بملا سے شادی میں ناکامی کے بعد اس نے بھاٹیہ کو ہلاک کرنے کی سازشیں کرنا شروع کردی تھیں۔ بھاٹیہ کو اپنی ایک ٹانگ گنوانے کے بعد بھتیجے کی حقیقت کا علم ہوگیا۔ بعد میں اس نے ربن کے ذریعے اپنے اس موذی بھتیجے سے نجات حاصل کرلی۔ منوہر کا انجام فاروق کے اسپتال میں قیام کے عرصے میں ہی ہوا تھا یوں یہ زیادہ پرانی بات نہیں تھی اور یقیناً بھاٹیہ کو موقع نہیں ملا تھا کہ روٹھی بیٹی کو منا پاتا چنانچہ وہ ہنوز باپ سے ناراض نظر آرہی تھی۔

بھاٹیہ کے پسندیدہ شخص نہ ہونے کے باوجود فاروق کو بملا کی اس سے ناراضی مناسب معلوم نہیں ہوئی۔ اسے علم تھا کہ اس ناراضی کا نقصان بھاٹیہ سے زیادہ بملا کو ہوگا۔ ماں باپ سے ناراض ہوکر الگ ہوجانے والی اولاد کی مثال درخت کی شاخ سے جھڑے پتے کی سی ہوتی ہے۔ ہوائیں اس ٹوٹے پتے کو اپنے ساتھ کہاں اڑا لے جائیں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ بملا بچی نہیں تھی۔ سمجھدار، باشعور اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی لیکن اس معاشرے میں تنہا عورت کی کیا حیثیت ہوتی ہے، اس سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔ تنہا عورت کو تو لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح دانت نکوس نکوس کر دیکھتے ہیں۔ جب تک بملا کا شوہر موجود تھا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اب اسے اپنے باپ کی پشت پناہی کی ضرورت تھی خاص طور پر اپنے لائف اسٹائل کی وجہ سے بھی۔ اس نے ہندو معاشرے کی روایت کے برخلاف کسی ودھوا کا روپ دھارنے سے انکار کردیا تھا اور اس حوالے سے یقیناً اس پر انگلیاں اٹھتی ہوں گی۔ ایک واقعہ تو یہیں شملہ میں پیش آیا تھا اور ایک واقف کار خاتون نے جاکھو ہل والے مندر میں بملا کو اس کے حلیے کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ بملا کو اگر اپنے بارسوخ اور دولت مند باپ کی پشت پناہی حاصل رہتی تو تنقید کرنے والے پیچھے پیچھے زبانوں کے جوہر دکھانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ بھاٹیہ جیسے طاقتور آدمی کی بیٹی کے خلاف براہ راست کچھ کر پاتے۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر اس نے بملا کو سمجھانے کا ارادہ کیا۔ اس کے گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل کرشن ٹرے میں جوس سے بھرا جگ اور دو گلاس رکھ

کر لے آیا۔ کیتھرائن کی ہدایت کے مطابق وہ فاروق کو صبح کے وقت جوس پیش کیا کرتا تھا۔ آج بملا کی یہاں موجودگی کے باعث دو گلاس لے آیا تھا۔ وہ ٹرے میز پر رکھنے کے بعد واپس پلٹ گیا تو فاروق نے گفتگو کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ بملا جگ سے گلاسوں میں جوس انڈیل رہی تھی۔ فاروق ذرا سا گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''ہوسکتا ہے آپ اپنے حساب سے اپنی سوچ میں درست ہوں لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے والد اپنے عمل میں بالکل غلط بھی نہیں تھے۔ ہمارے ہاں والدین اپنی اولاد کی شادیاں اپنی پسند سے کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں اولادوں میں بھی خصوصاً بیٹی کی من مانی کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کے کیس میں بھی ایسا ہی ہوا اور جواب میں آپ کے والد کا ردِعمل بالکل فطری بھی تھا۔ آپ نے اپنے لیے جس شخص کا انتخاب کیا وہ ان کے اسٹیٹس سے میچ کرتا ہوتا تو شاید پھر بھی بات بن جاتی لیکن ایک طرف آپ کا انتخاب ان کے حساب سے غلط تھا تو دوسری طرف فطری طور پر ان کا رجحان بھتیجا ہونے کے ناتے منوہر کی طرف زیادہ تھا۔ آپ منوہر کو ناپسند کرتی تھیں اور یقیناً اپنے عمل میں درست تھیں لیکن بھتیجے کی فطری محبت میں آپ کے والد نے بروقت اس کی خامیوں کو نہیں بھانپا۔ بعد میں انہیں اس کے کردار کا علم ہوا تو وہ اس سے سخت خفا ہوگئے۔ بہرحال اب تو وہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں بات کرنا بے کار ہے اور اہمیت اس بات کی ہے کہ اب آپ اپنے والد سے اختلافات ختم کردیں کیونکہ اب آپ کے درمیان موجود وجۂ تنازع ہی باقی نہیں رہی۔''

''لگتا ہے آپ کو ہمارے گھریلو معاملات سے خاصی واقفیت حاصل ہے۔'' اس نے فاروق کو جوس کا گلاس تھماتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھا۔

''محض اتفاقاً'' فاروق نے جوس کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا پھر اسے بتانے لگا کہ کیسے اسپتال میں قیام کے دوران منوہر ہی کی وجہ سے وہ بھاٹیہ سیٹھ سے متعارف ہوئے۔ منوہر نے اس رات ڈیوٹی پر موجود کیتھرائن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اگر فاروق بروقت وہاں نہ پہنچتا تو منوہر اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہوجاتا۔ وہ اتنا گھٹیا آدمی تھا کہ اپنے ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے بیمار چچا بھاٹیہ کے کمرے کا انتخاب کیا تھا اور بھاٹیہ کی مداخلت سے بچنے کے لیے اسے اس کے بستر پر باندھ کر ڈال دیا تھا۔ یوں بھی ایک ٹانگ سے معذور، بیمار بھاٹیہ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ بہرحال وہ منوہر کی اس حرکت پر اس سے سخت خفا ہوا تھا اور اگلے ہی دن اس نے اپنے وکیل کو بلا کر اپنی وصیت میں بھی تبدیلی کروائی تھی۔ یہ تو اتفاق ہی ہوا کہ منوہر ہلاک کردیا گیا اور بھاٹیہ کی ٹینشن ختم ہوئی کیونکہ بھاٹیہ کو شک تھا کہ وہ اس پر اور بملا پر قاتلانہ حملے کروانے کا بھی ذمے دار ہے لیکن واضح ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ منوہر کے خلاف کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھاسکا تھا۔

''لڑکیوں کے معاملے میں منوہر کے کریکٹر کی مجھے پہلے سے خبر ہے اور ایسا شخص باقی بھی ہر جرم کرسکتا ہے۔ ڈیڈی کو پورا وشواس ہوگا کہ منوہر ہی نے ہم پر قاتلانہ حملے کروائے تھے جب ہی تو وہ زیادہ دن اس دھرتی کے اوپر زندہ نہیں رہ سکا۔'' اس کی زبانی پوری بات سننے کے بعد بملا نے جو تبصرہ کیا، اسے سن کر فاروق تھرا اٹھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ بلا ارادہ ہی بملا سے پوچھ بیٹھا۔

''مطلب کو جانے دیجیے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے کبھی بھی ڈیڈی کے کسی مخالف کو زیادہ عرصے آزادی سے جیتے نہیں دیکھا۔'' اس کی بے نیازی سے کہے جملے کا مطلب بالکل واضح تھا۔ وہ یقین رکھتی تھی کہ منوہر کی ہلاکت میں خود بھاٹیہ کا ہاتھ ہے اور فاروق بخوبی جانتا تھا کہ وہ اپنے اندازے میں بالکل درست ہے۔ بھاٹیہ نے یہ کام ربن کے ذریعے ہی تو کروایا تھا۔

''آپ اتنے پریشان کیوں ہورہے ہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کس کے ساتھ کیا کرسکتے ہیں، میں اچھی طرح اندازہ لگاسکتی ہوں۔ منوہر کی موت کی اطلاع ملنے پر ہی مجھے شک ہوگیا تھا اور اب آپ کی زبانی حالات کو جان کر پورا وشواس ہوگیا ہے کہ یہ ڈیڈی ہی کا کام ہے۔'' فاروق کی پریشان صورت دیکھ کر اس نے مزے سے وضاحت کی اور آرام سے اپنے گلاس میں موجود جوس کو گھونٹ گھونٹ کرکے پینے لگی۔

''تو کیا اپنے پتی کی موت کے لیے بھی آپ اپنے ڈیڈی پر......'' فاروق نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

''نہیں، وہ بالکل الگ معاملہ تھا۔ ڈیڈی نے میری شادی کو پسند نہیں کیا تھا لیکن میری پسند کو دیکھتے ہوئے ہمیں ایک چانس ضرور دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ دولت کے لالچ میں مجھ سے شادی کررہا ہوگا تو مجھے عاق کردینے کے اعلان پر پیچھے ہٹ جائے گا لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا اور بیاہ کے

بعد بھی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تو وہ آہستہ آہستہ اس سے انسپائر ہونے لگے۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور جی جاتا تو ہو سکتا تھا کہ ڈیڈی اسے بزنس میں شامل کر لیتے لیکن اس کی قسمت میں یہ سب نہیں لکھا تھا۔''

بملا نے اس کی بات کی مکمل تردید کی۔ اس لمحے فاروق نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اپنے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا انداز بالکل سپاٹ تھا اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ اپنے محبوب شوہر کا تذکرہ کر رہی ہو۔ اپنے اس احساس کا اس نے بملا کے سامنے اظہار نہیں کیا اور یونہی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''قسمت آدمی کو کیا کیا کھیل دکھاتی ہے۔ ایک منوہر تھا جسے سیٹھ صاحب دل سے چاہتے تھے اور بیٹی سمیت اپنا سب کچھ سونپنے کے لیے تیار تھے لیکن منوہر نے اپنی حرکتوں سے نا صرف اپنا مقام گنوایا بلکہ زندگی بھی گنوا بیٹھا دوسری طرف آپ کے پتی تھے جنھوں نے بنا کسی لالچ کے آپ سے محبت کی اور وقت کے ساتھ ساتھ سیٹھ صاحب کے دل میں بھی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بس دو گام پر منزل تھی وہی والا معاملہ تھا ان کے ساتھ لیکن دیکھیے کیا تماشا ہوا کہ وہ بھی سسر کی دولت کا عیش و آرام نہیں اٹھا سکے۔ آدمی کا نصیب ساتھ نہ دے تو اس کی اچھائی اور برائی دونوں ہی ہار جاتی ہیں لیکن آپ کے پتی بہرحال خوش قسمت تھے کہ دولت نہ سہی آپ اور آپ کے ڈیڈی کا دل ضرور جیتنے میں کامیاب رہے۔ آدمی کو بھلا اس سے بڑھ کر کیا چاہیے ہوتا ہے۔ دولت تو آنی جانی چیز ہے اور بے بھروسا زندگی کے لیے اس کے ڈھیر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

''یعنی آپ کو پیسے کے حصول سے کوئی دلچسپی نہیں؟'' بملا نے اس کی گفتگو میں دلچسپی لی۔

''مجھے زندگی میں کبھی پیسے کی تنگی نہیں رہی۔ جب جو خواہش کی پوری ہوئی اس لیے شاید میں اس سوال کا زیادہ بہتر جواب نہ دے سکوں ہاں البتہ اپنے مزاج کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ کسی بھی شے کا بہت زیادہ شوق نہیں رکھتا۔ جو کھانے کو ملے کھا لیتا ہوں۔ لباس کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے کہ جو گولو نے نکال کر تیار کر دیا وہی پہن لیتا ہوں لیکن بات پھر وہی ہے کہ مجھے کھانے پینے اور پہننے کو ہمیشہ عمدہ چیزیں ہی میسر رہی ہیں اس لیے میں اس تنگی یا خواہش کو محسوس نہیں کر سکتا جو سب کچھ میسر نہ ہونے کی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے اور دولت کے حصول کے لیے بھاگتا ہے۔'' اس نے نہایت دھیمے لہجے میں اپنے بارے میں بتایا۔ بملا دلچسپی سے اس کا جواب سنتی رہی پھر شاید کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

''آپ نے اب تک اپنا مکمل تعارف نہیں کروایا۔ میرا مطلب ہے فیملی بیک گراؤنڈ اور سورس آف انکم وغیرہ۔''

''اتنا سب کچھ جان کر کیا کیجیے گا۔ اتنی معلومات تو وہاں حاصل کی جاتی ہیں جہاں کوئی رشتے داری قائم کرنی ہو۔ ہمارا آپ کا تعلق تو بس یہیں تک ہے۔ آپ چھٹیاں گزار کر اپنی منزل پر روانہ ہو جائیں گی اور مجھے بھی ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے پھر کہاں دوبارہ آپ کا اور ہمارا ملنا ہوگا۔'' فاروق نے پہلو بچانے کی کوشش کی۔

''آپ ڈیڈی کے جاننے والوں میں سے ہیں تو دوبارہ ملنا تو ہو سکتا ہے۔'' بملا نے جھٹ دلیل دی۔

''تو پھر آپ اپنے ڈیڈی سے ہی ہمارے بارے میں پوچھیے گا اور طے کیجیے گا کہ دوبارہ ہم سے ملنا بھی ہے یا نہیں۔'' فاروق نے ایک بار پھر پہلو بچایا۔

''چلیے آپ کے اس مشورے کو یاد رکھیں گے لیکن ابھی تو ہم دوست ہی ہیں اور اس کنڈیشنل فرینڈشپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ آج آپ کی کیا مصروفیت ہے؟ سسٹر کیتھرائن سے آج آپ کو باہر نکلنے کی پرمیشن ملے گی یا نہیں؟ دیکھنے میں تو آپ مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں لیکن سسٹر کی پرمیشن کے بغیر میں آپ کو باہر لے جانے کا رسک نہیں لے سکتی۔ اس دن تو آپ نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں خود کو آپ کی حالت کے لیے دوشی (مجرم) فیل کر رہی تھی۔ میرے کہنے پر ہی آپ اتنی بلندی پر گئے تھے اور آپ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔''

وہ جاکھو بل جانے اور وہاں جا کر فاروق کی طبیعت خراب ہونے کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔ فاروق اس کی بات سن کر ہنسا اور ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

''آپ خوامخواہ اتنا محسوس کر رہی ہیں۔ طبیعت کا کیا ہے، کبھی بھی خراب ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے مجھے شملہ اس لیے تو نہیں بھیجا کہ اس شاندار مکان میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہاں پر گھوموں گا پھروں گا تب ہی تو یہاں کی فضا کا اصل فائدہ اٹھا سکوں گا۔ آپ بس یہ بتائیے کہ کہاں کا پروگرام ہے؟''

''کرائسٹ چرچ تک جانے کا ارادہ ہے۔ آرام سے موٹر گاڑی میں پہنچ جائیں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

بملا نے اسے بتایا تو وہ ایک بار پھر ہنس دیا اور شگفتگی

سے بولا۔ ''آپ تو میرے لیے یوں پریشان ہو رہی ہیں جیسے میں شیشے کا بنا ہوا ہوں اور ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جاؤں گا۔''

''آپ بے شک شیشے کے نہیں بنے ہوئے لیکن جانے کیوں آپ سے مل کر یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ کسی شیش محل کے باسی ہیں اور آپ کو شہزادوں کا سا پروٹوکول دینا آپ کا حق بنتا ہے۔'' اس نے اتنی بے ساختگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ فاروق پل بھر کے لیے گنگ رہ گیا۔ اس کا تعلق جہاں سے تھا، وہ جگہ شیش محل سے کم تو نہیں تھی اور وہ رہتا بھی شہزادوں کی سی آن بان سے تھا۔ شہزادہ تو خیر اسے اب بھی بنا کر رکھا گیا تھا لیکن ربن کے اڈے اور اس جگہ میں بہت فرق تھا جہاں اس کی جڑیں موجود تھیں اور جہاں کی آن بان اس کے خون میں یوں رچ بس گئی تھی کہ دیکھنے والے عام سے حلیے میں بھی اس کا خاص ہونا محسوس کر لیتے تھے۔

''آپ کے آرام میں خلل دینا کچھ برا تو لگتا ہے لیکن میں ایک اچھی کمپنی کے لالچ میں یہ حرکت کر جاتی ہوں۔ شملہ میرا بہت بار کا دیکھا ہوا ہے لیکن آپ کی سنگت میں دیکھنا اور بھی اچھا لگ رہا ہے اس لیے میں آپ کو ڈسٹرب کرنے آ گئی ہوں۔'' بملا کی جاری گفتگو نے اسے ماضی کی یادوں میں کھونے نہیں دیا اور وہ دل کے مضطرب ہو جانے کے باوجود خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو میرے لیے اعزاز ہے کہ آپ مجھے اتنی اہمیت دے رہی ہیں ورنہ اصل میں تو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ بغیر کسی کوشش کے ایک اتنی اچھی گائیڈ کا ساتھ مل گیا ہے جس سے بہتر مجھے کوئی دوسرا شملہ گھما بھی نہیں سکتا تھا۔''

''تو پھر آج کا پروگرام پکا ہے؟'' بملا اس کا جواب سن کر خوش ہو گئی۔

''بالکل۔ آپ بس مجھے وقت بتا دیں۔ میں ٹھیک وقت پر تیار رہوں گا۔'' فاروق نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''ناشتے کے بعد نکل جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی مشکل تو نہیں ہو گی نا۔'' وہ فوراً پرجوش ہو گئی۔

''پریشانی کیسی، بس غسل کر کے لباس ہی تو بدلنا ہے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ تیاری کر لیں، ہم دوبارہ ٹیبل پر ملتے ہیں۔'' بملا نے اسے پروگرام سے آگاہ کیا پھر دونوں ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں ہی کے جوس کے گلاس گفتگو کے دوران ختم ہو چکے تھے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے دونوں سیڑھیوں سے اترتے چلے گئے۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اس چرچ کو دیکھنے جا رہے تھے جسے شمالی ہندوستان کا دوسرا قدیم چرچ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

کیتھرائن نے ان کے پروگرام کی پوری تفصیل جاننے کے بعد ضروری ہدایات اور ایمرجنسی میں استعمال ہونے والی دواؤں کے ساتھ اسے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ بظاہر وہ معاوضہ دے کر حاصل کی گئی ایک خدمت گار تھی لیکن فاروق نے اسے جو عزت اور مان دے رکھا تھا اس کے بعد وہ اس سے اتنی بحث کر سکتی تھی۔ فاروق نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ وہ جانتا تھا کہ کیتھرائن اس کی محبت اور فکر میں یہ سب کر رہی ہے۔ وہ نعمت کی طرح ملنے والی ان محبتوں کی ناقدری کا ہرگز بھی مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی مشکل تھی لیکن مشکل ترین کیسے ہوتی ہے، یہ جوزفین نے ماں کی موت کے بعد جانا اس کی باہمت ماں جس نے شوہر کے مرنے کے بعد گھر کی ذمے داری کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھا لیا تھا تو لیا فیکٹری کی پرمشقت ملازمت کرتے ہوئے نہ جانے کون کون سے مرض اپنے جسم میں پالتی رہی تھی۔ جوزفین نے کبھی اسے کسی ڈاکٹر سے اپنے لیے دوا لاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نزلہ، بخار اور کھانسی جیسے امراض کو وہ سرے سے خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ اگر کبھی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوتی تو بھی گھریلو اور دیسی نسخوں سے علاج ہو جاتا تھا اس لیے جوزفین کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ مشقت کی چکی میں پستی اس کی ماں آہستہ آہستہ اندر سے ڈھے رہی ہے۔ آخری بار وہ بیمار ہوئی تو تب بھی اس کا یہی اندازہ تھا کہ ماں دو چار دن میں ہمیشہ کی طرح خود ہی ٹھیک ہو جائے گی لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوئی اور زندگی میں پہلی بار اس نے ماں کو فیکٹری سے چھٹی لے کر پلنگ پر آرام کرتے دیکھا۔

ان دنوں وہ اپنے ایف اے کے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی لیکن ماں کی اس حالت پر تشویش میں مبتلا ہو گئی اور زبردستی اسے اسپتال لے گئی۔ اسپتال میں ڈاکٹروں نے اسے ماں کے بارے میں کوئی امید افزا خبر نہیں سنائی۔ وہ محنت کش عورت بہت خاموشی سے اپنے جسم میں دق کا مرض پالتی رہی تھی اور اب بالکل کسی دیمک زدہ دیوار کی طرح ڈھے گئی تھی۔ جوزفین کو تو زیادہ بھاگ دوڑ کرنے اور ماں کی خدمت کرنے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں چٹ پٹ ہو گئی تھی۔ بیماری کے

چند دن بعد مرنے والی کی آخری رسومات کی ادائیگی میں گنتی کے وہ چند روپے بھاپ کی طرح اڑ گئے تھے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مہینے کا خرچ چلا لیتی تھی۔ ماں کے مرنے کے فوراً بعد تو جوزفین کو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ بالکل تہی داماں کھڑی ہے اور اس کے گھر میں ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔ ماں کی جدائی کے صدمے سے نڈھال اسے فوری طور پر اس بات کا خیال آ بھی نہیں سکتا تھا۔ ماں سارا دن فیکٹری میں گزارتی تھی اور گھر آنے پر اتنی تھکی ہوئی ہوتی تھی کہ کھانا کھاتے ہی سو جاتی تھی اس لیے جوزفین کو اس کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ صبح بھی ماں کو فیکٹری اور اسے کالج جانے کی جلدی ہوتی تھی اس لیے چلتے پھرتے ہونے والے دو چار جملوں کے تبادلے کے سوا وہ دونوں سکون سے بیٹھ کر ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کر پاتی تھیں لیکن ماں نہیں رہی تھی تو اسے احساس ہوتا تھا کہ صبح شام ہونے والی وہ ادھوری سی ملاقاتیں ہی سب کچھ تھیں۔ اپنے چہرے پر پڑنے والی ماں کی محبت بھری وہ ایک نگاہ ہی تو تھی جو اسے اور بھی زیادہ تندہی سے اپنی تعلیم میں جت جانے پر اکساتی تھی۔ وہ ماں کے تھکن زدہ چہرے اور مشقت کے عادی ہاتھوں کو دیکھ کر سوچتی تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اچھی ملازمت مل جائے گی تو ماں کو اس مشقت بھری زندگی سے نجات دلا کر خوب عیش کروائے گی۔ ماں بھی اس کے مستقبل کو روشن دیکھنا چاہتی تھی اس لیے تمام تر تنگی ترشی کے باوجود اسے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے پر اکساتی تھی۔

ماں اچانک دنیا سے چلی گئی تو اس کا دل تعلیم سمیت ہر شے سے اچاٹ ہو گیا اور وہ گویا دنیا سے روٹھ کر گھر میں مقید ہو گئی۔ ان حالات میں صرف جوزف ہی تھا جو اس کا خیال رکھتا تھا لیکن وہ بے چارہ بھی ان دنوں حالات کی چکی میں پس رہا تھا۔ اس کی ماں اب پہلے سے بھی زیادہ بیمار رہنے لگی تھی اور باپ بھی محنت کرتے کرتے تھک کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ ان حالات میں کمانے کی ساری ذمے داری جوزف کے شانوں پر تھی۔ وہ اس ذمے داری کو نبھاتے ہوئے جوزفین کا خیال رکھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ وہی تھا جو اس کے لیے کھانا لا کر زبردستی اسے چند لقمے حلق سے اتارنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس روز بھی وہ کھانا لے کر آیا ہوا تھا۔ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی جوزفین نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔ اس کا حال دیکھ کر جوزف کا کلیجا کٹنے لگا۔ غربت کے باوجود اس نے جوزفین کو ہمیشہ اچھے حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ پرانے اور گھسے ہوئے کپڑے ضرور پہنتی تھی لیکن یہ کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے اور شکنوں سے پاک ہوتے تھے۔ اس کے سرخی مائل گھنگھریالے بال بھی ہمیشہ نہایت نفاست سے سنورے رہتے تھے لیکن اس وقت اس کا لباس بھی ملگجا اور شکنوں زدہ تھا اور بال بھی بے ترتیب اور الجھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ نہانا تو دور کی بات، ماں کے مرنے کے بعد اس نے ڈھنگ سے منہ بھی نہیں دھویا ہے۔ اس کی اس حالت پر جوزف کا دل دکھ سے بھر گیا اور وہ بے چین ہو گیا کہ کسی طرح اپنی اسی پرانی والی جوزفین کو واپس لے آئے چنانچہ اپنے ساتھ لائے کھانے کو ایک طرف رکھ کر خود اس کے سامنے جا بیٹھا اور آہستہ سے اسے آواز دی۔ اس کے پکارنے پر جوزفین نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ویران اور اداس آنکھیں جوزف کو تڑپا گئیں۔

"ایسا کب تک چلے گا جوزفین۔ اپن تیرے کو اتنا کم ہمت نہیں سمجھتا تھا۔ مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے پر تو، تو لگتا ہے اپنی جان لے کر ہی چھوڑے گی۔" اس کے لہجے میں خفگی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"ممی کے بعد جینے کو دل نہیں کرتا جوزف۔ مجھے ممی کے بنا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" اس نے دھیمے سے جواب دیا تو اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

"اپن مانتا ہے کہ تیرا دکھ بہت بڑا ہے پر ہمت تو تیرے کو کرنی پڑے گی۔ تیرے ایگزام شروع ہونے والے ہیں اور تو سب چھوڑ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ ایسے تو تیری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جائے گی۔" جوزف نے اسے سمجھایا۔

"میں سوچتی تھی پڑھ لکھ کر اچھی سی جاب کروں گی اور ممی کو آرام سے گھر میں بٹھا کر خوب عیش کرواؤں گی۔ اب ممی ہی نہیں رہیں تو میں کچھ کر کے کیا کروں۔ میں تو ممی کے واسطے ہی ساری اسٹرگل کر رہی تھی۔" اس نے یاسیت بھرے لہجے میں جوزف کی بات کا جواب دیا۔

"تو، تو ایک دم مینٹل ہے جوزفین۔ ٹھیک ہے تو اپنی ممی کے واسطے اچھا سوچتی تھی پر یوں بھی تو سوچ کہ تیری ممی تیرے واسطے کیا سوچتی تھی۔ وہ بے چاری اپنی لائف میں اتنی اسٹرگل اس لیے تھوڑی کر رہی تھی کہ بعد میں تو اسے عیش کروائے گی، وہ تو اس واسطے اتنی محنت کرتی تھی کہ بعد میں تیری لائف ہیپی اور پیس فل ہو۔ تو پڑھ لکھ کر اچھی آنرایبل جاب کرے اور تیرے کو اس کی طرح محنت مزدوری نہ کرنی پڑے پر تو، تو اس بے چاری کی ساری محنت مٹی میں ملانے

پر تلی ہے۔ تیرے کو کچھ اندازہ ہے کہ تیری اس حالت پر اُدھر ہیون میں اس کا سول کتنا بے چین ہوئیں گا۔ تو میری بات پر بلیف کرتو میں تیرے کو پکا بولتا ہوں کہ تو اپنی ممی کو بہت پین دے رہی ہے۔ ایسا مت کر جوزفین۔ اپنی ممی کا سارا لائف کا محنت برباد مت کر۔''

اسے سمجھاتے سمجھاتے جوزف التجا پر اتر آیا۔ حقیقتاً جوزفین کی حالت پر وہ خود بہت دکھی اور مضطرب تھا لیکن وہ اپنا حال کہہ کر سنانے والا شخص نہیں تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ جوزفین خود اس کے جذبات اور احساسات کو سمجھے۔ یوں تو جوزفین بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اپنی استعداد کے مطابق اس کا بہت خیال بھی رکھتی تھی لیکن اس کے انداز میں جوزف نے کبھی وہ جذبہ محسوس نہیں کیا تھا جو وہ خود اس کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا اسی لیے وہ اس سے اپنے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اب بھی اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ جوزفین میں تمہاری حالت پر اندر ہی اندر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہوں بلکہ اسے اس کی مری ہوئی ماں کی خواہشات اور احساسات کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہا اور مایوس اور بکھری ہوئی جوزفین یکدم ہی بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''تم نے بالکل ٹھیک کہا جوزف۔ میں اس طرح سے تو سوچ بھی نہیں سکی تھی۔ واقعی ممی مجھ سے جتنی محبت کرتی تھی اس نے میرے لیے بالکل ویسا ہی سوچا ہوگا جیسا تم کہہ رہے ہو اور میں...... میں ممی کی اتنے سالوں کی محنت ضائع کرنے چلی تھی۔'' وہ احساسِ ندامت میں گھرنے لگی اور اس کی آواز بھرا گئی۔

''اوہ سلی گرل...... روتا کیوں ہے۔ اپن نے تیرے کو بلیم نہیں کیا بس اپن تیرے کو سمجھا رہا تھا۔ اپنے کو معلوم ہے کہ غم کی وجہ سے تیرے سینس ٹھیک سے کام نہیں کر رہے لیکن تیرے کو احساس دلانا تو اپنا ڈیوٹی بنتا ہے نا۔ تیرے پاس تھوڑا ٹائم ہی تو رہ گیا ہے۔ ایگزام اسٹارٹ ہی ہونے والے ہیں۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز جوزف کو بے قرار نہ کرتی یہ کیسے ممکن تھا چنانچہ وہ جلدی جلدی وضاحت پیش کرنے لگا۔

''یو آر ریچ آسنسیئر فرینڈ جوزف۔ تم نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔'' جوزفین نے فوراً اس کی دلجوئی کی۔ اس کی بات سن کر جوزف مسکرا دیا۔ اس دن کے بعد جوزف نے دیکھا کہ جوزفین نے اپنا غم اپنے دل میں چھپا لیا ہے اور نئے عزم کے ساتھ اپنی ماں کی خواہش کی تکمیل کے لیے میدان میں اتر گئی ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف تعلیم اور اچھے نمبروں کے لیے محنت نہیں کرنی تھی بلکہ معاش کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارنے تھے۔ اس موقع پر جوزف بھی حتی المقدور اس کا ساتھ دے رہا تھا لیکن اس کے اپنے گھر کے بھی بے شمار مسائل تھے اور خود جوزفین اس پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ کوشش کرنے پر اسے دوران امتحان ہی اپنے ایک استاد کی وساطت سے ایک مسلمان گھرانے میں ٹیوشن مل گئی۔ اسے تیسری جماعت میں پڑھنے والی دو ایسی جڑواں بہنوں کو ٹیوشن پڑھانی ہوتی تھی جن کا باپ ایک سرکاری افسر تھا اور زمانے کے چلن کے مطابق اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں تعلیم دلا رہا تھا۔ افسر کی اپنی بیوی انگریزی پر زیادہ دسترس نہ رکھنے کی وجہ سے بچوں کو خود سے گھر پر پڑھانے سے معذور تھی۔

جوزفین نے ان بچیوں کو پڑھانا شروع کیا تو معاشی اعتبار سے پوری طرح تو فراغت حاصل نہیں ہوئی لیکن تھوڑا سا آسرا ضرور مل گیا لیکن یہ آسرا بھی اس وقت جاتا رہا جب بالکل اچانک ہی اس سرکاری افسر کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا۔ افسر کی بیوی اچھی ہمدرد عورت تھی اور جوزفین سے اس کے حالات معلوم کر چکی تھی چنانچہ اس نے اخبار میں چھپنے والے ایک اشتہار کی طرف جوزفین کی توجہ مبذول کروائی۔ یہ حیدر آباد دکن کے کسی نواب کی طرف سے دیا گیا اشتہار تھا جس میں ایک ایسی خاتون کی ضرورت کا بیان تھا جو بچوں کو انگریزی پڑھنا اور بولنا سکھا سکے۔ جوزفین یہ دونوں کام کر سکتی تھی لیکن اسے شبہ تھا کہ اس ملازمت کے لیے اس سے بہتر امیدوار نواب صاحب تک پہنچ جائیں گے اور اس کی دال نہیں گلے گی۔ اس لیے ملازمت کے حصول کے لیے اتنی دور جانا بے کار ہوگا۔ اس کے ان خدشات کو سرکاری افسر کی بیوی نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ جس گھرانے کی طرف سے اشتہار چھپا ہے اس کا ایک فرد اس کے شوہر کا کلاس فیلو رہ چکا ہے چنانچہ وہ اپنے شوہر کے ذریعے اس کی زبردست سفارش کروا سکتی ہے۔ اس کی ہمت بندھانے پر جوزفین نے حیدر آباد تک جا کر قسمت آزمانے کی ہامی بھر لی اور جوزف کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے حیدر آباد کے لیے رختِ سفر باندھا۔ جوزف کو اس کا خود سے دور جانا گوارا نہیں تھا لیکن اس کے اپنے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ جوزفین کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے چنانچہ دل پر بھاری پتھر رکھ کر

اسے حیدرآباد دکن جانے والی ٹرین میں سوار کروا دیا اور یوں برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنے والے جدا ہو گئے۔

جوزفین کی ڈائری کے مزید چند اوراق پڑھنے پر جولیٹ کو اپنے ماں باپ کی زندگی کے چند مزید گوشوں سے واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ اس نے اپنے والدین کو ہمیشہ ایک مثالی جوڑی سمجھا تھا لیکن اس حد تک ان کے حالات سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی یہ جانتی تھی کہ وہ کن کن مشکل حالات میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے آخر کار زندگی کے ساتھی بن پائے تھے۔

''آپ کی لائف مشکل تھی ممی لیکن آپ کتنی لکی تھیں کہ آپ کو ڈیڈ جیسا لونگ اینڈ کیئرنگ فرینڈ ملا ہوا تھا۔ میں تو اس معاملے میں بھی ان لکی رہی اور زندگی کی تاریک راہوں میں سب سے پہلے اسی نے سائے کی طرح میرا ساتھ چھوڑا جسے میں نے سب سے زیادہ اپنا جانا تھا۔'' عارف کا خیال کسک بن کر اس کے دل میں جاگا اور وہ ماں کی مخملی جلد والی ڈائری پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خیالوں میں اس سے مخاطب ہوئی۔ یہ ڈائری اپنے تکلیف دہ شب و روز میں اس کے لیے تنہائی کی ایک دلچسپ ساتھی ثابت ہو رہی تھی لیکن جوزفین کے حسبِ ہدایت وہ اسے کسی عام سی تحریر کی طرح روانی سے پڑھنے کے بجائے دھیرے دھیرے بہت توجہ سے پڑھ رہی تھی اور تحریر کو تصویر، وہ بھی متحرک تصویر بنا کر اپنی ماں کی زندگی کے ڈائری میں قید خصوصی گوشوں کو کسی جیتے جاگتے منظر کی طرح محسوس کرتی تھی۔ اپنے اس مشغلے کے لیے اسے زیادہ وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ دن بھر دفتر میں گزر جاتا تھا۔ گھر آ کر بھی فرصت نہیں ملتی تھی کہ اب اس گھر میں اس کی ماں موجود نہیں تھی جو اس چھوٹے سے گھر کو خوب سجا سنوار کر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی آمد سے قبل اس کے لیے اس کی پسند کے پکوان تیار رکھتی تھی۔ جولیٹ کو کھانے پینے سے تو خیر کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی جو وہ باورچی خانے میں اپنا زیادہ وقت گزارتی لیکن گھر کو حسبِ سابق حال میں رکھنے کے لیے اسے ہاتھ پیر چلانا پڑتے تھے۔ وہ اپنی ماں کے محنت سے سنوارے گئے گھر کو اسی طرح دیکھنے کی خواہش مند تھی جیسا کہ وہ اس کی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ اس ایک کام کے علاوہ وہ جو دوسرا کام بڑی باقاعدگی اور تندہی سے کر رہی تھی، وہ تھا دلدار آغا سے نفرت کرنا۔ اس کے کمرے کی دیوار پر لگی دلدار آغا کی تصویر اس کی چاقو زنی کی مشقوں کے دوران پھٹ کر چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن اس کے دل میں جلتی نفرت و انتقام کی آگ صرف تصویر کے اس حال پر تو نہیں بجھ سکتی تھی۔ اسے آغا کو اس کے دردناک انجام تک پہنچانے کے لیے ایک موقع درکار تھا اور وہ ایک موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

''وہ حرام کا پلا فیکا لوٹ کر نہیں آیا دادا۔''

''اس کو آنے کا تھا بھی نہیں رے۔ بیچ چوک میں جوتے کھا کر وہ کدھری واپس آنے کا تھا۔'' ربن نے اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے رامو کی بات کا جواب دیا۔

''پر وہ گدھے کے سر سے سینگ کے مافق غائب ہو گیا ہے دادا۔ اس کا گھر خالی پڑا ہے۔ بیوی بچے، سامان سب غائب ہے۔'' رامو نے اسے مزید اطلاعات فراہم کیں۔

''گیا ہوگا اپنی ماں کے خصم کے تلوے چاٹنے۔ اپن کو سب پتا ہے کہ وہ کس کے واسطے اپنے کو آنکھیں دکھاتا تھا۔'' ربن کے لہجے میں طیش کی ہلکی سی لہر جاگی۔

''کیا مطلب دادا! کدھری گیا ہے وہ...... کی اولاد۔'' رامو نے فیکے کا تعلق ایک ناپاک جانور سے جوڑا۔

''مجو کے پاس اور کدھر۔'' ربن نے اطمینان سے جواب دیا تو رامو حیران رہ گیا۔

''مجو کے پاس...... مگر کیوں؟ اب مجو کے کنے کیا رہ گیا ہے جو کوئی اس کے پاس جائے؟''

''کچھ نہ کچھ تو لالچ دیا ہوگا اس نے...... تو اس کی فطرت کو سمجھتا نہیں ہے۔ سالا چاقو پکڑنے کے لائق نہیں رہا ہے پر اس کا مغز بڑا چارسوبیس ہے۔ تو کیا سمجھ رہا ہے کہ وہ چوٹ کھا کر کہیں کونے میں ایسے ہی منہ چھپا کر بیٹھا ہوگا۔ ایسا سیدھا نہیں ہے وہ۔ کہیں نہ کہیں بیٹھا کھچڑی پکا رہا ہوگا اور فیکے جیسے کمیوں کو لارے لپے دے کر اپنی اور کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ ادھر بمبئی میں سارے اپنے جن تو نہیں بیٹھے ہیں نا۔ کتنے حرام کے جنے ایسے ہیں جن کی آنکھوں میں ربن دادا کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اپن کے ایسے دشمنوں نے کھل کر نہ سہی پر چوری چھپے تو ضرور مجو کے آنسو پونچھ کر سہارا دینے کا کام کیا ہوگا نا۔ مجو بے شک چاقو پکڑنے جوگا نہیں رہا پر اس کا کوئی نہ کوئی پلا ایسا ضرور ہوگا جسے وہ چاقو تان کر اپنے سامنے لانے کے واسطے تیار کر رہا ہوگا۔ وہ سالا بڑا کینہ پرور ہے۔ ابھی نہ سہی آگے جا کر ضرور اپنے پر وار کرے گا۔'' ربن مستقبل کی پیش گوئیاں کر رہا تھا۔

''پھر تو اپنے کو بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔'' رامو نے اس کی بات سن کر تبصرہ کیا۔

''اپنے کو ویسے بھی ہر دم ہوشیار ہی رہنے کا ہے رامو۔ اپنے دھندے میں جو ذرا غافل ہوا وہ گیا۔'' ربن نے اسے ایک کھلی حقیقت سمجھائی۔

''یہ تو اپن بھی سمجھتا ہے استاد پر جو کچھ تم نے بولا ہے وہ ذرا خاص ہے اور اپن سوچ رہا ہے کہ مجو دادا کے اڈے والے بندوں کو ذرا زیادہ کھینچ کر رکھنے کا ہے۔''

''سو تو ہے پر خیال رکھنا کہ ان کو پتا نہیں لگے، ایسے طریقے سے گلے میں پٹا ڈال۔ سالے سمجھ گئے کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے تو پکڑائی میں نہیں آئیں گے۔'' ربن نے اسے صلاح دی۔

''اپن خیال رکھے گا دادا...... تم بتاؤ ادھر شملہ میں اپنے شہزادے کا کیا حال ہے۔ تمہاری روزانہ ٹیلی فون پر بات تو ہو رہی ہے نا؟'' رامو نے موضوعِ گفتگو تبدیل کیا۔

''مزے میں ہے تیرا شہزادہ۔ بھابیہ کی بیٹی چھٹیاں بتانے شملہ پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ شملہ کی سیریں کر رہا ہے۔'' ربن نے اسے بتایا۔

''کیسی ہے بھابیہ کی بیٹی؟ دیکھنے میں سندر ہے کیا؟'' رامو نے تجسس سے پوچھا۔

''اپنے کو خبر نہیں پر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟'' ربن نے اسے گھورا۔

''اپن سوچ رہا ہے دادا کہ لونڈیا سندر ہے تو کیا پتا فاروق کا دھیان اس کی طرف لگ جائے۔ ماں کی سوگند اس بمبئی والی کے عشق نے تو اس کو روگ لگا دیا ہے۔ اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے۔ اپن سوچتا ہے کہ ادھر سے ہٹ کر کدھری اور دھیان دے تو شاید کچھ مرض میں کمی آئے۔'' رامو نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اس کا دھیان نہیں بٹنے کا ہے رامو۔ وہ بار بار دل لگانے والوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے ایک بار جو دل کو لگالیا ہے بس لگالیا ہے۔ ایسے ہی اچھی صورت دیکھ کر دھیان بٹانے والا ہوتا تو زمرد بائی کی لڑکی چاند بانو سے بڑھ کر بھلا کون حسین ہوگی۔ تو نے دیکھا ہے نا اسے کیسی سانچے میں ڈھلی چاندنی سے دھلی لڑکی ہے۔ اس پر سے اس کے گلے کا سر اور ادائیں بھی سونے پر سہاگا ہیں۔ سب سے بڑھ کر وہ خود دل و جان سے اپنے فاروق پر فدا ہے لیکن اسے کہاں اپنی جولی کے آگے کچھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ تو اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ اپن سچ بولیں تو یہ اپن کو عام عشق سے بہت آگے کا معاملہ دکھائی پڑتا ہے۔ اپن نے خود شہزادے کی حالت دیکھی ہے۔ اسپتال میں داخل تھا تو اسے کہاں کچھ خبر تھی کہ جولی پر کیا بیتی ہے لیکن وہ خوابوں میں اسے دیکھ کر بڑبڑاتا تھا۔ تو مان نہ مان، پر اپن جانتا ہے کہ اس کا عشق اتنا گہرا ہے کہ کسی کے بتائے بنا بھی اس تک جولی کے حال کی خبر پہنچتی ہے۔ جولی پر جو گزری اسے پتا نہیں ہے پر وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ اس کی جولی تکلیف میں ہے۔ اسی لیے اپن نے اسے جولی کی ماں کے مرنے کی خبر دے دی تھی کہ اس کا دماغ ادھر ادھر نہ بھٹکے اور وہ یہی سمجھے کہ جولی کو ماں کے مرنے کا دکھ ہے۔ ابھی اپن اسے جوزف کی خبر بھی دے دے گا۔'' ربن زمانہ شناس آدمی تھا پھر فاروق سے اس کی وابستگی بھی گہری تھی اس لیے اس کا فاروق کے بارے میں تجزیہ بھی درست تھا۔

''پر دادا آج نہیں تو کل فاروق استاد کو ادھری لوٹ کر تو آنے کا ہے نا...... ادھر آکر اسے اصل قصہ پتا چلا تو بہت ناراض ہوگا۔'' رامو نے سب سن کر نازک نکتے کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔ اپن اس کو سنبھال بھی لیں گے اور اس کی ناراضگی بھی سہہ لیں گے پر ابھی تو اپن کو سب سے جاستی اس کی صحت کی فکر ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو اپنے لیے یہی سب کچھ ہے۔ ادھر بھی کوشش کرتے رہیں گے کہ جولی کے مجرم کو اس کے کیے کی سزا دے سکیں پر سزا تو تب دیں گے نا جب لونڈیا اپنی زبان کھولے گی۔ وہ جس طرح منہ سی کر بیٹھی ہے اپن کو کسی طوفان کی آہٹ سنائی پڑتی ہے۔ جانے وہ اپنے من میں کیا ٹھانے بیٹھی ہے۔ اپن نے اسے جتنا سمجھا ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ڈر کر چپ ہو جانے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ اپنے ساتھ بیتی کا بدلہ لینے کی کرے گی پر کیسے یہ پتا کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انجانے میں وہ خود کو کوئی نقصان پہنچا بیٹھے اور اپن سچ مچ فاروق کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔'' ربن کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

''اس کے لیے تو اپنا جانی کام دکھا سکتا ہے دادا۔ جانی نے اپنے کو بتایا تھا کہ کوئی لونڈا جولی کو تنگ کر رہا تھا۔ جانی نے لونڈے کو چھٹی کا دودھ یاد دلا کر جولی کی اس سے جان چھڑائی تو وہ اس سے اتنی خوش ہوئی کہ اسے اپنا بھائی مان لیا۔ جانی بھی اسے سسٹر بول کر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ابھی تم بولو تو جانی کو کھوج لینے پر لگا دیتا ہے۔ پیار محبت میں وہ کچھ نہ کچھ تو سن گن لے ہی لے گا۔''

رامو کو آئیڈیا سوجھا۔ ربن کے دل کو بھی اس کا خیال بھایا چنانچہ خوش ہو کر بولا۔ ''تو بالکل ٹھیک لائن پر سوچ رہا

ہے رامو۔ فٹافٹ جانی کو اس کام پر لگا دے۔ وہ کوئی خبر لے آیا تو اپنا کام آسان ہو جائے گا۔''

''یہ کام تو سمجھو ہو گیا دادا...... اب دوسرے کام کا بولو۔ کمو کلکتے جا کر سب جانکاری کر آیا ہے۔ لڑکے کا کام، چال چلن اور گھر سب ایک دم ٹھیک ہے اب تم چاہو تو ادھر ہاں میں جواب بھجوا سکتے ہو۔ غفور نے تو پہلے ہی لڑکے کی گارنٹی لے رکھی ہے۔ ایسے میں رشتے کو اور ٹالنا ٹھیک نہیں رہے گا۔'' رامو، ربن کا رائٹ ہینڈ تھا اس لیے ایک کے بعد ایک سارے امور پر اس سے گفتگو کرتا جا رہا تھا۔

''تو ٹھیک بول رہا ہے۔ غفورے کی گارنٹی پر اپنے کو اعتبار تو تھا پھر بھی اپن نے احتیاط ضروری سمجھی۔ عورت بیٹی کا معاملہ ہے۔ پہلے ہی ثریا بانو بے چاری ایک بار جہنم جھیل چکی ہے۔ اس بار اپن اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لیے کمو کو جانچ پڑتال کے لیے کلکتے بھجوانے کو بولا تھا۔ رشتے ناتوں کے معاملات نازک ہوتے ہیں پھر اپن کون سا گھرداری والا آدمی ہے جو ان چکروں کو ٹھیک سے سمجھ سکے اس لیے یہی ٹھیک لگا کہ جتنا ہو سکے اتنا اطمینان کر لیں۔''

ان دونوں کے درمیان محلے میں ہی مقیم جوان العمر بیوہ ثریا بانو کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ثریا بانو وہ لڑکی تھی جو ربن اور مجو کے درمیان تنازعے کا سبب بنی تھی۔ مجو دادا ثریا بانو پر بری نظر رکھتا تھا اور اس کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے ثریا بانو کے چھ سالہ بیٹے تصور کو اغوا کروانے کی بھی کوشش کی۔ فاروق کی مداخلت پر وہ اس کوشش میں تو ناکام ہو گیا لیکن دونوں اڈوں کے درمیان کھلی دشمنی کا آغاز ہو گیا اور اس ساری کشمکش کا انجام مجو کی ذلت آمیز شکست کی صورت میں ہوا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے ربن نے فیصلہ کیا کہ ثریا بانو کی دوسری شادی کر دی جائے۔ اس امر پر اس نے ثریا بانو کے ماموں ممانی جو کہ اس کے ساس سسر بھی تھے، کو بھی راضی کر لیا تھا اور اب ایک محلے دار کے توسط سے کلکتے میں اس کے رشتے کے سلسلے میں بات چیت جاری تھی۔ لڑکے والوں نے ثریا بانو کے لیے پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا اور اب ادھر سے فیصلہ سنایا جانا تھا۔ ثریا بانو کے ماموں تو بستر علالت پر پڑے اپنی سانسیں گن رہے تھے اس لیے ربن کو ہی اس کے سرپرست کے فرائض انجام دینے تھے۔

بڑے بڑے سورماؤں کے سامنے بے خوفی سے ڈٹ جانے والا ربن اس معاملے میں ازحد محتاط تھا کہ یہ کام تھا ہی بے حد نازک اور وہ اس قسم کے کاموں کا خاص تجربہ نہ رکھنے کے باعث پہلے خود ہر طرح سے اپنا اطمینان چاہتا تھا اس لیے لڑکے والوں کو جواب دینے کے لیے مہلت مانگ لی تھی۔ اب کمو بھی اطلاعات کے ساتھ واپس آیا تھا تو وہ بھی اللہ کا نام لے کر ہاں کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ شادی کے سارے انتظامات کیونکہ اس نے پہلے ہی اپنے ذمے لینے کا اعلان کر دیا تھا اس لیے ہامی بھرتے ہی رامو سے اس سلسلے میں بھی مشاورت کرنے لگا۔ آخر طے پایا کہ ثریا بانو کی ممانی اور محلے کی چند دوسری خواتین سے جہیز، مہمانداری اور دوسرے امور کے سلسلے میں مدد بلکہ تیاری کی درخواست کی جائے گی اور اخراجات اور دیکھ بھال کا کام اڈے کے لوگ انجام دیں گے۔ موٹی موٹی باتیں آپس میں طے کر لینے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو ربن اپنی جگہ بڑا مطمئن تھا۔ آہستہ آہستہ معاملات سلجھتے جا رہے تھے اور اسے اعتراف تھا کہ رامو اس کا دایاں بازو بنا پوری طرح اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ یہ رامو ہی تو تھا جو مجو کے اڈے کا زیادہ تر انتظام سنبھالے ہوئے تھا اور دیگر معاملات میں بھی اسے صائب رائے دیتا تھا۔ اسی لیے وہ دن میں ایک بار ضرور رامو کے ساتھ نشست رکھتا تھا۔ آج کی نشست نے بھی اسے اتنا ہلکا کر دیا تھا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اپنا حقہ گڑگڑا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ شملہ گھومنے پھرنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس کی قلبی کیفیات بھی اضطراب کا شکار تھیں لیکن اسے یہاں اپنا وقت تو کاٹنا ہی تھا اور یہ اچھا ہوا تھا کہ وقت گزارنے کے لیے بملا جیسی پڑھی لکھی اور زندہ دل لڑکی کا ساتھ مل گیا تھا۔ بملا کی کمپنی نے کسی حد تک اسے ذہنی آسودگی عطا کی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ساتھ کرائسٹ چرچ میں گھومتے ہوئے وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بملا اسے بتا رہی تھی۔

''اس چرچ کو 1846ء سے 1857ء کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے اور یہ گوتھک طرز تعمیر کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ آپ نے چرچ کے ٹاور پر جو کلاک لگا ہوا دیکھا تھا، وہ 1860ء میں لگایا گیا تھا۔ یہاں 1910ء میں ایک لائبریری بھی تعمیر کی گئی ہے۔ میں آپ کو وہ لائبریری بھی دکھاؤں گی۔''

''ضرور۔ مجھے تو ویسے بھی کتب اور کتب خانوں سے خصوصی شغف ہے۔ زندگی میں کتابوں سے بڑھ کر میں نے

کوئی مخلص دوست نہیں پایا۔'' فاروق نے فوراً اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

''مجھے کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن انسان کے لیے انسان کی ضرورت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ آپ کو زندگی میں اگر کوئی مخلص دوست نہیں ملا تو کوئی بات نہیں، کبھی ہمارے خلوص کو آزما کر دیکھیے گا۔ بھگوان نے چاہا تو ہم ناکام نہیں رہیں گے۔'' بملا نے اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شوخی سے پیشکش کی۔

''ارے نہیں، میری بات کا یہ مطلب نہیں ہے میں تو بس اپنی ذاتی دلچسپی اور وابستگی کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ مجھے جتنی آسودگی اور سکون کتابوں کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے اور کسی شے میں نہیں ملتا، ورنہ انسانوں کی اہمیت کا تو میں خود بہت قائل ہوں۔ یہ چند انسانوں کا خلوص ہی تو ہے جو آج میں آپ کے مقابل کھڑا ہوں۔ میں جو اپنے سب رشتے ناتے گنوا کر انسانوں کے ہجوم میں بالکل تنہا بھٹک رہا تھا، کسی کے خلوص کی وجہ سے تو آج اتنا مالا مال ہوں کہ زندہ رہنا برا نہیں لگتا اور دل میں جینے کی تمنا رکھتا ہوں اپنے لیے نہ سہی ان کے لیے جو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ میری فکر کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے جملے کی وضاحت کرتے ہوئے بملا کے سامنے اعتراف کیا۔

''یہ بھی آپ پر اوپر والے کی کرپا ہے فاروق صاحب کہ لوگ آپ سے اتنا پریم کرتے ہیں، میں نے خود فیل کیا ہے کہ آپ میں کوئی عجیب سی اٹریکشن ہے جس کی وجہ سے من خود بخود ہی آپ کی طرف کھنچتا ہے۔ آپ کے اردگرد رہنے والے آپ کو کتنا چاہتے ہوں گے اس بات کا میں اندازہ لگا سکتی ہوں۔ اس نرس کیتھرائن اور لڑکے گولو کا سلوک میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ ایسے آپ کی کیئر کرتے ہیں جیسے آپ کوئی بھگوان ہوں۔'' بملا کا مشاہدہ غلط نہیں تھا لیکن فاروق زیادہ دیر تک اپنی ذات کو موضوعِ گفتگو بنانے سے کتراتا تھا چنانچہ موضوع بدلنے کے لیے بے نیازی سے بولا۔

''ان دونوں کی رہنے دیجیے، وہ تو ایسے ہی دیوانے ہیں۔ آپ مجھے چرچ کے بارے میں بتائیے۔ آپ کے پاس تو معلومات کا خزانہ ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ نے شملہ پر باقاعدہ تحقیق کر رکھی ہے جب ہی تو اس کے بارے میں یوں روانی سے بتاتی چلی جاتی ہیں۔''

''مجھے شملہ سے محبت ہے اور جس سے محبت ہو اس کے بارے میں سب ہی کچھ جاننے اور یاد رکھنے کا من کرتا ہے۔ یہ میری ممی کی جنم بھومی ہے۔ ممی خود بھی شملہ سے بہت محبت کرتی تھیں اور مجھے بھی ورثے میں یہ محبت دان کر گئی ہیں۔'' بملا نے اس کا موضوع بدلنا محسوس کر لیا تھا لیکن جتانا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ بات تو وہ خود بھی سمجھ گئی تھی کہ اپنی ذات کے بارے میں وہ زیادہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا۔

''شملہ واقعی ہے بھی اس قابل کہ اس سے محبت کی جائے۔ اسے کوئن آف ہلز کا نام دینے والے نے ایسے ہی تو نہیں دیا ہوگا۔ ایک طرف اگر اسے قدرت نے مالا مال کر رکھا ہے تو دوسری طرف انسانوں نے بھی ناقدری نہیں کی۔ یہ چرچ انسانوں کی قدر شناسی کا ایک نمونہ ہے۔ کتنی روحانیت اور سکون کا احساس ہے یہاں۔ آپ اور میں دونوں ہی عیسائیت کے پیروکار نہیں لیکن چرچ کی فضا میں جو روحانیت کا احساس ہے اس سے کسی طور انکار نہیں کر سکتے۔'' فاروق نے اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آیئے میں آپ کو پورا چرچ دکھاتی ہوں۔'' بملا اس کا تبصرہ سن کر یوں خوش ہوئی جیسے اس کی ذات کی تعریف کی گئی ہو۔ اس خوشی میں وہ اسے چرچ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے لگی۔

''یہ شمالی انڈیا کا دوسرا سب سے پرانا چرچ ہے۔ اسے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس کا نظارہ سحر زدہ کر دینے والا ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت جب یہاں روشنیاں جلائی جاتی ہیں تو یہ بہت ہی خوب صورت اور سحر انگیز لگتا ہے۔ اندر سے دیکھنے میں بھی یہ کم خوب صورت نہیں ہے۔ آپ ان اسٹینڈ گلاس ونڈوز کو دیکھیے۔ کتنی نایاب پینٹنگز بنی ہیں ان پر۔ یہ دیکھیے اس پینٹنگ میں یقین اور عقیدے کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ پینٹنگ امید کا بھاشن دیتی ہے اور اس میں صبر کی تعلیم ہے۔'' وہ اسے ایک، ایک پینٹنگ کی خوب صورتی بتاتی رہی وہ بھی دلچسپی سے سب دیکھتا اور سنتا رہا۔

چرچ کو اندر سے اچھی طرح دکھانے کے بعد وہ اسے دائیں جانب موجود لائبریری کی عمارت میں لے گئی۔ اس لائبریری میں کتابوں اور قدیم scriptures کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ فاروق نے وہاں اور بھی زیادہ دلچسپی اور شوق سے وقت گزارا۔ وہ دونوں اچھا خاصا طویل وقت گزار کر چرچ سے باہر آئے تو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ آج بملا گھر سے کھانا پیک کروا کر نہیں لائی تھی اور پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کھانا وہ لوگ باہر کھائیں گے۔ ان کے پروگرام کی طوالت کا اندازہ لگا کر کیتھرائن نے فاروق کی دوائیں

ساتھ کردی تھیں اور بملا کو ان کے بارے میں اچھی طرح ہدایات دے دی تھیں کہ کون سی دوا کب اور کتنی مقدار میں لینی ہے۔ چرچ سے نکل کر وہ بملا کی راہنمائی میں ایک راستے پر چل پڑے۔ قریب ہی ایک ڈھابا سا تھا۔

''یہاں کا کھانا بہت ٹیسٹی اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔'' ڈھابے کا رخ کرتے ہوئے بملا نے اسے بتایا۔ ایک مالدار سیٹھ کی بیٹی کا ایک ڈھابے کے کھانے پر یہ تبصرہ سن کر اسے حیران ہونا چاہیے تھا لیکن اس لیے نہیں ہوا کہ بملا اب تک اس کے لیے ایک غیر متوقع لڑکی ہی ثابت ہوئی تھی اور ایسے لوگ کبھی بھی کوئی بھی انوکھا کام کر سکتے ہیں۔ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ ڈھابے پر موجود دونوں افراد نے انہیں اپنی طرف آتا دیکھ لیا تھا۔ فربہ اور عمر رسیدہ شخص نے پہلے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

''نمستے میم صاحب۔ وڈے لمبے سے بعد ادھر کا پھیرا لگایا؟'' ڈھابے والے نے بملا کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ وہ اپنے حلیے اور زبان سے پنجابی لگ رہا تھا۔ فاروق نے دیکھا تھا کہ یہاں پہاڑی زبان کے علاوہ پنجابی بولنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔

''ہاں بھرا، اتنے عرصے ذرا بزی زیادہ رہی اس لیے یہاں کا چکر نہیں لگا۔ تم سناؤ کیسے ہو۔ گھر میں تو سب ٹھیک ہے۔'' بملا بے تکلفی سے بولتی ہوئی لکڑی کی اس بینچ پر بیٹھ گئی جسے ایک بھیگی مسوں والے لڑکے نے کپڑا مار کر ان کے لیے صاف کیا تھا۔ فاروق نے بھی اس کی پیروی کی۔

''بھگوان کی کرپا ہے میم صاحب۔ سب چنگا چل رہا ہے۔ تسی بتاؤ کیا خدمت کروں؟'' مالک نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''جو کچھ ہے سب لے آؤ۔ بمبئی سے یہ میرے خاص مہمان آئے ہیں اور میں انہیں تمہارے ہاتھوں کا سواد چکھانا چاہتی ہوں۔'' بملا نے اس سے فرمائش کی تو ڈھابا مالک تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ نوعمر لڑکا بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ لڑکے کی عمر کم تھی لیکن ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ اس کے چہرے میں ڈھابے کے مالک کی واضح جھلک سے ظاہر تھا کہ... دونوں میں کوئی قریبی رشتہ ہے۔ آدمی پتیلیوں میں سے کھانا نکالتا رہا اور لڑکا پھرتی سے تام چینی کی رکابیاں ان کے سامنے موجود لکڑی کی پرانی سی میز پر رکھتا رہا۔ کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز تھی، فاروق کی بھوک خود بخود کھلنے لگی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں ہر چیز پرانی ہونے کے باوجود نہایت صاف ستھری ہے۔ بملا کے اشارے پر اس نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا تو ذائقے کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ بملا بھی مزے لے کر کھانے لگی۔

''کیا بات ہے، آج بنچیں خالی کیسے پڑی ہیں؟ تمہارے ہاں تو بڑا رش لگا رہتا ہے۔'' تندوری روٹی کو سالن میں ڈبو کر نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بملا نے پوچھا۔

''آپ لوگ تھوڑا پچھیتی آ گئے ہو۔ دفتروں وغیرہ میں کھانے کا وقفہ ہونے میں کچھ سے باقی ہے فیر دسنا اتھے دا رش۔'' اس نے فخر سے جواب دیا۔

''تمہارے ہاتھ کے ذائقے کی تو میں بھی فین ہوں جب ہی تو شملہ آؤں تو یہاں ضرور آتی ہوں۔'' بملا نے چٹخارا لیا پھر فاروق سے مخاطب ہوئی۔

''کیوں فاروق صاحب...... کیسا لگا کھانا؟''

''بہت مزے کا ہے اور میرے لیے نیا بھی۔ میں نے یہ کھانے کبھی نہیں کھائے۔'' فاروق نے بملا کے سوال کے جواب میں اعتراف کیا۔ اس کے سامنے جو پلیٹ رکھی تھی، اس میں ساگ قسم کی کوئی سبزی موجود تھی۔ اس ڈش میں پنیر شامل کیا گیا تھا جس نے ذائقے کو مزید بڑھا دیا تھا۔

''یہ اسان دے پنجاب دا کھاجا ہے باؤ۔ اساں دا پیو پنجابی کھانوں کا ماہر تے مانا ہوا رسوئیا تھا۔ ہن ہی اساں نواں ای فن سکھایا سی......'' ڈھابے کے مالک نے ایک بار پھر فخر کا اظہار کیا۔

''تم بھی اپنے بیٹے کو یہ فن سکھا رہے ہو یا نہیں؟'' بملا نے اس سے پوچھا۔

''آہو جی۔ رسوئیا دا پتر کھانا پکانا نہیں سکھے گا تو فیر ہور کی کرے گا۔ ساڈا پتر بھی سب سیکھ گیا ہے۔ آنے والی دیوالی تے اسیں اس دا ویاہ کرنے والے ہیں۔'' اس نے اطلاع دی۔

''لیکن یہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اتنی کم عمری میں تم اس کی شادی کر دو گے۔'' بملا نے اعتراض کیا۔

''کدھر چھوٹا ہے جی۔ پورے ستارہ (سترہ) ورش کا ہونے والا ہے۔ اپنے بال بچہ نوں کما کر کھلا سکتا ہے۔ اسیں انہاں نوں الگ ڈھابا لگا کر دینے والے ہیں سی۔'' اس نے بملا کا اعتراض یکسر رد کر دیا۔ اسی وقت وہاں کچھ اور گاہک آ گئے اور ڈھابے والا ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عجیب لوگ ہیں۔ اتنے کم عمر بچوں کی شادیاں کر دیتے ہیں۔'' بملا نے اب فاروق کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''اپنے اپنے رواج کی بات ہے۔ ویسے بھی کچھ

پڑھے لکھے اور ماڈرن خاندانوں کو چھوڑ کر اپنے ہندوستان میں جلدی شادی کا ہی رواج ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کی اولاد غلط راہ پر چلنے سے بچ جاتی ہے۔ پھر کم عمری کی شادی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی ابھی جوان ہی ہوتا ہے تو اس کی اولاد بھی جوان ہو جاتی ہے۔ آپ اس ڈھابے کے مالک کو ہی دیکھیں، شکل سے چالیس بیالیس کا ہی ہے اور اس عمر میں آرام سے اپنے بچوں کی شادیاں کر کے فارغ ہو جائے گا۔ بڑھاپے میں اسے یہ فکر نہیں ہوگی کہ ابھی بچوں کی ذمے داریاں بھی ادا کرنی ہیں۔''

''آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں اتنی کم عمری کی شادی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ شادی کے وقت لڑکا لڑکی کو اتنا میچور تو ہونا چاہیے کہ اس رشتے کی نزاکت کو سمجھ سکیں اور اپنی ذمے داریاں پوری طرح اٹھا سکیں۔'' بملا نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''میں نے بھی اس فعل کی حمایت نہیں کی ہے بس آپ کو اپنے ہاں کے کلچر اور سوچ کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' فاروق اس کے انداز پر مسکرایا۔ کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے اس موضوع پر مزید کچھ دیر گفتگو کی پھر خود بخود ہی دوسرے موضوعات چھڑ گئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد بملا نے کیتھرائن کی دی ہوئی دوائیں فاروق کو کھانے کے لیے دیں۔ اصولاً اب فاروق کو واپسی کی راہ اختیار کرنی چاہیے تھی۔ اب اس کو آرام کی ضرورت تھی لیکن گفتگو کے دوران بملا نے اس سے ذکر کیا تھا کہ قریب ہی ایسی دکانیں وغیرہ ہیں جہاں سے شملہ میں تیار کی جانے والی خوب صورت ہینڈی کرافٹس خریدی جا سکتی ہیں۔ فاروق فوراً ہی وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے اپنے ساتھیوں کے لیے تحائف لینے کا خیال آ گیا تھا۔ جاتے جاتے ربن اسے اچھی خاصی رقم تھما گیا تھا اور اس کے نزدیک اس رقم کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا تھا کہ اپنے چاہنے والوں کے لیے یہاں کی سوغاتیں خرید لیتا۔ بمبئی تو اسے لوٹ کر جانا ہی تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ جلد ہی ایسا ہو جائے۔ اسے بمبئی کی وہ بند گلی بہت یاد آتی تھی جس کے دو منزلہ مکان میں وہ خود سے بے حد محبت کرنے والوں کے ساتھ رہتا تھا اور جہاں ایک چھوٹے سے گھر میں وہ لڑکی رہتی تھی جسے دل و جان سے چاہنے کے باوجود وہ اسے کبھی اپنا کہنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔

اس کی خواہش پر بملا اسے ہینڈی کرافٹس کی دکانوں تک لے گئی۔ ان میں سے کچھ باقاعدہ دکانیں تھیں اور کچھ یوں ہی اسٹال لگائے گئے تھے۔ دونوں ہی جگہوں پر اچھا مال

موجود تھا۔ اس سامان میں ہاتھ سے بنے قالین، پاندان، کمبل، دستی پنکھے، دستانے، گرم شالیں، چمڑے کے جوتے، بیلٹس اور پرس وغیرہ شامل تھے۔ فاروق کو اونی قالینوں اور کمبلوں پر بنے بیل بوٹے بہت دلکش لگے لیکن ان کے سائز اور وزن کی وجہ سے وہ انہیں محدود تعداد میں ہی خرید سکا۔ بیلٹیں، دستانے اور مردانہ بٹوے البتہ اس نے خوب دل کھول کر خریدے۔ خریداری کے دوران ہی اس نے بملا کی پسند سے دو شالیں بھی خریدیں۔ ان میں سے ایک شال وہ بملا کو دینے کا ارادہ رکھتا تھا جبکہ دوسری چاند بانو کے لیے تھی۔ چاند بانو نے خود بخود ہی اس کی زندگی میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ وہ خود جولیٹ کے عشق میں پور پور ڈوبا ہوا تھا لیکن چاند بانو کے جذبے کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ اس سے بڑھ کر دل کی بے بسی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ دل تو ایسی بے ایمان شے کا نام تھا جو ضدی بچے کی طرح کہیں بھی اڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نہیں سمجھتا تھا کہ اسے جو چیز بھا گئی ہے وہ دسترس سے باہر ہے۔ اس کا دل جولیٹ کے ناقابلِ حصول ہونے کے باوجود اس کے در سے لپٹ گیا تھا اور چاند بانو کا دل یہ جانے بغیر کہ وہ تو پہلے ہی کسی اور کے نام جیون لکھ چکا ہے' اس کے در پر جم کر بیٹھ گیا تھا۔ قصوروار نہ وہ تھا اور نہ چاند بانو...... تو بھلا وہ اس معصوم لڑکی کو اس کی جسارت پر کیسے جھڑکتا۔ اس نے اسے بھی ویسے ہی اپنی زندگی میں قبول کر لیا تھا جیسے دوسرے بلا ارادہ زندگی میں آنے والے لوگوں کو اپنا چکا تھا۔ انسان سے انسان کا سب سے بڑا رشتہ تو اس چاہت اور خلوص ہی کا ہوتا ہے نا جس میں شاید اوپر والا خود اسے باندھ دیتا ہے۔ چاند بانو بھی اپنی محبت اور دیوانگی کے ساتھ اچانک اس سے آ ٹکرانے والی ایک لڑکی تھی۔ فاروق کو اچھی طرح یاد تھا کہ بمبئی سے روانہ ہوتے ہوئے چاند بانو کتنے مختصر عرصے میں زادِ راہ کے طور پر اس کے اور اس کے ساتھیوں کے لیے قسم قسم کے کھانوں سے بھرے توشے دان لیے ریلوے اسٹیشن پر آ پہنچی تھی اور کتنی فکرمندی کے ساتھ اس نے اس کے بازو پر سبز کپڑے میں سلا امام ضامن باندھا تھا۔ یہیں تک ہی نہیں، وہ تو خط لکھ کر بھی برابر اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ اس کی تحریر ہی اس کی فکر اور خیال داری کا آئینہ تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ بمبئی میں رہ کر بھی اسی کی فکر میں مبتلا ہے اور دن رات اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ اتنی محبت سے نوازنے والی چاند بانو اس بات کی تو حق دار تھی کہ وہ بھی اسے یاد رکھتا اور اپنے دیگر پیاروں کی طرح اس کے لیے بھی کوئی تحفہ لے جاتا چنانچہ اس نے وہ دوسری شال چاند بانو کے لیے خرید لی تھی۔ لیے جانے والے تحائف کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بملا کی گاڑی کی ڈکی کے علاوہ پچھلی نشست بھی اچھی خاصی گھر گئی تھی۔ اسی حساب سے وقت بھی خاصا لگ گیا تھا۔

''آپ نے شاپنگ میں اتنا سے لگا دیا۔ اب وہ آپ کی نرس مجھ پر خفا ہو گی۔'' بملا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس سے شکوہ کیا۔

''اسے میں سمجھا دوں گا۔ آپ اس کی فکر مت کریں۔'' فاروق نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ کیتھرائن بھی اس کی زندگی میں وارد ہونے والا ایک مخلص کردار تھی اور وہ اسے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ ابھی خریداری کرتے ہوئے اسے کیتھرائن کا بھی خیال آیا تھا لیکن اس نے اس خیال سے اس کے لیے کچھ نہیں خریدا تھا کہ اسے اور گولو کو کسی دن ساتھ لا کر ان کی پسند کی چیزیں دلا دے گا۔ خریدا تو اس نے ایک اور شخصیت کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ شخصیت جو اس کے لیے بہت خاص تھی لیکن ایک تو اس کے لیے آسانی سے دل کو کچھ بھاتا نہیں تھا اور دوسرے اسے معلوم تھا کہ جولیٹ جوزف اس کے کسی تحفے کو بھی شرفِ قبولیت نہیں بخشے گی۔

''یو آر سو لیٹ مسٹر فاروق۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ زیادہ لیٹ مت ہونا...... آپ ادھر ریسٹ کے واسطے آیا ہے آپ کو ریسٹ کا نیڈ ہے۔'' وہ دونوں واپس پہنچے تو گولو اور کیتھرائن کو شدت سے منتظر پایا۔ کیتھرائن نے اسے دیکھتے ہی شکوہ بھرے لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

''سوری سسٹر! بس تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی اس میں دیر لگ گئی۔ پلیز تم مس بملا سے کچھ مت کہنا کیونکہ مجھے لیٹ کروانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔'' فاروق نے نرمی سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ بملا کا بھی دفاع کیا۔

''یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔ میں آپ کو گھومنے سے منع نہیں کرتی پر آپ کو اپنے ریسٹ کا بھی کیئر کرنے کا ہے۔ ابھی اتنا مشکل سے تو آپ سیٹ ہوئے ہیں۔ ایسی کیئرلیس نیس دکھائی تو دوبارہ بھی طبیعت بگڑ سکتی ہے۔ ادھر ڈاکٹر لوگ اور مسٹر رب نواز تو مجھ سے ہی سوال کریں گے نا کہ کیسی تم وہاں کیا کرتی تھیں۔'' وہ ابھی بھی فکر بھری خفگی میں مبتلا تھی۔

''اچھا بابا سوری کہا تو ہے نا۔ ویسے بھی دیکھو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔'' فاروق نے ہاتھ سے اپنی جانب اشارہ کیا۔

''اس کے لیے میں گاڈ کی تھینک فل ہوں، بٹ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ آئندہ اپنی کیئر نہیں کرو۔ اب کبھی ایسا ہوا تو میں مسٹر رب نواز کو ٹیلی فون پر انفارم کر دوں گی۔'' اس نے فاروق کو رین کی دھمکی دی۔

''اوہو، تم تو باقاعدہ دھمکیاں دینے لگیں۔'' فاروق اس کے انداز پر ہنسا۔

''سسٹر بالکل ٹھیک بولتا ہے فاروق بھائی۔ اب بابا کا فون آئیں گا تو اپن اس کو سب بول دینے کا ہے۔'' اس بار گولو نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور کیتھرائن کی مکمل حمایت کرتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''اچھا تو بیٹا یہ تم ہو جو کیتھرائن کو الٹی پٹیاں پڑھا رہے ہو ورنہ یہ خود سے تو اتنی چالاک نہیں ہے کہ مجھے دادا کی دھمکی دے سکے۔'' اس نے گولو کو گھورا۔

''پلیز فاروق صاحب! یہ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آئندہ ہم جب بھی باہر جائیں گے وقت پر واپس آنا مسٹ ہوگا ورنہ سیر سپاٹے بند۔'' خاموش تماشائی بنی بملا نے بھی اپنا ووٹ کیتھرائن اور گولو کے حق میں دے کر آخری فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے بھئی۔ میں کان پکڑتا ہوں کہ آئندہ زیادہ دیر باہر رکنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ اب تو آپ سب خوش ہیں نا۔'' اس نے سچ مچ اپنے کان پکڑ لیے تو وہ تینوں بیک وقت مسکرا دیے۔ اسی وقت ملازم چائے لے آیا۔

''گولو یار! جاؤ ذرا گاڑی کی ڈکی سے باقی سامان تو نکال لاؤ۔ تب تک ہم کرشن صاحب کی چائے سے انصاف کرتے ہیں۔'' ملازم کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے دیکھ کر فاروق نے گولو سے کہا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھے تھیلے وہ اور بملا اٹھا کر لے آئے تھے لیکن زیادہ سامان ہونے کی وجہ سے ڈکی میں رکھی چیزیں نہیں لا سکے تھے۔ گولو اس کے حکم کی تعمیل کے لیے فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ کیتھرائن ملازم کی میز پر رکھی جانے والی ٹرے اپنی جانب کھسکا کر سب کی پسند کے مطابق چائے تیار کرنے لگی۔ اس کے چائے پیش کرنے تک گولو بھی لدا پھندا اندر آ گیا۔

''بڑی شاپنگ کر ڈالی فاروق بھائی۔ ایسا لگتا ہے پوری پوری دکانوں کا سامان اٹھا لائے ہیں۔'' تھیلوں کو نیچے قالین پر رکھتے ہوئے اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

''وہاں بمبئی میں پوری فوج بھی تو بیٹھی ہے۔ سب کے لیے تھوڑا تھوڑا لیتے اتنی ساری چیزیں جمع ہو گئیں اور وقت بھی زیادہ لگ گیا۔''

''اپن کے لیے کیا لیا ہے؟'' تھیلوں کے اندر جھانکتے ہوئے گولو نے اشتیاق سے پوچھا۔

''تمہارے اور کیتھرائن کے لیے کچھ نہیں لیا......''

''اس لیے کہ تم دونوں ان کی شکایت لگانے کی دھمکیاں دیتے ہو۔'' فاروق کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بملا نے بیچ میں لقمہ دیا۔

بھولے بھالے گولو کا چہرہ فوراً ہی اتر گیا اور وہ آہستہ سے بولا۔ ''وہ تو اپن فاروق بھائی کی بھلائی کے لیے بول رہا تھا۔''

''یہ بھی تم سے مذاق کر رہی ہیں۔ میں نے تمہارے اور کیتھرائن کے تحائف اس لیے نہیں لیے کہ تم دونوں خود میرے ساتھ چل کر اپنی پسند سے لے لینا۔ اس بہانے تمہاری تھوڑی سیر بھی ہو جائے گی۔ دونوں جب سے آئے ہو اندر ہی بند ہو کر بیٹھے ہو۔ ارے بے وقوفوں شملہ آکر اسے نہ دیکھنا دنیا کی سب سے بڑی نادانی ہے۔'' اس نے گولو کو سمجھاتے ہوئے ان دونوں کے لیے کچھ نہ خریدنے کی وجہ بتائی۔

''تھینک یو مسٹر فاروق! ہم آپ کے ساتھ سیر کرنے چلیں گے لیکن پلیز میرے لیے کوئی گفٹ مت لیجیے گا۔ ادھر چنڈی گڑھ میں بھی آپ نے بہت چیزیں دلائی تھیں۔'' اس کی بات سن کر کیتھرائن بے ساختہ ہی بول پڑی۔

''خاموش رہو لڑکی۔ یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا اور ہاں...... یہ تم بار بار مسٹر فاروق کیوں پکارتی ہو؟ میں نے شاید پہلے بھی تمہیں سمجھایا تھا کہ مجھے فاروق بھائی بولا کرو۔'' فاروق نے محبت بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا تو وہ جھینپ گئی اور آہستہ سے ''سوری'' بولا۔

بملا چائے پیتے ہوئے خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کسی بات میں دخل نہیں دیا تھا۔ چائے ختم ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد فاورق نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اس کے ساتھ کیتھرائن بھی کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے فاروق کا تفصیلی معائنہ کیا اور دوا کے متعلق پوچھا۔ فاروق نے اسے بتایا کہ دوپہر کو کھانے کے بعد بملا نے اسے دوا کی خوراک کھلا دی تھی۔

''اوکے۔ اب آپ نیم گرم پانی سے باتھ لے کر تھوڑی دیر کے لیے سو جائیں۔ اب میں رات کے کھانے کے بعد آپ کا چیک اپ کروں گی۔ آپ کا بلڈ پریشر تھوڑا سا ریسٹ کرنے سے بہتر ہو جائے گا۔'' کیتھرائن نے اسے ہدایات دیں۔

"ٹھیک ہے سسٹر۔ میں بھی ریسٹ ہی کرنا چاہ رہا تھا۔ پلیز تم خیال رکھنا کہ اس دوران مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔" فاروق نے شرافت سے اس کی بات مانتے ہوئے خواہش ظاہر کی۔ اصل میں تو اس وقت وہ آرام سے زیادہ تنہا رہنے کا خواہش مند تھا۔ بہت بھرپور دن گزارنے کے بعد اب اسے کچھ وقت اپنے ساتھ گزارنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ یہ اپنے ساتھ گزرنے والا وقت ہی تو ہوتا تھا جس میں وہ ذہن میں نقش ماضی کی تصویریں دیکھنے کے ساتھ کچھ پل جولیٹ سے بھی خیالی گفتگو کرلیا کرتا تھا اور یہی وقت حقیقت میں اس کے لیے سب کچھ ہوتا تھا۔ باقی سب تو دنیاداری کے دھندے تھے جو اسے ہر حال میں نمٹانے پڑتے تھے کہ ان سے تو کسی بھی بشر کو مفر حاصل نہیں۔

☆☆☆

"میں تمہیں پہلے ہی بول چکا ہوں مس جولیٹ کہ میں تمہیں پنجاب نہیں بھجوا سکتا اس میں اپن کا بہت خرچہ ہے پھر جب ادھر اپنا آدمی موجود ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے اتنی دور سے تمہیں بھیجنے کی۔ تم ادھر رہ کر اپنا کام کرو۔" جولیٹ کے مقابل بیٹھا ہوا رندھاوا اس کو اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔ جولیٹ کے دل میں آغا کے خلاف انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی، وہ اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اب پھر اس کے دماغ میں لہر اٹھی تھی کہ آغا کے پیچھے پنجاب جائے اور کسی طرح اس کا کام تمام کردے۔ اپنی اسی خواہش کے تحت وہ رندھاوا کے سامنے کانگریسی جلسوں کی رپورٹنگ کے لیے پنجاب جانے کا مطالبہ لے کر آئی تھی لیکن رندھاوا نے فوراً ہی اس مطالبے کو رد کردیا۔

"میں اپنے کام کی خاطر ہی وہاں جانا چاہتی ہوں سر۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں سیاسی لیڈرز کے فیملی انٹرویوز والے پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں۔ وہاں جاؤں گی تو جلسے کی رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی نمٹا لوں گی۔" رندھاوا کے انکار کے باوجود اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اپنی طرف سے ایک اچھی دلیل دی۔

"ابھی ان لیڈرز میں سے کسی کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ انٹرویو دیتا پھرے۔ آج کل بڑی گرما گرمی ہے اور سارے کے سارے گھن چکر بنے ہوئے ہیں۔ ابھی کون تمہیں انٹرویو کے لیے ٹائم دے گا؟" رندھاوا کے پاس اس کی دلیل کے جواب میں اس سے بھی مضبوط دلیل موجود تھی۔

"کوشش کرنے میں کیا برائی ہے؟" جولیٹ منمنائی۔

"برائی یہ ہے کہ میرا روکڑا خرچ ہوگا اور میں بنا فائدے کے ایک پیسا بھی خرچ نہیں کرتا۔" رندھاوا نے اسے صاف جواب دیا اور مزید بولا۔ "ادھر بمبئی میں بھی کم لوگ نہیں رہتے۔ تم ان کے فیملی انٹرویوز کرلو۔ ابھی سارے لیڈر لوگ تو ایک دم اٹھ کر ادھر سے نہیں چلے گئے ہیں۔ سیاسی لیڈروں کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں بمبئی میں۔ اداکار، گلوکار، صنعت کار تم جس کا دل بولے انٹرویو لے لو۔"

"وہ ٹھیک ہے سر لیکن سارے بڑے لیڈر تو اس ٹائم ایک ٹیم بن کر جلسے کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ ابھی جو ٹائم چل رہا ہے اس میں ان ہی لوگوں کی زیادہ ڈیمانڈ ہے۔ پبلک کا سارا انٹرسٹ ان لوگوں میں ہے۔ اگر ابھی ہم ان کے پولیٹیکل ویوز اور فیملی لائف کو کمبائن کرکے انٹرویو چھاپیں گے تو نیوز پیپر کی سیل بڑھ جائے گی۔" اس نے رندھاوا کو ترغیب دی۔

"تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔ ایسا کرو کہ خاص خاص لوگوں کی لسٹ بنا کر ان کے انٹرویو کے لیے سوالات کی لسٹ بنالو۔" رندھاوا نے اس کی دلیل سے قائل ہوکر بولنا شروع کیا تو وہ اپنا تیر نشانے لگتا دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"سوالات کی لسٹ بنانے کے بعد مجھے دے دینا۔ میں ادھر پنجاب میں اپنے آدمی کو بھجوا دوں گا۔ وہ ان سے انٹرویوز لے کر یہاں ہمیں بھجوا دے گا۔"

رندھاوا نے اپنی بات مکمل کی تو اس کی امیدوں پر اوس پڑگئی اور وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ "یہ میرا پروجیکٹ ہے سر۔ آپ کسی اور کو کیسے یہ کام دے سکتے ہیں؟"

"یہ میرے نیوز پیپر کا پروجیکٹ ہے اور میں اسے کسی کے بھی ذمے لگا سکتا ہوں، بٹ یو ڈونٹ وری۔ ادھر پنجاب میں بیٹھے بندے سے میں صرف کام لوں گا، انٹرویو پر نام تمہارا ہی جائے گا۔ اس بندے کا نام تم چاہو تو اپنے معاون کے طور پر چھاپ دینا۔" رندھاوا نے اس کے احتجاج کو خاص اہمیت نہیں دی۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کرسکتی۔ اگر آپ خرچ بچانے کے لیے مجھے وہاں نہیں بھیجنا چاہتے تو میں اپنے خرچے پر چلی جاتی ہوں۔" اس نے رندھاوا کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے ایک اور حل پیش کیا۔ اسے ہر حال میں آغا تک پہنچنا تھا اور یہ کام وہ اپنی صحافتی ڈھال کے ساتھ ہی کرسکتی تھی۔ نیوز پیپر کی رپورٹر کی حیثیت سے ہی جلسے میں اسے آگے کے حصے میں جگہ ملتی جہاں سے وہ آغا کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ اگر یہ مجبوری نہیں ہوتی تو وہ رندھاوا کے ساتھ اتنی بحث کرنے کے بجائے خود ذاتی طور پر وہاں پہنچ جاتی۔

آغا اسے ٹیلی فون پر بھی نہیں مل رہا تھا ورنہ وہ اس سے ملاقات کا وقت لے کر بھی اپنا کام کر سکتی تھی۔ دن رات اسے تحائف بھجوانے اور ٹیلی فون کالز کرنے والا آغا مطلب برآری کے بعد اس سے بالکل غافل ہو گیا تھا اور ہر بار اسے فون کرنے پر اس کا پی اے یہی جواب دیتا تھا کہ آغا صاحب مصروف ہیں اور ملاقات تو دور کی بات ان سے فون پر بھی گفتگو کرانا ممکن نہیں ہے۔

''آر یو کریزی گرل؟ میں کتنی دیر سے سمجھا رہا ہوں کہ تمہیں وہاں نہیں بھجوا سکتا چاہے تم اپنے خرچ پر ہی کیوں نہ جانا چاہو۔ ادھر دفتر میں تمہاری ضرورت ہے۔ رادھے چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ عارف کی جگہ جو نئی لڑکی آئی ہے وہ ٹھیک طرح سے ٹرینڈ نہیں ہے۔ ایسے میں تم بھی چلی گئیں تو ادھر کا کام کون سنبھالے گا۔'' اس بار رندھاوا کے لہجے میں غصے کی تیزی در آئی۔ اس کا انداز دیکھ کر جولیٹ کے پاس مزید بحث کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ مایوسی کے عالم میں رندھاوا کے آفس سے باہر آ گئی۔ دفتر میں اس کا سارا وقت عجیب سی کیفیت میں گزرا۔ وہ جلدی حوصلہ ہار جانے اور مایوس ہو جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ اسے تو زندگی کے تاریک پہلوؤں میں سے روشنی کی کرن ڈھونڈ نکالنے کی عادت تھی لیکن پے در پے حادثات نے اسے جس طرح توڑا تھا اس کا اثر اس کی شخصیت پر بھی پڑا تھا۔ وہ پہلے جیسی متوازن اور سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک نہیں رہی تھی۔ انتقام کے شعلے بھڑا بھڑا اسے اندر سے جلا رہے تھے اور بظاہر پرسکون نظر آتی اس کی شخصیت کی تہ میں ڈھیروں طوفان کروٹیں لیتے رہتے تھے۔ وہ سب کچھ جلا کر تہس نہس کر دینے یا اپنی ایک ٹھوکر سے تباہ کر دینے کے درپے تھی لیکن اسے وہ ایک ٹھوکر لگانے کا موقع ہی تو نہیں مل رہا تھا۔ بے بسی کے شدید احساس کے تحت اس نے کسی مشین کی طرح اپنا کام نمٹایا اور دفتری اوقات ختم ہونے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئی۔ طبیعت ایسی اچاٹ تھی کہ گھر بھی واپس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن گھر نہ جاتی تو اور کہاں جاتی چنانچہ ناچار اسی سمت روانہ ہو گئی۔

دنیا وہی تھی اس کے مناظر بھی وہی تھے لیکن اس کے لیے سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس کے لیے ہر منظر اپنی اہمیت اور کشش کھو بیٹھا تھا۔ اپنے اسٹاپ پر پہنچنے کے بعد جب وہ پیدل گھر کی طرف روانہ ہوئی تو گلی کے نکڑ پر خود بخود ہی اس کے قدم سست پڑ گئے۔ یہاں وہ عجیب و غریب فقیر بیٹھا کرتا تھا جس نے کبھی اس کے دیے سکوں کو شرف قبولیت نہیں بخشا تھا اور ہمیشہ اسے نادان اور عقل کی اندھی قرار دیتا رہا تھا۔ وہ فقیر بالکل اچانک ہی دنیا سے چلا گیا تھا لیکن اس کی باتیں کبھی کبھی اسے یاد آتی تھیں۔ اب بھی اس کی خالی جگہ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ غلط سمت تو نہیں چل رہی تھی ورنہ ایسا کیا تھا کہ اس کی آغا تک پہنچنے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی تھی یا پھر یہ کہ ابھی اس خبیث کے انجام کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی ابھی وہ نکڑ سے گزر کر اپنی گلی میں داخل ہوئی۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہوتے ہوئے سب سے پہلا مکان ربن دادا کا اڈا تھا۔ اڈے کے بڑے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے بے ساختہ ہی اس شخص کا خیال آیا جو ہر روز یہاں اس کی راہ میں پلکیں بچھائے کھڑا رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا ایک شیش محل تھیں جس کے ہر آئینے میں جولیٹ کا ہی عکس نظر آتا تھا پر وہ خود اپنے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتی تھی یا دوسرے الفاظ میں اسے کوئی گنجائش دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ جس بدنام دنیا سے تعلق رکھتا تھا، وہ اسے کسی طور اچھا تسلیم کر ہی نہیں سکتی تھی۔ نادان کو خبر نہیں تھی کہ کیچڑ میں بھی کنول کھلا کرتے ہیں اور وہ تو وہ تھا جسے حالات کی آندھی اس کیچڑ تک لے آئی تھی اور اس کی جڑیں اس کیچڑ سے بہت دور کہیں ایسے مقام پر تھیں کہ جس کے بارے میں وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

فلم یونٹ میں شامل لوگوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ چاند بانو عرف چاندنی کے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی کے رنگ دیکھ رہے تھے۔ خوشی کے ان رنگوں نے بمبئی سے روانہ ہوتے وقت ہی اپنی جھلک دکھلا دی تھی اور جیسے جیسے بمبئی سے شملہ کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، ان رنگوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جو پہلے ہی قدرت کی طرف سے فیاضی سے نواز کر بھیجی گئی تھی، ان رنگوں میں رنگ کر اور بھی حسین لگنے لگی تھی۔ شملہ تک کا تھکا دینے والا سفر اس نے یوں طے کیا تھا جیسے پھولوں بھرے راستے پر قدم رکھتی آئی ہو۔ شملہ پہنچ کر تو گویا اس کا انگ انگ گنگنانے اور مسکرانے لگا تھا۔ دیکھنے والوں کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ شملہ کا حسن زیادہ سحر انگیز ہے یا چاند بانو کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ۔ زمرد بائی بھی یہ سب دیکھ اور سمجھ رہی تھی۔ اسے اپنے کوٹھے پر موجود ہر لڑکی کے انداز و اطوار معلوم تھے اور وہ ان کے دلوں کے بھید تک رسائی حاصل کرنے کا گر بھی خوب جانتی تھی پھر چاند بانو کے دل کا حال کیسے نہ سمجھتی کہ اس سے تو اس کا خونی رشتہ تھا۔ ہاں البتہ اب تک اس نے چاند بانو

سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی اور صرف خاموشی سے مشاہدہ کرنے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔ چاند بانو اپنے آپ میں اتنی مگن تھی کہ اسے زمرد بائی کی نگاہوں کی تیزی کی خبر ہی نہیں تھی۔ اس کے لیے تو اس وقت یہ نعمت ہی سب سے بڑی تھی کہ وہ اس فضا میں سانس لے رہی ہے جہاں اس کا محبوب موجود ہے اور وہ ذرا سی کوشش کر کے اس سے مل بھی سکتی ہے۔ یہ کوشش کرنے میں اس نے ذرا تاخیر نہیں کی اور سامان وغیرہ رکھنے اور کھانے پینے کے بعد جیسے ہی فرصت کی پہلی گھڑی آئی، فرمائش لیے انیل کمار کے کمرے میں پہنچ گئی۔ آج کا دن یونٹ میں شامل افراد کو آرام کے لیے دیا گیا تھا۔ طویل اور دشوار سفر نے سب ہی کو تھکا دیا تھا اس لیے یہ آرام ضروری تھا۔ کام کا آغاز آنے والے نئے دن سے کیا جاتا۔ انیل کمار خود بھی آرام کے موڈ میں تھا۔

''یس کم ان۔'' دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ چونکا اور بادل ناخواستہ اجازت دی۔ اجازت کے نتیجے میں دروازہ کھلا اور چاند بانو اندر داخل ہوئی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے روبرو یوں تنہا آئی تھی ورنہ زمرد بائی تو اسے سیٹ پر بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ چاند بانو اس کا انمول ہیرا تھی اور وہ اس ہیرے کی رکھوالی خوب دل جمعی سے کرتی تھی۔

''تم...... تم یہاں کیسے؟'' انیل کمار نے نہایت حیرت کے ساتھ اس سے دریافت کیا۔

''ہمیں آپ سے ایک ضروری کام تھا اس لیے آپ کو زحمت دی ہے۔ آپ کے آرام میں خلل ڈالنے پر معذرت چاہتے ہیں۔'' چاند بانو نے اپنی گنگناتی آواز میں اپنی آمد کی وضاحت دی۔

''زحمت کیسی۔ ہمارے تو بھاگ جاتے..... ہیں کہ دیوی نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ آؤ بیٹھو۔ بتاؤ میں تمہاری کیا سیوا کر سکتا ہوں۔'' انیل کمار پر فوراً ہی عاشقانہ مزاج طاری ہونے لگا۔ کوٹھے پر رہ کر چاند بانو نے ایسے عشق کے مظاہرے بہت دیکھے تھے اس لیے اس کی باتوں کو خاطر میں نہ لائی اور اس کی دعوت پر نہایت تمکنت اور نزاکت سے ایک دبیز صوفے پر ٹک گئی۔

''بائی جی کہاں ہیں۔ وہ نظر نہیں آرہیں تمہارے ساتھ؟'' انیل کمار کے لیے اس کی تنہا آمد جیسے کوئی ناقابلِ یقین واقعہ تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ ابھی زمرد بائی بھی چاند بانو کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلی آئے گی۔

''وہ سفر سے تھک گئی ہیں اس لیے اپنے کمرے میں آرام فرما رہی ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انیل کمار کے سوال کا جواب دیا اور پھر اسے مزید کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

''ہمیں یہاں اپنے ایک شناسا سے ملاقات کے لیے جانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے وہاں جانے کا بندوبست کروادیں۔''

''ابھی اسی وقت؟'' انیل کمار حیران ہوا۔

''جی ہاں۔'' چاند بانو نے مختصر جواب دیا۔

''آج آرام کرلیتیں تو اچھا تھا۔ سفر نے تھکا ڈالا ہوگا۔'' اس بار انیل کمار نے ہمدردی جتائی۔

''آپ بس ہمیں بھجوانے کا بندوبست کردیں۔ آرام کی فی الحال ہم ضرورت محسوس نہیں کررہے۔'' اس کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود لہجہ دوٹوک تھا۔

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو۔ کہاں جانا ہے؟'' انیل کمار نے ہتھیار ڈال دیے۔ جواب میں چاند بانو نے پتا لکھا کاغذ اپنی مٹھی سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ پتا دیکھ کر انیل کمار چونک گیا۔

''یہ تو بھابیہ سیٹھ کا ایڈریس ہے۔'' بے ساختہ ہی اس نے اپنی حیرت کا اظہار بھی کردیا۔ وہ فلمی یونٹ کے ساتھ ماضی میں بھی شملہ آچکا تھا۔ اس وقت وہ بھابیہ کی رہائش گاہ پر ہی رکا تھا لیکن اس بار بھابیہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ وہاں پہلے سے ہی کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ البتہ متبادل کے طور پر اس نے اس جگہ کا انتظام ضرور کروادیا تھا۔

''اس سے ہم واقف نہیں۔ ہمیں تو یہاں اپنے ایک واقف کار سے ملاقات کے لیے جانا ہے۔'' چاند بانو نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''میں اپنے یونٹ میں شامل افراد کو آزادانہ ادھر ادھر آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح شیڈول پر اثر پڑتا ہے اور کام ٹائم پر پورا نہیں ہوتا۔'' انیل کمار کو اس کی بے نیازی نے خفا کیا۔

''ہمارے کہیں آنے جانے سے آپ کا کام متاثر نہیں ہوگا، اس کی ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں۔ یوں بھی ابھی تو کام کا آغاز ہی نہیں ہوا۔'' چاند بانو کے ٹھہراؤ میں اس کی خفگی سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ عمر مختصر تھی لیکن آدمی کی پہچان رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ انیل کمار اس پر اپنی دھونس نہیں جما سکتا۔

''ٹھیک ہے۔ اپنی اس بات کو یاد رکھنا۔ کام میں میری طرف سے کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔'' کاغذی شیر

نے اپنا بھرم قائم رکھنے کو اسے رعب دکھایا۔

''جی بالکل۔'' اس بار چاند بانو کا جواب مختصر تھا۔

''کتنی دیر بعد روانہ ہونا ہے تمہیں؟'' انیل کمار جو اسے اپنے کمرے میں تنہا آتے دیکھ کر بہت خوش تھا، اب رکھائی سے پوچھ رہا تھا۔

''بس آدھا گھنٹا لگے گا ہمیں تیاری میں۔'' اس نے جواب دیا اور فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں واپس پہنچی تو زمرد بائی ہنوز محوخواب تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اپنی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ زمانے کا چلن ہے کہ عورت اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے جائے تو خوب سج سنور کو سولہ سنگھار کر کے نکلتی ہے لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ چاند بانو نے فاروق سے ملاقات کے لیے اپنے پاس موجود ملبوسات میں سے سب سے سادہ لباس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ فہم وفراست رکھنے والی لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ فاروق سے ملاقات کے لیے سنگھار سے زیادہ باوقار نظر آنے کی ضرورت تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کے کرتے پاجامے پر اولی کا ہم رنگ دوپٹا اور دوپٹے پر بنی گہرے سبز رنگ کی کروشیے کی بیل بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کرتے کی کلیوں پر بھی گہرے سبز رنگ کی نازک سی بیل کڑھی ہوئی تھی۔ سیدھی مانگ کے ساتھ بنائی گئی بالوں کی لمبی سے چوٹی اور نشیلی آنکھوں میں لگی کاجل کی ہلکی سی لکیر نے ہی اس کی تیاری کو مکمل کردیا تھا اور اسے کسی سرخی وغازے کی احتیاج محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تیاری کے آخری مرحلے میں اس نے ہلکی خوشبو والا عطر لگایا پھر کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی کہ زمرد بائی کی آنکھ کھل گئی۔

''ہم ذرا فاروق صاحب کی عیادت کے لیے جارہے ہیں۔'' زمرد بائی کے سوال کرنے سے قبل ہی اس نے اسے اپنی روانگی سے آگاہ کردیا۔ زمرد بائی کے علم میں تھا کہ فاروق ان دنوں بغرضِ علاج شملہ میں مقیم ہے اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ چاند بانو موقع پاکر اس سے ملاقات کے لیے ضرور جائے گی لیکن اتنی جلدی کی اسے بھی امید نہیں تھی۔

''جانا تھا تو ہمیں بھی بتا دیتیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ''عیادت'' کے لیے۔'' اس نے لفظ عیادت پر زور دیتے ہوئے چاند بانو سے کہا۔

''آپ تھکی ہوئی تھیں اس لیے ہم نے آپ کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کسی اور دن ہمارے ساتھ چلیے گا۔'' چاند بانو نے اس کے طنزیہ لہجے کا نہایت رسانت سے جواب دیتے ہوئے واضح کردیا کہ یہاں قیام کے عرصے میں وہ متعدد بار فاروق سے ملاقات کے لیے جاسکتی ہے۔ زمرد بائی اس کا مطلب سمجھ کر تلملا گئی اور ذرا تیز لہجے میں بولی۔

''تم نے ہماری تربیت کو بالکل خاک میں ملا دیا چاند بانو! ہم نے تو اتنے اہتمام سے تمہاری پرورش کی تھی کہ کسی شہزادے کا انتخاب ٹھہرتیں لیکن تم نے اپنے لیے منتخب بھی کیا تو کسے؟ ربن دادا کے اڈے پر رہنے والے ایک غنڈے کو......''

''آپ فاروق صاحب کو غنڈا کہہ کر ان کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ ان کی صحبت میں کبھی وقت گزار کر دیکھیے گا تو خود ہی جان لیں گی کہ وہ کتنے مہذب اور باوقار انسان ہیں۔ رہی بات اپنے لیے انہیں منتخب کرنے کی تو اطمینان رکھیے آپ کی تمام تر تربیت کے باوجود ہم تو اس شخص کا نظرِ انتخاب بھی نہیں ٹھہرے جنہیں آپ اتنی حقارت سے غنڈا قرار دے رہی ہیں۔'' چاند بانو کی آواز رنج وکرب کے عالم میں لہرا سی گئی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور سنبھل کر بولی۔ ''فی الحال ہمیں اجازت دیجیے۔ گاڑی آگئی ہوگی۔ ہمیں تاخیر ہورہی ہے۔'' زمرد بائی نے ہونٹوں کو بھینچ کر سر کو ایک جھٹکا دیا لیکن چاند بانو کو جانے سے نہیں روکا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ چاند بانو نے اس سے اجازت نہیں لی، صرف آگاہ کیا ہے ایسے میں اگر وہ اسے زبردستی روکنے کی کوشش کرتی تو نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ اسے چاند بانو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑسکتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ چاند بانو اس کے مقابل کھڑی ہو۔ چاند بانو اسے عزیز بھی تھی اور اس کے لیے اہمیت بھی رکھتی تھی۔

کوٹھے پر موجود لڑکیاں اگرچہ اس کی مشاق نگاہوں کا انتخاب تھیں اور اس نے کسی جوہری کی ہی طرح ان کی تراش خراش کی تھی لیکن ہر ہیرے میں تو کوہ نور ہیرے کی سی بات نہیں آسکتی تھی نا۔ چاند بانو تو اس کا کوہ نور ہیرا تھی اور ابھی تو وہ اس ہیرے کو پوری طرح سے دنیا کے سامنے لائی بھی نہیں تھی۔ فلم مکمل ہوکر ریلیز ہوجاتی تو پھر چاند بانو کی شان دیکھنے والی ہوتی۔ زمرد بائی سے بڑھ کر کون یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ فلم منظرعام پر آنے کے بعد اس کے کوٹھے پر چاند بانو کی خاطر کیسے قدردانوں کا ہجوم لگ جاتا۔ وہ اس ہجوم میں سے ہی چاند بانو کے لیے کوئی بہت عمدہ شخص منتخب کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ چاند بانو کے ہوش ربا حسن پر بڑے بڑے نواب زادے عاشق ہوجاتے۔ اسے ان عاشقوں میں سے ہی کسی ایسے کو منتخب کرنا تھا جو چاند بانو

کی قدر دانی کی صحیح قیمت ادا کر پاتا۔ فلموں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ چاند بانو اگر کسی بڑے نواب کی وظیفہ خوار بن جاتی تو برسوں کی بے فکری ہو جاتی۔ مگر فکر کا مقام یہ تھا کہ چاند بانو کسی بڑے نواب کو اپنی زلفوں کے جال میں الجھانے سے قبل خود مبتلائے عشق ہو گئی تھی اور اس کا یہ عشق زمرد بائی کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ طوائف کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ من چلوں کو خود پر عاشق کرواتی رہے لیکن اپنے دل کو آزاد رکھے کیونکہ جب طوائف کا دل عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے اندر کی عورت جاگنے لگتی ہے اور اس عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے محبوب کی چھاؤں میں عزت کی زندگی گزارے لیکن طوائف کو عزت کی زندگی بھی تو راس نہیں آتی۔ معاشرہ اسے اچھوت سمجھتا ہے اور اگر وہ شرفاء کے درمیان شرافت سے بسنے کی کوشش کرے تو وہ پوری جان لڑا کر اسے اپنے درمیان سے نکال پھینکتے ہیں۔ زمرد بائی اس اذیت ناک تجربے سے گزر چکی تھی اور چاند بانو کو اس تجربے سے بچانے کی اس نے ہمیشہ کوشش کی تھی لیکن وائے قسمت کہ چاند بانو مبتلائے عشق ہو گئی تھی اور وہ بھی اتنی عجیب جگہ کہ خود زمرد بائی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اڈے سے وابستہ فاروق نہ تو شرفاء کی دنیا میں قابلِ قبول تھا اور نہ ہی خود ان کی اپنی دنیا میں اس کی گنجائش تھی کہ وہ صرف نوابوں اور ساہوکاروں کے لیے ہی اپنے در کھول سکتی تھیں کیونکہ وہی تھے جو بازارِ حسن میں سجی حسن کی مورتیوں کی منہ مانگی قیمت ادا کر سکتے تھے۔

ادھر چاند بانو اس کی فکروں اور سوچوں سے بے نیاز گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی حالتِ سفر میں تھی۔ اس کی قلبی کیفیت کی طرح باہر کے مناظر بھی بہت خوب صورت تھے۔ وہ گاڑی کی کھڑکی سے بے حد اشتیاق سے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔ جلد ہی گاڑی ذرا بلندی پر گھوم کر جاتے ہوئے راستے پر سفر کرنے لگی۔ یہاں درختوں اور سبزے کی بہتات تھی۔ گاڑی نے وہ گھومتا ہوا راستہ طے کیا تو اس کے سامنے ترچھی سرخ چھتوں والی بھابیہ کی دو منزلہ رہائش گاہ آگئی۔ ڈرائیور نے دروازے کے قریب گاڑی روکی اور خود پہلے نیچے اتر کر دستک دی۔ چاند بانو سے اس موقع پر صبر نہیں ہو سکا اور وہ بھی گاڑی سے اتر کر ڈرائیور کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ دستک کے جواب میں ایک ملازم صورت شخص نے دروازہ کھولا۔

''میڈم چاندنی، مسٹر فاروق سے ملاقات کے لیے آئی ہیں۔'' ڈرائیور نے ملازم کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

''اندر آجائیں۔'' ملازم میڈم چاندنی کو تو نہیں جانتا تھا لیکن چاند بانو کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اندر جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ایک تو رعب حسن تھا، دوسرے فاروق کی ملاقاتی ہونے کا حوالہ اس لیے وہ مزید کوئی سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ اس کے راستے سے ہٹنے پر چاند بانو کے ساتھ آیا ڈرائیور بھی ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور وہ شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

''آیئے۔ ادھر پدھاریے۔'' ملازم اسے اپنی راہنمائی میں لیونگ روم تک لے گیا اور ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ چاند بانو ابھی صوفے پر بیٹھ ہی رہی تھی کہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ بملا تھی جو سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے ہوئے ملازم سے کہہ رہی تھی۔

''کرشن! فاروق صاحب کے لیے مرغی کی یخنی یاد سے بنا لینا۔ ساتھ میں کوئی میٹھا بھی ہونا چاہیے۔ باقی تم جو ہم لوگوں کے لیے پکا رہے ہو، وہی وہ بھی کھالیں گے۔''

''جی اچھا میڈم۔'' کرشن نے فوراً تابعداری کا مظاہرہ کیا۔ اسی وقت بملا کی نظر صوفے پر بیٹھی چاند بانو پر پڑ گئی۔ سادگی کے باوجود اس کے حسن کی جگمگاہٹ چھپنے والی نہیں تھی۔ بملا بے ساختہ ہی اس کی طرف بڑھی۔

''یہ میڈم چاندنی ہیں میڈم۔ فاروق صاحب سے ملاقات کے لیے آئی ہیں۔'' کرشن نے جلدی سے بملا کو چاند بانو کے بارے میں آگاہ کیا۔

''ہیلو۔'' بملا چاند بانو کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ سیاہ مہین سی جارجٹ کی ساڑی اور تنگ بلاؤز میں وہ بڑی تیکھی لگ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں موجود ہیرے کے ٹاپس اس کی گندمی رنگت میں اپنی شعاعوں کی دھنک بکھیر رہے تھے۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ اور فطری اعتماد نے مل کر اس کی شخصیت کو مزید جاذبِ نظر بنا دیا تھا پھر بھی چاند بانو کے حسن کے سامنے اس کا ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔

''آپ کون؟'' چاند بانو نے قدرے تعجب اور تجسس کے ساتھ اس سے دریافت کیا۔ بملا کی یہاں موجودگی نے اسے حیران کیا تھا۔ بمبئی ریلوے اسٹیشن پر وہ خود فاروق کو رخصت کرنے گئی تھی اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ صرف کیتھرائن کو بطور نرس دیکھا تھا اس لیے اس کے سوا یہاں کسی اور نسوانی وجود کی موجودگی کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

''مجھے بملا بھابیہ کہتے ہیں اور آپ؟'' بملا کا انداز غیر ارادی طور پر ہی جارحانہ تھا۔ شاید چاند بانو کے سادہ حسن کے سامنے اپنی اتنی تیاری کو ماند پڑتا دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر ہی اسے اپنا حریف تصور کر بیٹھی تھی۔

"جی ہم وہ......" چاند بانو بملا کے تعارف سے یہ تو سمجھ گئی کہ وہ یہاں کی مالکن ہے لیکن اس کا انداز اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا اس لیے ذرا سا گڑبڑا گئی۔ ویسے بھی بملا کی طرح اس کے پاس باپ کا زوردار حوالہ نہیں تھا جو وہ فخر سے اپنا تعارف کروا پاتی۔

"آپ فاروق صاحب کو بلوا دیجیے۔ وہ ہم سے اچھی طرح واقف ہیں۔" لمحہ بھر گڑبڑانے کے بعد اس نے خود کو سنبھال کر بملا سے مدعا بیان کیا۔

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے فاروق صاحب آپ سے واقف نہ ہوں یا پھر اس وقت وہ آپ سے ملنا نہ چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں انہیں ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔" اس کے لہجے کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ نے ہی بملا کے حوصلے کو مزید بلند کر دیا اور وہ اپنے جارحانہ انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے بولی۔ اس کے اس انداز پر چاند بانو نے بے بسی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ آنکھوں میں ذرا سی حیرت اور ذرا سی پریشانی لیے اس ادا کے ساتھ وہ اور بھی حسین لگنے لگی۔ بملا کو بلاوجہ ہی اس سے رقابت کا احساس ہوا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔" چاند بانو سی کم عمر لڑکی کے سامنے وہ ایک پختہ عمر کی تجربہ کار عورت تھی اس لیے مسلسل اس پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاند بانو اگر اس وقت اس کے مکان کے بجائے اپنے کوٹھے پر بیٹھی ہوتی تو بملا کی دودھاری تلوار جیسی زبان کا خوب مقابلہ کرسکتی تھی لیکن یہاں وہ فاروق سے ملنے آئی تھی اور کسی سے غیرضروری طور پر الجھ کر کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے آہستہ سے بولی۔

"ہم چاند بانو ہیں۔"

"فاروق سے کیا تعلق ہے؟" اپنا زیادہ سے زیادہ استحقاق ظاہر کرنے کے لیے اس نے فاروق کے نام کے ساتھ اس بار صاحب لگانے کا تکلف نہیں کیا اور چاند بانو سے ایک مشکل سوال کر ڈالا۔

"ہم نے کہا نا کہ وہ ہم سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ انہیں ہماری آمد کی اطلاع تو دیجیے۔" اس بار چاند بانو کے لہجے میں بھی ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی۔

"سوری۔ وہ آرام کر رہے ہیں اور میں انہیں ڈسٹرب نہیں کرسکتی۔ اگر آپ ان کے جاگنے تک انتظار کر سکتی ہیں تو شوق سے بیٹھیے ورنہ بعد میں انہیں آپ کے آنے کی اطلاع دے دی جائے گی۔ آپ کسی اور دن آ کر ان سے ملاقات کر لیجیے گا۔" بملا بڑے اطمینان سے اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بے نیازی سے بولی تو اسے شدید سبکی کا احساس ہوا۔ وہ تو وہ تھی کہ اس کی دید کے لیے بھی لوگ منتظر رہا کرتے تھے اور یہاں وہ خود چل کر آئی تھی تو اسے فاروق سے ملاقات کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔ آپ فاروق صاحب کو ہماری آمد سے مطلع کر دیجیے گا۔" واپسی کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے اس کا انداز ذرا شکست خوردہ تھا۔ بملا نے اپنے دل میں بڑی کمینی سی خوشی محسوس کی۔ چاند بانو باہر نکل گئی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے اس لڑکی کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی کر دی ہے......لیکن کیوں؟ جب یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا تو وہ خود تھوڑی سی الجھ گئی اور اپنا تجزیہ کرنے لگی۔ چاند بانو کے ساتھ اس سلوک کی واضح وجہ اس سے محسوس ہونے والی رقابت تھی لیکن یہ رقابت محسوس ہی کیوں ہوئی تھی؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ اپنی سادگی کے باوجود اس سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی......تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ وہ خوش شکل ضرور ہے لیکن ایسی بھی حسین نہیں کہ اس کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکے۔ اس کی اپنی کولیگز میں سے دو ایک خواتین ایسی تھیں جو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت تھیں لیکن اس نے کبھی ان خواتین سے تو ایسا حسد محسوس نہیں کیا تھا جو چاند بانو کے لیے محسوس ہوا تھا۔ چاند بانو سے حسد کی کیا وجہ تھی؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے اس کے سامنے جو نام آیا وہ "فاروق" کا نام تھا۔ وہ دنگ رہ گئی۔ اس پر بالکل اچانک ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ ان چند دنوں میں ہی وہ فاروق کے اتنے قریب ہوچکی ہے کہ کسی اور کو اس کے اور اپنے درمیان برداشت نہیں کرسکتی۔ چاند بانو سے بھی اس کے ایسے سلوک کی وجہ یہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر فاروق کے نام کے چراغ جل رہے تھے اور اصل میں اس نے چاند بانو کے حسن سے نہیں بلکہ اس کی آنکھوں سے چھلکتے جذبوں سے رقابت محسوس کی تھی۔ رقابت جو شاید محبت کے بعد انسان کے دل میں فوری طور پر جنم لینے والا سب سے طاقتور جذبہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

حیدر آباد جانے والی ریل میں سوار جوزفین کا اپنا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی ساری عمر بمبئی میں گزاری تھی اور سچ یہ تھا کہ اس نے بمبئی بھی بہت کم دیکھا

تھا۔ اس کی بہت محدود سی زندگی تھی اور اپنے گھر اور تعلیمی اداروں سے ہٹ کر وہ شاذونادر ہی کہیں جا پاتی تھی۔ کہیں جانے کی نہ تو ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی اتنے وسائل تھے کہ وہ بلاوجہ ادھر ادھر گھومتی پھرے۔ ماں کے مرنے کے بعد ملازمت کی تلاش میں ہی اس کا دو چار جگہ جانا ہوا تھا لیکن ایسے تمام مواقع پر بھی جوزف اس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے حالات کے جال میں پھنسا ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہوتا تھا اس کا ساتھ ضرور دیتا تھا اور آج وہ ہر دم ساتھ دینے والا پیچھے رہ گیا تھا۔ ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے جوزفین نے اس کی آنکھوں میں یہ خواہش دیکھی تھی کہ وہ حیدرآباد تک اس کے ساتھ چلے لیکن آج کل اس کی ماں کی طبیعت بہت زیادہ ہی خراب تھی اور وہ کسی صورت اسے چھوڑ کر کہیں آ جا نہیں سکتا تھا۔ جوزفین نے پہلے ہی اس سلسلے میں اسے بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور وہ اچھا لڑکا خود بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ ماں کی خدمت اس پر فرض ہے۔ جوزفین کا بس چلتا تو وہ خود بھی ان حالات میں دور نہ جاتی کہ بچپن کا ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے خود بھی جوزف کی ماں سے بہت محبت تھی لیکن زندگی بڑی ظالم شے ہے۔ اسے جاری رکھنے کے لیے انسان کو اپنے بہت سے جذبات کو مارنا پڑتا ہے۔

وہ جس سرکاری افسر کی بیگم کے حوالے کے ساتھ حیدرآباد جا رہی تھی، اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ نواب صاحب کے ہاں ملازمت اس کے لیے نہایت عمدہ ثابت ہوگی اور وہاں وہ بے حد آسودہ زندگی گزار سکے گی اس لیے اسے اس موقع کو بالکل بھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ اس نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر جوزفین وہاں پہنچنے میں تاخیر کرے گی تو کسی اور کو ملازمت مل جائے گی اور اس کے شوہر کی سفارش بھی کام نہیں آسکے گی، اس لیے وہ دل پر پتھر رکھ کر عازم سفر ہوگئی تھی۔ اس سفر میں اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ ایک طرف اپنی پیاری آنٹی کی خدمت نہ کرسکنے کا قلق تھا تو دوسری طرف بمبئی چھوڑ کر جاتے ہوئے دل دکھ رہا تھا۔ کچھ تنہا اتنے طویل سفر کی گھبراہٹ بھی تھی اور مستقبل کے اندیشے بھی کہ اگر سفارش کے باوجود ملازمت نہ ملی تو کیا ہوگا؟ اس کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ اس سفر کے اخراجات پر لگ گئی تھی اور اس کے پاس بس اتنے روپے تھے کہ ملازمت نہ ملنے کی صورت میں وہ واپس بمبئی آسکے۔ راستے میں کھانے کے لیے اس نے تلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ دو روٹیاں اپنے ٹفن میں رکھی تھیں، اس کے علاوہ بس بھنے ہوئے چنے اور پانی کا کولر تھا۔ ہاں ٹرین میں چڑھتے

چڑھتے جوزف نے اسے کاغذ میں لپٹے تھوڑے سے پکوڑے بھی تھما دیے تھے اور وہ مطمئن تھی کہ ان چیزوں کے سہارے اس کا سفر آسانی سے کٹ جائے گا۔ اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور وہ تھی بھی تنہا اس لیے کہیں اسٹیشن پر اتر کر اپنے لیے کھانے پینے کا سامان نہیں خرید سکتی تھی۔ ایسے میں بھوک بجھانے کے لیے چنے اور پانی اچھا ساتھ دے سکتے تھے۔ زنانہ ڈبے میں بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے کافی دیر تو وہ خود میں ہی اس حد تک مگن رہی کہ گرد و پیش کا جائزہ لینے کا بھی خیال نہیں آیا لیکن آخر کب تک خود میں گم رہتی۔ کسی چھوٹے بچے کے رونے کی تیز آواز نے اسے اپنے ماحول میں حاضر ہونے پر مجبور کر دیا۔ بچہ مشکل سے سات آٹھ ماہ کا تھا اور شاید بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا۔ اس کی نوعمر ماں نے اسے بہلاتے ہوئے اپنی بڑی سی چادر کی اوٹ میں اسے چھاتی سے لگا لیا۔ فوراً ہی بچے کے رونے کی آواز بند ہوگئی۔ اس منظر کو دیکھتی جوزفین تلخی سے مسکرا دی۔

''بھوک'' کی جلن اور دکھ کو وہ نہ سمجھتی تو اور کون سمجھتا۔ یہ وہ آگ تھی جو چھوٹے بڑے سب کو یکساں طور پر جلاتی تھی۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے اگر ننھا بچہ چیخ کر روتا تھا تو بڑا آدمی بھی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ خود بھی تو اسی پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے شہر بدر ہو رہی تھی۔

''آپ کدھر جا رہے ہیں بیٹا؟'' ابھی وہ بھوک کے فلسفے پر غور کر رہی تھی کہ اس کے برابر میں بیٹھی برقع پوش خاتون نے مخصوص حیدرآبادی لب و لہجے میں دریافت کیا۔

''جی حیدرآباد دکن۔'' اس نے خاتون کے سوال کا جواب دیا۔ صاف رنگت کی ان خاتون نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا رکھا تھا اور جوزفین ان کے چہرے پر آسودگی کے رنگ دیکھ سکتی تھی۔

''حیدرآباد میں کس کے کنے جا رہے ہیں؟ آپ خود تو مجھے حیدرآباد کے رہنے والے دکھائی نہیں دیتے۔'' خاتون کے لہجے میں ایسی مٹھاس تھی کہ اسے ان کی تفتیش بری نہیں لگی پھر سفر کا تجربہ نہ رکھنے کے باوجود وہ اتنی بات تو سمجھتی تھی کہ طویل سفر میں مسافر ایک دوسرے سے اس طرح کی گفتگو کیا ہی کرتے ہیں چنانچہ سادگی سے خاتون کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''میں نواب سلیم اللہ کے ہاں جا رہی ہوں۔''

''اچھا۔ انہوں تو بہت بڑے نواب ہیں۔ یہ بڑی سی حویلی ہے ان کی۔ نظام کے دربار میں بھی بڑی پہنچ ہے۔

آپ ان کے ہاں کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟'' ادھیڑ عمر خاتون کے جملوں نے اسے اور بھی مرعوب کر دیا۔ وہ ویسے بھی کشمکش کا شکار تھی کہ جانے اسے نواب صاحب کی حویلی میں ملازمت ملے نہ ملے اور اب مزید ڈر گئی تھی کہ جو اتنے اونچے نواب تھے ان کا معیار بھی بہت اونچا ہوگا اور اس نے تو محض ایف اے کر رکھا تھا۔ اگر کوئی خوبی تھی تو بس یہ کہ انگریزی بہت اچھے طریقے سے جانتی تھی۔

''آپ بتائے نہیں کہ نواب صاحب کے ہاں کس سلسلے میں جا رہے ہیں۔ ان کے عزیز تو نہیں لگتے آپ۔'' خاتون اس کا حدود اربعہ جاننے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔

''انہیں بچوں کے لیے ایک گورنس کی ضرورت ہے۔ میں اسی جاب کے لیے جا رہی ہوں۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''میرا بھی یہی اِچ اندازہ تھا۔ نواب صاحب یوں تو نماز روزے کے بڑے پابند ہیں لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ اِچ انگریزی جاننے والے استانی رکھتے ہیں۔ آپ بھی ہمیں کرستان لگتے ہیں۔'' خاتون نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ جوزفین نے لانگ اسکرٹ اور آدھی آستینوں کا بلاؤز پہن رکھا تھا اور اسی لباس سے انہوں نے اس کے کرسچین ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔

''آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔'' جوزفین کو ان کا ناقدانہ انداز برا نہیں لگا۔ ادھیڑ عمر کی وہ خاتون لوگوں کی اس قسم میں سے تھیں جن کی اندرونی کیفیات بڑے معصومانہ انداز میں دوسروں پر ظاہر ہو جاتی تھیں۔ انہیں یقیناً اس بات پر اعتراض تھا کہ نواب صاحب مسلمان ہوتے ہوئے اپنے خاندان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے غیر مسلم استاد کیوں رکھتے ہیں چنانچہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر بیٹھی تھیں۔

''آپ اپنے گھر والوں سے اتنی دور تنہا وہاں رہ لیں گے؟'' خاتون دیکھ چکی تھیں کہ وہ تنہا سفر کر رہی ہے چنانچہ اس سے مزید تحقیق کی۔ ان کا سوال جوزفین کا دل دکھانے والا تھا۔

''میرے گھر والے نہیں ہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔'' اس نے بدقت خاتون کے سوال کا جواب دیا۔

''ہائیں...... کیا مطلب؟ اماں باوا نہیں، بھائی کوئی بھی نہیں ہے؟'' خاتون حیران ہوئیں۔

''جی کوئی بھی نہیں ہے۔'' جوزفین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''باپ کا ساتھ چھوٹے برسوں بیت گئے تھے لیکن ماں کا غم تو ابھی تازہ تھا۔

''ارے رو نہیں بیٹی۔ مجھے بتاؤ اپنے بارے میں، ہو سکا تو میں تمہاری کچھ مدد کروں گی۔'' اس کے آنسو دیکھ کر خاتون فوراً پگھل گئیں اور تنقید و تحقیق کو بھول کر ہمدردی پر اتر آئیں۔ جوزفین کا دل تو پہلے ہی دکھتا ہوا پھوڑا بنا ہوا تھا ہمدردی پا کر فوراً ہی پھٹ پڑا۔ یوں بھی انسان کی فطرت ہے کہ اپنا غم سنانے اور آنسو بہانے کے لیے دانستہ و نادانستہ کسی ہمدرد کا متلاشی رہتا ہے۔ قدرت کی طرف سے یہ بھی غم کی شدت کم کرنے کا ایک انتظام ہے۔ غم کو جتنا کہہ سن لیا جائے اور اس پر جتنے آنسو بہا لیے جائیں انسان کا دل اتنا ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ نہ ہو تو غم پانے والا خود بھی نہ جی سکے اور شدت غم سے اس کا دل پھٹ جائے۔ جوزفین نے بھی خاتون کو اپنے سارے حالات کہہ سنائے جو انہوں نے نہایت دلسوزی سے سنے۔

''بہت دکھ ہوا تمہارے حالات سن کر۔ اوپر والا تم پر رحم کریں گا۔ بھیجنے والے نے تمہیں بالکل ٹھیک جگہ بھیجا۔ نواب سلیم اللہ بڑے دل والے ہیں۔ حیدر آباد کے کتنے یتیم محتاج ہیں جو ان کے کنبے سے ہر ماہ وظیفہ پاتے ہیں۔ انہوں تمہارا بھی خیال کریں گے۔ میں ان کے دوست نواب فراست بیگ کے کنبے ملازمت کرتی ہوں۔ انہوں بھی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مجھ بیوہ کو بڑی عزت دیتے ہیں۔ میں ان کو بولوں گی کہ نواب صاحب سے تمہاری سفارش کریں۔'' اس کے حالات جان کر خاتون کو مذہب وغیرہ کا فرق بھول گیا اور وہ پوری طرح سے اس کی ہمدردی پر کمربستہ ہو گئیں۔

''بہت شکریہ۔'' جوزفین نے جھلملائی آنکھوں سے ان کی ہمدردی پر شکرگزاری کا اظہار کیا پھر آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے میرے بارے میں اتنا کچھ جان لیا لیکن اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔''

''میرا نام صبیحہ بانو ہے۔ نواب فراست بیگ کی پشتینی ملازمہ ہوں۔ میرے میاں بھی ان کے کنبے ہی کام کرتے تھے پر اللہ کی رضا سے انہوں نوجوانی میں اِچ فوت ہو گئے۔ میرے کنبے اس وقت ایک اِچ بیٹی تھی بس اس بیٹی کے ہی سہارے نواب صاحب کی چھاؤں میں ساری زندگی گزار دیے ہم ماں بیٹی۔ نواب صاحب میری بیٹی کو پڑھائے لکھائے اور خود ہی دیکھ بھال کر ایک اچھے پڑھے لکھے پوتے سے اس کو بیاہ دیے۔ پوتا (لڑکا) سرکاری نوکری میں ہے، سال پیچھے اس کا بمبئی تبادلہ ہو گیا۔ بیٹی بھی اس کے ساتھ اِچ

چلی گئی۔ میرے کو اس کی بڑی یاد آرہی تھی، نواب صاحب بولے جا کر بل آؤ۔ انہوں اچ سفر کا سارا انتظام کیے اور ایک پونا بھی راستے میں خیال کرنے کو میرے ساتھ کردیے۔ پونا ادھر مردانہ ڈبے میں ہے۔ کوئی اسٹیشن آئیں گا تو میرا حال احوال پوچھنے کو آجائیں گا۔'' اس کی فرمائش پر انہوں نے اپنے تعارف کی رسم ادا کی۔ حیدرآبادی لہجے میں بولتی صبیحہ بانو جوزفین کو ایک اچھی ہم سفر محسوس ہوئیں اور بمبئی سے روانہ ہوتے ہوئے جو اس پر ایک مستقل تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی، اس میں کمی آنے لگی۔

''ایک بات سنو بیٹی۔ ایسا کرو کہ تم نواب فراست بیگ کا پتا اپنے پاس لکھ لو۔ خدانخواستہ اگر نواب سلیم اللہ کے کنے بات نہ بنی تو ہمارے نواب صاحب کی حویلی پر آجانا۔ نواب صاحب میرا اتنا مان تو رکھتے اچ ہیں کہ میرے کہنے پر تمہیں اپنے کنے کوئی نہ کوئی ملازمت دے اچ دیں گے۔'' صبیحہ بانو اسے نواب فراست بیگ سے سفارش کروانے کی تسلی تو دے ہی چکی تھیں پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک اور پیشکش بھی اس کے سامنے رکھ دی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی جوزفین سے یگانگت کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے آنٹی، آپ بتائیں پتا میں لکھ لیتی ہوں۔'' جوزفین جو خود بھی امید و بیم کی کیفیت میں تھی ان کی پیشکش پر خوش ہوگئی اور جلدی سے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر قلم اور نوٹ بک نکالنے لگی۔

''پتا تو میں تمہیں ابھی لکھوا دیتی ہوں پر یاد رکھو یہ آنٹی وانٹی میرے کو ذرا اچھا نئی (نہیں) لگتا۔ تم میرے کو خالہ جان بول کر پکارو۔'' انہوں نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی خالہ جان۔''

جوزفین نے فوراً فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا تو وہ خوش ہوگئیں اور خوشی خوشی پتا لکھوانے لگیں۔ جوزفین نے پتا لکھ کر نوٹ بک احتیاط سے دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لی۔ اب اسے اطمینان ہو چلا تھا کہ دیارِ غیر میں کوئی تو ہے جسے وہ ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے پکار سکتی ہے۔

''پتا کھونا نکو (نہیں) ویسے اللہ نے چاہا تو نواب سلیم اللہ کے کنے اِچ تمہاری ملازمت کا انتظام ہوجائیں گا پر نئی (نہیں) ہوا تو سیدھی میرے کنے چلی آنا۔ میں اپنے نواب صاحب سے بولوں گی کہ اسے میری نفیسہ جیسا اِچ سمجھیں۔ دیکھنا انہوں کیسے تمہاری قدر کریں گے۔'' پتا لکھوانے کے بعد انہوں نے اسے ہدایت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر ہمت دلائی تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مسکرا دی۔ بمبئی سے تنہا روانہ ہوتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ راستے میں اتنی مخلص ہم سفر کا ساتھ مل جائے گا۔

''باتاں تو ہوتی اچ رہیں گی چلو کھانا کھا لیتے ہیں بھوک لگ رئی نا؟'' صبیحہ بانو نے اچانک ہی یہ بات کہی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کئی ڈبوں پر مشتمل اپنا بڑا سا سلور کا توشے دان نکالا۔ ایک اکیلی جان کے حساب سے اتنا بڑا توشے دان دیکھ کر جوزفین کی آنکھیں کھل گئیں۔ ساتھ ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ اس کے مختلف ڈبوں میں انواع واقسام کے کھانے ہوں گے۔ صبیحہ بانو کے حلیے اور گفتگو سے ظاہر ہی تھا کہ وہ ملازمہ ہونے کے باوجود خاصی آسودہ ہیں اور آسودہ لوگ عموماً سب سے زیادہ کھانے میں ہی اہتمام کرتے ہیں جبکہ خود اس کے پاس کھانے کے نام پر دو روٹیاں، تلے ہوئے آلو اور تھوڑے سے پکوڑے ہی موجود تھے۔ اپنا اتنا معمولی سا کھانا لے کر اسے ان کے ساتھ شریکِ طعام ہوتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی چنانچہ پہلو تہی کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کھائیے خالہ جان، مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔''

''ایسے کیسے نہیں ہے۔ میرے سامنے اچ تم ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور جب سے اب تک کچھ کھانا تو دور کی بات، میں تمہارے کو پانی بھی پیتے ہوئے نہیں دیکھی۔ چلو تکلف نکو کرو اور جلدی سے آجاؤ۔ میرے کو اکیلے کھانا کھانا ذرا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے اِچ تم دیکھ اچ رہے ہوں گے کہ میرے کنے یہ کتا (کتنا) بڑا توشے دان ہے۔ وہ پوٹی ہے نا نفیسہ بانو، انہیں ذرا میری بات نہیں سنی۔ اتا ڈھیر کھانا میرے ساتھ کردی۔ بولی ساتھ اور مسافر بھی تو ہوں گے، ان کے ساتھ مل کر کھالیجیے گا۔'' صبیحہ بانو کی زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی مسلسل چل رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک چھوٹا سا دسترخوان نکال کر بچھا دیا تھا اور اس پر پلیٹیں، چمچے اور گلاس وغیرہ رکھنے کے بعد توشے دان کے مختلف ڈبے کھول کھول کر رکھ رہی تھیں۔ ڈبے کھلتے ہی اشتہا انگیز خوشبوئیں سارے میں چکرانے لگیں۔ ڈبے میں موجود دیگر خواتین بھی ان کی دیکھا دیکھی اپنے توشے دان نکالنے لگیں۔ کھانے کی خوشبوؤں نے گویا یلغار سی کردی۔ جوزفین اپنے نفس پر قابو رکھنے والی ایک باوقار لڑکی تھی لیکن فطری تقاضے تو ہر بشر کی طرح اس کے ساتھ بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک ایسی لڑکی، جسے زندگی میں بہت ہی کم اچھا کھانا نصیب ہوا تھا اور جس نے آج صبح بھی دو عدد

پاپڑوں کے ساتھ صرف ایک پیالی چائے بطور ناشتا نوش کی تھی، کیسے ان اشتہا انگیز خوشبوؤں کی یلغار میں اپنے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کو قابو میں رکھ سکتی تھی۔ اسے یکدم ہی بہت بھوک لگنے لگی اور خود پر قابو پانا جیسے مشکل ہو گیا۔

''ارے تم ابھی تک ایسے اچ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں پورا دسترخوان سجا دی اور تم اٹھ اچ نہیں رہے ہیں۔'' صبیحہ بانو نے اس بار اسے ذرا خفگی بھرے انداز میں پکارا تو وہ جس کی ساری مزاحمتیں پہلے ہی دم توڑ چکی تھیں، ان کے ساتھ دسترخوان پر آبیٹھی۔ دسترخوان اتنے عمدہ کھانوں سے بھرا ہوا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لائے معمولی کھانے کو نکالتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی لیکن بچپن سے رزق کی جو تنگی دیکھی تھی، اس نے رزق کی قدر کرنا سکھا دی تھی۔ پھر مرحوم ماں بھی ہمیشہ یہی سبق دیتی تھی کہ رزق کو ضائع نہ ہونے دو چنانچہ اس نے اپنے ساتھ لایا کھانا بھی کچھ شرماتے اور جھجکتے ہوئے دسترخوان پر رکھ دیا۔

''پوٹی، بہت اچ کھانا ساتھ میں دے دی۔ اتا کھانا کہاں کھائے جائیں گا۔ ایسا کرتی ہوں وہ جو پوٹا اکبر میرے ساتھ ہے اس کے لیے رکھ کر باقی بانٹ دیتی ہوں ورنہ تو یہ سارا کھانا خراب ہو کر جائیں گے۔'' بھرے ہوئے دسترخوان کو دیکھ دیکھ کر صبیحہ بانو خود بھی پریشان تھیں اور اس پریشانی میں بڑبڑاتے ہوئے ایک حل بھی نکال لیا تھا پھر وہ فوراً ہی اس حل پر عمل بھی کرنے لگیں۔ کچھ کھانا سنبھال کر رکھنے کے بعد انہوں نے کھانے کا بیشتر حصہ ساتھ سفر کرتی دیگر خواتین میں بانٹا پھر خود کھانے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جوزفین بھی شدید خواہش کے باوجود ان کے انتظار میں رکی رہی تھی۔

''چلو بیٹی بسم اللہ کرو۔'' انہوں نے اس سے کہا اور پھر خود اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں قورما ڈالا۔ یہ مرغی کا باداموں والا قورما تھا اور انہوں نے جوزفین کی پلیٹ میں مرغی کی ران ڈالی تھی۔ ساتھ میں روغنی روٹیاں تھیں۔ جوزفین نے پہلا نوالہ ہی منہ میں رکھا تو پکانے والی کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، چوتھا نوالہ مسلسل کھاتی ہی چلی گئی۔ قورمے کے علاوہ گوشت کا اچار، کچے قیمے کے کباب اور بگھارے بینگن بھی موجود تھے۔ صبیحہ بانو ایک کے بعد ایک چیز اس کی پلیٹ میں ڈالتی اور اسے بصد اصرار کھلاتی چلی گئیں۔ ہر شے ہی اپنی جگہ لاجواب تھی۔ جوزفین نے کہاں ساری زندگی میں ایسے عمدہ ذائقے چکھے تھے۔ اسے تو ایسا ہی لگا جیسے جنت میں جن عمدہ کھانوں کا وعدہ ہے، وہ آج یہیں پورا ہو رہا ہے۔ صبیحہ بانو کی پرتکلف میزبانی میں اسے اپنے ساتھ لائے گئے کھانے کو کھانے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ صبیحہ بانو نے خود اس کا کھانا اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا تھا اور اس معمولی کھانے کی بھی بے حد تعریف کر رہی تھیں۔ اگر وہ رغبت سے نہ کھا رہی ہوتیں تو اسے لگتا کہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف کر رہی ہیں۔

''پوٹی نفیسہ کتنے جتنے دن رہی انہیں مرغن کھانے اچ پکا پکا کر کھلاتی رہی۔ میں بوہت (بہت) منع بھی کری پر بولی اما آپ پہلی بار بمبئی آئے ہیں اور دوبارہ جانے کب آئیں گے اس لیے میرے کو اپنی خاطر خدمت کرنے دیں۔ میں چپ ہو گئی کہ چلو بچی اپنے دل کے ارمان پورے کر لے، پر سچ بولوں تو آج یہ تمہارا سادہ کھانا ایسا مزہ دے رہا ہے کہ میرے کو لگتا ہے آج اچ میرے کو پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ملی ہے۔ ادھر حیدرآباد میں نواب فراست بیگ کی حویلی کے مطبخ (باورچی خانہ) میں بھی بڑے اہتمام سے کھانا پکتا ہے پر بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ روز ساتھ میں دال سبزی کی بھی ایک ایک قسم ہونی چاہیے۔ میرے کو جب بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کا دل بولے دال یا سبزی کھالیتی ہوں۔ تم نے یہ آلو بہت ذائقے دار بنائے ہیں۔ سچی، کھا کر مزہ آ گیا۔'' ان کی تعریفوں کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت تھی کہ انہیں جوزفین کا وہ عام سا کھانا اتنا پسند کیوں آیا ہے۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد انہوں نے میٹھا نکال لیا۔ یہ ڈبل کا میٹھا تھا۔ زعفران اور الائچی کی خوشبو اس کے بھی عمدہ ہونے کی گواہی دے رہی تھی لیکن جوزفین کو لگ رہا تھا کہ وہ حلق تک کھانا کھا چکی ہے اور اب مزید ایک نوالے کی بھی گنجائش نہیں اس لیے میٹھے کے لیے معذرت کر لی۔

''ارے کھا کر تو دیکھو۔ ذرا سا چکھنے میں کیا ہوتا ہے۔'' انہوں نے اسے بصد اصرار وہ بھی کھانے پر مجبور کر دیا۔ کھوئے، چاندی کے ورق، بادام اور پستے کے گریوں سے سجے اس میٹھے سے جوزفین آشنا نہیں تھی۔ صبیحہ بانو کے اصرار پر ایک چمچہ منہ میں رکھا تو اس کی حلاوت نے دنگ کر دیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ جو حلق تک کھانا بھر جانے کی دعوے دار تھی، ایک کے بعد ایک کتنے چمچے منہ میں ڈالتی چلی گئی ہے۔

''یہ تو بہت ہی مزے کا ہے۔'' ایسے شاندار میٹھے کی تعریف نہ کرتی یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کے منہ سے تعریف سن کر صبیحہ بانو نے اس کی پلیٹ میں اور میٹھا ڈالنے کی کوشش کی

لیکن اس نے ان کا ہاتھ روک دیا۔

"بس خالہ جان۔ اب اگر اور کھایا تو پیٹ پھٹ جائے گا۔" اس کا یہ جملہ سن کر وہ ہنس دی اور پھر مزید اصرار نہیں کیا۔ کھانے کے بعد دسترخوان سمیٹنے کا کام جوزفین نے انجام دیا۔ وہ فطری طور پر سلیقہ مند تھی اس لیے جھوٹے برتنوں کے ساتھ ساتھ بچ رہنے والے کھانے کو بھی اس سلیقے سے سنبھالا کہ صبیحہ بانو خوش ہو گئیں۔

"جیتی رہو۔ اللہ نصیب کھولے۔ بہت سلیقے والی لڑکی ہو۔" خوش ہو کر انہوں نے باقاعدہ دعاؤں کے ساتھ اس کی تعریف کی۔ جوزفین شرمائی شرمائی سی مسکراتی رہی۔ آج وہ زندگی کے جس تجربے سے گزر رہی تھی، وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ بمبئی کے جس محلے میں رہتی تھی، وہاں اس کے اطراف میں رہنے والی خواتین غربت اور اس سے جنم لینے والے دیگر مسائل زندگی سے نمٹتے نمٹتے اتنی ادھ موئی ہو گئی تھیں کہ ان کے پاس یہ شفقت اور نرمی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سب تھکی ہوئی، پس مردہ اور مایوس عورتیں تھیں جن کے اندر کی جھنجلاہٹ نے ان کی زبانوں کو تلخ اور لہجوں کو کرخت بنا ڈالا تھا۔ واحد جوزف کی ماں ہی ایسی تھی جو اس سے محبت سے پیش آتی تھی لیکن اس کے پاس بھی صبیحہ بانو جیسا لب ولہجہ موجود نہیں تھا۔ صبیحہ بانو کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بہترین وقت گزارا۔ ان کی باتوں، دلچسپ قصوں اور شفقت بھری خیال داری میں گزرنے والا سفر کیسے گزرتا ہی چلا گیا، اسے پتا بھی نہیں چلا۔ صبیحہ بانو کے ساتھ مردانہ ڈبے میں سفر کرنے والا ملازم لڑکا اکبر بھی ہر اسٹیشن پر اتر کر ان کا حال احوال معلوم کرنے آتا رہا اور ان کی فرمائش پر کولر میں پانی بھرنے، ٹھنڈی بوتلیں لانے اور میٹھے پان پہنچانے جیسے فرائض بنا تیوری پر بل ڈالے خوش خلقی سے انجام دیتا رہا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ سچ مچ خوش خلق تھا یا فراست بیگ کے ملازمین میں صبیحہ بانو کی خاص اہمیت کی بنا پر یہ خوش خلقی اس کی مجبوری تھی۔

☆☆☆

"ادھر شادی میں تو سب کو بڑا مزہ آئے گا۔ سب مل کر بڑا موج مستی کرے گا۔" بڑے اشتیاق سے یہ بات کہنے والا صابر عرف گولو تھا۔ کل ہی ربن نے انہیں فون پر اطلاع دی تھی کہ ثریا بانو کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور جمعے کے دن اس کے نکاح اور رخصتی کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ گولو نے جب سے یہ اطلاع سنی تھی، اسے بمبئی کی رونقیں شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ ثریا بانو کی شادی کا مطلب تھا کہ سارے انتظامات اڈے کی طرف سے ہوں گے اور اڈے والے شادی کی تقریب میں پیش پیش رہیں گے۔ گولو کو اس طرح کی تقریبات میں شرکت کا بہت شوق تھا لیکن اڈے والوں کو ایسے مواقع کہاں میسر آتے تھے۔ ساتھیوں میں سے بھی کسی کے گھر میں کوئی شادی بیاہ ہو اور گھر والوں کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ اپنے ساتھیوں کو مدعو کر لیتا تھا، ورنہ تو ان کی زندگیاں بس ایک دوسرے کی ذات تک ہی محدود تھیں۔ اس حساب سے ثریا بانو کی شادی اڈے کی دنیا کا ایک انوکھا واقعہ تھی اور گولو کا اس شادی کے لیے پرجوش ہونا قابلِ فہم تھا۔

"تم کہو تو تمہارے بمبئی واپس جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ تم جا کر شادی میں شرکت کر لینا۔ مجھے تو دادا نے واپسی کی اجازت ہی نہیں دی ورنہ میں بھی چلتا تمہارے ساتھ۔" اس کا جوش اور شوق محسوس کرتے ہوئے فاروق نے اسے پیشکش کی۔ آج وہ گولو اور کیتھرائن کو اپنے ساتھ لے کر گھومنے نکلا ہوا تھا۔ گھومنے کے علاوہ اس کا انہیں خریداری کروانے کا بھی ارادہ تھا۔ ساتھ ہی ثریا بانو کے لیے بھی کوئی تحفہ لینا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ربن نے اسے بیٹی بولا ہے تو اس کی شادی کے انتظامات اور جہیز میں کوئی کمی نہیں رہنے دے گا لیکن وہ خود بھی اس مظلوم لڑکی کو اس کی شادی کے موقع پر کوئی اچھا سا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ تحفہ خرید کر یہاں سے پارسل کر دیتا تو شادی تک بمبئی پہنچ ہی جاتا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے ہملا سے بھی ساتھ چلنے کے سلسلے میں عندیہ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہملا انکار کر دے گی لیکن وہ فوراً ہی تیار ہو گئی اور ڈرائیونگ سیٹ بھی خود ہی سنبھال لی۔ ہمیشہ کی طرح پراعتماد آج بھی اس نے جدید تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا۔ بڑے بڑے پائنچوں والے بیل باٹم پاجامے کے ساتھ کھلے گریبان کی شوخ پھولوں والی چست قمیص اور رسی کی طرح بل کھائے دوپٹے کے ساتھ وہ بہت نمایاں ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے میک اپ بھی روزانہ کی نسبت ذرا زیادہ اہتمام سے کیا تھا۔ جسم پر چھڑکے گئے پرفیوم کی خوشبو بھی متوجہ کرنے والی تھی۔ ساری تیاری سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے ناز و ادا سے کسی کو قتل کرنے کی پوری تیاری کیے ہوئے ہے۔

اصل میں یہ سارا ہار سنگھار فاروق کے لیے تھا۔ چاند بانو سے ہونے والی ملاقات نے اس پر یہ انکشاف کر دیا تھا کہ وہ فاروق کو پسند کرنے لگی ہے اور اس انکشاف کے بعد وہ دانستہ فاروق کو خود سے متاثر کرنے کے مشن پر جت گئی

تھی۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے سب سے اہم بات تو یہی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ فاروق کے ساتھ رہتی تو اس کے لیے اس کے پاس مواقع کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پڑھی لکھی ہونے کے باعث اسے گفتگو کا ڈھنگ اچھی طرح آتا تھا اس لیے فاروق سے بات چیت کرنے کے لیے بھی اس کے پاس موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ فاروق اس کی صحبت میں بور نہیں ہوتا اور اچھا وقت گزارتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ بس عمومی پسندیدگی ہے جو کہ دوستوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس دوستی کے اندر عورت و مرد کے تعلق کی آنچ جلانے کے لیے اس نے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی شعوری کوششیں شروع کر دی تھیں۔ آج کی تیاری بھی اسے سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن گاڑی چلاتے ہوئے اسے مسلسل اس بات پر تاؤ آرہا تھا کہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے فاروق کی توجہ اس سے زیادہ پیچھے سیٹ پر بیٹھے گولو اور کیتھرائن پر مرکوز ہے۔ کیتھرائن تو پھر بھی ایک نسبتاً کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی لیکن گولو کا فاروق سے تعلق بہت گہرا تھا۔ فاروق اسے جتنی اہمیت دیتا تھا، اتنی کسی اور کے حصے میں نہیں آپاتی تھی۔ اب بھی وہ مسلسل گولو ہی کے ساتھ مصروف تھا جس کی گفتگو کا محور بمبئی میں ہونے والی ثریا بانو کی شادی تھا۔

''تمہارے بنا تو اپن بالکل بھی واپس نہیں لوٹنے کا ہے۔ جب بابا تمہیں واپسی کی اجازت دے گا، تب ہی اپن بھی واپس جائے گا۔'' شادی میں اپنی تمام تر دلچسپی کے باوجود گولو نے اس کی پیشکش قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''مجھے تو معلوم نہیں کب واپسی کی اجازت ملے گی۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ دادا نے علاج کے بہانے مجھے بمبئی بدر کر دیا ہو۔'' فاروق کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ شملہ بہت خوب صورت تھا اور وہ اس کی خوب صورتی سے متاثر بھی ہوا تھا لیکن وہ جو کسی کی خوب صورت آنکھوں کی دید تھی، اس دید کی سیرابی کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا پھر فی الحال تو اسے دید کی محرومی سے ہٹ کر بھی ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے اپنے اندر سے مسلسل یہ سگنل ملتا رہتا تھا کہ جولیٹ کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے اور وہ ناخوش اور پریشان ہے۔ اس کی ماں کے مرنے کی خبر سن کر اس نے اپنے اندر کی پریشانی کو اس واقعے کا سبب سمجھ کر دبانے کی بھی کوشش کی تھی کہ اتنا ذہنی فہم تو وہ بھی رکھتا تھا کہ سمجھ سکے کہ زندگی اور موت کے معاملات اس کائنات کا ایک مسلسل عمل ہیں اور جانے والوں کے پیچھے رونے والوں کو ایک نہ ایک دن صبر آ ہی جاتا ہے لیکن جولیٹ کے سلسلے میں جتنا اس کا دل بے چین رہتا تھا، اس سے اسے یہی لگتا تھا کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہے۔

''آپ ایسی بات کیوں کر رہے ہیں فاروق بھائی۔ ربن صاحب نے جو کچھ بھی کیا صرف آپ کی محبت میں اور آپ کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ دیکھیں یہ کتنی بیوٹی فل جگہ ہے۔ یہاں رہنے سے آپ کی ہیلتھ پر اچھا اثر پڑ رہا ہے اور امپروومنٹ کی رفتار تیز ہے۔ بمبئی جیسے پلوشن اور شور والے سٹی میں رہ کر آپ اتنی تیزی سے امپروو نہیں کر سکتے تھے۔'' اس کی تلخی اور مایوسی کو محسوس کر کے کیتھرائن نے ملائم لہجے میں اسے ٹوکا۔ وہ فاروق کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ لائی گئی تھی اور ربن نے فاروق کے سلسلے میں اسے مکمل طور پر اعتماد میں لیا تھا اس لیے وہ جانتی تھی کہ ربن فاروق کو کس وجہ سے بمبئی واپس آنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔ اس کے حساب سے ربن اپنی جگہ بالکل درست تھا اسی لیے اس وقت وہ ربن کی حمایت لینے کے ساتھ ساتھ اسے بھی سمجھانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے سسٹر۔ مجھے دادا کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے لیکن مجھے اپنے شہر اور ساتھیوں سے دوری گراں گزرتی ہے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا ہی تھا کہ بملا نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''پہلے کہاں چلنا ہے فاروق صاحب۔ پہلے ان لوگوں کو کچھ سیر سپاٹا کروانا ہے یا شاپنگ کرنی ہے؟''

''میرے خیال میں پہلے شاپنگ کر لیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے ثریا کا گفٹ خرید کر اسے پوسٹ آفس جا کر پارسل کروا دیں پھر باقی کام ہوتے رہیں گے۔ سیر کا کیا ہے، ابھی کونسا ہم شملہ سے واپس جا رہے ہیں۔ اگر آج موقع نہیں بھی ملا تو پھر کسی دن نکل جائیں گے۔'' فاروق نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

''فاروق بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو ہم لوگ ادھر ہی ہیں پھر کسی دن سیر کے لیے چلے جائیں گے۔'' گولو نے اس کی فوری تائید کرنا اپنا فرض سمجھا۔ بملا نے گولو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور فاروق کی طرف ہی متوجہ رہتے ہوئے ایک ادا سے بولی۔

''آگے آپ کے پاس سیر کے لیے وقت تو ہو گا لیکن مجھ جیسی گائڈ اور ڈرائیور کہاں سے لائیں گے۔ یہ تو میں ہوں جو شملہ کے چپے چپے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''یہ سالا کوئی پرابلم نہیں ہے بملا دیدی۔ اپن نے سیٹھ صاحب کے ڈرائیور سے بات کیا تھا۔ وہ اپن کو بتایا کہ بہت سالوں سے ادھر ہی رہ رہا ہے اور سارا شملہ اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ اپن اس سے بولے گا کہ وہ اپن کو سیر کروانے لے جائے۔'' گولو کی اس اچانک مداخلت نے بملا کی ادا سے کہی ہوئی بات کا سارا مزہ کرکرا کر دیا اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی بل کھا کر رہ گئی۔

''ارے نہیں گولو...... بملا جی کی بات بالکل الگ ہے۔ ڈرائیور ہمیں سیر کروانے تو لے جا سکتا ہے لیکن جتنی معلومات شملہ کے بارے میں بملا جی کو ہیں، وہ ہمیں کہیں اور سے نہیں مل سکتیں۔ میں تو سخت متاثر ہوں ان کی اتنی معلومات پر۔'' فاروق جانتا تھا کہ گولو اپنے سیدھے پن میں ایک ایسی بات کہہ گیا ہے جو بملا کو ناگوار خاطر گزر سکتی ہے۔ اس لیے اس کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے بملا کی طرف دیکھ کر خوش مزاجی سے بولا۔ اس کے ان تعریفی کلمات کا بملا پر اچھا اثر پڑا اور وہ کچھ فاتحانہ انداز میں مسکرا دی۔

''اپن کو معلومات کا کیا کرنا ہے۔ اپن کو کونسا واپس جا کر شملہ کے بارے میں امتحان دینے کا ہے۔'' گولو نے بے پروائی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ممکن تھا کہ وہ اس سلسلے میں مزید گوہر افشانی کرتا لیکن کیتھرائن نے اس کے بازو کو دھیرے سے دباتے ہوئے مزید کچھ بولنے سے روکا اور سمجھ داری سے بات سنبھالتے ہوئے بولی۔

''تمہیں شملہ کے بارے میں جاننے کا شوق نہیں ہے تو کیا ہوا۔ فاروق بھائی کو تم جانتے ہو نا، یہ کتنے علم دوست انسان ہیں اور ایسے لوگوں کی کمپنی کو کتنا انجوائے کرتے ہیں جن سے انہیں کچھ نالج مل سکے۔ بملا جی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔'' اس کے اس تبصرے نے گولو کی بات کا اثر زائل کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا اور بملا کے چہرے پر چھا جانے والا تناؤ کم ہو گیا۔ اس دوران وہ لوگ بازار بھی پہنچ گئے تھے۔ بمبئی جیسے گنجان اور متحرک شہر کے مقابلے میں شملہ کا بازار بہت چھوٹا تھا لیکن اس اعتبار سے اچھا تھا کہ یہاں سے وہ ایسی چیزوں کی خریداری کر سکتے تھے جو منفرد تھیں اور بمبئی میں عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی تھیں۔

بملا نے گاڑی ایک جانب روکی تو وہ سب نیچے اتر آئے۔ اسی وقت فاروق کی توجہ کچھ فاصلے پر کھڑی ایک دوسری گاڑی کی طرف چلی گئی۔ اس گاڑی کی پچھلی نشست پر چاند بانو بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر قدرے بیزاری کے تاثرات تھے۔

''ارے چاند بانو یہاں کہاں؟'' فاروق اپنی بے ساختہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

اس کی آواز پر بملا نے بھی چونک کر اس جانب دیکھا۔ سادہ گلابی لباس میں آنکھوں میں کاجل کے ہلکے سے ڈورے ڈالے چاند بانو کا حسن کسی آفتاب کی طرح ایسے اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا کہ اس کی ساری کی ساری تیاری دھری رہ گئی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر بملا کو شدید کوفت کا احساس ہوا لیکن ظاہر ہے وہ فاروق کو چاند بانو کے قریب جانے سے روک تو نہیں سکتی تھی۔ وہ تو فوراً اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا جس کی پچھلی نشست پر چاند بانو براجمان تھی۔ فاروق کے نزدیک پہنچنے سے قبل ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور چہرے پر چھائے بیزاری کے تاثرات یکدم ہی غائب ہو گئے۔

''آداب! آپ یہاں کیسے؟'' فاروق نے گفتگو میں پہل کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ وہ فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور فاروق کے مقابل سرو قامت کھڑی ہو گئی۔ فاروق نے اس وقت سفید رنگ کا کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے چاند سورج کی جوڑی لگ رہے تھے۔ بملا نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور دل ہی دل میں جلبلاتی ہوئی خود بھی فاروق کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

''ہم یہاں خریداری کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' چاند بانو نے اسے جواب دیا۔ اس کا انداز کچھ بجھا ہوا تھا۔ اصل میں اپنے اتنے ذوق و شوق سے فاروق سے ملاقات کے لیے جانے کا جو نتیجہ نکلا تھا، وہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ بملا کا اس کے ساتھ جو رویہ تھا، اس سے اس نے سبکی محسوس کی تھی پھر واپس جا کر بھی بہت دیر تک زمرد بائی کی باتیں سننی پڑی تھیں۔ دونوں طرف کے ان رویوں کو اس نے خاموشی سے سہا تھا جس کی وجہ سے گھٹن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کی یہ کیفیت اتنی واضح تھی کہ انیل کمار تشویش کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ اس کے خیال کے مطابق چاند بانو کا یہ موڈ اس کے تاثرات پر اثر انداز ہو رہا تھا جبکہ شملہ میں انہیں فلم کے جس حصے کی عکس بندی کرنی تھی، اس میں اس کا خوش باش نظر آنا ضروری تھا۔ انیل کمار کی اس تشویش کا زمرد بائی نے فوراً فائدہ اٹھایا اور یہ کہہ کر اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے روانہ ہو گئی کہ اس طرح چاندنی کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔ چاند بانو کو خریداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے

وہ مارے باندھے یہاں تک آ تو گئی تھی لیکن گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ زمرد بائی خریداری کرتی پھر رہی تھی اور ڈرائیور بوجھ ڈھونے کے لیے اس کے ساتھ تھا جبکہ چاند بانو گاڑی میں بیٹھی بیزاری سے ان دونوں کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''میں یہاں بازار میں نہیں بلکہ شملہ میں آپ کی موجودگی کے بارے میں دریافت کر رہا ہوں۔ کب سے ہیں یہاں؟ مجھے تو آپ نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔'' فاروق نے وضاحت سے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی شکوہ بھی کیا۔ اس کی بات سن کر چاند بانو چونکی اور ایک نظر فاروق کے پیچھے کیل کانٹوں سے لیس بملا پر ڈالی۔ اس کی نسوانی جبلت نے فوراً ہی اسے احساس دلا دیا کہ اس عورت کی یہ اتنی بااہتمام تیاری فاروق کے لیے ہے اور وہ خود اسے رقابت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

''یہ مس بملا بھاٹیہ ہیں۔ شملہ میں یہی ہماری میزبانی کر رہی ہیں۔'' اسے بملا کی طرف دیکھتے پا کر فاروق نے تعارف کی رسم ادا کی۔

''جی ہم انہیں جانتے ہیں۔ آپ کی مزاج پرسی کے لیے آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔'' بہت کچھ سمجھ جانے پر اس نے اطمینان سے فاروق سے کہا۔

''کب؟ کہاں؟'' فاروق اس کی بات سن کر الجھ گیا۔

''ان کے دولت کدے پر۔ ہم شملہ آمد کے فوراً بعد ہی آپ سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے تھے۔ سوچا تھا اچانک پہنچ کر آپ کو حیران کر دیں گے۔ اسی خیال سے خط میں بھی پہلے سے آپ کو مطلع نہیں کیا تھا لیکن ہماری آمد کے وقت آپ آرام فرما رہے تھے اس لیے ملاقات ممکن نہیں ہو سکی۔ کیا آپ کو ہماری آمد کی اطلاع نہیں ملی تھی؟'' اس کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی اور وہ ہلکی پھلکی ہو کر فاروق کے سامنے ڈھیرے ڈھیرے انکشافات کر رہی تھی۔ فاورق کے انداز نے اسے بتا دیا تھا کہ بملا نے اسے سرے سے کچھ بتایا ہی نہیں تھا اور وہ خوانخواہ یہ سوچ کر گھلتی رہی کہ فاروق نے اس کی آمد کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی اس لیے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ کیا آپ مجھ سے ملاقات کے لیے بھاٹیہ ہاؤس آئی تھیں؟'' فاروق کچھ الجھ سا گیا۔

''جی ہم یہی کہہ رہے ہیں۔'' چاند بانو کا اطمینان دیدنی تھا البتہ بملا کچھ بے چین ہو گئی تھی۔

''اوہ، فاروق! ویری سوری۔ میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ اس دن سیر سے واپس آ کر آپ بہت تھک کر سو رہے تھے تب یہ محترمہ آپ سے ملنے آئی تھیں۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ کچی نیند سے جگانا آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوگا اس لیے پھر کسی روز ملاقات کر لیں تو ٹھیک رہے گا لیکن میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ ویری سوری۔'' آخر کار اس نے اپنی زبان کھولی اور جلدی جلدی اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''یہ میری بہت خاص مہمان تھیں مس بملا۔ ان کے لیے نیند سے اٹھنا مجھے قطعی ناگوار نہیں گزرتا۔ آپ کیتھرائن سے اس سلسلے میں مشورہ کر سکتی تھیں اور کچھ نہیں تو کم از کم مجھے بعد میں تو مطلع کر دیتیں۔ کم از کم اس وقت مجھے چاند بانو کے سامنے شرمندہ تو نہ ہونا پڑتا۔'' فاروق نے ہلکی سی خفگی کا اظہار کیا۔

''میں نے بتایا نا کہ میں بھول گئی تھی۔'' بملا کو چاند بانو کے سامنے ٹوکا جانا برا لگا۔ اس لیے قدرے تیز لہجے میں بولی لیکن فاروق اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ چاند بانو سے کہہ رہا تھا۔

''آپ کو ہونے والی زحمت کے لیے میں دل سے شرمندہ ہوں چاند بانو۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟''

''اس طرح معذرت کر کے ہمیں شرمندہ مت کیجیے۔ آپ کا تو کوئی قصور ہی نہیں ہے۔'' چاند بانو کے ہونٹوں پر اب بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی۔ یوں مسکراتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ بملا بھڑا بھڑ رقابت کی آگ میں جلنے لگی۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز چاند بانو فاروق سے مصروفِ گفتگو رہی۔

''ہم اپنے یونٹ کے ساتھ یہاں شوٹنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ شوٹنگ کے دوران جب بھی فرصت ملی، کوشش کریں گے کہ گاہے بگاہے آپ سے ملاقات کرتے رہیں۔ آپ چاہیں تو خود بھی ہم سے ملنے آ سکتے ہیں۔'' وہ کن انکھیوں سے بملا کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ بملا نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کا حساب اب مع سود لینے کا موقع مل گیا تھا تو وہ کیوں چپ رہتی۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

لاعلمی

سلیم انور

قانون کا رائج کرنا... وہ بھی منصفانہ اصولوں پر... اور پھر انتہائی ناقدانہ انداز میں اس پر عمل کرنا تاکہ انتہائی شفاف طریقے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے اور مجرم خود جرم قبول کرلے... یہ واقعی کسی باکمال خواب سے کم نہیں ہوسکتا مگر... یہ کوئی خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی۔

ایک دہشت گرد کی تمام گرد جھاڑنے والے سپاہی کا انداز

لیفٹیننٹ فلپ اپنے پارٹنر سارجنٹ جیک بارنس سے دو قدم آگے چلتا ہوا اس عظیم الشان آڈیٹوریم میں داخل ہوگیا جہاں گارڈز کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

دونوں افسران اپنے شناختی بیج دکھاتے ہوئے اسٹیج تک پہنچ گئے جہاں گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک عورت متعدد ورکرز کو احکامات دے رہی تھی۔

''کیا تم ہی مارتھا ہو؟'' لیفٹیننٹ فلپ نے اس عورت کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

''ہاں اور یقیناً تمہارا تعلق مقامی پولیس سے ہوگا۔ اتنی جلدی یہاں پہنچنے کا شکریہ۔''

''مسئلہ کیا ہے؟''

''آج کی رات ہمارا کمیونٹی گروپ اسٹیٹ سینٹ کی نشست کے لیے دو امیدواروں کے درمیان ایک بحث اسپانسر کررہا ہے۔'' مارتھا نے بتایا۔ ''ان امیدواروں میں سے ایک ہمارا موجودہ سینیٹر ہے اور مجھے یقین ہے تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ زیادہ مقبول نہیں ہے۔''

''تو پھر! ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''آج صبح میرے دفتر میں ایک نامعلوم فون کال آئی تھی جس میں بتایا گیا ہے کہ آج رات کوئی رپورٹر کے روپ میں وہاں موجود ہوگا لیکن وہ فرد حقیقت میں سینیٹر پر کسی طریقے سے حملہ آور ہوگا۔''

''کسی طریقے سے؟''

''ہاں۔ فون کرنے والے نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے ہمیں علم نہیں کہ اس حملے کی نوعیت کیا ہوگی۔ وہ کوئی مہلک حملہ ہوگا جیسے شوٹنگ وغیرہ یا صرف سینیٹر کو شرمندہ کرنے کے لیے اس پر انڈے یا ٹماٹر پھینکے جائیں گے۔''

''یہاں کل کتنے رپورٹر ہوں گے؟''

''چالیس سے کچھ زیادہ۔''

''اور تم چاہتی ہو کہ ہم ان سب کو چیک کریں؟'' سارجنٹ جیک بارنس نے پوچھا۔ ''یہ تو خاصا مشکل کام ہوگا۔''

''نہیں۔ بیشتر رپورٹرز سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ان کا تعلق اہم اخبارات اور معروف ٹیلی وژن اسٹیشنز سے ہے۔ فہرست میں صرف تین رپورٹرز ایسے ہیں جن سے ہم واقف نہیں ہیں۔ میرے پاس ان کے نام موجود ہیں۔'' مارتھا نے ایک نیلا فولڈر اٹھایا اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر سارجنٹ جیک بارنس کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ جگہ سیکیورٹی کے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔'' لیفٹیننٹ فلپ نے کہا۔ ''ان تینوں رپورٹرز کی چیکنگ سیکیورٹی والوں سے کیوں نہیں کرا رہی ہیں؟''

''ہم اس کام کو مقامی حکام سے کرانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔'' مارتھا نے کہا۔ ''جبھی تو ہم نے تمہیں فون کیا تھا۔''

لیفٹیننٹ فلپ نے اس فہرست کا جائزہ لینا شروع کیا جو سارجنٹ جیک بارنس نے اسے تھمائی تھی۔

''لوئس ریمر، ہینک ماربل، ٹیڈ وینز......'' لیفٹیننٹ فلپ نے بلند آواز سے وہ تینوں نام پڑھے۔

مارتھا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا یہ تینوں افراد یہاں موجود ہیں تاکہ ان سے سوالات کیے جاسکیں؟''

مارتھا نے آڈیٹوریم کے عقبی حصے کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''آخری قطار میں موجود تینوں افراد وہی ہیں۔''

لیفٹیننٹ فلپ نے مارتھا کا شکریہ ادا کیا اور اپنے پارٹنر سارجنٹ جیک بارنس کے ہمراہ آڈیٹوریم کے پچھلے حصے کی جانب بڑھ گیا۔

نشستوں کی آخری قطار کے پاس پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ وہاں موجود تینوں افراد استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں لیفٹیننٹ فلپ ہوں اور یہ سارجنٹ جیک بارنس ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے چند سوالات پوچھنا چاہوں گا، پلیز۔''

وہ تینوں الجھی نظروں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

''سوالات کا آغاز تم سے کرتے ہیں، میڈم۔ یقیناً تم لوئس ریمر ہو۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم کس اخبار کی نمائندگی کرتی ہو؟''

''یقیناً۔ میں دی ہنزڈیل ویکلی، کے لیے فیچر لکھتی ہوں۔ یہ ایک مقامی اخبار ہے۔ میں لگ بھگ گزشتہ دس سال سے اس اخبار کے لیے انسانی دلچسپی کی داستانیں کور کر رہی ہوں۔''

''اور آپ سر؟''

''میں ہینک ماربل ہوں۔ میں یہاں اطراف میں سے نہیں ہوں۔ میں، دی میسنفیلڈ گزٹ کے لیے پولیٹکس کی کوریج کرتا ہوں۔ یہ اخبار اس چھوٹے سے شہر سے شائع ہوتا ہے جو یہاں سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔''

لیفٹیننٹ فلپ نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا۔

''میرا نام ٹیڈ وینز ہے۔ میں، دی کونیلس وِل کرونیکل کے لیے لکھتا ہوں۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی ہوگئی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تم سب کے پاس اپنے اپنے شناختی کارڈ موجود ہوں گے؟''

ان سب نے اپنے اپنے ناموں کے ٹیگس دکھا دیے جن پر ان کی تصویریں بھی موجود تھیں۔

ان میں سے کوئی ایک فرضی ہے، لیفٹیننٹ فلپ نے سوچا۔

''سارجنٹ بارنس!'' اس نے اپنے پارٹنر کو مخاطب کیا۔ ''اب ذرا ان کے کیمرا بیگس کا جائزہ لے لو، پلیز۔''

''وہ کیوں؟'' ہینک مارپل نے پوچھا۔
''سچ بات یہ ہے کہ ہمارے خیال میں تم میں سے کوئی ایک سینیٹر جیمز پر حملہ کرنے کی پلاننگ کر رہا ہے۔ ہمارا کام اس حملے کو روکنا ہے۔''
''کیا؟'' ٹیڈ وینز چلا اٹھا۔ ''تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ بہتان Libel تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ میں تمہارے خلاف عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہوں۔''
''مجھے بھی اس الزام میں ملوث کرنے پر اعتراض ہے۔'' لوئس ریمر نے کہا۔ ''میرے بیگ کی تلاشی لینے کے لیے تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہونا چاہیے۔''
''اور میری تلاشی کے لیے بھی۔'' ہینک مارپل نے کہا۔
''کیا تمہیں احساس ہے کہ یہ بات تم تینوں کو بے حد مشتبہ قرار دے سکتی ہے؟'' لیفٹیننٹ فلپ نے کہا۔
''یہ امریکا ہے۔'' ہینک مارپل نے غراتے ہوئے کہا۔ ''تم صرف شبہے کی بنیاد پر ہماری تلاشی نہیں لے سکتے۔''
''تم میرے ایڈیٹر کی جانب سے جواب آنے تک انتظار کرو۔'' ٹیڈ وینز نے اضافہ کیا۔
''اب ہم کیا کریں؟'' سارجنٹ جیک بارنس نے لیفٹیننٹ سے پوچھا۔
''اس شخص کو حراست میں لے لو۔'' لیفٹیننٹ فلپ نے ان تینوں مشتبہ افراد میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
سارجنٹ نے آگے بڑھ کر ٹیڈ وینز کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔
''تمہارا کہنا ہے کہ تم لگ بھگ چوتھائی صدی سے بہ طور رپورٹر کام کر رہے ہو لیکن جب میں نے یہ بات کہی تھی کہ تم میں سے کوئی ایک سینیٹر جیمز پر حملہ کرنے کی پلاننگ کر رہا ہے تو تم نے جواب میں یہ کہا تھا کہ یہ بہتان libel تعبیر کیا جاسکتا ہے۔'' لیفٹیننٹ فلپ نے کہا۔
''ہاں، میں نے کہا تھا۔'' ٹیڈ وینز نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''تو پھر؟''
''تم خود کو اخباری رپورٹر کہتے ہو اور کوئی بھی اخباری رپورٹر یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ جھوٹے تحریری الزام کو libel کہا جاتا ہے جبکہ جھوٹے زبانی الزام کو slander کہتے ہیں۔ تمہاری لاعلمی یہ ثابت کر رہی ہے کہ تم کوئی حقیقی رپورٹر نہیں بلکہ فرضی رپورٹر ہو۔ اب اپنے کیمرا بیگ کی تلاشی دینے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

جواہر پارے

☆ اپنے دوست کی عزت کرو اس لیے نہیں کہ وہ تمہارے عیب جانتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ تمہارے عیبوں سے واقف ہونے کے باوجود بھی تمہیں دوست مانتا ہے۔ (واصف علی واصف)

☆ سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی بار ہی دیکھنے سے دل یہ کہے۔ ''میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔'' (واصف علی واصف)

☆ جو لوگ تمہاری خدمت کرتے ہیں اس کے بدلے میں سونے کے ڈھیر بھی انہیں پیش کرو تو یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ... ہو سکے تو انہیں اپنا دل پیش کرو یا پھر ان کی خدمت کرو۔ (خلیل جبران)

مرسلہ۔ مرحا گل، رمنا گل
درابن کلاں، ڈیرہ اسماعیل خان

یاد رکھنے کی باتیں

☆ اللہ تعالیٰ کا خوف حکمت کا سرچشمہ ہے۔
☆ علم کی دولت سونا چاندی نہیں جو چوری ہو سکے۔
☆ محبت سب خطاؤں کو ڈھانپ لیتی ہے۔
☆ غضب ناک آدمی سدا فتنہ برپا کرتا ہے۔
☆ انسانیت کی قدروں کو پامال کرنے والا رسوا ہو جاتا ہے۔
☆ نیک اور پاک دامن بیوی اپنے شوہر کے لیے تاج کے مانند ہوتی ہے۔
☆ انسان میں بڑا پن لباس یا عمر سے نہیں بلکہ اس کی ذہانت اور عقلمندی سے پیدا ہوتا ہے۔
☆ ترش بولنے والے کی باتیں دوسروں کے دلوں کو تلوار کی طرح چھید دیتی ہیں۔
☆ بدی کے منصوبے باندھنے والوں کے دلوں میں شیطان بستا ہے۔
☆ دانا عورت اپنا گھر بناتی ہے مگر بے وقوف عورت اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر برباد کرتی ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دار العمل

مرزا امجد بیگ

قدرت کی طرف سے یہ بہت بڑا اعزاز انسان کے حصے میں آیا ہے کہ شعور ، تجسس اور عزم نے مل کر اس کی ذات کو تمام مخلوق پر اشرف بنا دیا ہے مگر... یہی انسان ہے جوخود سے بیگانہ اور اپنی صلاحیتوں سے انجان ہے۔ بہرحال جسے ان کی پہچان ہوجاتی ہے وہ انسانیت کی فلاح اور انصاف کے لیے میدان میں اتر جاتا ہے... کچھ ایسا ہی حال مرزا امجد بیگ کا بھی تھا جنہوں نے بے شمار کیسوں کو نہ صرف حل کیا بلکہ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے بے شمار دعائیں بھی سمیٹیں... اس کا دامن بھی ناحق خون سے داغدار کیا جارہا تھا۔ اپنوں کے ہی ہاتھوں ایک چھوٹے سے پُرسکون گھر کو بکھیرنے کی سازش بڑے زوروں پر چل رہی تھی۔ لیکن انسان بھول جاتا ہے کہ زور ہو یا زور آور ایک نہ ایک دن ڈھے جاتا ہے... قدرت کا مشاہدہ نہ صرف ایک دلچسپ شوق بلکہ خدا کے قریب ہونے اور اسے جاننے کا خوب صورت وسیلہ بھی ہے... اور جب یہ سب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے تو دل بے اختیار اس کی قدرت پر اش اش کر اٹھتا ہے۔

مضبوط کہانی بننے والے ایک کمزور مجرم کی بے وقوفیوں کا احوال

یہ دنیا بڑی عجیب و غریب جگہ ہے۔ انسان کا عمل اس کی زندگی پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ اثر پذیری اس قدر گہری ہوتی ہے کہ انسان کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اگر عمل صالح ہے تو وارے کے نیارے بھی ہوجاتے ہیں یعنی انسان کا فعل ہر لمحہ اس کے تعاقب میں رہتا ہے اور کسی بھی صورت اس سے بچاؤ یا فرار ممکن نہیں شاید اسی لیے دنیا کو دارالعمل کا نام دیا گیا ہے۔ انسان نے اچھا یا برا جو بھی کیا ہو، اس کے سامنے آکر رہتا ہے۔

انسان جب تک زندہ ہے اس کی کہانی مختلف انداز میں آگے بڑھتی ہے اور زندگی کی آخری سانس کے ساتھ ہی یہ چیپٹر کلوز ہوجاتا ہے تاہم اس کہانی سے نکلنے والی شاخیں پھل پھول کر نئی نئی کہانیوں کی صورت اختیار کرلیتی ہیں جن میں مختلف حوالوں سے گہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے اور کسی کہانی کو سن کر یا پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی یا اس سے ملتی جلتی کہانی یا اسی کہانی کا کچھ حصہ ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ زیر نظر کہانی بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے۔

ایک رات میں سونے کی تیاری کررہا تھا کہ میرے ایک دیرینہ دوست کا فون آگیا۔ انہوں نے مجھے میری کامیابی پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دی اور کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ کا کام ابھی ختم نہیں ہوا......!“

”کیا مطلب جناب؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ نے اس مجبور اور لاچار عورت کو اپنی وکالت کے زور پر عدالت سے انصاف تو دلا دیا ہے لیکن اس کے شوہر کا معاملہ ابھی تک وہیں کا وہیں اٹکا ہوا ہے۔“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ کس بے بس عورت کی بات کررہے ہیں عابد صاحب؟“ میری حیرت میں اضافہ ہوگیا۔

”کمال ہے، اتنی جلدی بھول گئے......“ عابد صاحب نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا پھر بتایا۔ ”بھئی......

میں یاسمین کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ...... اچھا، وہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیے۔

دو ماہ پہلے عابد نوید کے توسط سے میرے پاس ایک مصیبت زدہ عورت کا کیس آیا تھا۔ اس بدنصیب عورت کے پڑوسی نے مختلف داؤ پیچ کی مدد سے اس کا فلیٹ ہتھیا لیا تھا اور میں نے اس کی دست گیری کرتے ہوئے مذکورہ عیار شخص کو عدالت میں گھسیٹ کر اس کی خوب گت بنائی تھی جس کے نتیجے میں وہ شخص بندے دا پتر بن گیا تھا اور یاسمین نامی اس عورت کا فلیٹ خرد برد ہونے سے بچ گیا تھا۔ ابھی عابد صاحب اسی عورت کا تذکرہ کر رہے تھے۔

''عابد صاحب! میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کیس کے ٹکڑے نہ کریں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ یہ دونوں معاملات ایک ساتھ میرے حوالے کر دیتے تو مجھے یقین ہے، اب تک یاسمین کا شوہر بھی باعزت بری ہو کر گھر آچکا ہوتا......''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''لیکن میں کسی پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتا۔ آپ کی تجویز میں نے آگے بڑھا دی تھی اور وہاں سے جو جواب آیا وہ آپ کو بتا دیا تھا۔''

عابد نوید صاحب ایک فلاحی تنظیم چلاتے تھے۔ شہر میں ان کی تنظیم کی ریپوٹیشن بہت اچھی تھی۔ وہ ضرورت مندوں اور مصیبت زدہ افراد کی حتی الامکان مدد کرتے رہتے تھے اور اگر کوئی شخص مالی لحاظ سے بہت کمزور ہوتا تو اس سے بھرپور تعاون بھی کرتے تھے۔ عابد صاحب سے میری دوستی خاصی پرانی تھی اور ہم ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کیا کرتے تھے۔

میں نے دوسری جانب فون پر موجود عابد نوید سے کہا۔ ''عابد صاحب! جو بیت گئی اسے بھول جائیں۔ یہ بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے جناب! آپ یاسمین کے شوہر شوکت علی کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولے۔ ''اس سلسلے میں میری تنظیم کافی حد تک تعاون کرے گی۔ کچھ آپ بھی حصہ ڈالیں گے تو بات بن ہی جائے گی۔''

''جی بالکل......'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ ''کچھ حصہ'' ڈالنے والی بات خاصی معقول ہے۔''

''تو آپ کل ہی جیل جا کر شوکت علی سے ایک ملاقات کر لیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''تاکہ اس معاملے کو جلد از جلد نمٹایا جا سکے۔''

''اوکے......'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ ایسا کریں کہ کل سہ پہر میں یاسمین کو میرے آفس میں بھیج دیں۔ میں پہلے ملزم کی بیوی سے ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ کے لیے کوئی زبردست لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔''

''بہت بہتر......'' عابد نوید صاحب نے کہا۔ رسمی اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

قارئین اس بات کو بھولے نہیں ہوں گے کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے یاسمین نامی ایک عورت کو ایک فراڈ سے بال بال بچا لیا تھا۔ اس کا شوہر کسی کار ڈیلر کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام لیلیٰ تھا۔ تین افراد کا یہ کنبہ دو کمروں کے ایک فلیٹ میں امن و سکون کی زندگی گزار رہا تھا کہ ان کے جیون میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ایک روز یاسمین کے شوہر شوکت علی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس صورتِ حال نے یاسمین اور لیلیٰ کو پریشان کر دیا۔ بہرحال اس موقع پر یاسمین کا پڑوسی اجمل شاہ انسانی ہمدردی کے ناتے ان کی مدد کو لپکا۔ یہ الگ بات کہ بعد ازاں اس کی ہمدردی یاسمین کو بہت مہنگی پڑی تھی۔ اسی مکار شخص نے مختلف انداز میں پہلے یاسمین کو لاکھوں کا مقروض کیا پھر اس قرض کی ادائیگی کے ڈیل میں اس کا فلیٹ ہتھیانے کی کوشش کی تھی لیکن میری مداخلت اور قانونی چارہ جوئی کے بعد اجمل شاہ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے تاہم یاسمین کا شوہر شوکت علی قتل کے الزام میں ہنوز جیل میں بند تھا اور اس پر مقدمہ چل رہا تھا۔

آئندہ روز یاسمین میرے دفتر آکر مجھ سے ملی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''شاہ جی اب تو آپ کو تنگ نہیں کرتا؟''

''نہیں بیگ صاحب! وہ بالکل تیر کی طرح سیدھا ہو گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کبھی آمنا سامنا ہو جائے تو نگاہ جھکا کر گزر جاتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، اب پریشانی والی کوئی بات نہیں رہی......''

''شاہ جی کی طرف سے تو سکون ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن شوکت کی وجہ سے میں بے حد پریشان ہوں۔ عابد صاحب نے مجھے

یقین دلایا ہے کہ آپ دو چار پیشیوں میں شوکت کو باعزت بری کرالیں گے۔''
میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ ''اور آپ کو عابد صاحب کی بات پر اعتبار ہے؟''
''کیوں نہیں بیگ صاحب۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اور اس اعتبار کی دہری وجہ ہے۔''
''دہری وجہ...... میں سمجھا نہیں؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے اس یقین کا ایک سبب تو عابد صاحب کی بے لوث ہمدردی اور اخلاص ہے اور دوسری وجہ آپ کی کارکردگی ہے۔ آپ نے جتنی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ شاہ جی کے دانت کھٹے کیے ہیں اس واقعے کو دیکھ کر میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی کوششوں سے شوکت بہت جلد اس مقدمے سے بری ہوجائے گا۔''
''انشاء اللہ!'' میں نے صدق دل سے کہا۔ ''میں صرف کوشش کرتا ہوں اور صلہ دینے والی کوئی اور ہی ذات ہے۔ آپ مجھے جس قدر ٹھوس اور مبنی برصداقت معلومات فراہم کریں گی، میں اتنی ہی آسانی اور یقین کے ساتھ کیس لڑسکوں گا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''اب آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کا شوہر کن حالات کا شکار ہوکر جیل گیا ہے......؟''
''میں اس واقعے کی تفصیل سے واقف نہیں ہوں۔'' وہ بے بسی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''بس، اتنا جانتی ہوں کہ شوکت کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ وہ بے گناہ ہے۔ کسی گہری سازش کے تحت اسے اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔''
''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن عدالت ہمارے یقین کی روشنی میں فیصلے نہیں کرتی۔ اسے کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے واقعاتی شہادتوں، مضبوط گواہوں اور ٹھوس حقائق کے ثبوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''
''سوری بیگ صاحب! میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، اگر آپ شوکت سے ایک بھرپور ملاقات کرلیں تو آپ کی مطلوبہ معلومات آپ کو حاصل ہوجائیں گی۔''
''ہاں، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ شوکت سے تفصیلی بات کرنا پڑے گی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''اس کی پیشی کب ہے؟''
''ایک ہفتے کے بعد۔'' اس نے جواب دیا۔
''کیا ابھی تک وہی وکیل شوکت کا کیس لڑرہا ہے جس کے حوالے سے اجمل شاہ نے پچاس ہزار کی جعلی رسید بنا کر آپ کو دی تھی؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔
''شاید اس کا نام......''
''جاوید صادق!'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''جاوید صادق تو اس واقعے کے بعد خود ہی اس کیس سے الگ ہوگیا تھا اور اس کے بعد بس اللہ کے سہارے یہ کیس آگے بڑھ رہا ہے...... وکالت کرنے والا کوئی نہیں۔''
''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''میں اگلی پیشی پر شوکت سے ملاقات کروں گا۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی ہی میں آگے کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکتا ہے۔''
''ٹھیک ہے وکیل صاحب!'' وہ مطمئن لہجے میں بولی۔ ''آئندہ پیشی پر میں بھی آپ کو عدالت ہی میں ملوں گی اور آپ سمجھ لیں کہ یہ کیس آپ نے ابھی اور اسی وقت اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فیس والے معاملات آپ عابد صاحب کے ساتھ طے کرلیجیے گا۔''
''میری ان سے بات ہوگئی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ بے فکر ہوجائیں۔''
وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔
''آپ کی جاب چل رہی ہے یا......؟''
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''وہ جاب تو میری ضرورت ہے بیگ صاحب۔ اگر آمدنی کا وہ ذریعہ بھی بند ہوگیا تو پھر میں خود کو اور اپنی بیٹی کو کھلاؤں پلاؤں گی کہاں سے اور پھر......'' وہ لمحے بھر کو رکی، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''میں نے اپنے آفس سے بیس ہزار روپے قرض بھی لے رکھے ہیں۔ جب تک وہ قرض نہیں اتر جاتا، میں جاب کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔''
میں نے اس کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے تسلی دی اور اسے اپنے دفتر سے رخصت کردیا۔
شوکت علی کے جیل چلے جانے کے بعد یاسمین پر مصائب کے کئی پہاڑ ایک ساتھ ٹوٹ پڑے تھے۔ سب سے بڑا ستم تو معاشی تھا۔ شوکت اس گھر کا واحد کفیل تھا۔ جب وہ جیل چلا گیا تو ان ماں بیٹی کو کھانے کے لالے

پڑ گئے۔ شوکت پر جس شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا، اس کا تعلق براہِ راست شوکت کے باس کفیل یزدانی سے تھا۔ یعنی مقتول سلیم اختر، کفیل یزدانی کے لیے ایک پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس واقعے کے بعد شوکت علی کی طرف سے کفیل یزدانی کا دل میلا ہوگیا تھا حالانکہ پہلے وہ اس پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ حالات اور واقعات اس انداز میں شوکت علی کی مخالفت پر اتر آئے تھے کہ وہ اپنی سچائی، صداقت اور بے گناہی کو ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ واقعاتی شہادتیں اور گواہ اسے ایک مجرم ثابت کر رہے تھے۔ اس پر ایک پارٹی کو لوٹ کر قتل کرنے کا الزام تھا۔ واقعات کے مطابق شوکت علی نے کار کی خریدار ایک پارٹی (سلیم اختر) سے مبلغ دو لاکھ روپے کیش چھین کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان حالات میں کفیل یزدانی نے شوکت علی کی ہر طرح کی مدد سے صاف انکار کر دیا تھا۔

چنانچہ یاسمین کو گھر چلانے کے لیے ایک پرائیویٹ آفس میں جاب کرنا پڑی تھی۔ اس کے پاس تعلیم تھی لہٰذا ایک کلرک کی نوکری حاصل کرنے میں اسے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی لیلیٰ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کی خالہ فردوس کا گھر سعید منزل پر تھا جو لیلیٰ کے اسکول سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا۔ لیلیٰ اس صورتِ حال میں اسکول سے چھٹی کے بعد اپنی فردوس خالہ کے گھر چلی جاتی تھی اور شام میں یاسمین اپنے آفس سے واپسی پر لیلیٰ کو پک کر کے گھر آجاتی تھی۔ فردوس، یاسمین کی چھوٹی بہن تھی۔ یاسمین کا آفس ٹاور کے نزدیک تھا لہٰذا اسے لیلیٰ کو پک کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

پچھلے کیس کے سلسلے میں اجمل شاہ کی زبانی بھی مجھے شوکت کے حوالے سے کافی اہم معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ شاہ جی کے مطابق مقتول سلیم اختر، کفیل یزدانی کے شوروم پر کوئی کار خریدنے آیا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ ایک بریف کیس میں دو لاکھ کیش رکھ کر لایا تھا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور اس پارٹی کے لیے یزدانی کو مجبوری میں اپنا شوروم کھلوانا پڑا تھا۔ سلیم اختر کی کوئی ایسی مجبوری تھی کہ وہ چھٹی سے اگلے دن نہیں آسکتا تھا۔ یزدانی نے شوکت علی کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ پارٹی کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھولے تاکہ کار کی خریداری کے لیے آنے والے شخص کو کسی قسم کی دقت نہ اٹھانا پڑے۔ شوکت علی نے اپنے سیٹھ کفیل یزدانی کی ہدایات پر من وعن عمل کیا لیکن ابھی پارٹی دو لاکھ کی رقم کے ساتھ شوروم پہنچی بھی نہیں تھی کہ شیطان نے اس کے دماغ پر قبضہ کرلیا۔ اس نے کفیل یزدانی کو فون کر کے بتایا کہ پارٹی نے آج آنے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔ یزدانی نے اس سے کہا کہ وہ شوروم بند کر کے گھر چلا جائے۔ شوکت نے یزدانی کو تسلی دی کہ وہ ایسا ہی کرے گا لیکن اس کے ذہن میں کوئی اور ہی منصوبہ پک چکا تھا۔ وہ فون پر اپنے سیٹھ کو بے وقوف بنانے کے بعد بڑی بے تابی سے پارٹی کا انتظار کرنے لگا۔ پارٹی جب شوروم پہنچی اور سیٹھ کے بارے میں پوچھا تو شوکت نے ریوالور نکال کر اس سے دو لاکھ روپے والا بریف کیس چھیننے کی کوشش کی۔ اس صورتِ حال نے سلیم اختر کو الجھا کر رکھ دیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں اس نے رقم والے بریف کیس کو ایک ڈھال کے مانند اٹھا رکھا تھا۔ شوکت نے سلیم اختر پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں سلیم اختر کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ کسی کی جان لینا شاید اس کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا لہٰذا اس سنگین صورتِ حال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا اور اس نے جائے واردات سے بھاگنے کی کوشش کی تاہم وہ اس کوشش میں کامیابی حاصل نہ کرسکا اور وہاں موجود کچھ لوگوں نے جن میں مقتول سلیم اختر کے ساتھ آنے والا اس کا ڈرائیور بھی شامل تھا، شوکت علی کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

اجمل شاہ نے اس اندوہناک واقعے کے بارے میں مجھے جتنی تفصیل سے بتایا تھا، اس سے تو یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ اس وقت خود شوروم کے اندر موجود تھا اور قتل کی یہ واردات اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئی تھی لیکن میں کسی بھی صورت اس کے بیان کردہ واقعات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا اور اس کی بھی چند وجوہات تھیں......

میری معلومات کے مطابق اجمل شاہ اور شوکت علی آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔ شوکت علی کے باپ اشفاق حسین نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک بیوی مسرت جبیں سے اجمل شاہ اور دوسری بیوی عالیہ بیگم سے شوکت علی پیدا ہوا تھا۔ عمر میں اجمل شاہ، شوکت علی سے بڑا تھا۔ اصولی طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں والا برتاؤ کرنا چاہیے تھا لیکن شوکت علی کے جیل چلے جانے کے بعد اجمل شاہ نے اس کی بیوی یاسمین کو ہمدردی اور اپنائیت کے نام پر الو بنا کر جس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا اس سے اجمل شاہ کی کمینگی اور پست ذہنیت کا اظہار ہوتا تھا لہٰذا اس کی فراہم کردہ معلومات کو چیک کیے بغیر میں درست ماننے کو تیار نہیں تھا اور

اس بیان کی تصدیق صرف اور صرف شوکت علی ہی کر سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی میں اس سے ملاقات کر چکا تھا لیکن اس وقت ہمارے درمیان فلیٹ والے معاملے پر گفتگو ہوئی تھی۔ شوروم پر پیش آنے والا واقعہ زیر بحث نہیں آسکا تھا۔

اس کیس کی ایف آئی آر، واقعاتی شہادتیں اور گواہوں کے بیانات سے جو صورت سامنے آئی تھی، اس کے مطابق شوکت علی کی پوزیشن خاصی مشکوک یہ الفاظ دیگر خاصی کمزور تھی۔ مقتول سلیم اختر کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں دو گولیاں لگی تھیں جن کی وجہ سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس نہ تو اس بریف کیس کا کوئی سراغ لگا سکی تھی جس میں سلیم اختر دو لاکھ روپے کی خطیر رقم رکھ کر لایا تھا اور نہ ہی ملزم شوکت علی کی زبان سے وہ کچھ اگلوا سکی تھی۔ اس ضمن میں پولیس کے دو نقطۂ نظر تھے۔

نمبر ایک...... سلیم اختر کو قتل کرنے کے بعد شوکت علی نے نہایت ہی چابک دستی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بریف کیس کو کہیں ٹھکانے لگا دیا تھا تاکہ بعد میں جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے تو وہ چھپائے ہوئے بریف کیس کو چپ چاپ نکال کر اپنے کام میں لے آئے۔ نمبر دو...... شوکت علی نے یہ کام بڑی مضبوط پلاننگ کے ساتھ کیا تھا اور اس مذموم کارروائی میں اس کا کوئی ساتھی بھی شامل تھا جو رقم والا بریف کیس لے کر کہیں نکل گیا تھا مگر فرار ہونے کے دوران میں شوکت علی پکڑا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول سلیم اختر کی موت دن دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا سبب وہی دو خطرناک گولیاں تھیں جو اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگی تھیں اور اسے دوسری سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

پولیس کے قائم کردہ نظریات میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا تھا۔ یقیناً ریمانڈ کی مدت کے دوران میں انہوں نے شوکت علی پر تشدد بھی کیا ہوگا تاکہ دو لاکھ والے بریف کیس کے حوالے سے اس کی زبان کھلوا سکیں لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ شوکت علی نے سلیم اختر کے قتل کا اقرار کیا تھا اور نہ ہی بریف کیس کے حوالے سے کچھ بتایا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اس کی پیشی تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ اس پیشی پر اس سے بھرپور ملاقات کروں گا تاکہ شوروم پر پیش آنے والے واقعے کی حقیقت سے پردہ اٹھایا جا سکے۔

☆☆☆

اس روز میں ذرا جلدی عدالت پہنچ گیا تھا حالانکہ اس دن میرا کوئی کیس عدالت میں نہیں لگنے والا تھا۔ میں صرف اور صرف شوکت علی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ یاسمین کی پریشانی کا مجھے اندازہ تھا اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس کا شوہر گھر آجائے۔ یہ معاملہ تو بہت پہلے نمٹ چکا ہوتا اگر یہ دونوں کیس ایک ساتھ میرے ہاتھ میں ہوتے۔ بہرحال قدرت کے کارخانے میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے اور سو فیصد درست کہا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا۔

اس بات کا مجھے پتا چل چکا تھا کہ جو جونیئر وکیل شوکت علی کے کیس کی پیروی کر رہا تھا، وہ اب اس کیس کو چھوڑ کر جا چکا تھا اور پچھلی ایک دو پیشیاں اللہ توکلی ہی ہوئی تھیں۔ جاوید صادق کی مجھ سے بھی ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اجمل شاہ نے کسی موقع پر شوکت علی کی رہائی کے لیے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی اسی لیے وہ بھی بددل ہو کر کنارہ کش ہو گیا تھا اور اب تو وہ خیر، اس کیس سے ہینڈز اپ ہی ہو چکا تھا۔

میں نے عدالت پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شوکت علی کے کیس کی تاریخ بڑھوا لی۔ یہ ایک ٹیکنیکل کام ہے اور کوئی بھی وکیل اپنے کیس کی تاریخ کو آگے بڑھوا سکتا ہے۔ میں اگرچہ ابھی تک اصولی طور پر شوکت علی کا وکیل نہیں تھا لیکن پیش کار کے سامنے میں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ یہ کیس اب میرے ہاتھ میں ہے اور اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اخلاقی اعتبار سے میں یہ کیس لے ہی چکا تھا۔ پھر چونکہ جاوید صادق اس کیس کو چھوڑ کر جا چکا تھا اس لیے بھی پیش کار نے کسی قسم کی جرح نہیں کی۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا کہ اب اس کیس کی پیروی میں کروں گا۔

لگ بھگ ساڑھے نو بجے مجھے شوکت علی کی صورت نظر آئی۔ وہ دو کانسٹیبلز کی نگرانی میں عدالت پہنچا تھا۔ یقیناً جیل کی گاڑی نے اسے عدالت تک پہنچایا ہوگا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ بال الجھے ہوئے، شیو بڑھا ہوا اور آنکھوں میں ویرانی جھلکتی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ وہ ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں بند تھا اور ہر دس پندرہ دن کے بعد عدالتوں کے دھکے کھا رہا تھا۔ دنیا کا دستور بھی نرالا ہے۔ بعض خطرناک جرائم پیشہ لوگ معاشرے میں آزادانہ دندناتے پھرتے ہیں اور بعض بدنصیب بے گناہ ہی تھانوں

اور جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں۔

میں اس وقت عدالت کے احاطے میں کھڑا تھا۔ شوکت علی کی مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ میں جلدی سے اس کے قریب چلا گیا اور باری باری دونوں کانسٹیبلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں چند منٹ کے لیے ملزم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک کانسٹیبل نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''آپ کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے......''

''اسی احاطے میں یا اندر عدالت کے کسی کمرے میں دیکھا ہوگا۔'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے اور ظاہر ہے، ایک وکیل کورٹ کچہری ہی میں نظر آئے گا۔''

''اوہ...... مجھے یاد آگیا۔'' اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی۔ ''آپ نے ملزم کے کسی فلیٹ والے کیس میں وکالت کی تھی مگر...... وہ کیس تو ختم ہو چکا۔''

''یقیناً وہ کیس ختم ہو چکا لیکن میں اب بھی شوکت علی کا وکیل ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے......؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت چمکنے لگی۔

''اب میں قتل والے مقدمے میں شوکت علی کا وکیل ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج کے بعد اس کیس کی پیروی میں کروں گا۔''

''مگر...... اس کیس کی پیروی تو کوئی دوسرے وکیل صاحب کر رہے تھے۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا پھر چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کیا۔ ''وہ وکیل صاحب کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔''

''وہ وکیل صاحب اب کم از کم شوکت علی کے کیس میں کہیں نظر نہیں آئیں گے کیونکہ انہوں نے یہ کیس چھوڑ دیا ہے۔''

''ان وکیل صاحب نے کیس چھوڑا ہے یا نہیں، اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔'' وہ قدرے بے مروتی سے بولا۔ ''ہم نے تو اپنا فرض پورا کرتے ہوئے ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی مذکورہ کانسٹیبل نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے کیس کی تاریخ بڑھوالی ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو اندر جا کر پیش کار سے پوچھ لیں۔''

میرے الفاظ اور انداز میں اتنی توانائی تھی کہ وہ شش و پنج میں پڑ گیا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے کہا۔

''میری ساری زندگی انہی عدالتوں میں گزری ہے اور یہ بات بھی مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کوئی ملزم جوڈیشل ریمانڈ پر ہوتا ہے تو تنہائی میں اس سے ملاقات کے لیے قائداعظم کی کس رنگ کی تصویر کو زحمت دینا پڑتی ہے۔ بابائے قوم سارے مسائل حل کر دیتے ہیں۔''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا بٹوا برآمد کیا تو کانسٹیبل کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسرت ہلکورے لینے لگی تھی۔ بابائے قوم کے دیدار کو ترسی ہوئی اس کی آنکھوں کو شاید عید کا چاند نظر آ گیا تھا اور اس انجانی خوشی کے نتیجے میں ٹھیک ایک منٹ کے بعد میں عدالت کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ملزم شوکت علی کے ساتھ جزوی تنہائی میں ملاقات کر رہا تھا۔ دو میز چھوڑ کر وہ پولیس اہلکار بھی موجود تھے جنھوں نے قائداعظم کی صورت دیکھتے ہی میرے ارشاد کی تعمیل کر دی تھی۔

گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے ہی میں نے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر شوکت علی کے دستخط کرا لیے جن میں درخواستِ ضمانت بھی شامل تھی۔ اس کارروائی سے شوکت کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ میں واقعی اس کا مقدمہ لڑنے والا ہوں۔

''بیگ صاحب! آپ نے جس طرح ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے فلیٹ والا مسئلہ حل کیا تھا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اب آپ نے یہ کیس ہاتھ میں لیا ہے تو مجھے امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ سچ پوچھیں تو میں...... بالکل مایوس ہو گیا تھا۔''

''مایوسی گناہ ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''آپ بے گناہ جیل تو چلے گئے مگر جیل کے اندر بیٹھ کر آپ یہ گناہ البتہ ضرور کر رہے ہیں......''

''آخر انسان ہوں نا بیگ صاحب۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں اس کیس کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں، کب اس سے میری جان چھوٹے گی۔''

''بہت جلد......'' میں نے اس کی مایوسی بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس سے آپ کی جان چھڑانا میری ذمے داری ہے لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط بیگ صاحب؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''آپ مجھے اس واقعے کی مکمل تفصیل سنائیں گے

جب سلیم اختر کا قتل ہوا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس روز شوروم میں پیش آنے والے واقعے کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔''

''بیگ صاحب! میں بالکل بے گناہ ہوں۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں نے سلیم اختر کو قتل نہیں کیا۔''

''یہ میں بھی جانتا ہوں کہ آپ قاتل نہیں ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ میں یہ کیس لینے کی کبھی ہامی نہ بھرتا لیکن اس کیس کی پیروی کے لیے مجھے جن معلومات کی ضرورت ہے، وہ آپ ہی فراہم کرسکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ پوچھیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا سولہ آنے درست جواب دوں گا۔''

آئندہ دس منٹ تک میں گھما پھرا کر شوکت علی سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس کے جوابات میں بہت زیادہ سنسنی پائی جاتی تھی۔ میں ان حاصل شدہ معلومات کو فی الحال آپ کے سامنے بیان نہیں کروں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر ان کا ذکر آتا رہے گا۔ اس کیفے ٹیریائی میٹنگ کے اختتام پر میں نے ملزم اور اپنے مؤکل شوکت علی سے پوچھا۔

''میرے ایک سوال کا جواب اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیں۔ یہ بات کتنے لوگوں کو معلوم تھی کہ سلیم اختر دو لاکھ روپے کیش لے کر وقوعہ کے روز شوروم پہنچنے والا ہے؟''

''صرف تین افراد یہ بات جانتے تھے۔'' ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ایک میں، ایک یزدانی صاحب اور ایک سلیم اختر یا...... زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ آنے والا بندہ......''

''ان کے علاوہ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''آپ نے کسی غیر متعلقہ شخص سے تو اس رقم کا ذکر نہیں کیا تھا؟''

وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''یہ بہت ضروری ہے شوکت صاحب۔ آپ اچھی طرح ذہن پر زور دینے کے بعد جواب دیں۔''

''ہاں......'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کے علاوہ یہ بات میری بیوی یاسمین کو پتا تھی۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے یہ بات کی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یاسمین نے آگے اور کس کس کو اس راز سے آگاہ کیا تھا۔ یہ خاصی اہم بات تھی۔ جب شوکت علی نے سلیم اختر کا قتل نہیں کیا تھا تو کسی نہ کسی نے تو کیا تھا کیونکہ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ سلیم اختر کا قتل ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت کا سبب وہ دو گولیاں تھیں جو اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگی تھیں اور اسے دوسری سانس لینے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ مذکورہ گولیاں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ میری اپنی سوچ کے مطابق یہ محض اتفاقیہ واقعہ نہیں ہوسکتا تھا۔ کوئی ایسا شخص ضرور تھا جو یہ بات جانتا تھا کہ سلیم اختر دو لاکھ کیش لے کر وقوعہ کے روز کفیل یزدانی کے شوروم پر آنے والا تھا۔ وہ مقتول کی آمد کے اوقات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ یہ خونیں واردات اسی نامعلوم شخص کا کارنامہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے آلۂ قتل کے حوالے سے شوکت علی سے پوچھا۔ ''پولیس نے جائے وقوعہ سے آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا تھا اور وہ بضد ہے کہ اعشاریہ تین دو کیلیبر کا وہ ریوالور تمہاری ملکیت ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''جناب! پولیس کا تو شروع ہی سے یہ موقف ہے کہ وہ ریوالور میرا ہے۔'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نے تو کبھی اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھا۔''

دو میز دور بیٹھے پولیس اہلکاروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ اٹھ کر ہمارے پاس آگئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔ ''جناب! بہت ہوگئی گفت وشنید۔ اب آپ اس بدنصیب کی جان چھوڑ دیں تاکہ ہم اسے جیل پہنچا سکیں۔ ہمیں دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔''

میں نے ان کی مٹھی گرم کرنے کے علاوہ کیفے ٹیریا ہی سے اس بات کو بھی یقینی بنا دیا تھا کہ ان کی شکم سیری کا خاطر خواہ بندوبست ہوجائے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھے۔

میں نے دو چار رسمی باتوں کے بعد شوکت علی کو تسلی تشفی دے کر فارغ کردیا۔ اگلے روز میں نے یاسمین سے ملاقات کی اور اسے شوکت علی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ وہ توجہ سے میری بات سنتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر وہ تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

''شوکت علی نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے یہ بات آپ سے بھی شیئر کی تھی کہ وقوعہ کے روز مقتول سلیم اختر دو

لاکھ روپے کیش کے ساتھ شوروم آنے والا ہے......؟''

''جی بیگ صاحب! یہ بات بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ کوئی چھٹی کے دن کار خرید نے شوروم آرہا ہے۔ میں نے شوکت سے پوچھا تھا کہ ایسا کیوں...... تو اس نے بتایا تھا کہ پارٹی کی کوئی مجبوری ہے۔ جبھی اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پارٹی کار کی قیمت دو لاکھ کیش کی صورت میں لے کر آرہی ہے۔''

''ذرا سوچ کر بتائیں، آپ نے اس بات کا تذکرہ اور کس سے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر بولی۔ ''صرف ایک عورت سے۔''

''عورت سے......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''شاہ جی کی بیوی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اجمل شاہ کی بیوی شائستہ کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ''آپ نے شائستہ سے کب یہ بات کہی تھی اور...... اور اسے کیا بتایا تھا؟''

یاسمین کے انکشاف نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

''وہی بتایا تھا جو شوکت نے مجھے بتایا تھا۔'' وہ عام اور سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''یہ بات میں نے شائستہ کو وقوعہ سے ایک دن پہلے بتائی تھی یعنی اس رات جس کے دوسرے دن چھٹی تھی۔ ہمارے بیچ عام گھریلو قسم کی باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے شائستہ سے کہا کہ کل چھٹی کا دن ہے مگر لیلیٰ کے باپ کو ایک مجبوری میں شوروم جانا ہوگا۔ کوئی پارٹی دو لاکھ کیش کے ساتھ چھٹی کے دن کار خرید نے آرہی ہے......''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا میں نے کچھ غلط کر دیا؟'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

اجمل شاہ عرف شاہ جی کا جو کردار پچھلے کیس میں نکل کر سامنے آیا تھا، اس کی روشنی میں وہ ایک مکار، عیار اور کمینہ خصلت انسان تھا۔ میں نے یاسمین کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کہا۔

''یاسمین صاحبہ! میری ایک بات نوٹ کر لیں۔ آج ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ شائستہ کو کچھ نہیں بتائیں گی۔ آپ کے شوہر کا کیس بہت حساس ہے۔ جتنا زیادہ رازداری سے کام لیا جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گی۔'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ویسے میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ شائستہ اپنے شوہر اجمل شاہ سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایک اچھی عورت ہے۔ فلیٹ والے کیس کے بعد شاہ جی نے تو ہم ماں بیٹی سے قطعی لاتعلقی اختیار کر لی ہے لیکن شائستہ چوری چھپے مجھ سے ملنے آتی رہتی ہے۔''

''مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''شائستہ یقیناً بہت اچھی عورت ہو گی لیکن اس کے باوجود بھی میں یہی کہوں گا کہ آپ نہ صرف شائستہ بلکہ کسی بھی شخص سے ہماری اس گفتگو کا ذکر نہیں کریں گی۔''

''ٹھیک ہے بیگ صاحب! آپ جیسا کہہ رہے ہیں میں ویسا ہی کروں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ ''آپ نے شوکت علی کے پاس کبھی کوئی ریوالور وغیرہ دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اسے اس قسم کے ہتھیاروں سے شدید نفرت ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر تشویش بھرے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''آپ ریوالور کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں...... کہیں آپ شوکت علی کو......؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اگر میری نظر میں آپ کا شوہر مجرم ہوتا تو میں یہ کیس کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔ یہ بات میں نے احتیاطاً اپنی معلومات کے لیے پوچھی ہے۔''

ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''کیا شائستہ نے کبھی آپ سے ایسی بات کی کہ اجمل شاہ کے پاس کوئی ریوالور ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ بڑی شدت سے انکار کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کبھی ایسی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں شائستہ سے اس بارے میں پوچھ کر بتا سکتی ہوں۔''

''نہیں، اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ویسے کبھی باتوں باتوں میں ایسا کوئی تذکرہ نکل آئے تو پوچھ لیجیے گا مگر بہت ہوشیاری کے ساتھ۔ کہیں اسے یہ محسوس نہ ہو کہ یہ بات شوکت کے وکیل نے پوچھی ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب! میں

اس سلسلے میں بہت احتیاط کروں گی اور کہیں بھی آپ کا نام نہیں آنے دوں گی۔'' وہ خاصے اعتماد سے بولی۔ ''ویسے شائستہ آج کل بہت پریشان رہتی ہے۔ اجمل شاہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ وہ اکثر اپنے شوہر کی شکایتیں کرتی رہتی ہے۔''

میں نے یاسمین کو چند اہم امور کے حوالے سے کچھ ہدایات دیں اور رخصت کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر میں نے ملزم شوکت علی کی درخواستِ ضمانت کے ساتھ ہی اپنا وکالت نامہ بھی دائر کر دیا۔ جج نے چونک کر میری جانب دیکھا اور خوشگوار انداز میں بولا۔

''تو ملزم کی وکالت اب آپ کریں گے بیگ صاحب!''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یس، جنابِ عالی! میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والا شریف شہری ہے جسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں الجھا دیا گیا ہے۔ یہ کیس کافی عرصے سے اس عدالت میں زیرِ سماعت ہے لیکن صفائی کی جانب سے ابھی تک کسی وکیل نے ڈھنگ سے اس کیس کی پیروی نہیں کی جس کی وجہ سے یہ کیس چوں چوں کا مربا بن کر رہ گیا ہے۔ آگے چل کر میں اس امر کی بھی وضاحت کروں گا کہ اس گھناؤنی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا اور ایک دوسرے مقدمے میں اس کا کیا انجام ہو چکا ہے لیکن فی الحال میں یہ چاہوں گا کہ اس کیس کو ملزم کے بیان سے شروع کیا جائے تاکہ ترتیب وار آگے بڑھ کر یہ کیس اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائے......دیٹس آل یور آنر......!''

''عدالت اس امر سے اچھی طرح واقف ہے کہ ملزم کی جیل کسٹڈی کے دوران میں اجمل شاہ نامی کسی شخص نے اس کی بیوی سے ان کا فلیٹ ہتھیانے کی کوشش کی تھی اور آپ نے اجمل شاہ کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اجمل شاہ کا زیرِ سماعت قتل کے مقدمے سے بھی کسی طرح کا تعلق بنتا ہے؟''

''یہ ناممکن نہیں ہے جناب لیکن میں فی الحال منطقی انداز میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے عدالت کا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس میں ملزم شوکت علی کے عدالتی معاملات کی تمام تر ذمے داری اس کی بیوی یاسمین نے اجمل شاہ کے حوالے کر رکھی تھی جو نہ صرف ملزم کا پڑوسی ہے بلکہ رشتے میں وہ ملزم کا سوتیلا بھائی بھی لگتا ہے لیکن اس شخص نے یاسمین کو اندھیرے میں رکھتے ہوئے ایک طرف تو اس کیس سے مجرمانہ غفلت برتی اور دوسری جانب وہ مختلف مد میں ملزم کی بیوی سے چھوٹی بڑی رقوم بٹورتا رہا تھا جس کا تفصیلی احوال معزز عدالت کے علم میں ہے۔ اس طرح اجمل شاہ نے نہ صرف ملزم کی بیوی کو لاکھوں کا مقروض کر دیا بلکہ اس قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں وہ بڑی ہوشیاری سے ان کا فلیٹ بھی ہضم کرنے والا تھا۔ بہرحال، میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زیرِ سماعت کیس کو فی الحال فوری طور پر آگے بڑھایا جائے۔ پچھلے کئی ماہ سے یہ کیس جوں کا توں کھڑا ہے۔ ابھی تک استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا بھی سلسلہ شروع نہیں ہوا اور ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اجمل شاہ نے نہ صرف ملزم کو بلکہ اس کی بیوی کو بھی یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اب بچنے والا نہیں۔ اگر اسے پھانسی نہ بھی ہوئی تو کم از کم عمر قید ضرور ہو جائے گی۔ باقی کی زندگی وہ جیل کی دیواروں کے پیچھے گزارے گا۔''

''یہ تو واقعی اس شخص نے بہت برا کیا تھا۔'' جج نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، آپ کیا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟''

''جنابِ عالی! میری یہ خواہش ہے بلکہ معزز عدالت سے میری یہ درخواست ہے کہ اب تک اس کیس کے سلسلے میں جو عدالتی کارروائی ہو چکی ہے، اسے ازسرِنو کیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کیس کی ازسرِنو سماعت کی جائے۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے میری درخواست پر شدید ترین ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم ایک سنگین کیس میں ملوث ہے اور کیس جس حد تک آگے بڑھ چکا ہے، اسے وہیں سے مزید آگے بڑھنا چاہیے۔ وکیلِ صفائی خوامخواہ معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''جنابِ عالی! اس کیس کے سلسلے میں ابھی تک معزز عدالت کا جتنا قیمتی وقت برباد ہو چکا ہے، اس کی نظیر ڈھونڈنا ممکن نہیں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اپنے فاضل دوست کے اطمینان کے لیے اتنا عرض کر دوں کہ میں صرف ملزم کے بیان سے اپنی جرح کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ آگے جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا......''

جج نے مجھے اجازت دے دی اور کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ملزم سے جو بھی پوچھنا چاہیں، پوچھ سکتے ہیں۔''

میں نے فاتحانہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف

دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اگر اس کا بس چلے تو مجھے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں نے وکیلِ مخالف کے چہرے کے تاثرات کو نظرانداز کرتے ہوئے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''جنابِ عالی! ملزم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کو جو بیان دیا ہے، میں اس کا مختصراً ذکر کروں گا۔ واقعات کے مطابق وقوعہ سے ایک روز قبل مقتول سلیم اختر نے شوروم فون کر کے ایک کار خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر وہ اس روز شوروم آنے سے قاصر تھا اور اس کی ضد تھی کہ وہ اگلے روز کار کی قیمت کیش کی صورت لے کر آئے گا اور اپنی پسندیدہ کار خرید کر لے جائے گا۔ واضح رہے کہ اپنی مطلوبہ کار کو پہلے پسند کر کے جا چکا تھا۔ جس روز مقتول پیمنٹ کر کے کار کی ڈیلیوری چاہتا تھا، اس دن ہفتہ وار تعطیل تھی لیکن مقتول کے ساتھ کوئی ایسی مجبوری تھی کہ وہ چھٹی سے اگلے روز بھی شوروم آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا اس شوروم کے مالک مسٹر کفیل یزدانی نے اپنے گاہک کی خواہش اور سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ملزم سے کہا کہ وہ چھٹی کے روز پارٹی کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھول لے۔ اسی آدھے پونے گھنٹے میں یزدانی خود بھی شوروم پہنچ جائے گا۔ ملزم، کفیل یزدانی کے پاس سالہا سال سے ملازم ہے اور یزدانی اس پر بھروسا بھی کرتا ہے۔ ملزم نے اپنے باس کے حکم کی تعمیل کی اور چھٹی کے روز پارٹی کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھول کر بیٹھ گیا پھر مسٹر یزدانی کی آمد سے قبل ہی، پے در پے شوروم پر اس قسم کے واقعات پیش آئے کہ جن کے نتیجے میں میرا موکل ایک ملزم کی حیثیت سے عدالتوں کے دھکے کھا رہا ہے اور ایک شخص کے قتل کے الزام میں جیل میں پڑا اسڑ رہا ہے اور......''

''آبجیکشن یور آنر......!'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وکیلِ استغاثہ نے دخل در معقولات کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست نے ابھی وقوعہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے استغاثہ کو کب انکار ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ شوروم میں پیش آیا، وہ ملزم کو ایک خطرناک مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے......''

''ایک منٹ......!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر وکیل استغاثہ کو مزید بولنے سے روک دیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''محترم! کیا میری بات مکمل ہو گئی ہے جو آپ کو اس میں کلیاں پھندنے ٹانکنے کا شوق اٹھا ہے؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میرے الفاظ میں کھلی ہوئی تلخی نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ روٹھی ہوئی بیوی کے مانند منہ بگاڑ کر جلدی سے بولا۔

''چلیں، آپ پہلے اپنی بات مکمل کر لیں۔ میں بعد میں بولوں گا۔''

''چلیں یا آئیں کی بات نہیں ہے میرے فاضل دوست۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''آپ پہلے اپنی بات کہہ ڈالیں۔ اس کے بعد میں ملزم سے سوال جواب کروں گا۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کوئی اہم انکشاف کرنے والے تھے جس کی بنا پر میرا موکل آپ کی نظر میں ایک خطرناک مجرم قرار پاتا ہے۔ پلیز...... کیری آن۔''

جج کی سوالیہ نظر بھی وکیل استغاثہ پر لگی ہوئی تھی لہٰذا اسے بولنا ہی پڑا۔ وہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''جنابِ عالی! جیسا کہ معزز عدالت جانتی ہے...... دو لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ جب اسے پتا چلا کہ پارٹی دو لاکھ کیش کے ساتھ شوروم پہنچنے والی ہے تو اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ اس نے اپنے سیٹھ کے حکم پر ٹھیک دس بجے شوروم کھول لیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا لہٰذا ملزم کو اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا اور اس کا منصوبہ بہت خطرناک تھا......'' لمحاتی توقف کر کے وکیلِ استغاثہ نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پارٹی...... یعنی مقتول سلیم اختر نے گیارہ بجے شوروم پہنچنے کو کہا تھا۔ ملزم نے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شوروم سے اپنے باس کفیل یزدانی کو فون کیا کہ پارٹی نے آج آنے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔ وہ اب چھٹی کے اگلے روز آئے گی۔ یزدانی نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ شوروم بند کر کے گھر چلا جائے۔ اپنے باس کو ملزم نے یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا لیکن وہ اپنے منصوبے کے مطابق شوروم میں رک کر پارٹی کا انتظار کرنے لگا۔ پارٹی ٹھیک گیارہ بجے شوروم پہنچی اور یزدانی کو وہاں موجود نہ پا کر ملزم سے اس کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں ملزم نے ریوالور نکال لیا اور گن پوائنٹ پر پارٹی کو لوٹنے کی کوشش کی۔ سلیم اختر ایک بریف کیس میں دو لاکھ کے نوٹ رکھ کر لایا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ باہر کی طرف بھاگا اور اس نے بریف کیس کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ ملزم کی نیت کھل چکی تھی اس لیے اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں مقتول کی

کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگیں اور وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔
اس صورتِ حال نے ملزم کو بوکھلا کر رکھ دیا اور اس نے جائے واردات سے فرار ہونے کی کوشش کی تاہم اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور وہ پکڑا گیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر مقتول کا ڈرائیور بھی حرکت میں آ گیا تھا لہٰذا ملزم کو فوراً پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ دیٹس آل یور آنر......!''

''دیٹس ناٹ آل......!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے جو کہانی بیان کی ہے وہ درحقیقت پولیس کی رپورٹ کا عکس ہے اور اس حوالے سے میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہوں گا لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''لیکن...... اس سے پہلے آپ میرے دو سوالوں کے جواب دیں گے......؟''

وکیلِ استغاثہ الجھن بھرے انداز میں مجھے تکنے لگا۔ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ ڈالا۔

''اجازت ہو تو میں سوال کروں؟''

''جی پوچھیں......کیا پوچھنا ہے؟'' وہ روکھائی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''سوال نمبر ایک......کیا آپ کو غیب کا علم ہے؟''

''استغفراللہ!'' وہ جلدی سے بھڑک کر بولا۔ ''آپ کیسی کفر کی باتیں کر رہے ہیں۔ غیب کا علم تو صرف خدا کو ہی ہے......''

''بے شک! اللہ ہی کو ہر غیب اور ظاہر کا مکمل علم ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک خاص مقصد کی خاطر آپ سے یہ سوال کیا تھا۔ بہر حال، آپ کا جواب مجھ تک پہنچ گیا۔ سوال نمبر دو......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ میرے پہلے سوال نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا اور دوسرے سوال کے حوالے سے بھی وہ ایسی ہی توقع کر رہا تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''سوال نمبر دو یہ ہے کہ کیا آپ وقوعہ کے وقت کفیل یزدانی کے شوروم میں موجود تھے اور آپ نے اپنی آنکھوں سے قتل کی وہ واردات ہوتے دیکھی تھی؟''

''آپ بھی کیسے عجیب وغریب اور بے ڈھنگے سوال کر رہے ہیں۔'' وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا اس شوروم میں کیا کام......؟''

''سیانے کہتے ہیں کہ سوال پر سوال نہیں کیا کرتے۔'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

''میرے سوال کی ساخت پر تبصرہ کرنے کے بجائے آپ اس کا سیدھا اور کھرا جواب دیں جیسا کہ آپ نے پہلے سوال کا جواب دیا ہے کہ......آپ غیب کا علم نہیں رکھتے؟''

اس نے ناپسندیدہ انداز میں مجھے دیکھا اور سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں وقوعہ کے وقت کفیل یزدانی کے شوروم میں موجود نہیں تھا۔''

''اوکے......دیٹس فائن!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور وکیلِ استغاثہ سے پوچھا۔ ''مائی ڈیئر! اگر آپ کو غیب کا علم نہیں اور آپ دلوں کا حال اور نیت کا احوال نہیں جان سکتے تو پھر آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ دو لاکھ کیش کی رقم نے ملزم کے دل میں بے ایمانی کے جذبات جگا دیے تھے اور اس نے گن پوائنٹ پر پارٹی کو لوٹنے کا شیطانی منصوبہ بنا ڈالا تھا اور پھر وہ اسی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے پکڑا بھی گیا......''

''میں نے ملزم کے منصوبے کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ ملزم کے عمل سے ثابت ہوتا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''اس کے لیے کسی غیب کے علم کی ضرورت نہیں۔ ملزم نے وقوعہ کے روز شوروم میں جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا، وہ اس کی بدنیتی اور مجرمانہ سوچ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

''منہ بولتا ثبوت......!'' میں نے استہزائیہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کے آخری الفاظ کو دہرایا اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، میرا دوسرا سوال زیادہ اہم ہے اور آپ نے اس کا درست جواب نہیں دیا۔ آپ نے وقوعہ کا نقشہ جتنی تفصیل کے ساتھ کھینچا ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ وقوعہ کے وقت بہ نفسِ نفیس وہاں موجود تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے سامنے اپنا آنکھوں دیکھا احوال بیان کیا ہے...... ٹھیک گیارہ بجے مقتول سلیم اختر دو لاکھ کیش کے ساتھ شوروم پہنچا اور جب مقتول نے شوروم کے مالک کو وہاں موجود نہ پا کر ملزم سے اس کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں ملزم نے ریوالور نکال کر مقتول کو لوٹنے کی کوشش کی تاہم مقتول نے وہاں سے بھاگنے کی غلطی کی اور بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر ملزم نے پے درپے مقتول پر دو گولیاں چلائیں جو مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں جا کر لگیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ بعدازاں......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے کہا۔

"بعدازاں...... ملزم اپنی فرار کی کوشش میں بری طرح ناکام رہا اور پکڑا گیا وغیرہ وغیرہ...... آپ اپنی اس رننگ کمنٹری کی کیا توجیح پیش کریں گے میرے محترم دوست؟"

"دیکھیں، بات یہ ہے کہ......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں وقوعہ کے روز جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ یہ ساری تفصیلات پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں سامنے آئی ہیں۔"

"ہوں...... پولیس کی تفتیش!" میں نے استفساریہ انداز میں اسے گھورا۔ "پھر تو آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے......" تھوڑی دیر کو رک کر میں نے اس کیس کے تفتیشی افسر کی طرف دیکھا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) سے چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اجازت ہے......!" جج نے فراخ دلی سے کہا۔

کسی بھی کیس کے تفتیشی افسر کو ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ اگلے ہی لمحے جج کے اشارے پر آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں جرح کے لیے وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) کے قریب چلا گیا۔

"آئی او صاحب! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟" میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"دوست محمد۔" اس نے جواب دیا۔ "سب انسپکٹر دوست محمد۔"

نام کے ساتھ ہی اپنے عہدے کی یاددہانی اس نے بہت ضروری سمجھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "دوست محمد صاحب! آپ ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟"

"جب سے وہ اس کیس میں ملوث ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے جب سے ہم نے اسے سلیم اختر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو توجہ سے پڑھا ہے؟"

"جی ہاں...... کئی بار پڑھا ہے۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "کیوں...... کوئی خاص بات؟"

"خاص اور عام کا فیصلہ کرنا تو معزز عدالت یا آنے والے وقت کا کام ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"میں اس وقت آپ سے مقتول کی موت کے وقت کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول سلیم اختر کی موت دن کے دس بجے سے بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔" میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتا دیا۔

"دس سے بارہ بجے کے درمیان......!" میں نے آئی او کو گھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت دس بج کر پانچ منٹ پر بھی واقع ہونے کا امکان ہے اور پانچ منٹ کم بارہ بجے بھی...... میرے، یہ بتائے ہوئے دونوں اوقات پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ٹائمنگ سے باہر تو نہیں ہیں دوست محمد صاحب......؟"

"آپ کی بات تکنیکی اعتبار سے بالکل درست ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ اس کو حقیقت کے تناظر میں دیکھیں تو بات صاف ہو جائے گی۔"

"حقیقت کے تناظر میں...... کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں کسی شخص کی موت کے وقت کی رینج بتائی جاتی ہے یعنی رپورٹ میں درج شدہ وقت کے دوران میں کسی وقت اس کی موت واقع ہوئی ہوتی ہے...... درمیان میں کہیں جیسے مقتول سلیم اختر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا مطلب یہ ہے کہ دس اور بارہ بجے کے درمیان یعنی...... گیارہ بجے کے آس پاس اس کی موت واقع ہوئی تھی۔"

"گیارہ بجے کے آس پاس......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "گیارہ بجے مقتول اس شوروم پر پہنچا تھا۔ گیارہ سے پہلے تو اس کی موت واقع ہو نہیں سکتی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سلیم اختر کی موت گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے دوست محمد صاحب؟"

"میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں وکیل صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "سلیم اختر کی موت گیارہ بجے کے بعد ہی واقع ہوئی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ...... گیارہ پانچ یا گیارہ دس پر......!"

"اوہ...... اتنا قریب اندازہ لگانے کا سبب بتا سکتے ہیں۔" میں نے طنزیہ انداز میں آئی او کی طرف دیکھا۔ "آپ کو تو کسی اسپتال کے چیر پھاڑ ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے تھا۔ اسپتال والے آپ کی اس بے مثال خوبی بلکہ

حیرت انگیز صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ ایکوریٹ پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کر سکتے ہیں......"

"اس میں میری کسی صلاحیت کا دخل نہیں ہے وکیل صاحب!" وہ میرے طنز پر جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

"پھر...... پھر کیا آپ کو الہام ہوتا ہے؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ میرے تیکھے سوال کے جواب میں تحمل سے بولا۔ "دراصل، سارا مسئلہ ٹائمنگ کا ہے۔"

"ٹائمنگ...... کیسی ٹائمنگ؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے وہاں پہنچنے کی ٹائمنگ۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم جب جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتول اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو چکا تھا۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "آپ کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟"

"سوا گیارہ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" میں نے چونک کر انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا۔ "گیارہ بجے پارٹی یعنی مقتول سلیم اختر جائے وقوعہ پر پہنچا اور سوا گیارہ بجے آپ۔ کیا آپ کو پہلے سے پتا تھا کہ کفیل یزدانی کے شوروم میں قتل کی کوئی واردات ہونے والی ہے کیونکہ......" میں نے ڈرامائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ پولیس کی ایسی پھرتی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی کہ واردات کے دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ وقوعہ پر موجود ہو۔"

"اس میں پولیس کی پھرتی والی کوئی بات نہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بس ایک اتفاق کے تحت ہم سوا گیارہ بجے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے۔"

"اس اتفاق کی وضاحت فرمائیں گے؟"

"ہم معمول کے گشت پر تھے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "جب ہماری گاڑی جمشید روڈ سے گزری تو ادھر کاروں کے ایک شوروم کے پاس ہم نے غیر معمولی نقل وحرکت دیکھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور شوروم کھلا دیکھ کر ہم چونک اٹھے۔ جب ہماری گاڑی وقوعہ پر پہنچی تو پتا چلا کہ ملزم نے شوروم میں کسی کو قتل کر دیا ہے۔ دو تین افراد نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ ہم نے جا کر موقع کا جائزہ لیا تو صورتِ حال واضح ہو گئی۔ ہم نے فوراً ملزم کو گرفتار کر لیا۔"

"صورتِ حال واضح ہو گئی سے آپ کی کیا مراد ہے؟" وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ......" وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مقتول سلیم اختر کی لاش شوروم کے آفس والے حصے میں فرش پر پڑی تھی اور وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک میز کے نیچے آلۂ قتل یعنی اعشاریہ تین دو کیلیبر کا ریوالور بھی مل گیا۔ یہ ریوالور دیسی ساخت کا تھا۔ بعدازاں مذکورہ ریوالور کے لیبارٹری ٹیسٹ سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ جن دو مہلک گولیوں کی وجہ سے مقتول سلیم اختر کی موت واقع ہوئی، وہ اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔"

"کیا آپ نے گرفتاری کے بعد ملزم کے فنگر پرنٹس لیے تھے؟" میں نے ایک تکنیکی سوال کیا۔ "اور آلۂ قتل پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات سے ان فنگر پرنٹس کا موازنہ کیا تھا؟"

"نن...... نہیں......" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں......!" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ "اتنا اہم کام آپ کس طرح بھول گئے؟"

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی......" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

"ضرورت محسوس نہیں کی کا کیا مطلب ہوا؟"

"اس وقت شوروم کے آفس والے حصے میں صرف دو افراد ہی تھے۔" وہ اپنی عقل کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک کی لاش فرش پر پڑی تھی اور دوسرا فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تھا لہٰذا وہی قاتل ہو سکتا تھا۔"

"آپ کی اس منطق کو فارمولا نہیں بنایا جا سکتا آئی او صاحب۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی تیسرا شخص پہلے سے وہاں چھپا بیٹھا ہو اور اسی نے سلیم اختر کو موت کے گھاٹ اتارا ہو؟"

"اس امر کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "اول تو یہ کہ وقوعہ کے روز ملزم نے ٹھیک دس بجے شوروم کھولا تھا لہٰذا پہلے سے وہاں کسی کے چھپ کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور شوروم کھولنے کے بعد اگر کوئی تیسرا شخص وہاں آیا تھا تو وہ ملزم کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کا علم ملزم کو ہونا چاہیے۔"

"اور پیرافن ٹیسٹ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"پیرافن...... یہ کیا ہوتا ہے؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے

تکنے لگا۔

''پیرافن ایک کیمیکل ٹیسٹ ہوتا ہے۔'' میں نے اس کے علم میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جب کوئی شخص کسی گن سے فائر کرتا ہے تو بارود کے چند ذرات اس کے ہاتھ پر بھی لگ جاتے ہیں جو عام طور پر نظر نہیں آتے لیکن پیرافن نامی کیمیکل کی مدد سے جب یہ مخصوص ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو پتا چل جاتا ہے کہ مذکورہ شخص نے گن کا استعمال کیا تھا یا نہیں۔ اس ٹیسٹ کی مدد سے قاتل تک رسائی بہت آسان ہو جاتی ہے لیکن......'' میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب آپ کو اس ٹیسٹ کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تو پھر آپ یہ ٹیسٹ کر کیسے سکتے تھے اور جب آپ نے یہ ٹیسٹ کیا ہی نہیں تو پھر آپ سے اس بارے میں کوئی سوال کرنے کا بھی جواز نہیں بنتا......''

وہ خجالت آمیز نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''بریف کیس......!'' میں نے سوالیہ نظر سے آئی او کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''وہ بریف کیس جس کے اندر دو لاکھ کیش رقم موجود تھی جس کو لوٹنے کے لیے استغاثہ کے مطابق ملزم نے سلیم اختر کو قتل کیا......وہی بریف کیس جس کو ڈھال بنا کر مقتول نے جائے وقوعہ سے فرار ہونے کی کوشش کی...... اس بریف کیس کو آپ رقم سمیت یا رقم کے بغیر بازیاب کرانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟''

''نہیں جناب...... وہ بریف کیس ہمیں کہیں نہیں ملا۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ میں نے آفس کے علاوہ باہر شوروم کا بھی کونا کونا چھان مارا تھا۔''

''کمال ہے......'' میں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو مقتول کی لاش مل گئی، ملزم کو آپ نے گرفتار کر لیا اور آلۂ قتل بھی آپ نے برآمد کر لیا لیکن بریف کیس کی کوئی خیر خبر نہیں۔ کیا بریف کیس کا سائز کسی سوئی کے برابر تھا جو آپ کو نظر نہیں آسکا جبکہ اس سے کہیں چھوٹے سائز کا ریوالور آپ کو مل گیا تھا؟''

''جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یقین کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی ہے۔''

''بات میری مرضی کی نہیں ہے دوست محمد صاحب۔ ہم واقعاتی شواہد اور امکانات کی بات کر رہے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی نظر میں جو حقیقت تھی وہ آپ نے بیان کر دی۔ اب ذرا ذہن پر زور دے کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کریں کہ آخر وہ دو لاکھ روپے والا بریف کیس گیا کہاں۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ کوئی جادو کا بریف کیس تو نہیں تھا کہ اڑن چھو ہو گیا؟''

''ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے جناب۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''عین ممکن ہے ملزم نے اس واردات کے لیے کسی اور بندے کو بھی اپنے ساتھ لگا رکھا ہو۔ اس نے سلیم اختر کو قتل کیا اور اس کا ساتھی بریف کیس لے کر غائب ہو گیا۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔''

''یہ دنیا امکانات کا گڑھ ہے۔ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس واردات میں کوئی اور شخص بھی ملزم کے ساتھ شامل تھا تو پھر وہ شخص کہاں غائب ہو گیا؟ آپ نے تو جائے وقوعہ کا چپا چپا چھان مارا تھا۔''

''جیسے آپ نے تھوڑی دیر پہلے فرمایا تھا کہ ممکن ہے، شوروم میں پہلے سے کوئی شخص چھپا بیٹھا ہو جس نے سلیم اختر کو قتل کر ڈالا ہو۔'' وہ مجھ پر ایک گہری چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''اسی طرح میں بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ ملزم نے مقتول کی آمد سے پہلے ہی اپنے ساتھی کو کہیں چھپا رکھا ہو اور بریف کیس ہاتھ لگتے ہی اس نے اپنے ساتھی کو رفوچکر کر دیا ہو۔ بعد ازاں یہ فرار ہونے کی کوشش میں پکڑا گیا۔''

''بہت خوب...... آئیڈیا جان دار ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں آپ نے مختلف ہتھکنڈوں سے ملزم کی زبان کھولنے کی تو کوشش کی ہوگی۔ اس نے دو لاکھ والے بریف کیس کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کمال ہے...... پولیس کی تفتیش کے سامنے تو پتھروں کو بھی زبان مل جاتی ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور آپ ایک کمزور سے انسان کی زبان سے کچھ نہیں اگلوا سکے......''

''پولیس والوں کے بارے میں آپ کی رائے معتبر نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''ہم بھی انسان ہیں اور حدود میں رہتے ہوئے ہی ملزم سے تفتیش کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے دوست محمد صاحب! میں نے آپ کی بات پر یقین کر لیا۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''یہ سوال میں ملزم ہی سے براہ راست کروں گا۔ آپ میرے ایک

اہم سوال کا جواب دیں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ جائے وقوعہ پر اس وقت پہنچے جب مقتول سلیم اختر کا کام تمام ہو چکا تھا اور ملزم کو دو تین افراد نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ جب آپ کو پتا چلا کہ اس شخص نے شوروم کے اندر کسی کو قتل کر دیا ہے تو آپ نے اسے فوراً گرفتار کرلیا۔ شوروم کے اندر تھوڑی دیر پہلے جو واقعہ پیش آیا تھا، آپ اس کے عینی شاہد نہیں ہیں۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے قتل کی واردات کو اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تو پھر میں اس واقعے کا عینی شاہد کیسے ہو سکتا ہوں؟''

''آپ اس واقعے کے آئی وٹنس نہیں ہیں مگر......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن استغاثہ کی رپورٹ میں اس امر کا بڑی شدومد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جب ملزم نے ریوالور کے بل بوتے پر مقتول کو لوٹنے کی کوشش کی تو مقتول نے نوٹوں والے بریف کیس کو ڈھال بنا کر وہاں سے فرار ہونا چاہا تھا۔ میرے مؤکل کے مطابق نہ تو اس نے مقتول کو گن پوائنٹ پر رکھ کر لوٹنے کی کوشش کی اور نہ ہی مقتول نے بریف کیس کو ڈھال بنانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ جب یہ واردات ہوئی، اس وقت شوروم کے آفس والے حصے میں صرف دو افراد موجود تھے۔ نمبر ایک، ملزم شوکت علی۔ نمبر دو، مقتول سلیم اختر۔ سلیم اختر سے کچھ بھی پوچھنا ممکن نہیں رہا کیونکہ وہ ایسی جگہ جا چکا ہے جہاں جا کر اس کا انٹرویو کرنا ناممکن ہے اور دوسرے شخص یعنی اپنے مؤکل کا بیان میں نے آپ کو سنا دیا ہے۔ اب آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ مقتول نے بریف کیس کو ڈھال بنا کر جائے وقوعہ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟''

''یہ بات مجھے مقتول کے ڈرائیور نے بتائی تھی۔'' آئی او دوست محمد نے جواب دیا۔

میں نے دو چار ضمنی سوالات کے بعد انکوائری آفیسر سے جرح ختم کر دی۔ اس کے بعد جج کی اجازت حاصل کر کے میں اکیوزڈ باکس کی جانب بڑھ گیا۔

آج جب عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تھا تو میں نے جج سے درخواست کی تھی کہ میں ملزم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر وکیلِ استغاثہ نے اعتراضات کی بارش کر دی تھی اور میری توجہ کا زاویہ استغاثہ کی رپورٹ یعنی پولیس کے پیش کردہ چالان کی طرف مڑ گیا تھا لہٰذا اس ضمن میں تفتیشی افسر کا تفصیلی انٹرویو کرنا لازمی ٹھہرا تھا۔ اس انٹرویو میں جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا، استغاثہ کی بہت سی خامیوں...... تفتیشی خامیوں کی نشان دہی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ پتا بھی چلا تھا کہ مقتول کو بریف کیس کی ڈھال بنا کر فرار ہوتے ہوئے اس کے ڈرائیور نے دیکھا تھا۔ یہی بات پچھلے کیس میں مجھے اجمل شاہ عرف شاہ جی کی زبانی بھی معلوم ہوئی تھی۔ مقتول کے ڈرائیور کا بیان تو سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت جائے واردات پر موجود تھا لیکن اجمل شاہ کو اس بات کا کیسے پتا چلا؟ یہ سوال تحقیق طلب تھا......

میں نے بریف کیس کے ایشو کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے مؤکل یعنی اس کیس کے ملزم شوکت علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ شوکت علی کی عمر پینتالیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ قدوقامت میں اپنی بیوی یاسمین کے برعکس تھا یعنی یاسمین دراز قامت جبکہ شوکت پستہ قامت تھا۔ ان کی بیٹی لیلیٰ قدوقامت میں اپنے باپ پر گئی تھی۔ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے شوکت علی سے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ سے ایک دن پہلے مقتول نے شوروم فون کر کے کار خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟''

''جی ہاں۔ یہ بالکل درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند روز پہلے وہ اس کار کو پسند کر گیا تھا۔ وقوعہ کے روز اسے رقم ادا کر کے کار وصول کرنا تھی۔''

''رقم...... یعنی دو لاکھ روپے......؟''

''جی ہاں...... دو لاکھ کیش۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ مذکورہ کار کی کل قیمت تھی یا وہ اس سے پہلے بھی کچھ رقم ادا کر چکا تھا؟''

''میری معلومات کے مطابق کار کو پسند کرنے کے بعد مقتول نے دس ہزار روپے ٹوکن منی کے طور پر یزدانی صاحب کو ادا کر دیے تھے۔'' ملزم نے پُراعتماد لہجے میں بتایا۔ ''اور یہ کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ مزید دو لاکھ روپے ادا کر کے اپنی کار لے جائے گا۔''

''یعنی...... کار کی کل قیمت دو لاکھ دس ہزار طے ہوئی تھی؟''

''جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔''

آپ کسی نئی کار کی اتنی کم قیمت کا سن کر حیران نہ

ہوں۔ یہ جس زمانے کا واقعہ ہے، اس وقت دو ڈھائی لاکھ میں خاصی ''ہینڈسم'' کار آجاتی تھی۔ پچھلے چالیس سال میں دیگر اشیائے ضرورت کی قیمتوں کے ساتھ گاڑیوں کی قیمتوں میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

''کیا آپ معزز عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ مقتول نے چھٹی کے روز ہی کار حاصل کرنے کا پروگرام کیوں بنایا تھا؟'' میں نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں سوال کیا۔

''اس کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''وقوعہ سے ایک روز پہلے مقتول نے کتنے بجے شوروم فون کر کے اگلے روز اپنے آنے کے بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''لگ بھگ شام...... یعنی رات آٹھ بجے۔''

''کیا اس وقت فون پر مقتول سے آپ کی بات ہوئی تھی؟''

''نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ فون یزدانی صاحب نے اٹینڈ کیا تھا۔''

''اور یزدانی صاحب ہی نے آپ کو چھٹی کے دن شوروم کھولنے کے لیے کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''آپ نے چھٹی کے روز یعنی وقوعہ کے روز کتنے بجے شوروم کھولا تھا؟''

''دس بجے۔'' اس نے بتایا۔ ''پارٹی نے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا۔ یزدانی صاحب اپنے کسٹمرز کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے پارٹی کی سہولت کی خاطر انہوں نے مجھے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھولنے کا آرڈر دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، آپ نے وقوعہ کے روز دس بجے شوروم کھول لیا تھا اور وہاں بیٹھ کر یزدانی صاحب کا انتظار کرنے لگے تھے۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''یزدانی صاحب نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ پارٹی کی آمد سے پہلے شوروم پہنچ جائیں گے۔'' وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یزدانی صاحب اور پارٹی دونوں کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔''

''ان دونوں میں سے پہلے کون شوروم پہنچا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں......!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ان دونوں کی آمد سے قبل پارٹی کا فون آگیا تھا۔''

''پارٹی سے آپ کی مراد مقتول سلیم اختر ہی ہے نا؟''

''جی ہاں!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''مقتول نے کتنے بجے آپ کو فون کیا تھا؟''

''دس بج کر چالیس منٹ پر......'' اس نے بتایا۔

''پارٹی نے فون پر آپ سے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ اس نے آنے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے اگلے روز آنے کی بات کی تھی۔''

''پارٹی کی جانب سے پروگرام کی تبدیلی کے بعد آپ نے کیا کہا تھا؟''

''میں نے فوری طور پر یزدانی صاحب کو فون کر کے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''یزدانی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں شوروم بند کر کے اپنے گھر چلا جاؤں۔''

''آپ نے یزدانی صاحب کو کتنے بجے فون کیا تھا؟''

''پارٹی کا فون سننے کے فوراً بعد۔'' اس نے کہا۔ ''لگ بھگ پونے گیارہ بجے۔''

''پونے گیارہ بجے......'' میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا اور سوال کیا۔ ''کیا اس کے بعد آپ نے یزدانی صاحب کی ہدایت پر شوروم بند کر دیا تھا؟''

''جناب! شوروم کوئی ماچس کی ڈبیا نہیں جسے ایک سیکنڈ میں کھول بند کر لیا جائے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ پندرہ بیس منٹ کا کام ہے اور میں ابھی اس کام کو مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ پارٹی وہاں پہنچ گئی۔''

''پارٹی...... شوروم میں پہنچ گئی......'' میں نے حیرت بھری نظر سے ملزم کی طرف دیکھا۔ ''لیکن تھوڑی دیر پہلے پارٹی نے تو آنے سے منع کر دیا تھا۔ آپ نے پارٹی کی طرف سے آنے والے فون کا ذکر کیا ہے؟''

''جی ہاں...... پارٹی کی آمد پر مجھے بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''شکر ہے، اس وقت تک میں نے شوروم کے شٹر نہیں گرائے تھے۔ میں پارٹی کو اپنے ساتھ اندر آفس میں لے گیا۔''

''کیا مقتول اکیلا ہی آفس میں آیا تھا یا اس کا ڈرائیور بھی ہمراہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اکیلا ہی اندر آیا تھا۔'' ملزم نے بتایا۔ ''اس کا ڈرائیور باہر گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کی

جھلک دیکھ لی تھی۔"

"اور دو لاکھ روپے والا بریف کیس پارٹی یعنی...... مقتول کے ہاتھ میں تھا......؟"

"جی ہاں۔ وہ بریف کیس کے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔"

"اس کے بعد آفس کے اندر کیا واقعات پیش آئے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی مقتول نے یزدانی صاحب کے بارے میں سوال کیا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا چونکہ آپ نے آج کا پروگرام کینسل کر دیا تھا اس لیے یزدانی صاحب کی آمد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور...... میں بھی شوروم بند کر کے بس جا ہی رہا تھا کہ آپ آ گئے۔"

"آپ کی اس وضاحت پر پارٹی نے کیا کہا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میری بات پر مقتول نے الجھن بھری حیرت کا اظہار کیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور کہا تھا کہ اس نے تو کوئی فون وغیرہ نہیں کیا تھا......"

"کیا مطلب...... فون تو مقتول نے کیا تھا۔" میں نے چونکتے ہوئے انداز میں کہا۔ "جبھی تو آپ نے یزدانی صاحب کو پارٹی کے پروگرام کے کینسل ہو جانے کے بارے میں بتایا تھا۔"

"جی ہاں، حقیقت تو یہی ہے مگر پارٹی کا اصرار تھا کہ اس نے ایسا کوئی فون نہیں کیا۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "پارٹی نے مجھ سے کہا کہ وہ دو لاکھ کیش لے کر آیا ہے اور اپنی پسندیدہ کار لے کر جائے گا لہٰذا میں جلدی سے یزدانی صاحب کو فون کر کے شوروم پر بلوا لوں۔"

"پھر آپ نے پارٹی کی فرمائش پر اپنے باس کو فون کیا تھا؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی جناب......!" ملزم بے چارگی سے بولا۔

"نوبت نہیں آئی سے آپ کی کیا مراد ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا اچانک وہاں کوئی ایٹم بم پھٹ گیا تھا؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں جناب......"

"ایسا کیسے سمجھ لوں۔" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "آپ معزز عدالت کے سامنے اس واقعے کی تفصیل بتائیں جس کی وجہ سے آپ پچھلے کئی ماہ سے قانون کی گرفت میں ہیں۔ جیل اور عدالت کی صعوبتیں اٹھا رہے ہیں......"

"میں نے جیسے ہی یزدانی صاحب کو فون کرنے کے لیے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا......" وہ ایک جھرجھری لے کر بتانے لگا۔ "ایک مسلح شخص اچانک شوروم میں داخل ہوا۔ اس نے چہرے پر ڈھاٹا لگا رکھا تھا۔ بس اس کے بعد سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ مقتول چونکہ مجھ سے بات کر رہا تھا اس لیے دروازے کی جانب اس کی پیٹھ تھی۔ نووارد مسلح شخص نے مقتول کے سر کا نشانہ لے کر فائرنگ شروع کر دی۔ میں یکبارگی نیچے جھک گیا۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں اور میں نے مقتول کو کٹے ہوئے شہتیر کے مانند آفس کے فرش پر گرتے دیکھا۔ یہ منظر میں نے چوبی میز کے نیچے سے دیکھا تھا کیونکہ خود کو فائرنگ سے محفوظ رکھنے کے لیے میں آفس کی میز کے پیچھے بیٹھ گیا تھا......" لمحاتی توقف کر کے اس نے سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"دو گولیاں چلنے کے بعد فائرنگ تھم گئی تھی۔ خاموشی چھاتے ہی میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اندرونی تجسس نے مجھے تھوڑا غیر محتاط اور بہادر بنا دیا تھا۔ میں نے میز کے عقب سے اٹھ کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر وہاں ہو کیا رہا ہے اور اسی وقت میری آنکھوں نے دو رونگٹے کھڑے کرنے والے مناظر دیکھے......"

میں نے قطع کلامی کی۔ "کیسے مناظر......؟"

"پہلا منظر تو مقتول سلیم اختر کی لاش کا تھا۔" وہ ایک خوفناک جھرجھری لے کر بتانے لگا۔ "مقتول اپنے ہی خون میں لت پت شوروم کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا اور دوسرا منظر......" اس نے لمحاتی توقف کر کے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"دوسرے منظر میں، میں نے اسی ڈھاٹا پوش مسلح شخص کو فرار ہوتے ہوئے دیکھا جس نے مقتول پر فائرنگ کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے گن نظر نہیں آئی البتہ وہ بریف کیس کو مضبوطی سے تھامے وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔"

"گن اس کے ہاتھ میں آپ کو نظر آ بھی نہیں سکتی تھی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیونکہ یہ تحفہ تو وہ آپ کے لیے میز کے عقب میں بہ انداز خاموشی چھوڑ گیا تھا تاکہ بعد ازاں آپ کو ایک قاتل کی حیثیت سے اس خونیں واردات میں ملوث کیا جا سکے۔ اینی ہاؤ......" میں نے ڈرامائی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب آپ نے گن بردار...... مطلب بریف کیس

بردار ڈھاٹا پوش شخص کو شوروم سے فرار ہوتے دیکھا تو آپ نے کیا کیا؟"

"اس کے ہاتھ میں گن نہ دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا تھا۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "میں نے اس قاتل لٹیرے کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔"

"تو کیا آپ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟"

"جی نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے زور دے کر پوچھا۔ "کیوں......؟"

"جب تک میں اس کے قریب پہنچتا، وہ شوروم سے باہر نکل چکا تھا۔" اس نے مایوس لہجے میں بتایا۔

"باہر نکل چکا تھا تو کیا ہوا......" میں نے ایک خاص انداز میں کہا۔ "اس کے پاس آتشیں اسلحہ تو تھا نہیں۔ آپ باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے لپک جاتے اور اسے دبوچ کر سو جوتے لگاتے......"

"ارادہ تو میرا یہی تھا......" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان جو سوچے وہ ہو بھی جائے۔"

"ہاں، یہ ضروری نہیں ہے۔" میں نے اس کے فلسفے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ ہو ہی نہ سکے۔ آپ کی ناکامی کا راز کیا تھا؟"

وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"آپ کی اس معنی بھری مسکراہٹ پر معزز عدالت کو قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "اب آپ جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ آپ اس خطرناک قاتل اور لٹیرے کو پکڑ کیوں نہیں سکے تھے؟"

"جب میں شوروم سے باہر آیا تو وہ بندہ غائب ہو چکا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس کے بعد مقتول کے ڈرائیور نے مجھے دبوچ لیا......"

"ہائیں......!" میں نے حیرت بھری نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "وہ کم بخت کہاں غائب ہو گیا تھا اور مقتول کے ڈرائیور نے آپ کو کیوں دبوچ لیا تھا؟"

"اس قاتل لٹیرے کے غائب ہونے کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ مقتول کے ڈرائیور نے مجھے ایک قاتل کی حیثیت سے پکڑ کر شور مچانا شروع کر دیا تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی......" میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ تو خود قاتل کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ آپ نے مقتول کے ڈرائیور کو صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا...... میں نے متعدد بار اسے بتایا کہ شوروم کے اندر کیا واقعہ پیش آیا تھا لیکن وہ میری کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔" ملزم نے بے بسی سے بتایا۔ "اسی دوران میں وہاں ایک دو راہ گیر بھی جمع ہو گئے۔ سب نے مقتول کے ڈرائیور کی بات پر یقین کر لیا اور مجھے زدوکوب کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہاں سے پولیس کی ایک گاڑی گزری اور ان لوگوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کی کہانی تفتیشی افسر نے آپ کو سنا ہی دی ہے۔"

"ویری سیڈ......" میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ اس ڈھاٹا پوش کو شناخت کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، اگر اس قاتل لٹیرے کو دوبارہ آپ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے تو کیا آپ اسے پہچان لیں گے......؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "نن...... نہیں...... ایک تو وہ سب کچھ چشم زدن میں پیش آ گیا تھا اور پھر اس شخص نے اپنے چہرے کو ڈھاٹے کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ میں اس کے خدوخال نہیں دیکھ سکا۔ اس کا حلیہ یا قد کاٹھ کچھ بھی مجھے یاد نہیں ہے......"

"وقوعہ کے روز شوروم کے اندر جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں آپ نے پولیس کو نہیں بتایا تھا؟" میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"ایک بار نہیں، دس بار...... بلکہ سو بار بتا چکا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "لیکن وہ لوگ میری بات کا یقین کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کی سوئی صرف ایک ہی جگہ پر اٹک کر رہ گئی ہے کہ میں نے دو لاکھ کے لالچ میں مقتول سلیم اختر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اپنے کسی ساتھی کو رقم والا بریف کیس دے کر کہیں روانہ کر دیا ہے......"

"میری تحقیق اور عدالتی کارروائی سے ایک بات واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ یہ بات مقتول کے ڈرائیور نے پولیس کو بتائی تھی کہ جب آپ نے مقتول پر فائرنگ کی تو وہ بریف کیس کو ڈھال بنا کر وہاں سے بھاگا تھا لیکن کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگنے والی دو گولیوں نے اسے فرار کا موقع نہیں دیا۔ ڈرائیور کے اس بیان میں کس حد تک صداقت ہے؟"

"کسی بھی حد تک صداقت ہو ہی نہیں سکتی جناب۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "آفس میں اس وقت میرے اور مقتول کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ کسی تیسرے شخص کو کیسے خبر ہو سکتی ہے کہ مقتول نے بریف کیس کو ڈھال بنا کر وہاں

سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول کے ڈرائیور نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے؟"

"جی ہاں، سو فیصد!" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ مقتول کے ڈرائیور نے باہر گاڑی میں رہتے ہوئے آفس کے اندر کا منظر دیکھ لیا ہو......؟" میں نے ایک امکانی بات کی۔

"یہ ناممکن ہے۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ شوروم کے آفس میں سامنے والے حصے میں شیشہ لگا ہوا ہے لیکن مقتول نے سڑک پر جہاں اپنی گاڑی کھڑی کی تھی اور جہاں ڈرائیور اس گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے آفس کے اندر جھانکنا ممکن نہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مقتول کو اتنا موقع ہی نہیں مل سکا تھا کہ وہ بریف کیس کو ڈھال بنا کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ ادھر ڈھاٹا پوش قاتل نے دو فائر کیے، ادھر مقتول دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا۔ آپ تفتیشی افسر سے پوچھیں کہ مقتول کی لاش آفس میں کہاں پڑی ملی تھی......؟"

"دیٹ از امپارٹنٹ پوائنٹ یور آنر......!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں معزز عدالت کی اجازت سے یہی سوال آئی او دوست محمد سے کرنا چاہوں گا۔"

تفتیشی افسر دوبارہ وٹنس باکس میں آگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آئی او صاحب! جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتول سلیم اختر کی لاش آفس کے کس حصے میں پڑی ہوئی تھی؟"

جواب دینے سے پہلے آئی او نے الجھن زدہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ وکیلِ استغاثہ سے نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ ہدایات لینا چاہتا ہے۔ میں نے آئی او کی اس کوشش کو ناکام بناتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

"نو اشارے بازی دوست محمد صاحب۔ ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر میرے سوال کا جواب دیں۔"

وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ "یہ ممکن نہیں کہ آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار نہ کیا ہو......اس نقشے میں آپ نے شوروم کے آفس میں موجود مختلف چیزوں کے نام اور مقامات کی تفصیل بھی درج کی ہو گی اور اسی دوران میں لازماً یہ ذکر بھی آیا ہو گا کہ مقتول سلیم اختر کی لاش آفس کے فرش پر کس جگہ پڑی پائی گئی تھی......؟"

"جی ہاں......مقتول کی لاش آفس کی میز کے قریب ہی فرش پر پڑی ملی تھی......" اس نے رک رک کر بتایا۔

"وقوعہ کے نقشے میں بھی اس کا ذکر موجود ہے......"

آئی او کا یہ جواب میرے مؤکل کی حمایت میں جاتا تھا جس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ مقتول کو جان بچانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا تو بریف کیس کو ڈھال بنا کر بھاگنے کا کیا سوال۔ اس اہم ترین انکشاف کے بعد میں نے انکوائری آفیسر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"آئی او صاحب......!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ "کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگنے والی دو گولیوں نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا؟"

"اس امر سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔ "اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔"

"اب آپ اس ٹھوس حقیقت اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کی روشنی میں معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ جب ملزم اور مقتول آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے تو پھر ملزم کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں تو مقتول کے جسم کے سامنے والے کسی حصے میں لگنا چاہئیں نا......؟"

"جی......جی ہاں۔" وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

"اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ مقتول پر عقب سے فائرنگ کی گئی تھی۔" میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے پوچھا۔ "اور یقیناً یہ فائرنگ ملزم نے نہیں کی ہو گی؟"

انکوائری آفیسر بہت مشکل میں نظر آیا۔ جواب دینا اس کی مجبوری تھی لہٰذا بادل ناخواستہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "جی......جی......!"

"آئی او صاحب! آپ کی اس مسلسل "جی جی" سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقتول پر ملزم نے فائرنگ نہیں کی تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ "جس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا مؤکل قاتل نہیں ہے......؟"

وہ جز بز ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر بولا۔ "جی......میں کیا کہہ سکتا ہوں......!"

"دوست محمد صاحب! سب کچھ آپ ہی کو کہنا پڑے گا۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "آپ اس کیس کے تفتیشی

افسر ہیں۔ آپ کی تفتیش کی رپورٹ کی وجہ سے میرا مؤکل ایک قاتل کی حیثیت سے گزشتہ کئی ماہ سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے اور آپ کی یہ تحقیق اور تفتیش اب ریت کی دیوار ثابت ہو رہی ہے......''

اس نے ایک بار پھر امداد طلب، بہ الفاظِ دیگر مشورہ طلب انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے وہاں سے کسی قسم کی خصوصی یا عمومی ہدایات لینے کا موقع نہیں دیا اور خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔

''دوست محمد صاحب! حالات وواقعات اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ میرے مؤکل نے سلیم اختر نامی کار کے خریدار کو قتل نہیں کیا اور آپ کا استغاثہ میرے مؤکل کو قاتل ثابت کرنے کے لیے کئی ماہ سے تگ ودو میں لگا ہوا ہے۔ صاف اور واضح الفاظ میں بتائیں کہ آپ کی نظر میں میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کی کیا حیثیت ہے۔''

''وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''استغاثہ کے ایک گواہ اور مقتول کے ڈرائیور کے مطابق ملزم نے مقتول کو لوٹنے کے لیے اس پر ریوالور تان لیا تھا۔ مقتول اپنی جان بچانے کے لیے جب بریف کیس کی آڑ لے کر بھاگا تو عقب سے ملزم نے اس پر دو گولیاں چلائیں جو سیدھی اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں پیوست ہوگئیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے آئی او صاحب! ملزم نے ابھی بتایا ہے اور جائے وقوعہ پر جا کر اس امر کی تصدیق بھی کی جاسکتی ہے کہ مقتول کا ڈرائیور باہر اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شوروم کے اندر آفس والے حصے میں جھانک ہی نہیں سکتا تھا پھر اس نے اتنا تفصیلی منظر کیسے دیکھ لیا؟ اپنے اس سوال کا جواب تو میں استغاثہ کے گواہ یعنی مقتول کے ڈرائیور ہی سے لوں گا لیکن آپ بھی کوئی کم اہم انسان نہیں ہیں۔ میں بار بار آپ کو کٹہرے میں بلانے کی زحمت نہیں دوں گا لہٰذا آپ ابھی اپنا کام نمٹا دیں تو اس میں آپ ہی کی آسانی ہے......''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''آئی او صاحب! آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس امر کی تصدیق کر چکے ہیں کہ مقتول سلیم اختر کی لاش آفس میں رکھی میز کے قریب فرش پر پڑی ملی تھی۔ اگر آپ کے گواہ اور مقتول کے ڈرائیور کے بیان کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر جب مقتول اپنی جان بچانے کے لیے بریف کیس کو ڈھال بنا کر بھاگا تھا تو کھوپڑی میں دو گولیاں کھانے کے بعد اسے ایسی جگہ گرنا چاہیے تھا جو میز سے دور اور آفس کے داخلی دروازے کے نزدیک ہوتی۔ وہ مقام میز اور دروازے کے درمیان ہوتا مگر ایسا ہرگز ہرگز...... اور ہرگز نہیں تھا...... آپ اس زمینی حقیقت کے بارے میں کون سی آسمانی بات کریں گے آئی او صاحب......؟''

میں نے اتنی مضبوطی کے ساتھ اسے اپنی جرح کے شکنجے میں کس لیا تھا کہ اس کے لیے سوئی کے ناکے کے برابر بھی جائے فرار نہیں بچی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر ابھر آنے والے پسینے کو صاف کیا اور لرزیدہ آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے، استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے ڈرائیور الیاس کو کسی قسم کی غلط فہمی ہوگئی تھی جبھی اس نے ایسا بیان دیا کہ......''

''ایسا بیان دیا کہ اس بیان کی روشنی میں میرا مؤکل قاتل نظر آنے لگا اور اصل قاتل کہیں تاریکی میں چھپ کر بیٹھا ہے۔'' میں نے اس کے ادھورے جملے کو حقائق کی توانائی سے مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ استغاثہ کے گواہ نے دروغ گوئی کا مظاہرہ کیا تھا...... کیا تھا یا نہیں؟''

''جی...... جی ہاں......'' وہ میکانکی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو گواہ کو مغالطہ ہوا تھا اور یا پھر اس نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔''

''اگر اسے مغالطہ ہوا تھا تو آپ کی عقل کہاں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہیں۔ آپ نے آنکھیں، کان اور دماغ کے دروازے کھلے رکھتے ہوئے موقع کی کارروائی کیوں نہیں کی اور بعد ازاں کیس کا چالان تیار کرتے ہوئے آپ نے اس امکان کو ذہن میں کیوں نہیں رکھا کہ استغاثہ کے گواہ الیاس کو کوئی مغالطہ ہوسکتا ہے اور وہ اپنے بیان کے سلسلے میں کسی قسم کی غلط بیانی بھی کرسکتا ہے۔ آپ کو پیرافن ٹیسٹ کے بارے میں اگر معلومات نہیں تو کوئی بات نہیں مگر اتنا تو معلوم ہوگا کہ......'' میں نے دانستہ توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اضافہ کیا۔

''جب کوئی شخص جھوٹ کا سہارا لے کر کسی حقیقت کو چھپا رہا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ یہ مقصد کسی بھی نوعیت کا ہوسکتا ہے۔ یا تو وہ اپنے کسی جرم کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے یا وہ کوئی جرم کرنے جارہا ہوتا ہے اور دروغ گوئی کا سہارا لے کر اپنی راہ ہموار کر رہا ہوتا ہے یا کسی بھی حوالے سے وہ جھوٹ بول کر کوئی بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور یا پھر وہ اس غلط بیانی کے ذریعے کسی بڑے نقصان سے بچنا چاہتا ہے...... آپ کے خیال میں استغاثہ کے گواہ الیاس نے کس ضمن میں یہ جھوٹ بولا ہوگا؟''

''میں...... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آپ کے سوال کا جواب تو الیاس ہی دے سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، یہ سوال میں استغاثہ کے گواہ الیاس ہی سے کروں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے ساتھ ہی میں آپ کی معلومات میں بھی اضافہ کرنا چاہوں گا۔''

''اضافہ...... کس قسم کا اضافہ؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''جیسے آپ کو الیاس کی زبانی یہ پتا چلا کہ وقوعہ کے روز مقتول سلیم اختر اپنی جان بچانے کے لیے بریف کیس کو ڈھال بنا کر بھاگا تھا ایسے ہی یہ بات مجھے بھی کسی شخص نے بتائی تھی......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کس نے......؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''اجمل شاہ نے۔''

''اجمل شاہ کون؟'' اس کے لہجے میں حیرت در آئی۔

''اجمل شاہ المعروف شاہ جی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص ملزم کا پڑوسی ہے اور اس کیس میں ملزم کے لیے وکیل صفائی کا بندوبست بھی اسی نے کیا تھا اور...... اور یہ وہی شخص ہے جس نے دھوکا دہی سے ملزم کا فلیٹ ہتھیانے کی کوشش بھی کی تھی جو میری وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کیس کی روداد آپ کی نالج میں ضرور ہوگی......؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس کا چالان اور استغاثہ تیار کرنے کے سلسلے میں جس نوعیت کی سنگین غلطیاں کی گئی ہیں ان کی تفصیل معزز عدالت کے علم میں آچکی ہے۔ ملزم کو جائے وقوعہ سے گرفتار کیا گیا۔ آلۂ قتل بھی جائے واردات سے ڈھونڈ لیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی آلۂ قتل پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے گئے اور نہ ہی ملزم کے فنگر پرنٹس لے کر ان کا آلۂ قتل والے فنگر پرنٹس سے موازنہ کرنے کی زحمت گوارا کی گئی۔ یہ استغاثہ کی ایک ایسی غلطی بلکہ کوتاہی ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے اور دوسری اہم بات......'' میں نے سانس لینے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دوسری اہم بات یہ کہ...... پیرافن ٹیسٹ کی زحمت بھی نہیں کی گئی اور اس پر طرہ یہ کہ آئی او صاحب کو اس اہم ٹیسٹ کے بارے میں معلومات بھی نہیں ہیں۔ اس وقت تک عدالتی کارروائی جہاں تک پہنچ چکی ہے اس کی روشنی میں میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم سراسر بے گناہ نظر آتا ہے۔ معزز عدالت سے میری بھی استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ الیاس کو عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ اس کیس کو کسی منطقی انجام تک پہنچایا جاسکے اور میرا مؤکل اپنی مختصری فیملی کے بیچ بیٹھ کر سکھ کا سانس لے سکے۔ دیٹس آل یور آنر......''

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر جج نے وکیلِ استغاثہ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا آپ اگلی پیشی پر اپنے گواہ الیاس کو عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جناب!'' وہ کسی فرماں بردار بچے کی طرح جلدی سے بولا۔ ''ضرور پیش کروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

میں عدالت سے باہر آیا تو آئی او دوست محمد میرے پاس آگیا۔ اس کے چہرے پر مجھے گہری گمبھیرتا دکھائی دی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا آئی او صاحب! اگر میرے کسی سوال سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے کہ عدالت پہلوانوں کے کسی اکھاڑے سے کم نہیں ہوتی۔ ہر پہلوان اپنی جیت کے لیے مختلف داؤ پیچ استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات تھوڑی بہت زیادتی بھی ہوجاتی ہے......''

میں کورٹ کے اندر ٹرائل کے دوران میں کسی بھی شخص سے جس قسم کے سخت سوالات یا جارحانہ رویہ روا رکھتا ہوں تو وہ عدالت اور قانون کے تقاضے نبھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن عدالت سے باہر کی بات دوسری ہے۔

آج کی کارروائی میں، میں نے انکوائری آفیسر دوست محمد کو کاسنک سوڈے کی مدد سے دھوڈالا تھا۔ اسی لیے اس وقت میں نرمی، خوش اخلاقی اور معذرت خواہی کے انداز میں پیش آرہا تھا لیکن جب وہ بولا تو معاملہ کوئی اور ہی نکلا۔

''بیگ صاحب! بات اکھاڑے، داؤ پیچ اور زیادتی کی نہیں ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''پھر......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر کیا بات ہے؟''

''آپ نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں...... میں نے ایسا کیا کردیا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ نے ذکر کیا ہے کہ بریف کیس کو ڈھال بنا کر بھاگنے والی بات اجمل شاہ نے بھی آپ کو بتائی تھی۔'' وہ بہ دستور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہی موقف استغاثہ کے گواہ الیاس کا بھی ہے لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں ملزم، مجرم نظر نہیں آرہا اور......''

''آپ اتنے محتاط الفاظ کا استعمال کیوں کررہے ہیں آئی او صاحب!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ کورٹ روم نہیں ہے۔ آپ سیدھا سیدھا یہ کیوں نہیں کہتے کہ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم شوکت علی کو پچھلے کئی ماہ سے بے گناہ عدالتوں میں گھسیٹا جارہا ہے اور جیل میں سڑایا جارہا ہے...... ملزم، مجرم نظر نہیں آرہا کے بجائے آپ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ملزم بے گناہ ہے اور کسی سوچی سمجھی، گہری سازش کے تحت اسے اس سنگین مقدمے میں پھنسایا گیا ہے؟''

وہ دل سے تو اقرار کرچکا تھا کہ میرا موکل بے گناہ ہے لیکن زبان سے اس حقیقت کا اقرار کرتے ہوئے ہچکچارہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''اگر ایک ہی بات دو افراد نے کہی ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الیاس اور اجمل شاہ میں کوئی گہرا تعلق موجود ہے......!''

''بہ ظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔'' میں نے اچانک بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کیس کے تحقیقی اور تفتیشی آفیسر ہیں۔ اس سلسلے میں بھی تھوڑی تحقیق اور تفتیش فرمالیں۔ اگلی پیشی میں ابھی دس دن باقی ہیں۔ ہوسکتا ہے، آپ کو اجمل شاہ اور الیاس کے مابین تعلق کا کوئی اہم سراغ مل جائے اور اگر ایسا ہوجاتا ہے تو......'' میں نے ایک لمحہ رک کر گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تو...... آئندہ پیشی پر الیاس کے ساتھ ہی اجمل شاہ کو بھی عدالت میں لے آئیے گا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جو بھی ہونا ہے، جج کے سامنے ہی ہوجائے گا......''

وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہ گیا اور میں بے مروتی سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا جو کورٹ کے احاطے میں پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر میں تو یہی توقع کررہا تھا کہ استغاثہ کی جانب سے الیاس کے علاوہ اجمل شاہ کو بھی گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ میں نے گزشتہ پیشی کے اختتام پر آئی او دوست محمد کو سوچنے کے لیے ایک نئی راہ دے دی تھی اور وہ اس نکتے میں بہت دلچسپی لیتا نظر آرہا تھا کہ الیاس کے علاوہ اجمل شاہ نے بھی مقتول کے حوالے سے بریف کیس کو ڈھال بنا کر بھاگنے کی بات کی تھی۔ وہ ان دونوں افراد کے بیچ کسی خاص کنکشن کی تلاش میں تھا اور اسی بنا پر مجھے امید تھی کہ دوست محمد، الیاس ڈرائیور کے ساتھ ہی اجمل شاہ کو بھی عدالت میں پیش کرے گا تاکہ یہ کیس اپنی آخری حدود کو چھوتے ہوئے منطقی انجام کو پہنچ جائے۔

لیکن ہوا اس کے برعکس......!

اس پیشی پر نہ تو الیاس موجود تھا اور نہ ہی اجمل شاہ۔ الیاس کی جانب سے بیماری کا سرٹیفکیٹ آگیا تھا اور ظاہر ہے، عدالت نے اجمل شاہ کے ضمن میں کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا تھا اس لیے اس کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس پیشی پر تین افراد کی گواہی ہوئی جن میں دو... راہ گیر مشتاق حسین اور امجد علی تھے اور تیسرا شوروم کا مالک کفیل یزدانی تھا۔ ان تینوں کی گواہی بس رسمی سی تھی۔

مشتاق حسین اور امجد علی نے وقوعہ کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جائے واردات پر پہنچے تھے جب مقتول کے ڈرائیور الیاس نے ملزم شوکت علی کو اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا تھا اور حلق پھاڑ کر ''قاتل، قاتل'' چلا رہا تھا۔ ان دونوں نے قاتل (ملزم) کو قابو کرنے میں الیاس کی مدد کی تھی۔ اس کے فوراً بعد پولیس کی گاڑی وہاں سے معمول کے گشت پر گزری تو یہ معاملہ پولیس کے حوالے کردیا گیا تھا۔ مشتاق حسین اور امجد علی درحقیقت شوروم کے آفس والے حصے میں پیش آنے والے

واقعات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے لہٰذا میں نے سرسری سی جرح کے بعد انہیں فارغ کر دیا۔

کفیل یزدانی خالصتاً ایک کاروباری شخص تھا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ ملزم ایک طویل عرصے سے اس کے پاس ملازم تھا اور وہ اس پر اندھا اعتماد بھی کرتا تھا لیکن اس افسوس ناک واقعے کی وجہ سے وہ ملزم سے خاصا برگشتہ نظر آتا تھا۔ اصل میں استغاثہ نے کیس کی ابتدا میں جس طرح ملزم کو ایک خطرناک مجرم کے روپ میں پیش کیا تھا، اس تاثر نے یزدانی کی سوچ کو بھی خاصا منتشر کر ڈالا تھا۔ انسان کی شرافت اور ایمان داری اپنی جگہ لیکن کسی بھی دور میں اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ دولت کا لالچ بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار افراد کی آنکھوں پر حرص و ہوس کی پٹی باندھ دیتا ہے اور شوکت علی بھی ایک انسان تھا...... ایک ضرورت مند انسان!

لیکن جیسے جیسے یہ کیس آگے بڑھ رہا تھا اور پہلے فلیٹ والے سلسلے میں اور اب ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں، میں نے کیس کا رخ پھیر دیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کفیل یزدانی کے دل میں شوکت علی کے لیے ہمدردی کے جذبات بیدار ہوئے تھے اور گزشتہ پیشی پر ہونے والی کارروائی میں میری کارکردگی نے تو کفیل یزدانی کو پوری طرح یہ باور کرا دیا تھا کہ شوکت علی کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس جہنمی کھیل میں دھکیلا گیا تھا۔

میری گزشتہ پیشی والی دھواں دھار کارروائی نے تو عدالت کو بھی کئی زاویوں سے متاثر کیا تھا۔ میں نے چند ایسے ٹھوس پوائنٹس عدالت کے سامنے اجاگر کیے تھے جن کی روشنی میں میرا مؤکل بے قصور اور بے گناہ نظر آیا تھا اور اسی بنا پر میری فرمائش پوری کرنے کی غرض سے عدالت نے اس پیشی پر مقتول کے ڈرائیور۔ اور اس کیس میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت کے حامل الیاس کو پیش کرنے کا خصوصی حکم جاری کیا تھا لیکن اس حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی تھی۔

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیس ایک مقام پر رک سا گیا ہے۔ واقعات و حالات اور شواہد اس حقیقت کی جانب بڑا واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ میرا مؤکل سراسر بے گناہ ہے۔ ایک خاص منصوبے کے تحت اسے اس جھمیلے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر آج استغاثہ کا گواہ الیاس یہاں موجود ہوتا تو میں حقیقت کے چہرے پر پڑا آخری پردہ بھی چاک کر کے اسے روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیتا لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ استغاثہ کی غفلت کے نتیجے میں آج اس کا گواہ الیاس یہاں نظر نہیں آ رہا......''

''اس میں استغاثہ کی غفلت کا کوئی دخل نہیں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''استغاثہ کے گواہ کی جانب سے میڈیکل سرٹیفکیٹ عدالت میں داخل کر دیا گیا ہے۔ شاید...... یہ بات میرے فاضل دوست کے علم میں نہیں ہے۔''

میں نے وکیلِ مخالف کے طنزیہ الفاظ کو زیرلب زہریلی مسکراہٹ کی مدد سے کاٹا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کسی بات سے بھی غافل نہیں ہوں میرے فاضل دوست اور نہ ہی اس معاملے میں بے خبری سے میرا کوئی تعلق رہا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتا سکیں گے کہ آپ کے معزز کی ناسازیٔ طبع کتنے دن تک چلے گی؟''

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں کوئی نجومی تو نہیں ہوں۔''

''میڈیکل سرٹیفکیٹ میں استغاثہ کے گواہ کی ناسازیٔ طبع کا سبب ایک وبائی مرض بیان کیا گیا ہے۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ''جو دو نہیں تو تین دن تک ٹھیک ہو جاتا ہے یا کم از کم پوری طرح کنٹرول میں آ جاتا ہے اور ویسے بھی عدالت کے کمرے میں ہم نے ان سے نہ تو گڑھے کھدوانا ہیں اور نہ ہی دس دس بلاک اٹھا کر انہیں چھٹی منزل تک لے جانے کو کہا جائے گا۔ ہم تو ان سے...... ہم بھی نہیں، بلکہ صرف میں تو ان سے ہلکی پھلکی گفتگو کروں گا۔ دو یا تین سوالات......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر جارحانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب آپ یہ بتائیں کہ استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے ڈرائیور الیاس کو کب عدالت میں پیش کر رہے ہیں؟''

وکیلِ استغاثہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا ہی تھا کہ جج نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! آپ ٹھیک تین دن کے بعد اپنے گواہ الیاس کو ہر صورت عدالت میں حاضر کریں گے......''

''یس سر!'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔

استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے ڈرائیور الیاس کی ذات کے حوالے سے جج کو یقین ہو چکا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ جج کے اس احساس یا یقین کا مطلب یہ تھا کہ میرا مؤکل بے گناہ تھا لہٰذا اس موقع پر میں نے ایک اور

فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

''جناب عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''تین روز بعد اگر ملزم کے سوتیلے بھائی اجمل شاہ عرف شاہ جی کو بھی عدالت میں بلا لیا جائے تو یہ کیس اسی دن ''خاتمہ بالخیر'' کے مصداق اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ان دونوں افراد میں کوئی نہ کوئی تعلق یا ربط ضبط موجود ہے جبھی دونوں کے بیان میں قدرِ مشترک پائی جاتی ہے کہ...... اپنی جان بچانے کے لیے مقتول بریف کیس کو ڈھال بنا کر آفس کے دروازے کی جانب بھاگا تھا...... دیٹس آل یور آنر!''

اس وقت ملزم کی بیوی یاسمین شوکت بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ جج وکیلِ استغاثہ سے کچھ کہتا، یاسمین نے اچانک اپنا ہاتھ فضا میں اٹھا دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ یاسمین آج تاخیر سے عدالت پہنچی تھی۔ ابھی تک میری اس سے باقاعدہ ''ہیلو ہائے'' بھی نہیں ہوئی تھی۔ بس، دونوں نے سر کی مخصوص جنبش سے ایک دوسرے کو عدالت میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

''جی بی بی! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' جج نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر...... اجمل شاہ کو عدالت تک لانا شاید ممکن نہ ہو......'' یاسمین نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

جج کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات ابھرے اور پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ میں نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جج نے پوچھا۔

''کیوں بی بی......؟''

''اس کے گھر پر تالا پڑا ہے......'' یاسمین نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اوہ......'' میں نے متاسفانہ انداز میں سانس خارج کی۔

''بی بی! تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، ادھر کٹہرے میں آکر کہو۔'' جج نے وٹنس باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اگلے چند سیکنڈ میں ملزم کی بیوی یاسمین شوکت گواہوں والے کٹہرے میں موجود تھی۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد یاسمین کے قریب چلا گیا۔ اس نے عدالت کے کمرے میں اچانک جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا، اس نے جج سمیت وہاں موجود ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے یاسمین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یاسمین صاحبہ! یہ بات آپ نے مجھے کیوں نہیں بتائی کہ اجمل شاہ کہیں غائب ہو چکا ہے؟''

''مجھے خود آج صبح ہی پتا چلا ہے۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کل رات تک تو وہ لوگ گھر کے اندر موجود تھے مگر آج صبح سے دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔''

''وہ لوگ کہاں گئے ہیں......؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ سادگی سے بولی۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آج عدالت آتے ہوئے میرے ذہن میں یہی تھا کہ سب سے پہلے آپ کو اجمل شاہ کے غیاب کے بارے میں بتاؤں گی لیکن راستے میں رکشا خراب ہو گیا اور جب میں عدالت پہنچی تو کیس کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ میں یہ سوچ کر ایک طرف بیٹھ کر عدالتی کارروائی دیکھنے لگی کہ جب آپ یہاں سے فارغ ہوں گے تو آپ سے اس اچانک رونما ہونے والی تبدیلی کا ذکر کروں گی لیکن اس سے پہلے کہ آج کی سماعت ختم ہوتی، آپ نے اجمل شاہ کا تذکرہ شروع کر دیا۔''

''کسی کو کچھ تو پتا ہوگا کہ وہ کہاں غائب ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے آس پاس کے لوگوں سے سن گن لینے کی کوشش کی؟''

''سب سے پوچھ لیا وکیل صاحب! مگر کوئی ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بتانے لگی۔ ''لوگ الٹا مجھ سے سوال کر رہے ہیں کہ اجمل شاہ میرا پڑوسی تھا اور میں ان سے کیوں پوچھ رہی ہوں۔ ان لوگوں کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ پتا ہونا چاہیے۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اجمل شاہ کی پراسرار گمشدگی بہت سے سنسنی خیز انکشافات کی جانب اشارہ کر رہی ہے اور وہ بھی عین اس دن جب اس کیس کی ایک اہم کارروائی ہونے والی تھی۔ گزشتہ پیشی پر اس امر کا امکان پیدا ہوا تھا کہ مقتول کے ڈرائیور اور استغاثہ کے گواہ الیاس اور ملزم کے پڑوسی کے بیچ کوئی کنکشن ہو سکتا ہے۔ اس پیشی کا اختتام بھی اسی ایشو پر ہوا ہے کہ الیاس کے علاوہ اجمل شاہ کو بھی آئندہ پیشی پر عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی

الگ ہو سکے لیکن......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ دلائل کو اسی جوش و جذبے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن آج الیاس کی جانب سے میڈیکل سرٹیفکیٹ آجاتا ہے اور اجمل شاہ بھی اچانک کہیں گم ہو جاتا ہے یعنی...... آپس میں قدرِ مشترک رکھنے والے دونوں افراد عدالت کی اسکرین سے غائب ہیں۔ کہیں...... کہیں...... اجمل شاہ کی طرح...... الیاس بھی اپنے گھر پر یہ بڑا سا تالا ڈال کر اڑن چھو نہ ہو جائے اس لیے...... جنابِ عالی! معزز عدالت سے میں استدعا کرتا ہوں کہ استغاثہ کے گواہ الیاس کو پہلی فرصت میں عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کیے جائیں اور......'' میں نے ایک بار پھر توقف کر کے گہری نظر سے جج کی طرف دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور اس کے ساتھ ہی پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ اجمل شاہ عرف شاہ جی کو جلد از جلد تلاش کر کے عدالت تک لانے کی کوشش کرے۔ اس شخص کا کردار معزز عدالت سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس نے جس طرح اپنے سوتیلے بھائی یعنی اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل کو دھوکے میں رکھ کر اس کی بیوی یاسمین سے ان کا فلیٹ ہتھیانے کی مذموم کوشش کی، وہ پورے کا پورا کیس عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ جو شخص اس حد تک گر سکتا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ سلیم اختر کا قتل الیاس اور اجمل شاہ کی ملی بھگت کا شاخسانہ ہو جس میں میرے مؤکل کے لیے انہوں نے ''قربانی کے بکرے'' کا کردار تجویز کرتے ہوئے اس معصوم شخص کو گہری کھائی میں پھینک دیا ہو۔''

میرے ذہن اور دل میں جو کچھ بھی تھا وہ میں نے بے لاگ کہہ ڈالا تھا اور یہ تمام بے بنیاد یا من گھڑت باتیں نہیں تھیں بلکہ اسے میری تحقیق اور پیشہ ورانہ تجربے کا نچوڑ کہا جا سکتا تھا۔ عدالت بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی جس کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا۔

میرے خاموش ہونے پر جج نے اس کیس کے انکوائری آفیسر دوست محمد اور وکیل استغاثہ سے مشترکہ طور پر کہا۔ اس کے الفاظ میں ایک خاص قسم کا تحکم پایا جاتا تھا۔

''یہ عدالت استغاثہ کے گواہ الیاس اور ملزم کے پڑوسی اجمل شاہ کو آئندہ پیشی پر عدالت میں حاضر دیکھنا چاہتی ہے اور...... اگلی پیشی ایک روز بعد ہے۔ الیاس کو اسٹریچر پر اٹھا کر بھی عدالت کے کمرے میں لانا پڑے تو کوئی تردد نہ کیا جائے۔ آرڈر از آرڈر...... اینڈ دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!''

☆☆☆

اگرچہ جج نے پچھلی پیشی پر آئندہ پیشی کے لیے ایک دن بعد کی تاریخ دی تھی تاہم اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے اس کیس کا پانسا پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ جج کی جارحانہ حکم گوئی کے بعد اسی روز وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ سے رابطہ کیا تاکہ اسے ایک روز بعد عدالت میں پیش ہونے کے لیے کہہ سکے مگر گواہ کی جانب سے اس کا فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ اس کوشش میں تین چار بار ناکام ہونے کے بعد وکیلِ استغاثہ نے خود اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے دروازے پر بھی تالا پڑا ہوا تھا۔ وکیل استغاثہ نے الیاس کے پڑوسیوں سے اس کی بابت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں سے اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے اس کیس کے انکوائری آفیسر کو فون کیا اور اسے تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا۔

اس صورتِ حال نے دوست محمد کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ وہ اپنی پولیس مشینری کے ساتھ حرکت میں آگیا۔ جہاں کہیں بھی الیاس کے پائے جانے کا امکان تھا، دوست محمد نے وہاں ضرور جھانکا۔ جب سے میں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ اجمل شاہ نے بھی مقتول کے حوالے سے وہی بیان دیا ہے جو استغاثہ کے گواہ الیاس کا موقف ہے تو اس کے بعد سے آئی او دوست محمد خاصا چوکنا ہو گیا تھا اور خفیہ نگرانی کرتے ہوئے اس نے ایک ایسی جگہ کا پتا لگا لیا تھا جہاں الیاس اکثر وقت گزارنے آتا تھا۔ وہ مقام دراصل جوئے کا ایک اڈا تھا جہاں دیسی شراب بھی بہ آسانی دستیاب ہو جاتی تھی۔ اس اڈے کو مراد خان نامی ایک موٹا شخص چلاتا تھا۔

مراد خان کی زبانی دوست محمد کو پتا چلا کہ آج صبح الیاس وہاں آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ جب اس ''اور شخص'' کے حلیے کے بارے میں دوست محمد نے مختلف سوالات کیے تو اسے مراد خان کے جوابات نے سیدھا اجمل شاہ کی صورت تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد کے مراحل آسان ہوتے چلے گئے اور رات گئے، مراد خان کی نشاندہی پر دوست محمد نے چھاپا مار کر الیاس اور اجمل شاہ کو اورنگی ٹاؤن کے ایک گھر سے برآمد کر لیا۔

اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اورنگی ٹاؤن کا وہ گھر

فرید خان کا تھا۔ یہ وہی فرید خان تھا، اجمل شاہ نے جس کے کندھے پر بندوق رکھ کر یاسمین کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ فرید خان اس معاشرے کا ایک ناسور، ایک مجرم اور ایک غنڈا تھا جس کے اجمل شاہ اور الیاس جیسے لوگوں سے گہرے روابط تھے۔ یہ سب لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ فرید خان اورنگی ٹاؤن کے ایک دور افتادہ کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

پولیس کی کسٹڈی میں الیاس اور اجمل شاہ نے جو بیان دیا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے اختتام سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

الیاس اور اجمل شاہ کی بہت پرانی دوستی تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ بھی اور الگ الگ بھی بہت سی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہے تھے لیکن ان کی سرگرمیوں کی نوعیت ایسی سنگین کبھی نہیں رہی تھی کہ معاملہ قتل تک جا پہنچے۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا اور اس معاملے میں فرید خان نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا مگر اصل قاتل اجمل شاہ عرف شاہ جی ہی تھا۔ بعدازاں الیاس اور اجمل شاہ کی نشاندہی پر پولیس نے فرید خان کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

واقعات کے مطابق ملزم سے ملزم کی بیوی یاسمین اور یاسمین سے اجمل شاہ کی بیوی تک یہ بات پہنچی کہ چھٹی کے روز ملزم شوروم جانے والا ہے کیونکہ کوئی پارٹی دو لاکھ کی کیش رقم لے کر شوروم پہنچنے والی ہے تو اجمل شاہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ دو لاکھ کیش کے تصور نے اس کی نیت میں فتور اور منہ میں پانی بھر دیا تھا۔ اس نے فی الفور اپنے یار الیاس سے رابطہ کیا۔

''یار! ایک چانس ہے، دو لاکھ کمانے کا......''

''کہاں سے؟'' الیاس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

وہ دونوں اس وقت ایک چائے خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اجمل شاہ نے پوری تفصیل کے ساتھ اسے ملزم شوکت علی کے حوالے سے بتا دیا۔ اجمل شاہ خاموش ہوا تو الیاس نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''تم کس شوروم کی بات کر رہے ہو۔ میرا مطلب ہے، تمہارا پڑوسی شوکت علی کس کار شوروم میں کام کرتا ہے؟''

''وہ شوروم جمشید روڈ پر ہے۔'' اجمل شاہ نے جواب دیا۔ ''اور شوروم کے مالک کا نام ہے کفیل یزدانی......!''

''اوہ......!'' الیاس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں پتا ہے، چھٹی کے دن دو لاکھ کیش کے ساتھ جو پارٹی کار خریدنے یزدانی کے شوروم آ رہی ہے، وہ کون ہے؟''

''نن...... نہیں......'' اجمل شاہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھلا اس پارٹی کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنی بیوی کی زبانی جو پتا چلا ہے وہ تمہیں بتا دیا ہے......''

''اس کے آگے میں تمہیں بتاتا ہوں یار......'' الیاس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تم اس طرح کیوں مسکرا رہے ہو......؟'' الیاس کے پراسرار انداز کو دیکھ کر اجمل شاہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''تم نے ابھی جس پارٹی کا ذکر کیا ہے نا......'' الیاس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''میں اسے جانتا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں...... جیسے کہ تم اپنے پڑوسی اور کفیل یزدانی کو جانتے ہو۔''

''کک...... کون ہے وہ......؟'' اجمل شاہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''میرا سیٹھ......'' الیاس نے گویا دھماکا کیا۔ ''سلیم اختر...... اور میں بھی اس کے ساتھ ہی شوروم آؤں گا...... اس کی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کیونکہ...... میں اس کا ڈرائیور جو ٹھہرا۔''

''تو...... اس کا مطلب ہے...... دو لاکھ کی رقم گئی ہاتھ سے......؟'' اجمل شاہ نے مایوسی بھری نظر سے الیاس کی طرف دیکھا۔

''یہ کس نے کہہ دیا؟'' الٹا الیاس نے اس سے سوال کر ڈالا۔

''مم...... مطلب، سلیم اختر تمہارا سیٹھ ہے......'' اجمل شاہ نے کہا۔ ''ظاہر ہے...... تم اسے لوٹنے کے منصوبے کی حوصلہ افزائی کیسے کر سکتے ہو!''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' الیاس، اجمل شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو تم اپنے سیٹھ کو لوٹنے کے لیے تیار ہو؟'' اجمل شاہ نے پوچھا۔

''میرے سیٹھ کو تم لوٹو گے اور الزام تمہارے پڑوسی پر آئے گا۔'' الیاس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اس بات کا گواہ بنوں گا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا ہے اور بعد میں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور بعد میں ''ففٹی ففٹی'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک لاکھ تمہارے اور ایک لاکھ میرے...... کیسا آئیڈیا ہے یار......؟''

''بہت عمدہ آئیڈیا ہے......'' اجمل شاہ کی باچھیں کھل گئیں۔

اس کے بعد ان دونوں نے اس مشن کی پلاننگ کی اور اگلے روز اس منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ حسب پروگرام مقتول سلیم اختر دو لاکھ کیش کے ساتھ کفیل یزدانی کے شوروم پہنچ گیا۔ الیاس دانستہ باہر گاڑی ہی میں رک گیا تاکہ اپنا رول نبھا سکے۔ مقتول نے بھی اسے اپنے ساتھ اندر لے جانے کی ضد نہیں کی۔

ملزم شوکت علی اپنے باس کفیل یزدانی کے حکم پر پارٹی کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھولے بیٹھا تھا۔ الیاس اور اجمل شاہ نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت شوروم فون کر کے ملزم کو یہ اطلاع دی کہ پارٹی آج نہیں آئے گی۔ اس کا فائدہ وہ لوگ اسی طرح اٹھانا چاہتے تھے کہ کفیل یزدانی شوروم نہ آسکے اور انہیں اپنے کام میں آسانی حاصل رہے۔ اگر کفیل یزدانی اور ملزم دونوں بیک وقت آفس کے اندر موجود ہوتے تو ان کے لیے یہ کارروائی خاصی مشکل ہو جاتی۔ ملزم نے اس فون کو پارٹی ہی کا فون سمجھا اور اپنے سیٹھ کو اس بارے میں بتا دیا۔ یہ فون ایسی ٹائمنگ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ملزم کے شوروم بند کرنے سے پہلے پارٹی یعنی سلیم اختر وہاں پہنچ جائے اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں کسی وقت کا سامنا نہ ہو۔ اس کے بعد سب کچھ ویسا ہی ہوا تھا جیسا ان لوگوں نے چاہا تھا۔

ملزم نے جس ڈھاٹا پوش گن بردار شخص کا ذکر کیا تھا وہ درحقیقت اجمل شاہ عرف ''شاہ جی'' ہی تھا۔ اس نے ملزم سے اپنی شناخت چھپانے کے لیے چہرے پر ڈھاٹا لگا رکھا تھا۔ الیاس اور اجمل شاہ میں جو کچھ بھی طے ہوا تھا، اس میں مقتول سلیم اختر کا قتل شامل نہیں تھا لیکن اجمل شاہ اپنے طور پر کوئی اور ہی منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ وہ اس دو لاکھ کی رقم کے علاوہ ملزم کو ساری زندگی جیل میں سڑا کر اس سے فلیٹ کو بھی ہتھیانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس نے اپنے عزائم کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے پورا زور مارا تھا لیکن اس کی بدبختی کہ دونوں بار میں اس کے آڑے آگیا تھا اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

الیاس کو کیس کی پل پل کی خبر تھی کیونکہ وہ استغاثہ کا گواہ خاص یعنی عینی شاہد تھا۔ پچھلی ایک دو پیشیوں پر میرے اٹھائے ہوئے نکات اور ٹھوس دلائل نے جس طرح اس کیس کا رخ پھیرا تھا، اس صورتِ حال نے یقیناً الیاس کو اندر باہر سے بہت ڈسٹرب کر دیا ہوگا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے اجمل شاہ کو اس بارے میں نہ بتایا ہو لہٰذا پہلے اس کی جانب سے بیماری کا سرٹیفکیٹ آیا اور اس سے جب بات نہ بن سکی، بہ الفاظِ دیگر جب میں نے اس کی دال نہ گلنے دی اور میری فرمائش پر جب جج نے ہر حال میں اسے عدالت میں پیش کرنے کا حکم نامہ جاری کر دیا تو اس کے پاس فرار کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہ رہا۔

الیاس کے اکیلے فرار سے یہ معاملہ سنبھلنے والا نہیں تھا۔ اس کیس میں، میں نے الیاس کے نام کے ساتھ ہی اجمل شاہ کا نام بھی نتھی کر دیا تھا اور اسے بھی عدالت میں گھسیٹنے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا لہٰذا ان دونوں جرائم پیشہ افراد کو ایک ساتھ منظر سے غائب ہونا پڑا۔

اجمل شاہ کے بچے وغیرہ نہیں تھے۔ اس نے چپ چاپ گھر پر تالا ڈالا، بیوی کو اس نے میکے چھوڑا اور خود الیاس کی معیت میں اورنگی ٹاؤن کے ایک گھر میں جا چھپا تاہم آئی او کی ہوشیاری نے ان دونوں کو فرید خان کے بل سے باہر نکال لیا تھا۔

انسان بھی بہت عجیب وغریب شے ہے۔ تمام زندہ چیزوں میں سب سے زیادہ عقل اس کے پاس ہے مگر یہ اس کا سب سے کم استعمال کرتا ہے اور جتنا استعمال کرتا ہے اس میں بھی اس کا ذاتی مفاد پیش پیش رہتا ہے جبھی کہا گیا ہے کہ انسان سراسر گھاٹے میں ہے۔

اجمل شاہ کے لالچ اور مکارانہ سوچ نے وہ، وہ گل کھلائے جن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ایک طویل عرصے تک متاثر ہونا پڑا۔ شوکت علی ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں مہینوں عدالت کے چکر لگاتا رہا اور جیل میں سڑتا رہا۔ اس کی مختصر سی فیملی نے جو دکھ اٹھائے وہ ایک الگ کہانی ہے اور اب شاہ جی کی بیوی کے دکھوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اجمل شاہ نے جو ''کارنامہ'' انجام دیا تھا اس کا پھل تو اسے ملنا ہی تھا کیونکہ یہ دنیا دار العمل ہے۔ جلد یا بہ دیر...... انسان کو اس کے کیے کی سزا، جزا مل کر ہی رہتی ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اصل قاتل کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کر دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

آخری خواہش

ثمر عباس

وہ عجیب وغریب فطرت اور منفرد سوچ کا مالک تھا۔ جس کی انفرادیت اور ارادوں کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ زندگی رفتہ رفتہ موت کی جانب گامزن تھی مگر لازوال شہرت کی خواہش نے اس کے پائے استقلال میں ذرا بھی لرزش نہ آنے دی۔ حتیٰ کہ دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ بغیر کسی خطا کے اس نے سزا کو کسی فاتح کے مانند گلے لگایا۔

ادھوری حسرتوں اور نامکمل خواہشوں کی تکمیل کا حیرت انگیز منظر

جورڈن ڈون کی سزائے موت پر عمل ہونے میں دو یا تین ہفتے باقی تھے کہ ہوورڈ سائمن میرے کمرے میں داخل ہوا اور بہ آوازِ بلند بولا۔ ”کرس کیا تم مجھے ایک منٹ دو گے؟“ اس کے بزنس کارڈ پر ہیڈ آف پبلسٹی لکھا ہوا تھا لیکن وہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور تھا۔ وہ بندوں کو ایسی صفائی سے غائب کیا کرتا جیسے جادوگر اسٹیج پر اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ لاپتا افراد کو کہاں دفنایا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر اسی کے ہاتھوں دفن ہوئے تھے۔

میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''تمہارے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ جتنا وقت چاہو لے سکتے ہو۔''
اس نے دفتر کا اندرونی دروازہ بند کیا اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر میئر نے ایک بار پھر مجھے پیغام رسانی کا فریضہ سونپا ہے۔ وہ اس وقت سانتا انیتا کے کلب ہاؤس میں ہیں ان کے دو گھوڑے آج کی چوتھی اور ساتویں ریس میں دوڑ رہے ہیں اور انہیں اپنے دونوں گھوڑوں کے جیتنے کی امید ہے۔''
لوئیس بی میئر امریکا میں سب سے زیادہ تنخواہ لینے والا ایگزیکٹو تھا اور ایم جی ایم کو اس طرح چلا رہا تھا جیسے وہاں کام کرنے والے سب لوگ اس کے غلام ہوں۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر پر لکیر کے مانند تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکے۔ چار سال پہلے جب میں نے لاس اینجلس پولیس کی ملازمت چھوڑی تو ایک حادثے کے نتیجے میں وہ میرا باس بن گیا۔ میں نے سائمن سے پوچھا۔ ''کیا میں تمہارے آنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟''
سائمن نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کا مرغولہ بناتے ہوئے بولا۔ ''باس چاہتا ہے کہ تم اس کی طرف سے ہمارے ایک سابق ساتھی سے ملنے جاؤ۔''
''اس کی طرف سے!'' یہ الفاظ سن کر مجھے تجسس ہونے لگا کیونکہ یہ کام عموماً وہ اپنے دو خونخوار جاں نثاروں کو سونپا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک ایڈی اور دوسرا سائمن تھا۔ یہ کبھی انفرادی طور پر یا مل کر مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔
میں نے پوچھا۔ ''کیا میں اس شخص کو جانتا ہوں؟''
اس نے گریٹا گاربو کی طرح کلوز اپ دیا اور بولا۔
''جورڈن ڈون۔''
میں نے زیرِلب یہ نام دہرایا اور سوچ میں پڑ گیا کیونکہ میں ہی وہ سرکردہ سراغ رساں تھا جس نے جورڈن ڈون کے خلاف ثبوت تلاش کیے تھے جو اسے ہالی وڈ ایکٹریس اور اس کے بوائے فرینڈ کا قاتل ثابت کرتے تھے۔ ان دونوں کو پانچویں اکیڈمی ایوارڈ کی شب ایمبیسڈر ہوٹل میں قتل کیا گیا تھا اور جس کی تفصیلات اخبارات نے صفحہ اول پر شائع کی تھیں۔
سائمن نے میری الجھن کو بھانپ لیا اور بولا۔ ''یہ آئیڈیا باس کا نہیں بلکہ خود ڈون کا ہے کہ تم اس سے ملو۔ باس کو ایک ایسے ایکٹر کی خواہش پوری کرنے پر کوئی اعتراض نہیں جس نے بہت اچھا آغاز کیا تھا اور وہ بہت بڑا اسٹار بن سکتا تھا، اگر اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا جس نے اس کے کیریئر کو بہت مختصر کردیا۔''
''اس نے مسٹر میئر تک اپنی خواہش کس طرح پہنچائی؟''
''مسٹر میئر نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھا۔ جب تم اس سے ملنے جاؤ تو پوچھ لینا۔''
دوسرے روز صبح کے وقت میں سان کوئنٹین کے لیے روانہ ہوگیا۔ میرے پاس کرسلر امپریل تھی جو مہمانوں کو سیر وتفریح کرانے یا کسی خاص صورتِ حال میں استعمال کی جاتی تھی۔ میں بارہ گھنٹے میں تین سو اسی میل کا فاصلہ طے کر کے منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ راستے میں صرف ایک جگہ رک کر میں نے اپنے لیے برگر اور کافی لی۔ موسم خوشگوار تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس راستے پر ٹریفک بہت کم تھا۔ میں نے اپنی گاڑی جیل سے نصف میل کے فاصلے پر پارک کی۔ میں نے منیجر کو بیس ڈالر کا نوٹ دیا جس کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس نے مجھے رجسٹر میں دستخط کرنے کی اجازت دے دی اور بولی۔ ''کیا میں جان سکتی ہوں کہ تم کس سے ملنے آئے ہو؟''
''جورڈن ڈون!'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''ہاں، میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔ اس کی تاریخ زیادہ دور نہیں ہے تم اس کے رشتے دار ہو یا کسی اخبار کے رپورٹر اور اس کا انٹرویو لینے آئے ہو؟''
''میں اس کا دوست ہوں۔'' میں نے اس گفتگو سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔ لیکن اس نے بات جاری رکھی۔
''تمہیں معلوم ہے کہ وہ کسی زمانے میں ایکٹر ہوا کرتا تھا۔ میں شکل سے اسے نہیں پہچانتی تھی جب تک میں نے اخبار میں اس کی تصویر اور پوری کہانی نہیں پڑھ لی کہ کس طرح اس نے ایک معصوم لڑکی اور اس کے بوائے فرینڈ کو خون میں نہلا دیا۔''
میرے ذہن میں عدالت کا منظر گھوم گیا کہ آٹھ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل جیوری مجھے کتنے غور سے سن رہی تھی جب میں نے انہیں ایمبیسڈر کاٹیج کے بیڈروم میں ڈون کی موجودگی کے بارے میں بتایا جہاں ایم جی ایم نے ایوارڈ حاصل کرنے والوں کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔

"جب دوسری صبح ہوٹل کے جنرل منیجر نے پولیس کو بلایا تو میں بھی اس قتل کی تفتیش میں شامل تھا۔ میں نے جیوری کو بتایا۔ "ایک ہاؤس کیپر نے کاٹج کو بے ترتیب حالت میں پایا۔ وہاں شراب کی خالی بوتلیں بکھری پڑی تھیں اور مس کیلی رش کی برہنہ لاش جہازی سائز بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں ٹام بھونز بھی بے لباس حالت میں لیٹا ہوا پڑا تھا۔ ان کے چہرے خون سے تربتر تھے ایسا لگتا تھا کہ انہیں بہت قریب سے گولی ماری گئی تھی۔ دو گولیاں مس کیلی اور تین کلینسی کو لگیں۔ یہ گولیاں کولٹ اعشاریہ پینتالیس کے سیمی آٹومیٹک ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ اس وقت وہ ایک کونے میں اپنے گھٹنوں پر بازو رکھے ہوئے بیٹھا خوف سے لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہی ان دونوں کو قتل کیا ہے۔ مجھے ایک عرصہ سے ان پر شک تھا اور اس رات میں نے انہیں ایک ساتھ دیکھ لیا تو خود پر قابو نہ رکھ سکا۔"

اس نے جو کہا وہ میں نے حرف بہ حرف جیوری کو بتادیا۔ ڈون کو اپنے کیے پر پشیمانی تھی لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی فلم کے مکالمے بول رہا ہے۔ تاہم وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ مس کیلی گزراوقات کے لیے لوگوں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی تھی بلکہ وہ جب اس سے ملا تو وہ کسی بڑی کامیابی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کیلی کو اس کے بوائے فرینڈ سے دور رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ بدکردار شخص تھا۔

اس نے بعد میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر یہی بیان دہرایا اور میری طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے اس نے کم و بیش انہی الفاظ میں اپنے جرم کا اعتراف کر لیا جو اس نے مجھ سے اس وقت کہے تھے جب میں نے اسے کمرے میں دیکھا۔

جیوری نے اسے قتل کا مجرم ٹھہراتے ہوئے اسے پھانسی کی سزا سنادی۔ اب تک اسے پھانسی ہوجانی چاہیے تھی گوکہ اسے اپیل کا حق دیا گیا تھا جس کی سماعت کئی ہفتوں تک ہوتی رہی لیکن بالآخر وہ اپیل بھی مسترد ہوگئی اور اس کی سزائے موت برقرار رہی اور اب وہ بھی ان درجنوں سزا یافتہ قیدیوں کی طرح اس قانون کی منظوری کا انتظار کر رہا تھا جس کے تحت پھانسی کے بجائے گیس چیمبرز میں بٹھا کر سزائے موت دی جائے۔

ڈون کا نام بھی قیدیوں کی اس فہرست میں شامل تھا جنہیں بلیو جینز اور صاف ستھری سفید قمیص پہنا کر ننگے پاؤں گیس چیمبر میں رکھی ہوئی لوہے کی کرسی پر لے جایا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ آخری بار مکمل کر سانس لے سکتا تھا جب تک کہ جلاد وہ لیور نہ کھینچے اور چیمبر میں ہائیڈروجن سائنائیڈ گیس بھر جائے لیکن ابھی تک اس فہرست کو آخری شکل نہیں دی گئی تھی ممکن ہے کہ دو تین ہفتے بعد قانون منظور ہونے کی صورت میں اس سزا پر عمل ہوتا۔

ڈون سے ملنے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی۔ کیا اسے یہ امید تھی کہ وہ مجھے اپنا بیان بدلنے پر قائل کرلے گا جس کے نتیجے میں اس کی سزا معاف ہوجائے یا مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہو لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ سان کوئنٹین جیل میں ملاقات کا وقت ہفتہ کے دنوں میں صبح آٹھ سے ساڑھے دس اور گیارہ سے ڈیڑھ تھا لیکن ہفتہ اور اتوار کو ان اوقات میں توسیع کردی جاتی تھی کیونکہ چھٹی کی وجہ سے ملاقاتیوں کی تعداد عام دنوں سے زیادہ ہوا کرتی تھی مجھے ایک اسٹاف کار کے ذریعے اس تین منزلہ عمارت تک لے جایا گیا جہاں خطرناک اور سزائے موت کے منتظر قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔

ملاقاتیوں کے کمرے میں وہ تنہا لوہے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا اور مضطرب انداز میں اپنی انگلیوں سے میز پر طبلہ بجا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے حلیہ اور وضع قطع میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتا تھا لیکن اب اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ اس کے لمبے بال کندھوں تک جھول رہے تھے اور وہ مجھے کسی تاریخی فلم کا جنگجو کردار لگ رہا تھا۔

"تم آدھ گھنٹے تاخیر سے آئے ہو۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ کتنی اہم ملاقات ہے۔"

"میں اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"میں مسٹر میئر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر گھنٹا دو گھنٹا بات کر سکتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ اگر تم خدا حافظ کہنا چاہ رہے ہو تو مجھے خط لکھ سکتے تھے۔"

"میں تم سے مل کر ذاتی طور پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مسٹر میئر کے بہت قریب ہو اور ان سے کوئی بھی بات منوا سکتے ہو۔"

”تم میرا شکریہ کیوں ادا کرنا چاہتے ہو۔ مجھے تو خوشی ہے کہ تمہیں دُہرے قتل کا مجرم ٹھہرایا گیا۔ میں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران ایسا دہشت ناک منظر نہیں دیکھا تھا۔“

”اس وقت مجھے بھی خوشی ہوئی تھی جس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اب معاملہ بالکل مختلف ہے۔“

”لگتا ہے کہ تم نے مجھے سنانے کے لیے نئی کہانی گھڑی ہے تاکہ میں تمہاری باتوں میں آکر اپنا بیان بدل دوں جس کے نتیجے میں تمہاری سزا معطل ہوجائے اور مقدمے کی نئے سرے سے سماعت ہو۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو یہ ناممکن ہے۔“ یہ کہہ کر میں جانے کے ارادے سے اٹھنے لگا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے وہ قتل نہیں کیے تھے لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ مقدمہ کی دوبارہ سماعت چاہتا ہوں جس کے نتیجے میں مجھے بے قصور ٹھہرایا جائے اور میں آزاد ہوجاؤں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوں لیکن اپنی شرائط پر۔ اگر تمہارا باس چاہتا ہے کہ میری زبان بند رہے تو اسے میری مدد کرنا ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اس کی یہی خواہش ہوگی ورنہ تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔“

”تم نے میری توجہ حاصل کرلی ہے۔“ میں دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کہو، میں سن رہا ہوں۔“

”تم جانتے ہو کہ جس رات وہ دونوں قتل ہوئے۔ اس روز ایمبیسڈر ہوٹل میں ایم جی ایم کی جانب سے ایوارڈز کے سلسلے میں تقریب منعقد ہوئی تھی۔ وہیں میں نے کیلی رش کو دیکھا۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے کہنے پر میں نے اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں کیونکہ مجھ جیسے ایکٹر ہمیشہ نمایاں نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں کسی بڑے بجٹ کی فلم میں کام مل جائے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیلی کوئی اداکارہ نہیں بلکہ ماڈل ہے اور ایک ویئر ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ عین اسی وقت ہال کین وہاں پہنچ گیا۔“

”ہال کین فلم ڈائریکٹر؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں وہ مسٹر میئر کا چہیتا ہے کیونکہ وہ ان کے لیے پیسے بنانے کی مشین ہے۔ اس کی فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ مقررہ وقت میں کم بجٹ کی فلم بناتا ہے لیکن وہ بدکردار شخص ہے اور اسے جنسی پارٹیاں کرنے کا شوق ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو جنسی حرکات کے نظارے سے تسکین حاصل کرتا ہے۔ وہ کیلی کو بھی ایوارڈ شو اور پارٹی میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن سب کے سامنے اسے اپنے بازوؤں میں لینے سے کترا رہا تھا۔ اس نے ریڈی اور سائمن کے سامنے یہ مسئلہ رکھا جنہوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں وقتی طور پر کیلی کو کمپنی دوں۔ میں اس خیال سے متفق نہیں تھا لیکن سائمن نے مجھے سنہرے خواب دکھائے اور بولا کہ یہ تمہارے لیے لوگوں کی نظروں میں آنے کا بہترین موقع ہے جو تمہارا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔ خاص طور پر ہال اور مسٹر میئر۔“

”اور تم نے ان کی بات مان لی؟“

”کیسے نہ مانتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہال کین کی آنے والی فلم میں ایک ایسا رول ہے جو مجھے راتوں رات بڑا اسٹار بنا سکتا ہے۔ اس رول کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔“

میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”ٹام اس پارٹی میں کیا کررہا تھا؟“

”ظاہر ہے کہ اس کی موت اسے پارٹی میں کھینچ لائی تھی، وہ کوئی دلال نہیں تھا جیسا کہ اخبارات نے اس کے بارے میں لکھا اور تم بھی یہی سمجھتے ہو۔ وہ بے چارہ تو ایک معمولی سا ایجنٹ تھا اور کیلی کے کاروباری معاملات دیکھا کرتا تھا۔ اس رات کیلی اس پر مہربان ہوگئی اور جب ہال کین کیلی کے ساتھ شب بسری کے ارادے سے اس کے بیڈروم میں داخل ہوا تو کیلی اور ٹام کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر مشتعل ہوگیا اور اس نے ان دونوں پر پے در پے کئی فائر کردیے۔“

”گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے نہیں بلکہ ہال کین نے ان دونوں کو حسد کے جذبے سے مغلوب ہوکر مار ڈالا۔“

”یہ سچ ہے لیکن میں نے یہ کہانی کسی کو نہیں سنائی اور نہ ہی تم یہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں یہ سب بتانے کے لیے بلایا ہے۔“

”تم نے اسے ان دونوں پر فائر کرتے دیکھا تھا؟“

”میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔ دراصل اس رات میں نے بہت پی لی تھی۔ اس وقت میں باتھ روم میں تھا جب میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ اس وقت بھی ہال میں لوگ جشن منا رہے تھے اور موسیقی کی دھن پر رقص کررہے تھے۔ اس لیے شاید ہی کسی نے فائر کی آواز سنی ہو۔ میں نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی اور ڈگمگاتا ہوا

بیڈروم میں داخل ہوا۔ وہاں میں نے دو برہنہ لاشوں کو بستر پر پڑے دیکھا۔ ان کے قریب ہی ایک شخص ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا وہ ہال کین تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ میرے سر کی پشت پر ایک زوردار ضرب لگی اور میں وہیں ڈھیر ہوگیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنی دیر بے ہوش رہا لیکن جب آنکھ کھلی تو سائمن اور ایڈی میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے واقعہ کی تفصیل پوچھی لیکن جب میں نے ہال کین کا نام لیا تو اینڈی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''نہیں۔''

''تم نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی تم ہال کا نام لو گے۔'' سائمن غراتے ہوئے بولا۔ ''کیا مجھے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے؟''

اینڈی بولا۔ ''سائمن اسے بتادو کہ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ یہ ہمارے کہنے پر عمل کرے۔''

''تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آگئی۔ اس سے پہلے تم اور اسٹوڈیو پولیس آفیسر ہینڈری بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا تھا اور اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہی انہیں قتل کیا ہے۔ مجھے پہلے سے ہی ان پر شبہ تھا اور جب میں نے انہیں ہم بستری کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے ان پر فائر کھول دیا۔ تم نے بھی گواہی دی کہ تم نے مجھے الماری کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

''تمہاری حماقت کا نتیجہ مجھے بھگتنا پڑا۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''آخر سائمن اور اینڈی نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی کہ تم اس قتل کا اعتراف کرنے پر رضامند ہوگئے۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے؟''

''انہوں نے مجھے سبز باغ دکھائے اور کہا کہ اگر میں ہال کا نام نہ لوں تو وہ مجھے اسٹار بنا دے گا۔ اینڈی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں مسٹر میسٹر کی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے ہال کی مدد کی تو وہ تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''میں اپنے گناہ کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن کسی دوسرے کو بچانے کے لیے پھانسی نہیں چڑھ سکتا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پھانسی نہیں ہوگی۔'' ایڈی نے کہا۔ ''ہم تمہارے لیے بہترین وکیلوں کا انتخاب کریں گے جو اپنے دلائل سے تمہیں بے گناہ ثابت کر سکتے ہیں۔ ان میں گیسلر بھی شامل ہے اس نے بروس بیک کو کس طرح بچایا تھا حالانکہ اس نے روز ویلٹ ہائی وے پر تیز رفتاری سے دو آدمیوں کو ہلاک اور پانچ کو زخمی کر دیا تھا۔''

''پھر غلطی کہاں پر ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ مسٹر میسٹر اور ایم جی ایم کا حکومت کے افسران، قانون نافذ کرنے والے اداروں پر گہرا اثر ہے اور وہ جسے چاہیں پیسے کے ذریعے خرید سکتے ہیں۔'' ''ہم جیوری کے لوگوں کو خرید لیں گے اور ڈسٹرکٹ اٹارنی عدالت میں اعتراف کرے گا کہ تمہیں مجرم قرار دینے کے لیے اس کے پاس کافی ثبوت نہیں۔ اس کے بعد تم بری ہو کر جیل سے باہر آجاؤ گے اور تمہیں وعدے کے مطابق ہال کی نئی فلم میں مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کر لیا جائے گا۔'' اس نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اس کے برعکس تم چھ ضرب نو فٹ کی کوٹھری میں سزائے موت کا انتظار کر رہے ہو۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم سب سے معتبر گواہ تھے۔ تم نے عدالت میں بیان دیا کہ تم نے مجھے کپڑوں کی الماری کے پاس دیکھا تھا۔ اسٹوڈیو کے محافظوں نے بھی جھوٹ بولا کہ وہ تمہارے ساتھ تھے اور انہوں نے مجھے نشے کی حالت میں گالیاں بکتے دیکھا۔ اس کے بعد اینڈی کی یقین دہانیاں اور ضمانتیں ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔ اسٹوڈیو کے پولیس آفیسر نے بھی ہال کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔''

میں نے ایک نیا سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''یہ بات تو پرانی ہو چکی۔ اب ہم اصل نکتہ کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ مسٹر میسٹر تمہاری فون کال سننے پر کیوں مجبور ہوئے۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں اور تم اب کیا چاہتے ہو؟''

جب میں آدھ گھنٹے بعد اس سے رخصت ہوا تو مجھے اپنے سوالوں کا جواب مل چکا تھا۔

میں میسٹر کے عالی شان دفتر میں داخل ہوا تو وہ ٹیلی فون پر سرگوشیوں میں کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''ناشکرے۔ میں نے انہیں زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا اور اب یہ مجھے ہی آنکھیں دکھا رہے ہیں۔''

اس کا اشارہ کسی ایکٹر کی جانب تھا۔ سائمن نے اس کا غصہ کم کرنے کے لیے کہا۔ ''باس! تم فکر نہ کرو۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

''لیکن ہاتھ ہلکا رکھنا۔ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔''

میئر نے ایک سگار نکالا اور اس کا کونہ توڑتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو اس لیے بلایا ہے تاکہ ہم جورڈن ڈون کے معاملے پر غور کرسکیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہاں سے واپس آنے کے بعد تم نے جو رپورٹ مجھے دی ہے۔ اس کے بارے میں انہیں بھی بتادو۔''

''یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے لہٰذا اسے غور سے سننے کی ضرورت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈون نے حلفیہ کہا ہے کہ وہ تم میں سے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہتا گو کہ اس کا اصرار ہے کہ وہ دونوں قتل اس نے نہیں کیے لیکن وہ اس فیصلے سے مطمئن ہے اور سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے لیکن اس کے لیے اس نے ایک شرط رکھی ہے۔''

''یقیناً وہ کوئی بڑی شرط ہوگی۔'' اینڈی نے کہا۔

''حکومت عنقریب یہ فیصلہ کرنے والی ہے کہ پھانسی کے طریقہ کو برقرار رکھا جائے یا اسے گیس چیمبر سے بدل دیا جائے لیکن ان میں سے سزائے موت دینے کے لیے کسی ایک طریقے پر عمل ہوگا۔ ڈون چاہتا ہے کہ وہ پھانسی پانے والا آخری یا گیس چیمبر میں جانے والا پہلا شخص ہو۔''

اینڈی میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟''

''کیونکہ اس طرح وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائے گا اور اخبارات اس کی موت کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کریں گے۔ اسے وہ شہرت ملے گی جو فلموں سے نہیں مل سکی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ ایم جی ایم نے اسے لاوارث چھوڑ دیا ہے تو اس نے سچ سامنے لانے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا چنانچہ وہ مایوس ہوکر خاموش ہوگیا۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ چاہے پھانسی کی سزا پانے والا آخری شخص ہو یا گیس چیمبر میں جانے والا پہلا قیدی۔ دونوں صورتوں میں وہ تاریخ کا حصہ بن جائے گا اور اسے شہرتِ دوام مل جائے گی اور لوگ پچاس یا سو سال بعد بھی اسے یاد رکھیں گے۔ اسے یقین ہے کہ مسٹر میئر ایسا بندوبست کرسکتے ہیں۔''

''وہ حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے۔'' اینڈی نے ناگواری سے کہا۔

''مسٹر میئر ایسا کیوں چاہیں گے؟'' سائمن بولا۔

''اگر وہ ایسا نہ چاہتے تو ڈون کا فون نہ سنتے اور نہ ہی اس کی درخواست پر مجھے اس سے ملنے کے لیے بھیجتے اور نہ میری رپورٹ سننے کے بعد یہ میٹنگ بلاتے۔''

مسٹر میئر نے اثبات میں سرہلایا اور بولے۔ ''اس نے وفاداری نبھائی۔ میں بھی اپنی بات سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔'' انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور جذباتی انداز میں بولے۔ ''اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے تم لوگ جو کرسکتے ہو ضرور کرو لیکن اس کی زیادہ تشہیر نہیں ہونی چاہیے۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔''

اینڈی اور سائمن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اینڈی بولا۔ ''اور اگر ہم ایسا نہ کرسکے؟''

میئر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسی بات سننا نہیں چاہتا۔''

سائمن بولا۔ ''بے فکر رہو باس۔ کیا ہم نے پہلے کبھی تمہیں مایوس کیا ہے؟''

اس لمحے میں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب مجھے وہاں سے کھسک جانا چاہیے چنانچہ میں کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر آگیا اور کسی نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔

ایک ہفتے بعد میئر نے مجھے دوبارہ ڈون کے پاس بھیجا جو میری اس سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ میں اسے بتانے گیا تھا کہ میئر نے خود فون کرکے اس معاملے میں آرٹی ملر کی مدد مانگی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی لابی بہت مضبوط ہے اور وہ کیلی فورنیا کے گورنر سے زیادہ طاقتور ہے۔

آرٹی ملر کا وزن تین سو پونڈ سے زیادہ اور قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ اس کے کئی کاروبار تھے اور وہ بڑے بڑے لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ایم جی ایم بھی انہی میں سے ایک تھی۔ الیکشن کے موقع پر وہ سیاسی پارٹی کو فنڈ فراہم کرتا اور وہ اقتدار میں آنے کے بعد اس کی احسان مند رہتیں۔

جب میں نے ڈون کے سامنے ملر کا نام لیا تو وہ خاصا متاثر ہوا اور بولا۔ ''میں نے اس کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' تم واپس جاکر میئر سے میرا شکریہ ادا کردینا کہ اس نے میرے لیے اتنی زحمت اٹھائی۔''

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔''

"کیوں؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"یہاں آنے سے پہلے میں نے ملر کے دفتر فون کیا تھا تاکہ جان سکوں کہ تمہارے معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی بڑی خبر ہے؟"

"میرے پاس سرے سے کوئی خبر ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو اس کی سیکریٹری نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے مسٹر میسر کا نام لیا تو اس نے ملر سے میری بات کروادی میرے پوچھنے پر اس نے صرف یہ بتایا کہ صورتِ حال کنٹرول میں ہے۔"

"اس میں کون سی غلط بات ہے؟" ڈون نے پوچھا۔

"ملر نے مجھ سے جس انداز میں بات کی۔ اس سے لگ رہا تھا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ میں کس سلسلے میں بات کر رہا ہوں۔ اس کے دس منٹ بعد اینڈی کا فون آیا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مجھے اپنی نوکری عزیز ہے تو ملر کو پریشان کرنا چھوڑ دوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا مسٹر میسر کو اس فون کال کا علم ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ کوئی کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں کرتا۔"

"کیا تم مجھے ایک سگریٹ دے سکتے ہو؟" وہ بولا۔

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور بولا۔ "مجھے امید ہے کہ آرٹی ملر کی مدد کے بغیر بھی میں گیس چیمبر میں جانے والا پہلا قیدی کہلاؤں گا۔ کیا تمہارے پاس کاغذ قلم ہے۔"

میں نے جیب سے ایک چھوٹا پیڈ اور قلم نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے لکھتے وقت بلند آواز میں کہا۔ "تیس جنوری انیس سو بارہ۔" اس سے آگے میں نے کچھ نہیں سنا تھا۔

میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ سزائے موت پر عمل ہوتے وقت میں اس جیل میں موجود رہوں لیکن اس نے مجھ سے وعدہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس موقع پر اس کا کوئی دوست یا شناسا موجود ہو جو ملاقاتیوں کی کھڑکی سے اسے گیس چیمبر کی طرف جاتا ہوا دیکھ سکے۔

چیمبر میں دو لوہے کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر اے اور بی لکھا ہوا تھا۔ دو محافظ ڈون کو لے کر آئے اور اسے اس کرسی پر بٹھا دیا جس پر اے لکھا ہوا تھا پھر انہوں نے چمڑے کی پٹی سے اس کے بازو، سینے اور ٹانگوں کو کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے بعد اس کے سینے پر اسٹیتھ اسکوپ رکھا تا کہ چیمبر کے باہر بیٹھا ہوا ڈاکٹر اس کے دل کی دھڑکن محسوس کر سکے اور اس کی موت کے وقت کا اعلان کرے۔

کرسی کے نیچے ایک پیالے میں سلفیورک ایسڈ اور ڈسٹلڈ واٹر کا آمیزہ پڑا ہوا تھا۔ کرسی کے اوپر ایک بیگ بندھا ہوا تھا جس میں سوڈیم سائنائیڈ تھا۔ وارڈن کے اشارے پر دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا جلاد رسی کھینچتا اور سوڈیم سائنائیڈ اس پیالے میں گرنا شروع ہو جاتا۔

اس وقت مجھے ڈون کی بے گناہی پر بڑا ترس آیا شاید اسے اب بھی موہوم سی امید تھی کہ آخری لحات میں شاید گورنر کا فون آجائے اور اس کی سزائے موت وقتی طور پر ٹل جائے لیکن ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

گیس بننے سے پہلے ڈون نے میری طرف دیکھا اور میرے چہرے پر چھائے مایوسی کے تاثرات کا جواب پھیکی سی مسکراہٹ سے دینے کے بعد گہری سانس لی، تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور منہ سے رال بہنے لگی کیونکہ دماغ کو آکسیجن کی سپلائی رک گئی تھی لیکن وہ فوراً ہی بے ہوش نہیں ہوا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے جسم نے جھٹکے لینے شروع کر دیے اور دھیرے دھیرے ساکت ہو گیا لیکن ڈاکٹر نے آٹھ منٹ بعد اس کی موت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد بھی میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر ایک ایگزاسٹ فین کے ذریعے چیمبر سے گیس نکالی گئی اور ڈون کی لاش پر ایمونیا کا اسپرے کیا گیا تاکہ سائنائیڈ کے اثرات زائل ہو جائیں۔ آدھ گھنٹے بعد دو آدمی گیس ماسک اور ربر کے دستانے پہن کر چیمبر میں داخل ہوئے اور ڈون کی لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

واپس روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک پبلک بوتھ سے اسٹوڈیو فون کیا لیکن میسر اپنے دفتر میں نہیں تھا۔ فون اس کی سیکریٹری ایڈا نے اٹھایا۔

"باس کو بتا دو کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔"

"اسے پہلے سے معلوم ہے۔" سیکریٹری نے کہا۔ "وارڈن اسمتھ نے فون کر کے اسے یہ خبر پہنچا دی ہے۔"

"کیا سائمن اور اینڈی کو بھی معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی ہے اور اب وہ پریس کے لیے تعزیتی بیان لکھ رہے ہیں جس میں مسٹر میسر کی طرف سے جورڈن ڈون کی المناک موت پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ یہ قتل نہ کرتا تو

آنے والے دنوں میں بہت بڑا اسٹار بن سکتا تھا۔ میں نے مسٹر میئر کو تجویز دی ہے کہ یہ ہماری آئندہ فلم کے لیے ایک بہترین کہانی بن سکتی ہے۔''

میں بجھے دل کے ساتھ گھر پہنچا اور ایک کاؤچ پر ڈھیر ہوگیا۔ میری نظر کے سامنے ڈون کی موت کا منظر چل رہا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک اسے شہرت کی طلب رہی اور اس کی خاطر اس نے ایک ایسے جرم کی سزا قبول کرلی جو اس سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ اسی روز میں اسٹوڈیو کی کینٹین میں لنچ کررہا تھا کہ سائمن اور اینڈی آگئے۔ سائمن نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے حالانکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ جورڈن ڈون کی آخری خواہش پوری ہوگئی اور اب وہ تاریخ میں گیس چیمبر کے ذریعے رخصت ہونے والا پہلا قیدی کہلائے گا۔''

''اسی بات کا تو افسوس ہے کہ یہ اعزاز اسے حاصل نہ ہوسکا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''یہ بات مجھے کرائم رپورٹر جیک جیکب نے بتائی جو ہیرالڈ ایکسپریس کے لیے رپورٹنگ کرنے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے محافظوں کو باتیں کرتے سنا کہ وارڈن نے عین وقت پر فہرست میں تبدیلی کردی تھی لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس نے ایسا کیوں کیا، چنانچہ ڈون سے پہلے دو دوسرے سزا یافتہ قیدیوں رابرٹ کینین اور البرٹ کیسل کو گیس چیمبرز میں لے جایا گیا۔ ان دونوں کی موت نصف شب اور صبح کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی۔ اس طرح جورڈن ڈون پہلا نہیں بلکہ تیسرا شخص ہے جو گیس چیمبر میں لے جایا گیا اور اس طرح وہ تاریخ میں اپنا نام نہیں بنا سکا۔''

''شاید ایسا نہیں ہے۔'' سائمن نے عجیب سے انداز میں کہا۔

دوسرے دن میں ہیرالڈ ایکسپریس میں جیک جیکب کی اسٹوری پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے لکھا تھا ''اداکار جورڈن ڈون جو ایک بڑا اسٹار بننے کا خواہش مند تھا لیکن ایک حادثہ نے اس کے خواب چکنا چور کردیے اور اس نے جوش رقابت میں اپنی محبوبہ اور اس کے آشنا کو قتل کردیا۔ اس نے اپنے جرم کی قیمت گزشتہ روز سان کوئنٹین جیل میں ادا کردی اور اس طرح وہ گیس چیمبر میں ہلاک ہونے والا پہلا قیدی بن گیا۔''

میں نے سائمن کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ روز جیکب نے تم سے بات کرنے کے بعد مجھے فون کیا تھا۔ وہ برسوں سے ہمارے لیے کام کررہا ہے۔ جب اس نے مجھے تم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو میں نے اسے سمجھا دیا کہ اسے اپنی اسٹوری میں کیا لکھنا ہے۔ اب یہی خبر ہر جگہ چھپے گی اور ساری دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ ڈون ہی وہ پہلا شخص ہے جسے گیس چیمبر میں موت کی سزا دی گئی۔''

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ وارڈن نے عین وقت پر فہرست کیوں تبدیل کردی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسٹر میئر نے اس معاملے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو۔ میئر نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ انہوں نے ہر اس شخص کو فون کیے جو اس سلسلے میں مددگار ہوسکتے تھے۔ یہاں تک کہ گورنر سے بھی بات کرلی لیکن آرٹی ملر کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔ جب اس نے گورنر کو فون کرکے چیف کی جانب سے التجا کی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ پہلے ہی چیف سے وعدہ کرچکا ہے۔ گورنر ہمیشہ سے ہی آرٹی کو پسند نہیں کرتا۔ اسے اس کی مداخلت اچھی نہیں لگی لہٰذا اس نے طیش میں آکر وارڈن کو اصل فہرست کے مطابق عمل کرنے کا حکم دے دیا جس میں ڈون تیسرے نمبر پر تھا۔''

چھ ماہ بعد ایم جی ایم نے ڈون کی کہانی پر مبنی ایک فلم ریلیز کی جس سے اس کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا لیکن میں جانتا تھا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور سچ ایک دن سامنے آجائے گا۔ تین سال بعد اکیس نومبر انیس سو اکتالیس کو ٹائمز نے ایک اور انکشاف کیا۔ اس کے صفحہ اول پر شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق باون سالہ ایلینا جونز کو سان کوئنٹین کی جیل میں گیس چیمبر کے ذریعے موت کی سزا دی گئی اس پر دو آدمیوں کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ اخبار کے مطابق وہ پہلی عورت تھی جسے گیس چیمبر میں لے جایا گیا۔ اس رپورٹ میں جورڈن ڈون کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

میرے پاس جورڈن ڈون کا لکھا ہوا بیان تھا جس میں اس نے میئر کے سارے کرتوت بیان کیے تھے۔ میرا دل چاہا کہ اس بیان کو منظرِ عام پر لے آؤں لیکن پھر مجھے سائمن اور اینڈی کا خیال آیا جو خونخوار کتوں کی طرح مجھے بھنبھوڑ دیتے۔ اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی البتہ مجھے زندگی بھر یہ افسوس رہے گا کہ ڈون کی آخری خواہش پوری نہ ہوسکی۔

محفلِ شعر و سخن

❊ صادق معاویہ سعیدی......رحیم یار خان
جب ہوئی تھی محبت لگا تھا کہ نیکیوں کا صلہ ہے
ہمیں معلوم نہ تھا کہ گناہوں کی سزائیں بھی ملا کرتی ہے

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
گلاب ہاتھ میں، آنکھوں میں ستارا ہو
کوئی وجود محبت کا استعارا ہو
قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبتوں میں جو احسان ہو تمہارا ہو!

❊ محمد عمر سندھو جٹ......ملتان
ٹوٹ سا گیا ہے میری چاہتوں کا بھرم
اب کوئی اچھا بھی لگے تو ہم اظہار نہیں کرتے

❊ معاویہ مغل......ایبٹ آباد
نظریں بھی میری اسی کے ساتھ گریں
چاند کے پاس سے گرا ستارہ ڈھونڈ رہا تھا
محفل سے جانے کا کوئی جواز تو ہونا چاہیے
بیٹھ کر "بام" پر اشارہ ڈھونڈ رہا تھا

❊ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی
نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

❊ سید ظفر عباس زیدی......ضلع چنیوٹ
اس سمندر میں طوفان بڑے آتے ہیں
اس کے ساحل پر گھر بنانے کی ضد نہ کر

❊ ظہیر الدین......شاہ فیصل کالونی، کراچی
خط لکھنا اور خط کے نیچے نام نہ لکھنا
دل لکھنا اور دل کا کوئی پیغام نہ لکھنا

❊ مرحا گل......درابن کلاں
درد جب حد سے آگے بڑھا ضبط کے آنسو لکھے
ہم نے سیکھا ہی نہیں آنکھ سے رونا سائیں
کوئی کھیلے کوئی توڑے کوئی چاہے تو رکھے
مرد کے ہاتھ میں عورت ہے کھلونا سائیں

❊ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نبی منڈی سلھکی
ریزہ ریزہ ہو کے بکھرا ہے خلاؤں میں بدن
کس قدر مہنگی پڑی ہے چاند سے یاری مجھے

❊ رعنا رضوی......یو کے
روٹھا وہ رہے مجھ سے مجھے منظور ہے لیکن
یارو اسے سمجھاؤ میرا شہر نہ چھوڑے

❊ سعد شمسی......ناظم آباد، کراچی
تیرے جاتے ہی زمیں بوس ہوئے یار مرے
ایسے لگتے تو نہیں تھے در و دیوار مرے
حسن سفاک یہ کس ناز سے کہتا ہے وصی
اچھا ہونا ہی نہیں چاہتے بیمار مرے

❊ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
یہ کیا ہوا کہ بھرے آسماں کے آنگن سے
بچھڑ گیا جو ستارہ ہمارے نام کا تھا

❄ زرین آفریدی...... حیدرآباد
وہ کہتی ہے بتاؤ میں کیوں تم کو بھا گئی اتنا
میں کہتا ہوں میری جان حادثے تو ہو ہی جاتے ہیں

❄ معراج محبوب عباسی...... ہری پور، ہزارہ
میں نفرتوں کے جہان میں رہ کر جدا کروں گا تو کیا کروں گا
یہ ٹھیک کہتے ہو بے وفا ہوں وفا کروں گا تو کیا کروں گا
بغیر پانی بھی کوئی مچھلی رہ سکتی ہے بھلا محسن
میں تجھ کو کھو کر کسی کا ہو کر، بتا کروں گا تو کیا کروں گا

❄ جاوید ابراہیم...... لاہور
اے جانِ داستاں! تجھے آیا کبھی خیال!
وہ لوگ کیا ہوئے جو تیری داستاں کے تھے
مل کے تپاک سے، ہمیں نہ کیجیے اداس
خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

❄ محمد رشید سیال...... روہڑی، ضلع سکھر
تم ہی نے ہم کو نہ سنایا دکھ اپنا ورنہ
دعا وہ کرتے کہ آسمان تک ہلا دیتے

❄ ممتاز ادریس...... فیصل آباد
دامن کو بھی اپنے وسعت صحرا کریں گے ہم
یہ عزم کرلیا ہے تو پورا کریں گے ہم
ہم مشکلوں سے ڈر کے نہ بیٹھیں گے اک طرف
دیوار میں بھی راستہ پیدا کریں گے ہم

❄ احمد علی...... حیدرآباد
میری عقل و ہوش کی سب حالتیں
تم نے سانچے میں جنوں کے ڈھال دیں
کرلیا تھا میں نے عہدِ ترکِ عشق
تم نے پھر بانہیں گلے میں ڈال دیں

❄ وحید عباسی...... بہاولپور
یہ زرد موسم کے اداس لمحوں میں ہم رو پڑے یونہی ہنستے ہنستے
یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے تھک گئی ہیں آنکھیں خواب بنتے بنتے

❄ فرید عباسی...... بہاولپور
تجھ کو بھولا نہیں وہ شخص کہ جو
تیری بانہوں میں بھی اکیلا تھا

❄ نوید عباسی...... بہاولپور
تم کو بے وفا کہنے کی جرأت تو نہیں مجھ میں
تمہیں اتنا بتائیں ہم وفائیں یوں نہیں ہوتیں

❄ ولید عباسی...... بہاولپور
رات اندھیری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے ...... تھے
تم جو بچھڑے تو یہ بھی نہ سوچا......
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

❄ محمد کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
وہ کسی دن نہ آسکے پر اُسے
پاس وعدے کو ہو نبھانے کا
ہو بسر انتظار میں ہر دن
دوسرا دن ہو اس کے آنے کا

❄ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
جو حقیقت ہے اس حقیقت سے
دور مت جاؤ، لوٹ بھی آؤ
ہوگئیں پھر کسی خیال میں گم
تم میری عادتیں نہ اپناؤ

❄ بہادر گروپ...... بہاولپور
کیوں ہم کو سناتے ہو جہنم کے فسانے
اس دور میں جینے کی سزا کم تو نہیں

❄ ریاض بٹ...... حسن ابدال
دفنا دیا گیا مجھے چاندی کی قبر میں
میں جس کو چاہتا تھا وہ لڑکی غریب تھی

❄ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
زندہ رہے تو ہماری کسی نے خبر نہ لی
ہم مرگئے تو لوگ ہمیں پوجنے لگے

❄ یاسمین مرزا...... سیالکوٹ
ناز کو جس نے اپنا حق سمجھا
کیا تمہیں یاد ہے وہ بے چارہ
چاند ہے آج کچھ نڈھال نڈھال
کیا بہت تھک گیا ہے ہرکارہ

❄ جاوید اختر رانا...... پاک پتن شریف
اب تیرا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنوان جاناں

❄ محمد شہباز اکرم نوئی...... ڈھپئی پاک پتن شریف
یہ الگ بات ہے کہ میں اداکاری نہیں کرتا دلنشیں
مگر چاہوں تو میں پریوں کو بھی پاگل کردوں

❊ محمد صفدر معاویہ.....تحصیل وضلع خانیوال
کل رات میکدے میں عجب حادثہ ہوا
زاہد پی گیا شراب میرے حساب میں

❊ عرفان احمد عاجز، جمیل انور.....آڑہ، چوآسیدن شاہ
ہم نے دیوتا بنا ڈالا
ورنہ عشق فقیر پیشہ تھا

❊ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے لاچار جی سے ہم

❊ احسان علی.....فیصل آباد، سمندری
کتنا رویا تھا میں تیری خاطر!
اب جو سوچوں تو ہنسی آتی ہے

❊ عابد مظہر.....راولپنڈی
نوید سرخوشی جب آئے گی اس وقت تک شاید
ہمیں زہر غم ہستی گوارا ہو چکا ہوگا

❊ تبسم فاطمہ.....خانیوال
ہستی حال کبھی تھی کہ نہ تھی بھول گئے
یاد اپنی کوئی حالت نہ رہی بھول گئے

❊ مدحت.....کراچی
کیا ہے جو غیر وقت کے دھاروں کے ساتھ ہیں
وہ آئے ہم تو اس کے اشاروں کے ساتھ ہیں

❊ مختار احمد.....حیدر آباد
مانا بجھے ہیں تیر سخن زہر طنز میں
سانچے میں التفات کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

❊ شیراز احمد.....بہاولپور
گلہ ہے اک گلی سے شہرِ دل کی
میں لڑتا پھر رہا ہوں شہر بھر سے

❊ محمود الٰہی.....سرگودھا
کبھی خرابہ نشینوں پہ طنز مت کرنا
یہی تو ہیں جو خزانے تلاش کرتے ہیں

❊ احمد جہانزیب.....ملتان
رکھو دیر و حرم کو اب مقفل
کئی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے

❊ کوثر ابراہیم.....حیدر آباد
میں کیا بتاؤں کسی بے وفا کی مجبوری
کبھی خیال جو آیا تو آنکھ بھر آئی

❊ حسن بارائی.....کراچی
تیرا زیاں رہا ہوں میں، اپنا زیاں رہوں گا میں
تلخ ہے میری زندگی، تلخ زباں رہوں گا میں

❊ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
حسن کے جانے کتنے چہرے حسن کے جانے کتنے نام
عشق کا پیشہ حسن پرستی عشق بڑا ہرجائی ہے

❊ عابد جہانگیر.....اٹک
کتنی دلکش ہو تم، کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

❊ اطہر علی.....کراچی
شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی
لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں

❊ سرفراز احمد.....میرپور خاص
سرور مے پہ بھی غالب رہا شعور مرا
کہ ہر رعایت غم ذہن میں رکھی میں نے

❊ شازیہ.....کراچی
اس کے عروج کی تھی بہت آرزو ہمیں
جس کے عروج ہی میں ہمارا زوال تھا

❊ سلمان.....راولپنڈی
نام ہی کیا نشاں ہی کیا خواب وخیال ہو گئے
تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے

❊ دانش عمیر.....کراچی
ساری ردیفیں بھی حاضر ہیں پھر ساری ترکیبیں بھی
اور تمہیں کیا چاہیے یارو، حاصل میری داد بھی ہے

کوپن برائے شمارہ جون 2016

محفلِ شعر و سخن

نام : ---

پتا : ---

ایک بڑی کہانی

منظر امام

اکثر کہانیاں بہت سوچ سمجھ کر لکھی جاتی ہیں مگر... بعض اوقات کسی کی زندگی کہانی کے مانند خود اپنے کرداروں کو لے کر اپنا آغاز، درمیان اور اختتام مرتب کرتی ہے اور کہانی کے مرکزی کردار کو احساس تک نہیں ہونے دیتی کہ اس کی ناآسودہ خواہشیں... اس کا بے لوث پیار... اور پھر لوگوں کا ناروا سلوک جو بھی اس کے دل پر نقش ہو رہا ہے کہانی میں کیسا سوز اور درد جگا رہے ہیں... اسے بھی خبر نہ تھی کہ بے بنیاد کہانیاں لکھتے لکھتے وہ کتنی بڑی کہانی تخلیق کرتا جا رہا ہے۔

بے فکری سے آگے بڑھنے والے کرداروں کی

پُرفکر تحریر

ہم انہیں مسافر کہتے تھے۔ ہم کیا کہتے تھے، انہوں نے خود اپنا تعارف اس انداز سے کروایا تھا۔ وہ گرمی کی ایک بے چین کر دینے والی دوپہر تھی۔ جب وہ میرے دفتر تشریف لائے تھے۔

درمیانہ قد، قدرے فربہی مائل بدن، ہلکی سی ڈاڑھی، آنکھوں پر عینک لگی ہوئی۔ لباس پرانا، بغل میں ایک تھیلا دبائے ہوئے۔ پان سے دانت اور زبان گندے۔ وہ سیدھے میری میز کی طرف آئے تھے۔

''آپ ہی اس رسالے کے ایڈیٹر ہیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی ہاں، میں ہی ہوں۔ تشریف رکھیں۔'' وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''ایڈیٹر صاحب! میں مسافر ہوں۔'' انہوں نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ''آپ نے میرا نام تو سنا ہی ہوگا۔''

''میری بدقسمتی کہ میں آپ کا نام نہیں سن سکا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے ایک میلے سے رومال سے اپنا پسینا خشک کیا۔ ''بہت گرمی ہے جناب...... قیامت کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک۔''

''جی ہاں۔ آج واقعی بہت گرمی ہے۔'' میں نے گردن ہلائی۔ ''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''جناب! میں ایک افسانہ نگار ہوں۔'' یہ جملہ فخریہ انداز سے کہا گیا تھا۔

''اچھا، کہاں شائع ہوتے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو کہیں شائع نہیں ہوا۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں ایک دو رسالوں میں اپنی کہانیاں لے کر گیا ہوں لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل کا معیار کیا ہے۔ کون ہے جس کو ادب کے معنی بھی معلوم ہوں۔''

''تو کیا انہوں نے انکار کردیا؟''

''جی جناب! صاف انکار۔ نالائق لوگ۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ انہوں نے کتنا بڑا موقع گنوا دیا ہے۔ اگر وہ مجھے چھاپ دیتے تو آنے والے برسوں میں فخر سے بتا سکتے تھے کہ مسافر کو انہوں نے متعارف کروایا ہے۔ خیر، میں اس لیے آپ کے پاس اپنے افسانے لے کر آیا ہوں۔''

''کتنے افسانے ہیں؟''

''ابھی تو صرف پانچ لایا ہوں۔ اگر یہ سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر لائن لگا دوں گا۔'' انہوں نے اپنے چرمی بیگ سے کاغذات کا ایک پلندا نکال کر میز پر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ اپنی کہانیاں چھوڑ جائیں۔ میں دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ آپ اپنا رابطہ نمبر بھی دے دیجیے گا۔''

''میں کہانیاں چھوڑے جارہا ہوں لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان کہانیوں کے صرف عنوانات سن لیں۔ اس سے آپ کو میری تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ بھی ہوجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ میری کہانیاں کیسی اچھوتی اور نئے موضوعات پر ہوں گی۔''

''ضرور، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چلیں سنائیں۔''

''جی سنیں۔ پہلی کہانی کا عنوان ہے 'بادلوں کی حسینہ' کیوں چونک گئے نا؟''

''جی جناب! واقعی چونک گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بادلوں کی حسینہ۔ واہ...... کیا بات ہے۔''

''اور میری دوسری کہانی ہے...... تم کہاں ہو۔''

''کیا فرمایا، تم کہاں ہو؟ یہ کیسا عنوان ہے؟''

''چونک گئے نا۔ یہی تو کمال ہے میری کہانیوں کا۔ ہر ہر صفحے پر چونکاتی ہے میری تحریر۔ پڑھنے والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اب تیسری کہانی کا عنوان سن لیں...... رات اور دھوپ کی شادی۔''

اس عنوان کو سن کر میں مسکرا دیا۔

''مسکرائیں نہیں جناب۔ کہانی پڑھیں گے پھر آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے رات اور دھوپ کی شادی سے کیا مفہوم لیا ہے۔''

''ضرور۔ ضرور۔ اب تو ضرور پڑھوں گا اور چوتھی کہانی کا کیا عنوان ہے؟''

''عنوان آپ رکھ لیں۔'' انہوں نے کہا۔

''یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کہانی کا عنوان میں رکھ لوں؟''

''نہیں جناب۔'' وہ طنزیہ طور پر مسکرائے۔ ''اس کا عنوان ہی یہی ہے کہ عنوان آپ رکھ لیں۔''

''واہ۔ یہ تو واقعی بہت اچھوتا عنوان ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''شکریہ، میں نے بتایا نا کہ میں ایک منفرد تخلیقی ذہن کا انسان ہوں۔ میں پرانی ڈگر پہ تو چلتا ہی نہیں ہوں۔ ہر کام میں اچھوتے پن کی تلاش رہتی ہے۔ بہرحال اب ذرا پانچویں کہانی کی طرف آجائیں۔ اس کا عنوان ہے...... سمندر گھاس کھاتا ہے۔''

اس بار میں اپنی ہنسی روک نہیں سکا تھا لیکن کیا مجال جوان کے ماتھے پر شکن بھی آئی ہو۔ میرے خاموش ہونے کا انتظار بہت صبر سے کرتے رہے تھے۔

''واہ جناب واہ...... کیا عنوان ہے۔ سمندر گھاس کھاتا ہے۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس چالیس کہانیاں ہیں اور ہر کہانی کا عنوان ایک سے ایک ہے۔''

''جی جناب! کم از کم اس بات پر تو یقین آہی گیا ہے۔''

''اور جب کہانیاں پڑھ لیں گے تو میری بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں پر بھی یقین آجائے گا۔'' مسافر صاحب نے

کہا۔ ''تو پھر میں جواب لینے کے لیے کب تک حاضر ہو جاؤں؟''

''آپ نے اپنا موبائل نمبر تو لکھ ہی دیا ہے۔ میں فون کر کے بتادوں گا۔''

''ارے صاحب! مجھے فون وغیرہ پر زیادہ بھروسا نہیں ہے۔ جو بات سامنے بیٹھ کر ہو سکتی ہے، وہ فون پر نہیں ہو سکتی۔''

''تو پھر اگلے ہفتے تشریف لے آئیں۔ میں اس دوران میں آپ کی کہانیاں پڑھ لوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' مسافر صاحب اپنی کہانیاں چھوڑ کر مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

وہ ایک دلچسپ کردار تھے۔ ان کے جانے کے بعد آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ میرے پاس آگئے۔ سب نے ان کی باتیں سن لی تھیں اس لیے ہر شخص دل کھول کر تبصرے کر رہا تھا۔ خود میں بھی ہنس ہنس کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔ میں نے ان عجیب وغریب عنوانات کی کہانیاں پڑھیں۔ یہ سب ویسی ہی تھیں، جیسی کہانیاں عام طور پر بچے لکھا کرتے ہیں۔ نہ کوئی خیال، نہ پلاٹ اور نہ ہی مضبوط طرز تحریر۔ سب کی سب بس یوں ہی تھیں۔

مسافر صاحب کچھ دنوں کے بعد تشریف لے آئے۔ بہت پُر امید دکھائی دے رہے تھے۔ ''جی جناب! آپ نے میری کہانیاں تو پڑھ لی ہوں گی؟''

''جی ہاں جناب پڑھ لی ہیں۔''

''تو پھر کب تک شائع ہو رہی ہیں؟''

''مسافر صاحب! افسوس کے ساتھ......''

''بس بس رہنے دیں۔'' انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''آپ بھی میرے تخلیقی ذہن تک نہیں پہنچ سکے۔ خیر، کوئی بات نہیں لیکن میں اردو کی سب سے شاہکار کہانی آپ کو تخلیق کر کے دکھاؤں گا۔ بتادوں گا کہ بڑی کہانی ہوتی کیا ہے۔''

''جی ہاں مسافر صاحب! بالکل سچ کہہ رہے ہیں آپ۔ آپ میں صلاحیتیں ہیں۔ بس تھوڑا سا آپ پلاٹ پر توجہ دیں تو ایک بڑی کہانی لکھ سکتے ہیں۔''

مسافر صاحب اپنی کہانیاں لے کر واپس چلے گئے۔ مجھے افسوس تو ہوا تھا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ بقول انور شعور کے۔ ''دوست تم اچھے ہو لیکن شاعر کہہ سکتا نہیں۔ دوستی اپنی جگہ ہے شاعری اپنی جگہ۔''

ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔

راہِ زندگی...

انسان کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، میاں بیوی دوست یا سہیلی۔ ہر ایک کی اپنی جگہ قدر و قیمت ہوتی ہے، مگر پھر بھی بعض انسان تنہائی کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسی تنہائی جہاں ان کے قیمتی آنسو سوائے رب تعالیٰ کے کوئی نہ دیکھ پائے۔ ویسے تو کمزوریاں ہر انسان میں موجود ہیں مگر کوئی بھی رشتہ آپ کی کمزوریوں کو پہچان نہیں سکتا جب تک آپ خود اپنی کمزوری کو پہچان نہ لیں۔ یہ طے ہے کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک خود سے مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ ہو، شناخت نہ ہو۔ ممکن ہے دوسروں سے امیدیں وابستہ کر کے آپ اپنی قدر و قیمت بھی کھو دیں۔ لہٰذا انسان کی بہترین ساتھی اس کی اپنی تنہائی ہے جس کو اپنا کر وہ بہت صابر ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی آپ کو مکمل اطمینان یا خوشی نہیں دے سکتا اور ایک مکمل انسان اس وقت بنتا ہے، جب اللہ پر کامل یقین ہو کہ اس نے میرے بارے میں بہترین فیصلے کیے ہیں۔ انسان کا سوز زندگی اس وقت سہل ہو جاتا ہے جب وہ خود کو مکمل طور پر پہچان کر اپنا آپ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیتا ہے۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

اس کے بعد بہت دنوں تک مسافر صاحب کا کوئی پتا نہیں چلا۔ ویسے ان کا موبائل نمبر میرے پاس تھا لیکن کیا فون کرتا...... کیا کہتا ان سے؟

ایک دن وہ مجھے کہیں راستے میں مل گئے۔ مجھے دیکھ کر وہ خود ہی میرے پاس چلے آئے۔ حالانکہ میں شرمندگی کی وجہ سے کترا کر نکل جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے آکر بڑی گرم جوشی سے پکڑ لیا۔

''ارے جمال صاحب آپ...... کیسے ہیں، کہاں جا رہے ہیں؟''

''مسافر صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میرا آفس اسی روڈ پر آگے جا کر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''تو کبھی کبھی میں رکشا یا ٹیکسی کو چھوڑ کر واک کرتا ہوا جاتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔ اس طرح صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔''

''اور آپ یہاں کہاں؟''

''بھئی جس طرح آپ کا آفس یہاں سے قریب ہے، اسی طرح میرا گھر بھی یہاں سے قریب ہے۔ آئیں

میں آپ کو سامنے والے ہوٹل سے چائے پلاتا ہوں۔''
''نہیں مسافر صاحب! پھر کبھی سہی۔''
''اوہو، تکلف نہ کریں، آجائیں۔ آپ کو ایسی چائے پورے شہر میں نہیں ملے گی۔''
مسافر صاحب مجھے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آئے۔ یہ ایک عام سا ہوٹل تھا لیکن اس کی چائے واقعی لذیذ تھی۔
''ایڈیٹر صاحب! آج کل میں ایک بڑی کہانی لکھنے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔'' مسافر صاحب نے چائے پینے کے دوران بتایا۔ ''ایسی کہانی جو براہِ راست دل میں اتر جائے۔ جو آنکھوں کو نم کردے۔ آپ بھی مان جائیں گے کہ مسافر میں کیسی صلاحیتیں ہیں۔''
''کیوں نہیں مسافر صاحب، کیوں نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میں یہی لگن رہی تو آپ کوئی بہت بڑی کہانی تخلیق کرلیں گے۔''
ہم نے چائے ختم کردی تھی۔ میں نے ان سے اجازت چاہی اور اپنے دفتر آگیا۔ وہ آدمی مجھے پُرخلوص اور سیدھا سادہ دکھائی دیا تھا۔ بس ایک پرابلم تھی اس کے ساتھ کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی کہانی لکھنے کے جنون میں مبتلا تھا۔
عام طور پر کہانیاں لکھنے والے اپنے ذہن میں کوئی پلاٹ بنالیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے ایک شاہکار کہانی تخلیق کرلی ہے جبکہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ صرف پلاٹ کے کہانی بننے تک خون تھوکنا پڑ جاتا ہے۔ یہ کوئی آسان نہیں ہے۔
بہرحال کئی دنوں کے بعد پھر اس راستے پر مسافر سے ملاقات ہوگئی۔ اس بار اس کی ضد کچھ اور تھی۔ ''جناب! اب تو میں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔''
''مسافر صاحب! آپ مجھے چائے تو پلوا ہی چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''چائے نہیں جناب۔ کباب۔'' مسافر نے کہا۔ ''میرے اپنے ہاتھ کے کباب۔ آپ نے اتنے لذیذ کباب کبھی نہیں کھائے ہوں گے۔''
''واہ مسافر صاحب۔ آپ تو اس فن کے بھی ماہر معلوم ہوتے ہیں۔''
''بس آپ آجائیں۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔ دس منٹ کے لیے پلیز۔''
اس نے یہ بات اتنے عاجزی اور خلوص سے کہی تھی کہ میں انکار نہیں کرسکا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ اس کا گھر اسی روڈ پر آگے جاکر تھا۔ ایک منزلہ پرانا سا مکان جس کے بیرونی دروازے پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔
مسافر نے پردہ ہٹا کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔
''آجائیں جناب! یہ خانۂ بے تکلف ہے۔''
میں اندر آگیا۔ دو کمرے تھے اس گھر میں۔ ایک کمرے کو بیٹھک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اس نے مجھے اسی بیٹھک میں لے جاکر بٹھایا تھا۔ دوسرے کمرے سے بچوں کے بولنے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔
''تشریف رکھیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''
میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ بہت معمولی سا فرنیچر۔ ایک کونے میں ایک میز پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں...... یہ کتابیں بچوں کے کورس کی معلوم ہوتی تھیں۔
کچھ دیر بعد سات آٹھ برس کی ایک پیاری سی بچی ایک ٹرے میں ایک گلاس پانی لیے داخل ہوئی۔ اس نے بہت ادب سے سلام کیا تھا۔
''انکل، ابو ابھی آرہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ پانی پی لیں۔''
''رکھ دو بیٹا۔''
بچی نے گلاس میری طرف بڑھا کر ٹرے ایک طرف رکھ دی تھی۔ اس کے ہر انداز سے اس کی تربیت اور سلیقے کا اظہار ہو رہا تھا۔
''کیا نام ہے بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔
''بشریٰ۔'' اس نے بتایا۔
''اسکول میں پڑھتی ہو؟''
''جی انکل! تیسری میں پڑھتی ہوں۔'' اس نے بہت سلیقے سے جواب دیا۔
اتنی دیر میں مسافر بھی ٹرے لے کر داخل ہوگیا تھا جس میں کباب تھے اور جن کی خوشبو سے پورا کمرا معطر ہوگیا تھا۔
''مسافر صاحب! آپ کی یہ بچی بہت باسلیقہ ہے۔'' میں نے تعریف کی۔
''جی ہاں۔'' مسافر نے بڑے فخر اور پیار سے بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے تو چھوٹی سی لیکن پوری قیامت ہے۔''
''ابو۔'' بچی ناز سے ٹھنکنے لگی تھی۔
''ارے میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔ اب جاؤ شاباش اور اپنی کتابیں لیتی جاؤ۔ جواد کو بھی ساتھ بٹھا لینا۔ اس نے

اپنا ہوم ورک مکمل نہیں کیا ہے۔''
''جی ابو۔'' بچی نے میز پر رکھی ہوئی کتابیں سمیٹیں اور مجھے خدا حافظ کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔
''ماشاء اللہ آپ کی بیگم نے بہت اچھی تربیت دی ہے بچی کو۔''
''بیگم۔'' وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوگیا پھر اس نے بات بدل دی۔ ''چلیں چھوڑیں۔ آپ یہ کباب کھائیں۔''
نہ جانے کیوں وہ بیگم کے ذکر کو گول کر گیا تھا۔ میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ بہت ممکن تھا کہ بیگم کا انتقال ہوگیا ہو یا دونوں میں علیحدگی ہوگئی ہو۔ کچھ ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا تھا۔
کباب واقعی بہت لذیذ تھے۔ اگر اس کی بیگم نہیں تھی تو یقیناً یہ کباب اس نے بنائے ہونگے۔ میں نے دل کھول کر تعریف کی اور اجازت لے کر آ گیا۔ اس دن کسی کہانی وغیرہ کے موضوع پر کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ملاقات ہوگئی۔ اس بار یہ ملاقات راستے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ میرے دفتر آ گیا تھا۔
''جمال صاحب! آپ کو زحمت دینے آیا ہوں۔ شام کی چائے ہمارے ساتھ ہوگی۔''
''ارے مسافر صاحب! کیوں زحمت کرتے ہیں۔''
''بھائی صاحب آج میرے جواد کی آمین ہے۔'' وہ خوش ہوکر بولا۔ ''مولوی صاحب بسم اللہ پڑھا کر چلے جائیں گے، بس آپ ہوں گے اور محلے کے دو چار افراد۔ یہ میرے لیے تو بہت خوشی کا موقع ہوگا۔ آپ آئیں گے تو خوشی دوبالا ہوجائے گی۔''
''مسافر صاحب! اس مبارک موقع پر ضرور آؤں گا۔ خدا آپ کو خوشیاں دے اور بچے کے علم میں اضافہ کرے۔''
شام کو میں اس کے گھر پہنچ گیا۔
چھوٹے سے آنگن میں بہت معمولی سا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا تخت تھا۔ اس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ میرے علاوہ اور بھی چار پانچ آدمی تھے۔ ایک مولوی صاحب تھے جن کے گلے میں ہار تھا۔ ایک بچہ تھا۔ وہ بھی بہت پیارا سا تھا۔ اس نے بھی ہار پہن رکھا تھا۔
مسافر نے اس بچے کا تعارف کروایا۔ ''یہ جواد ہے، بچی بشریٰ سے چھوٹا۔''
بچے نے ادب سے سلام کیا۔ میں نے اسے دعائیں دیں۔ آمین کی رسم ختم ہوئی۔ مسافر نے کھانے پینے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ اس موقع پر اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ لوگ اسے مبارک باد دے رہے تھے اور وہ خوشی سے نہال ہوا جارہا تھا۔
اس وقت پتا چل رہا تھا کہ محبت کرنے والے کسی باپ کے جذبات اور احساسات کیا ہوتے ہیں۔ ناشتے سے فراغت کے بعد مسافر نے کہا۔ ''بھائیو...... اب میں چائے لے کر آتا ہوں۔ چائے پی کر جایئے گا۔''
سب بیٹھے رہے۔ مسافر شاید چائے لینے چلا گیا تھا۔
''بھائی...... یہ تو بہت کمال کا آدمی نکلا۔'' محلے کا ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ''ورنہ آج کل کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔''
''جناب! اپنی اولاد کے لیے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔'' میں نے مداخلت کی۔
''اپنی اولاد!'' اس آدمی نے میری طرف دیکھا۔ ''شاید آپ کو نہیں معلوم۔''
''کیا نہیں معلوم؟''
''اس بے چارے کی اولاد کہاں ہے بلکہ اس نے تو شادی ہی نہیں کی۔''
کیا؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''تو پھر یہ بچے؟''
''ارے یہ دونوں تو لاوارث بچے تھے۔'' دوسرے نے بتایا۔ ''کسی ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔ یہ جوان کا بچہ دونوں کو اٹھا کر لے آیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح دونوں کی پرورش کی ہے کہ کیا کوئی سگا باپ کرے گا۔ ہاں بن کر سینے سے لگا کر رکھا ہے دونوں کو۔ احساس تک نہیں ہونے دیتا ان کو کہ وہ لاوارث ہیں۔ ان کو یہی بتایا ہے کہ تمہاری ماں مر چکی ہے۔ ہم محلے والے بھی اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں۔''
اس دوران میں مسافر ٹرے میں چائے لے کر آ گیا تھا۔ ''یہ لیں بھائیو...... گرما گرم چائے تیار ہے اور آج تو جواد میاں نے بھی چائے بنانے میں میرا ساتھ دیا ہے۔''
میں اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کا قد اچانک بہت بڑا، بہت بڑا ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار، سب سے بڑا کہانی نگار ہو گیا تھا۔
میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ ''مسافر! تم نے دنیا کی سب سے بڑی کہانی لکھ لی ہے۔ دوسری کہانیاں تو کاغذوں پر لکھی جاتی ہیں۔ لیکن تم نے اپنی یہ شاہکار کہانی دلوں پر لکھ دی ہے۔ یو آر گریٹ مسافر...... یو آر گریٹ۔''

ماروی

محی الدین نواب

تیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی منی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔
مراد جوکہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جوکہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جوکہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جوکہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگا دیا۔
یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف نجّی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔
دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور نجّی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔
مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممّی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممّی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرکے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرلیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا

دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب وہ غبارے مغرب کی سمت جا رہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوا لیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد بر سر اقتدار آ گیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنا دی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور سنگھی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریکِ حیات بنا لیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زیر کرتا آ رہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن تنظیموں نے مراد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا سرپرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار رہے۔ مراد اور ہم زاد دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہم زاد نے کہا۔ ”ہماری یہ چھوٹی سی ریاست ان کے لیے تر لقمہ ہے۔ ہم تنہا اس ریاست کے رکھوالے ہیں۔ جرائم کی دنیا کے تمام بدمعاش اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ہم پر حملہ کریں گے تو بیک وقت ان سب سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہو گا اور یہ نئے دشمن جلد باز نہیں ہیں۔ رفتہ رفتہ ہمارے اطراف محاصرہ تنگ کرتے رہیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی عورتوں کی عزت آبرو اور سلامتی کی فکر کرنی چاہیے۔“

وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ہم زاد نے مزید کہا۔ ”ہم اپنی بیویوں کو راز داری سے کسی دوسرے ملک میں بھیج دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”سوچنا آسان ہے، عمل کرنا مشکل ہے۔ ہماری خواتین جس ملک میں بھی پناہ لینے جائیں گی، وہاں کی شہریت انہیں حاصل کرنی ہو گی۔ ہمیں اس ملک کے اکابرین کو اپنا راز دار بنانا ہو گا۔ اب دور تک سوچو کہ ہماری ایک کمزوری ان کے ہاتھ میں ہو گی۔ ان کے اتحادی ممالک تک یہ بات پھیلے گی۔ تمام مجرموں کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اپنی عورتوں کو کہاں رکھا ہے پھر یہ کہ ماروی اور محبوب میرے لیے سب سے اہم ہیں۔ میں انہیں کیسے سیکیورٹی دے سکوں گا؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمیں اپنی ریاست کو بچانا ہے۔ اپنی عورتوں کی بھی فکر ہے۔ ماروی اور محبوب کو بھی تحفظ فراہم کرنا ہے۔“

وہ کچھ اور پریشان ہو کر بولا۔ ”پھر یہ کہ جینی کل آ رہی ہے۔ اپنے بچے کی بھی سلامتی کا سوال ہے۔“

مراد اور تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”جینی کو تو یہاں آنا ہو گا۔ تمہارے ساتھ رہنا ہو گا۔ بچے کو اپنی نگرانی میں رکھنا ہی ہو گا۔ ورنہ ماں اسے یہودی بنا دے گی۔“

ہم زاد نے پوچھا۔ ”جب دشمن ہمارے اطراف گھیرا تنگ کریں گے تو ہم جینی اور بچے کی حفاظت کیسے کریں گے؟“

مراد نے ایک گہری سانس لی پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”ہم خواہ مخواہ فکر میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں۔ بچے کو اور بیویوں کو ذہن سے نکال دو۔ ان کی فکر میں زیادہ اہم باتوں کو پس پشت نہ ڈالو۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا بچے کی بھی فکر نہ کریں؟“

”نہ کرو۔ جب زلزلہ آتا ہے تو آدمی بیوی بچوں کے ساتھ زمین میں ملبے کے نیچے دب کر مر جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم تمام عمر بیوی بچوں کی سلامتی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں لیکن جب قضا آتی ہے تو انہیں بچا نہیں سکتے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں مرتے دیکھتے ہیں۔ بہرحال ہماری بیویاں اسی ریاست میں ہمارے ساتھ جئیں گی اور ہمارے ساتھ مریں گی۔ ہمیں سب سے پہلے دشمنوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف روکنا نہیں ہے۔ انہیں جہنم میں بھی پہنچانا ہے اگرچہ یہ آسان نہیں ہے۔ ایک آیت الم نشرح میں سمجھایا گیا ہے کہ آسانی کے بعد مشکل ہے تو مشکل کے بعد پھر آسانی ہے۔“

وہ چپ ہو گیا۔ اچانک ہی دروازہ کھلا تھا۔ کوئی اجازت کے بغیر اندر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن جیسیکا آ گئی.... ہم زاد نے وعدہ کیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کے پاس آ جائے

گا لیکن ایسے پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے تھے کہ وہ سارا رومانس بھول گیا تھا۔ ان لمحات میں جیسی بھی ذہن سے نکل گئی تھی۔

وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جیسی نے کہا۔ ”تم بہت جھوٹے ہو۔ ابھی آنے کو کہا تھا۔ کیا تمہیں بھی میری طرح بھول جانے کی بیماری ہوگئی ہے؟“

وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”جیسی! ہم بہت مشکل میں ہیں۔ بہت اہم باتیں کررہے ہیں۔ پلیز اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا۔“

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ”نہیں جاؤں گی۔ رونے لگوں گی۔ پہلے سینے سے لگاؤ۔“

وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر بولی۔ ”اپنے ہاتھوں سے لپیٹ لو۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

مراد نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھاما پھر ہم زاد کو ناگواری سے دیکھ کر بولا۔ ”بڑے کارنامے انجام دے رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔ اسے لے جاؤ۔ گیٹ آؤٹ۔“

وہ جیسی کا بازو تھام کر اسے کمرے سے باہر لاکر بولا۔ ”کچھ تو عقل سے سمجھا کرو۔ ایسی باتیں دوسروں کے سامنے نہیں کی جاتی ہیں۔ ایسا صرف تنہائی میں ہوتا ہے۔“

اس نے فطری معصومیت سے پوچھا۔ ”ایسا سب کے سامنے کیوں نہیں ہوتا؟ کیا یہ گناہ ہے؟“

وہ کیا جواب دیتا؟ اگر کہتا کہ یہ گناہ ہے تو شاید وہ پھر کبھی اسے پاس نہ آنے دیتی۔ وہ بولا۔ ”گناہ تو نہیں ہے مگر......“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”نہیں ہے تو مجھے پکڑو۔ دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں لے کر کس لو۔“

وہ بوکھلا گیا۔ کنیزیں اور گارڈز دور کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کا بازو تھام کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔ کیا ہو تم؟ تم تو آئندہ بھی پبلسٹی کرتی رہوگی۔“

وہ اس کے بازو سے لگ کر چلتے ہوئے بولی۔ ”تم منع کررہے ہو پھر پبلسٹی کیسے کروں گی؟“

”میرے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ تم پھر بھول جاؤ گی۔ پھر کسی وقت دوسروں کے سامنے بولوگی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ شرم وحیا کیا ہوتی ہے؟“

”مجھے سب پتا ہے۔ شرما کے دکھاؤں؟“

”یہی تو نہیں سمجھ رہی ہو کہ شرم والی باتیں دکھائی نہیں جاتیں۔ چھپائی جاتی ہیں۔ تم ایسی اہم رازداری کو بھول جایا کروگی اور مجھے دوسروں کے سامنے شرمندہ کرتی رہوگی۔“

”پھر میں کیا کروں...... بولو؟“

وہ اس کے کمرے میں آگیا۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد بولا۔ ”میں شرمندگی سے بچنے کے لیے تمہیں دونوں بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے نہیں لگاؤں گا۔“

وہ تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ”نہیں۔ دور رہنے کی باتیں نہ کرو۔ میں مرجاؤں گی۔“

”جیسی! یہی ایک راستہ ہے۔ میں تمہارے ساتھ کچھ نہیں کروں گا تو تم دوسروں کے سامنے کچھ نہیں بولوگی۔“

وہ مچلنے لگی۔ ”کچھ نہیں بولوں گی۔ کسی کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ نہ جاؤں گی نہ بولوں گی۔“

وہ تو ایسی تھی کہ اس کے لگتے ہی وہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ کچھ بولنا بھول گیا۔ اس کے بدن کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ یہ ایسے مرحلے ہوتے ہیں کہ بہکنے بھٹکنے والوں کو ہی منزل ملتی ہے۔ اسے بھی ملنے والی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی توجہ دوسری طرف بھٹک گئی۔ اس کی نظر سینے پر پڑی صلیب پر گئی تو وہ صلیب کچھ غیر معمولی سی لگی۔ اس نے دو انگلیوں سے اسے تھام کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے اوپری حصے میں تین ننھے سے سوراخ تھے۔ دماغ نے چیخ کر کہا۔ وہ مائکروفون ہے اور وہاں ہونے والی باتوں کو کہیں دور تک نشر کررہا ہے۔

جیسی پر اس کی قربت کا سحر طاری ہوگیا تھا۔ وہ مدہوش ہورہی تھی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”رک کیوں گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟ پلیز مجھے بہکاتے رہو۔ مجھے بہکتے رہنے دو۔“

وہ بولا۔ ”جیسی، میری جان! تم بہت حسین ہو۔ میں رک رک کر شرارتیں کررہا ہوں۔ ابھی سوچ رہا ہوں، یہ صلیب بہت مقدس ہے۔ ایسے وقت اسے اپنے بدن سے دور رکھو۔“

وہ بیڈ پر پڑی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ صلیب کی سنہری چین کو گلے سے اتارتے ہوئے بولی۔ ”گاڈ مجھے معاف کرے۔ میں بھول گئی تھی۔ مام نے سمجھایا تھا ٹوائلٹ جانے اور شاور لینے سے پہلے اسے اتار دیا کروں۔“

وہ اس کے ہاتھ سے صلیب کو لیتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے دور رکھ دیتا ہوں۔ پھر غسل کرنے کے بعد اسے پہن لینا۔“

وہ بیڈ سے اتر کر اسے دور ایک فلاور اسٹینڈ پر رکھنے سے پہلے اچھی طرح دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''آؤ نا...... مجھ سے ذرا دیر کے لیے بھی دور نہ جاؤ۔''

وہ بیڈ پر آ کر اس پر چھا گیا۔ وہ رنگیلا راجہ تھا لیکن فرائض کی ادائیگی کے وقت بڑی قوت ارادی سے عیاشی کو بھول جاتا تھا۔ وہ صلیب اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔

اتنا تو وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کی اور جیسی کی باتیں کہیں سنی جا رہی ہیں۔ اگر وہ جیسی سے صلیب کے بارے میں کوئی سوال کرتا اور شبہ ظاہر کرتا تو دوسری طرف سننے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ مراد ان کی سازشوں کو سمجھ رہا ہے۔ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال خاموشی سے سوچ رہا تھا کہ پہلے مراد کو اس سازش سے آگاہ کرے گا پھر اس صلیب کو کھول کر دیکھا جائے گا۔ صلیب کو ہاتھ لگا کر کھولتے ہی دوسری طرف دشمنوں کو معلوم ہو سکتا تھا کہ اب وہ جیسی کے گلے میں نہیں ہے۔ اس کی حقیقت معلوم کی جا رہی ہے۔

جیسی کو زندگی میں پہلی بار ایسی انوکھی اور جادو بھری مسرتیں مل رہی تھیں کہ اب ہم زاد کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ ''اب تمہیں شاور لے کر سو جانا چاہیے۔ تم بہت اچھی ہو مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔''

وہ لپٹ کر اور زیادہ کمبل بن گئی۔ ''نہیں جانے دوں گی۔ کبھی نہیں جانے دوں گی۔ جاؤ گے تو چیخ چیخ کر رونے لگوں گی۔''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''اچھی بات ہے۔ نہیں جاؤں گا لیکن باتھ روم میں جاؤ۔ شاور لو۔ پھر ہم سو جائیں گے۔ چلو اٹھو دیر نہ کرو۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی پھر ہم زاد نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کھڑی ہوئی دو کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ نیند کی گولیاں لے آئیں۔ فی الحال اس سے نجات پانے کا یہی راستہ تھا۔ ایک کنیز مطلوبہ گولیوں کی ایک شیشی لے آئی۔ جیسی غسل سے فارغ ہو کر آئی تو ہم زاد نے شیشی سے دو گولیاں نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے پانی کے ساتھ نگل جاؤ۔''

اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''دوا ہے۔ تم پہلی بار جوانی کے آپریشن سے گزری ہو۔ اس لیے یہ دوا ضروری ہے۔''

وہ پانی کے ساتھ گولیاں نگل گئی پھر بولی۔ ''چلو پھر اسی طرح محبت کریں گے۔''

دونوں بیڈ پر آ گئے۔ وہ اسے تھپک کر بولا۔ ''پہلے ہم ایک نیند لے کر تھکن اتاریں گے پھر محبت کریں گے۔''

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ ہم زاد نے اسے باتیں کرنے سے منع کیا۔ اسے پیار سے تھپکتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد خواب آور گولیوں نے اثر دکھایا۔ وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ اس نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بیڈ سے اتر گیا۔ وہاں سے فلاور اسٹینڈ کے پاس آ کر ایک بڑے سے کپڑے میں صلیب کو چھپا لیا تا کہ آس پاس کی کوئی آواز اس صلیب کے ذریعے کہیں دوسری طرف نہ پہنچے۔

وہ اس کمرے سے نکل کر سیدھا مراد کے پاس آیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ مراد نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ''تم نے نیند سے جگایا ہے۔ کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں۔ بہت اہم بات ہے۔ تم نے جیسی کے گلے سے لٹکے ہوئے صلیب کو دیکھا ہے؟''

''میں کسی نامحرم کو توجہ سے نہیں دیکھتا۔ تم کیا کہنے آئے ہو؟''

''اس کی صلیب ایک جاسوسی آلہ ہے۔''

''کیا......؟'' وہ چونک کر بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ابھی پوری طرح معلوم نہیں ہوا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ اس بے چاری ایبنارمل لڑکی کو آلۂ کار بنا کر یہاں بھیجا گیا ہے۔ ہم جو باتیں کرتے ہیں، وہ باتیں اس صلیب کے ذریعے کسی دوسری طرف پہنچتی رہتی ہیں۔''

یہ بہت ہی تشویش میں مبتلا کرنے والی بات تھی۔

''یا خدا......! ہم انجانے میں دھوکا کھا رہے ہیں۔ کہاں ہے وہ صلیب؟''

''میں نے اسے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا ہے۔ اس طرح ہماری باتیں دوسری طرف نشر نہیں ہو رہی ہیں۔''

مراد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''شاباش! تم حاضر دماغ ہو۔ میں ابھی الیکٹرونک آلات کے ماہر کو بلاتا ہوں۔ وہ اس صلیب کو کھول کر حقیقت معلوم کرے گا۔''

''مراد! یہ کپڑا ہٹا کر اس صلیب کو کھولا جائے گا تو دوسری طرف دشمنوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سازش پکڑی گئی ہے۔ وہ فوراً ہی اپنے بچاؤ کی تدبیر کریں گے۔''

''درست کہتے ہو۔ پہلے دشمنوں سے نمٹنا چاہیے۔''

اس نے فون پر پلے کو مخاطب کیا۔ وہ نیند سے اٹھ کر بولا۔ ''ہاں بولو مراد! خیریت تو ہے؟''

وہ بولا۔ ''بستر چھوڑ دو۔ سیکرٹ فورس کے چند جاں نثاروں کے ساتھ سفیر جیمس ہارورڈ کے بنگلے میں گھس جاؤ۔ سب سے پہلے ان کے موبائل فون چھین لو۔ سفارت خانے

کے عملے کو بھی بالکل ہی بے دست وپا کردو۔ میری دوسری کال آنے تک ان سب کو حراست میں رکھو۔ انہیں کسی سے بات بھی نہ کرنے دو۔''

اس نے فون بند کر کے الیکٹرونک آلات کے کسی ماہر کو طلب کیا۔ جب وہ آیا تو مراد نے کہا۔ ''اس کپڑے کے اندر ایک جاسوسی آلہ ہے۔ اسے باہر نکالا جائے گا تو ہماری آوازیں دوسری طرف کہیں سنی جائیں گی۔ اس لیے کپڑے کو ہٹاتے ہی گونگے بن جاؤ۔ ہم میں سے کوئی کسی سے نہیں بولے گا۔''

اس ماہر نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کپڑے کو ہٹا کر صلیب کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس آلے کو سمجھ گیا ہے پھر اپنے بیگ میں سے ننھے اوزار نکال کر اسے کھولنے لگا۔ اس صلیب کے کھلتے ہی انکشاف ہوا کہ وہ ایک ایسا فون ہے جو اپنے آس پاس کی آوازیں نشر کرتا ہے لیکن کسی دوسری طرف کی آوازیں ریسیو نہیں کرتا ہے۔

ماہر نے کہا۔ ''اب ہم بول سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہماری آواز نہیں جائے گی۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''میرا شبہ درست نکلا۔ یہ جاسوسی کا آلہ ہے۔''

مراد نے ماہر سے کہا۔ ''اسے پھر اسمبل کرو۔ میں بات کروں گا دیکھوں گا کہ وہ کون لوگ ہیں؟''

دوسری طرف دشمن جاسوس چوکنے ہو گئے تھے۔ پہلے تو جیسی نے اس صلیب کو اتار کر پتا نہیں کتنی دور کر دیا تھا۔ وہ اس کی اور ہم زاد کی باتیں نہیں سن پائے تھے پھر تقریباً دو گھنٹے بعد ان کے ریکارڈر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس وقت وہ ماہر اس صلیب کو ننھے اوزار سے کھول رہا تھا۔ وہ جاسوس ایسی آوازیں سن کر سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ انہوں نے فوراً ہی جیمس ہارورڈ کے فون سے رابطہ کیا تو ریکارڈنگ سنائی دی کہ اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔

انہوں نے مسز ہارورڈ کے نمبر پنچ کیے۔ وہاں سے بھی وہی جواب موصول ہوا۔ جیمس ہارورڈ کے پرسنل سیکریٹری کے فون سے بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ تب انہوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو اطلاع دی کہ ان کا جاسوسی کا آلہ شاید پکڑا گیا ہے۔ سفیر سے اور سفارت خانے کے کسی فرد سے بھی فون پر رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

پھر رابطہ ہو گیا۔ ان کے سامنے رکھی ہوئی ریکارڈنگ مشین بولنے لگی۔ ''ہیلو کون ہو تم لوگ؟ ہم سمجھ گئے ہیں کہ تم نے ایک مقدس صلیب کو چالبازی کا حربہ بنایا ہے۔''

وہ جاسوس مراد کی آواز پہچان رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ جاسوسی کا آلہ یک طرفہ ہے۔ میری آواز تمہارے پاس پہنچ رہا ہے لیکن تمہاری آواز مجھ تک نہیں پہنچائے گا۔ تم کوئی بھی ہو، تمہارے پاس میرا فون نمبر ضرور ہوگا۔ پھر بھی میں اپنا نمبر بول رہا ہوں۔ نوٹ کرو اور مجھ سے بات کرو۔''

اس نے اپنا نمبر بتایا۔ اس نمبر کو تین بار دہرایا پھر کہا۔ ''میں تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر مجھے نظر انداز کرو گے تو یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا سفیر اپنے سفارت خانے کے عملے کے ساتھ حرام موت مارا جائے گا۔''

انہوں نے ریکارڈنگ مشین سے مراد کی آواز بند کر دی۔ حکومت کے اکابرین کو اس کی دھمکی آمیز کال سنانے لگے۔ مراد نے تھوڑی دیر تک کال کا انتظار کیا۔ پھر ہم زاد سے کہا۔ ''آؤ جیمس ہارورڈ کے پاس چلیں۔ اصل آلۂ کار تو وہی ہے۔ جوتے پڑتے ہی بولنے لگے گا۔''

اس ملک کے اکابرین سفیر جیمس ہارورڈ سے اور سفارت خانے کے عملے سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اور ناکام ہو رہے تھے سپر پاور کو اطلاع دے رہے تھے کہ جیسی کے ذریعے ان کی سراغ رسانی ناکام رہی ہے۔ مراد انتقامی کارروائی کرنے والا ہے لیکن مراد سیاسی حکمت عملی سے سوچ رہا تھا کہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے تمام خطرناک مجرم اس کی ریاست پر دھاوا بولنے کے لیے آپس میں متحد ہو گئے ہیں اور بہت بڑی اتحادی قوت بن گئے ہیں۔ حالات موافق نہیں تھے۔

عقل سمجھا رہی تھی کہ ایسے وقت وہ سپر پاور اور اس کے اتحادیوں سے مخالفت مول لے گا تو دو بڑی طاقتوں کے درمیان سینڈوچ بن جائے گا۔ وہ ہم زاد کے ساتھ سفیر جیمس ہارورڈ کے بنگلے میں آیا۔ وہاں بشریٰ بلا اور سیکرٹ فورس کے جاں نثار تھے۔ جیمس ہارورڈ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''یور ہائی نس! میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے حراست میں کیوں رکھا گیا ہے؟''

مراد نے اس کے سامنے سونے کے نیکلس کو لٹکایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیکلس سے منسلک وہ صلیب پینڈولم کی طرح دائیں بائیں جھولنے لگی۔

ہم زاد نے سخت لہجے میں کہا۔ ''جواب دو کہ یہ کیا ہے؟ سچ بولو گے تو زندہ رہو گے۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ اس ریاست میں غداروں کو اور غیر ملکی جاسوسوں کو سزائے موت

دی جاتی ہے۔ تمہاری اور تمہاری بیوی کی لاشیں اپنے ملک جائیں گی۔"

وہ دونوں میاں بیوی سہم کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر مسز ہارورڈ دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "میری بیٹی معصوم ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کے نیکلس کے ساتھ یہ سراغ رسانی کا آلہ منسلک کیا گیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "ابھی اپنا تحریری بیان دو کہ تم میاں بیوی نے مقدس صلیب کو جاسوسی کا آلہ بنا کر اسے اپنی ایبنارمل بیٹی کے گلے میں پہنایا تھا۔ اس کے ذریعے ریاست کے اور حکمران کے خلاف جاسوسی کر رہے تھے۔ تم دونوں کی سچ بیانی کے باعث مراد علی منگی تمہاری جان بخش رہا ہے۔ تم اپنے پورے سفارت خانے کے ساتھ سلامتی سے واپس جا رہے ہو۔ پھر کبھی ریاست میں دوستی کے نام پر دھوکا دینے نہیں آؤ گے۔"

انہیں جان کی امان مل رہی تھی۔ ان میاں بیوی نے تحریری بیان لکھ کر دستخط کیے اور اس پر سفارت خانے کی مہر لگا دی۔

مراد نے سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے فون پر رابطہ کیا اور کہا۔ "آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ آپ کے ایک اتحادی ملک نے پھر مجھ سے دشمنی کرنے کی حماقت کی ہے۔"

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ "ابھی مجھے معلوم ہوا ہے۔ ہم کئی ممالک اس ملک کا محاسبہ کر رہے ہیں۔ اس کی اس مجرمانہ غلطی کے باعث ہم آپ کی نظروں میں ناقابلِ اعتماد ہو جائیں گے۔ ہم آپ کو ہر طرح یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ ہم اس سازش میں نہ شریک تھے، نہ آئندہ ایسی نادانی کریں گے۔"

مراد نے کہا۔ "مجھے یقین ہے۔ آپ اس سازش میں شریک نہیں ہیں۔ آپ ہمارے دوستانہ تعلقات کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گے لیکن ہم اس ملک پر اب کبھی بھروسا نہیں کریں گے۔"

مراد ان کی توقع کے خلاف نرمی سے دوستانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہم ایک دوست کی حیثیت سے پوچھ رہے ہیں۔ سفیر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ میرے قانون کے مطابق ان کا جرم سنگین ہے۔ جیمس ہارورڈ کو اس کی فیملی اور پورے عملے سمیت سزائے موت دی جائے گی۔"

"یور ہائی نس! ان پر رحم فرمائیں۔ میری سفارش پر ان سب کو جان کی امان دیں۔ انہیں ملک بدر کر دیں۔ اس ملک سے سفارتی تعلق نہ رکھیں۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم آپ کی سفارش پر ان سب کو سلامتی کے ساتھ یہاں سے روانہ کر دیں گے۔"

وہ شکر گزار و ممنون ہو کر مراد کے گن گانے لگا۔ مراد نے پہلے سے کہا۔ "ان کا فون واپس کرو۔"

دونوں میاں بیوی کو فون مل گئے۔ مراد نے سفیر سے کہا۔ "اپنے اکابرین سے رابطہ کرو۔ ان سے بولو، تم سب چوبیس گھنٹے کے اندر یہاں سے نہیں جاؤ گے تو جان کی امان نہیں ملے گی۔ تم سب کو گولی مار دی جائے گی۔ لہٰذا تمہارے ملک سے طیارہ آئے اور تمہیں یہاں سے لے جائے۔"

اس نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "یاد رکھو، صرف چوبیس گھنٹے...... اور یہ کہہ دینا کہ ہم ان اکابرین سے بات نہیں کریں گے۔ ہمارے سفارتی تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔"

اس نے پہلے سے کہا۔ "جب تک یہ لوگ یہاں سے دفع نہ ہو جائیں، ان پر کڑی نظر رکھو۔ انہیں لینے کے لیے ایک طیارہ آئے تو ان سب کو سیکرٹ فورس کی نگرانی میں ائرپورٹ پہنچا دو۔"

مسز ہارورڈ نے کہا۔ "یور ہائی نس! کیا میری بیٹی یہیں رہے گی۔"

ہم زاد نے کہا۔ "بیٹی کے لیے ممتا نہ جتانا۔ تم اس کی دشمن ہو۔ اسے بھی سزائے موت دلانے کے لیے جاسوسہ بنا کر ہمارے محل میں بھیجا تھا۔ وہ معصوم لڑکی آئندہ تمہارے جیسے ماں باپ کی آلۂ کار بننے کے لیے نہیں جائے گی۔"

مراد اور ہم زاد محل میں آ گئے۔ وہاں ماسٹر گوبو نے مراد کو فون پر مخاطب کیا اور پوچھا۔ "مراد! تم مجرموں کا چیلنج ٹی وی کے ذریعے سن رہے ہو، اخبارات میں پڑھ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ ساری باتیں میرے علم میں ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے باتیں کرنے والا تھا لیکن آپ ریاست کے حوالے سے میری مصروفیات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کو اپنے اس بیٹے سے کتنی محبت ہے۔ آپ حساب لگا رہے ہوں گے کہ دنیا کے بدترین خطرناک مجرموں کا اتحاد مجھ تنہا شخص کو کچل کر رکھ دے گا اور آپ میری سلامتی کی تدبیریں بھی سوچ رہے ہوں گے۔"

"بیٹے، میری سوچ گھوم پھر کر یہی ہے کہ تم صرف میرے پاس آ کر محفوظ رہ سکتے ہو اور یہ بھی سمجھ رہا ہوں کہ میرے پاس آؤ گے تو مجرموں کی اتحادی فوج گوریلا جنگ لڑتی ہوئی ریاست پر قبضہ جما لے گی۔ سپر پاور اور دوسرے

بڑے ممالک بھی اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ سچ پوچھو تو میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

اس نے کہا۔ "میری عقل کہتی ہے کہ میں سانپوں کو ڈسنے سے پہلے کچل دوں۔ اس مقصد کے لیے معلوم کرنا ہوگا کہ سانپوں نے چھپنے کے لیے کہاں کہاں اپنے بل بنا رکھے ہیں۔ کیا آپ کے جاسوس اور شوٹرز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ میری طرف آنے والے دشمن کس ملک میں اور کن علاقوں میں رہتے ہیں؟ اور ان کی پشت پناہی کرنے والے مافیا گروپ اور کرمنل تنظیمیں کتنی ہیں اور کن ممالک سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"یہ تو تم جانتے ہو کہ ریڈ الرٹ سسلی میں ہے۔ دوسری انڈر ورلڈ مافیا لندن، پیرس، ڈنمارک، استنبول، ممبئی اور دہلی میں ہیں۔ میں آج اپنے تمام سراغ رسانوں اور شوٹرز کو ان ملکوں کی طرف روانہ کروں گا۔ اگلے چند دنوں میں ان کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

پھر اس نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم پاکستان کا دورہ منسوخ کر دو۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرو کہ انجانے خطرات تمہارے منتظر ہیں۔ سب ہی دشمن تمہاری تاک میں ہوں گے۔"

"آپ اکثر یہ دیکھتے آئے ہیں کہ جہاں خطرات ہوتے ہیں، وہاں ضرور جاتا ہوں۔ اس لیے کہ وہیں دشمن ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر حملے کرتے ہیں اور کبھی بے نقاب ہو کر حرام موت مارے جاتے ہیں۔ میں پاکستان جاؤں گا تو مجھے دشمنوں کے طریقۂ کار اور ان کے خفیہ ذرائع اور اختیارات کا اندازہ ہوگا۔ خطرات مول لے کر دشمنوں کی کمر توڑی جاتی ہے۔ میں پاکستان جاؤں یا کہیں بھی جاؤں۔ جانا تو ہے ہی۔ میں محل میں چھپ کر زندگی نہیں گزاروں گا۔ بے شک خطرات مول لینے سے جان کا خطرہ رہتا ہے لیکن میری زندگی ابتدا سے اسی طور گزر رہی ہے۔ کبھی موت مجھے دیکھ لیتی ہے۔ کبھی موت سے چھپ کر سلامتی سے نکل آتا ہوں۔ مقدر نے موت سے آنکھ مچولی کا کھیل لکھ دیا ہے۔ مجھے کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ آپ میرے لیے دشمنوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔"

اس نے فون بند کیا۔ ہم زاد تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر بولا۔ "ہماری توقع کے خلاف کچھ نہ کچھ ہوتا آ رہا ہے۔ پتا نہیں کیسے کیا ہوا ہے۔ جیسیکا چل بسی ہے۔ شی از نو مور......"

مراد نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ "اس کی موت اچانک کیسے ہو گئی؟"

"سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اسے دو خواب آور گولیاں کھلا کر سلا دیا تھا۔ ابھی جا کر دیکھا تو وہ مر چکی ہے۔"

اسے فوراً ہی اسپتال پہنچایا گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتایا کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ اگر اس کی پچھلی میڈیکل ہسٹری معلوم ہو جائے تو کہا جا سکے گا کہ اچانک حرکتِ قلب کیوں بند ہو گئی تھی۔ وہ معصوم اور ابنارمل لڑکی وصال کی ایک ہی رات گزارنے کے لیے دنیا میں آئی تھی۔ اس کے والدین کو بلا کر میڈیکل رپورٹ دکھائی گئی۔ ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر کہا۔ "میری بیٹی کا صرف دماغ ہی نہیں دل بھی کمزور تھا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "ہم نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ گاڈ ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

جب وہ اپنے ملک سے آنے والے طیارے میں گئے تو بیٹی کی لاش بھی لے گئے۔ ہم زاد نے پہلی بار اسے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ وہ کبھی کسی کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ پہلی بار اس کے لیے صدمہ اٹھا رہا تھا۔ وہ جیسے آتے ہی چلی گئی تھی۔ عجیب لڑکی تھی۔ دنیا میں رہ کر دنیا کو بھول جاتی تھی۔ اب وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکے گی۔

☆☆☆

ماسٹر کو بو نے رات کے دس بجے کال کی۔ مراد سے کہا۔ "یہ معلوم ہوا ہے کہ تمہاری ریاست سے آنے والے دس مجرموں کو ٹین ڈیولس (دس شیطان) کہا جاتا ہے۔ ریڈ الرٹ کے سربراہ جیکی براؤن نے ان ٹین ڈیولس کو پناہ دی ہے۔ وہ دس شیطان مختلف ملکوں میں بیٹھے پلاننگ کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ جیکی براؤن کے خاص آدمی کس ملک میں کس حیثیت سے رہتے ہیں؟"

"وہ بڑے بڑے بزنس مین اور سرمایہ داروں کو ٹریپ کر کے ان کے دفتروں میں، فیکٹریوں اور کئی پروجیکٹس میں ملازم بن کر رہتے ہیں۔ جب تک وہ واردات کرتے ہوئے پکڑے نہیں جاتے، تب تک ان کی اصلیت سامنے نہیں آتی۔ میرے جاسوس بھرپور کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ انہیں پہچانیں گے۔ پھر تمہیں ان کے پتے ٹھکانے تک پہنچا سکیں گے۔"

مراد نے کہا۔ "انہیں پہچاننے تک، ان کی خفیہ پناہ گاہوں میں پہنچنے تک نہ جانے کتنی مدت لگے گی۔ مجھے جیکی

براؤن کے پرسنل معاملات کا کچھ علم ہوگا تو میں اس کی کسی کمزوری سے کھیل سکوں گا۔ پہلے اسے قابو میں کرنا ہوگا۔"

اس نے ذرا سوچ کر کہا۔ "معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی امید سے ہے۔ جیکی پہلی بار باپ بننے والا ہے۔ وہ بیوی پہلے اس کی داشتہ تھی۔ جیکی اس کا دیوانہ تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے باپ نے اجازت نہیں دی تھی۔ جب اس کا باپ تمہاری گولی سے مارا گیا تو جیکی نے خودمختار ہوتے ہی اس داشتہ سے شادی کر لی۔ میں اس حسینہ کا نام بھول رہا ہوں۔ جیکی اسے پیار سے ہنی کہتا ہے اگرچہ وہ بدترین مجرم ہے لیکن ہنی کا اب بھی عاشق ہے۔ جس دن میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس دن تسلی میں خوب جشن منایا گیا تھا۔ وہ ہنی کو بازوؤں میں اٹھا کر محل سے باہر لوگوں کے سامنے آیا تھا اور مراد...... ! یہ اس کے الفاظ ہیں۔ اس نے لوگوں کے سامنے کہا تھا کہ مراد نے میرے چچا، بھائی اور باپ کو مار ڈالا۔ موت مارتی ہے لیکن ہم پھر اپنا وارث اور جاں نشین پیدا کر لیتے ہیں لیکن مراد اپنی کوئی اولاد پیدا کرنے سے پہلے ہی حرام موت مارا جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "اس کے باپ اور بھائی بھی ایسی ہی لن ترانی کیا کرتے تھے۔ خدا کو جب منظور ہوگا، تب ہی میری سانسیں تمام ہوں گی۔ بہرحال جیکی تو اپنی ہنی کا اور دیوانہ ہو گیا ہوگا؟"

"ہاں، ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ ہنی کو زچگی کے مرحلے تک کسی پرفضا مقام میں رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے سوئٹزرلینڈ میں ایک کاٹیج لیا گیا ہے۔ اس کاٹیج کے اطراف پچیس مسلح گارڈز رہتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے جدید الیکٹرونک آلات نصب کیے گئے ہیں۔ یہ تمام انتظامات اس نے تمہارے خوف سے کیے ہیں۔ یوں تو اس کے کئی دشمن ہوں گے لیکن تم زبردست ہو۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ بیٹا پیدا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے جاں نشین پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔"

"ماسٹر! آپ جانتے ہیں کہ ایک طویل عرصے سے نہ میں نے اس کی طرف رخ کیا ہے، نہ اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں ایک ریاست کا حکمران بن گیا ہوں۔ اس کی سطح سے بہت اوپر ہو گیا ہوں لیکن اب......؟ اب وہ دس شیطانوں کو پناہ دے کر اپنی شامت کو بلا رہا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ میں ان شیطانوں سے نمٹنے سے پہلے اس پر چڑھ دوڑوں گا۔ اسی لیے وہ اپنی ہنی اور اپنے ہونے والے جاں نشین کے لیے سخت حفاظتی انتظامات کر رہا ہے۔"

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا خیال ہے، تم ریاست کی بھاری ذمے داریاں چھوڑ کر اس پر حملہ کرنے نہیں جاؤ گے۔"

"جاؤں گا۔ ریاست کی ذمے داریاں بلا سنبھالے گا۔ پاکستان کے دورے پر میرا ہم شکل جائے گا۔ مجھے جیکی براؤن کی بہت بڑی کمزوری سے کھیلنے کے لیے جانا ہی ہوگا۔ اس کی کمر ٹوٹے گی تو دوسرے بڑے مجرم بھی ٹوٹتے چلے جائیں گے۔"

"میں تمہاری ضدی طبیعت کو خوب سمجھتا ہوں۔ ہنی کو زیورخ میں جھیل کے قریب ایک بہت خوبصورت کاٹیج میں رکھا گیا ہے۔ میں اس کاٹیج کے قریب ہی تمہاری رہائش کے انتظامات کروں گا۔ وہاں تمہاری خدمات کے لیے جتنے ملازم ہوں گے، وہ سب تجربہ کار شوٹر ہوں گے۔ تمہاری ضرورت کے مطابق اسلحہ پہنچتا رہے گا۔ زیورخ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ تمہیں منہ مانگی کرنسی ملتی رہے گی۔"

"شکریہ ماسٹر! ایسی سہولتیں حاصل ہوتی رہیں گی تو میں جیکی براؤن کے ہوش اڑا دوں گا۔"

"میرا ایک مشورہ مان لو۔ وہاں جانے سے پہلے جیکی سے رابطہ کرو اور اسے دھمکیاں دو۔ وہ ہر حال میں اپنے جاں نشین کی سلامتی چاہے گا۔ تمہاری دھمکیوں سے لرز جائے گا۔ اسے یاد ہے کہ اب سے پہلے تم نے جب بھی اس خاندان کے افراد کو چیلنج کیا تھا، انہیں بعد میں گولی مار دی تھی۔ اب وہ اپنے ہونے والے بیٹے کے بارے میں بھی سہم جائے گا۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ تم اس بچے کو زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

"آپ کا مشورہ مناسب ہے۔ اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ گھر بیٹھے دھمکیوں سے کام نکل جائے گا۔ میں ابھی اس سے بات کروں گا۔"

اس نے جیکی براؤن کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کے پرسنل سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرانی سے بول رہا تھا۔ "یہ...... یہ تو ریاست کے حکمران مراد علی منگی کا فون نمبر ہے۔ آ...... آپ...... جناب کون ہیں؟"

"میں مراد علی منگی ہوں۔ جیکی براؤن سے بات کراؤ۔"

"پلیز...... ہولڈ آن۔ ابھی بات کراتا ہوں۔"

وہ پی اے دوڑتا ہوا جیکی براؤن کے پاس آیا۔ ہانپتا ہوا بولا۔ "سر! یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہ مراد علی منگی کی کال ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

جیکی نے پوچھا۔ ''کیا فون نمبر اسی کا ہے؟''

''جی ہاں۔ اسی کا نمبر ہے اور اسی کی آواز ہے۔''

وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ''او گاڈ! ہیلپ می۔ یہ جان کا دشمن پھر عذاب بننے والا ہے۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر پی اے سے فون لیا۔ پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو، میں جیکی براؤن بول رہا ہوں۔''

''اور میں ریاستِ ارضِ اسلام کا حکمران مراد علی منگی ہوں۔''

''میں کسی حکمران کو نہیں جانتا۔ تمہیں یور ہائی نس نہیں کہوں گا۔ ایک مجرم کو مجرم اور قاتل کو قاتل ہی کہوں گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اپنے خاندان میں میری گولیاں چلنے کا حساب یاد رکھو اور آنے والے دنوں کے لیے یہ طے کرو۔ کیا مجھ سے سمجھوتا کرو گے یا اپنی کسی گولی پر تمہارے آنے والے جانشین کا نام لکھ دوں؟''

وہ اپنے بچے کی موت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ بچے پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔ وہ یکبارگی غصے سے بھڑک کر بولا۔ ''یو شٹ اپ۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔''

''یہی بات تمہارے باپ، بھائی اور چچا برسوں سے بولتے بولتے میرے ہاتھوں مارے گئے۔ یاد کرو، ان میں سے ہر ایک مرنے سے پہلے میرے خلاف کس قدر اچھلتا رہا اور وہ میرے ہی ہاتھوں اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچتا رہا۔ اور اب...... اب تمہاری نسل کو آگے بڑھانے والا پہلا جانشین آرہا ہے۔ تم جتنے پیدا کرو گے اس سے زیادہ گولیاں میرے ریوالور میں ہیں۔ سوچ لو...... گزرے ہوئے دنوں پر ایک نظر ڈالو اور تسلیم کرو کہ مجھ سے دشمنی نہ کرتے، میرے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز نہ لگاتے تو آج تمہارے خاندان کے تمام اہم افراد زندہ رہتے۔''

وہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا، مراد نے کہا۔ ''جرائم کی دنیا میں تمہاری تنظیم ریڈ الرٹ سب سے ٹاپ پر ہے۔ درجنوں کرمنل سنڈیکیٹس تمہارے اتحادی ہیں۔ طاقت کے غرور میں رہو گے تو ایک بچے کے پیدا ہونے سے پہلے اس کی موت دیکھو گے۔ میں تم سے پیدا ہونے والی اولاد کو ماں کے پیٹ میں یا اس کی گود میں ختم کر دوں گا۔ یا تو نادانی سے پھر ایک بار میرا چیلنج قبول کرو یا پھر دانائی سے سمجھوتا کرو کہ ہم ایک دوسرے کی سلامتی چاہیں گے اور دشمنی بھول جائیں گے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں تھک گیا ہوں۔ جب بھی میرے خاندان کا کوئی فرد تمہارے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو میرے غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ میری طاقت نہ تمہیں کچل سکی نہ جھکا سکی۔ آئندہ بھی یہی ہوگا تو میں اپنے جانشین کی زندگی ہار جاؤں گا۔ میری عقل کہتی ہے کہ بچے کی سیکیورٹی میں لاکھوں ڈالرز خرچ کرتے رہنے سے بہتر ہے، تم سے سمجھوتا کر لیا جائے۔''

''ایسی ہی دانشمندی سے سوچو گے اور عمل کرو گے تو میں تمہارے ہونے والے بچوں کی سلامتی کی ضمانت بن جاؤں گا۔''

وہ اچانک دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''یور ہائی نس! میں آپ کو ریاست کا حکمران تسلیم کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں آئندہ میرے ہونے والے بچوں کی سلامتی کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں دو شرائط پر تم سے سمجھوتا کروں گا۔ ایک تو یہ کہ پہلی فرصت میں ان دس شیطانوں کو گولیوں سے اڑا دو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجرموں کو میری ریاست کے خلاف متحد نہ ہونے دو۔''

''آپ کی دونوں شرائط نہایت آسان ہیں۔ آپ چوبیس گھنٹوں کے اندر سنیں گے کہ وہ دس شیطان جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔ ان کے بعد مجرموں کا اتحاد خود ہی کمزور ہو جائے گا۔''

''میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد زیورخ کے اس کاٹیج سے میرے شوٹرز محاصرہ ختم کر دیں گے جہاں تمہاری ہنی ایک جانشین کو جنم دینے والی ہے۔''

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں کہ میری ہنی اس کاٹیج میں ہے۔''

''میری معلومات کے ذرائع تم سے زیادہ ہیں۔ میں نے اس کاٹیج کے اطراف ایسے جال بچھائے ہیں کہ چوبیس گھنٹے کے بعد ہنی کو کوئی ڈاکٹر اٹینڈ کرنے اس کاٹیج میں نہیں جا سکے گا، جانے والا کاٹیج سے دور ہی مارا جائے گا۔ تمہاری سیکیورٹی کے انتظامات صرف کاٹیج کی حد تک ہیں، وہاں سے باہر ہنی ایئرپورٹ تک نہیں جا سکے گی۔ تم اسے خشکی کے راستے بھی کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کر سکو گے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ تم میری آنکھ مچولی کا خطرناک کھیل برسوں سے دیکھتے آرہے ہو۔ مجھے یقین ہے۔ اب دیکھنے کی جرأت نہیں

کرو گے۔''

''درست کہتے ہو۔ میں چوبیس گھنٹے کے اندر تمہاری شرائط پوری کروں گا۔ پھر تو دشمنی نہیں کرو گے؟''

''یہ سب جانتے ہیں۔ مراد علی منگی زبان کا دھنی ہے۔ یہ یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے وسیلے سے تمہاری آئندہ نسلوں کو سلامتی دی ہے۔''

اس نے پھر کوئی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر ماسٹر کو بوبو سے رابطہ کر کے بولا۔ ''تھینکس ماسٹر! میں نے آپ کے بہترین مشورے پر عمل کیا ہے۔ جیکی براؤن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ ان دس شیطانوں کو کل تک جہنم میں پہنچا دے گا۔ مجرموں کو میرے خلاف متحد ہونے نہیں دے گا۔ آئندہ بھی اپنی اولاد کی سلامتی کی خاطر مجھ سے دشمنی نہیں کرے گا۔''

ماسٹر نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب تمہیں سوئٹزر لینڈ جانا نہیں پڑے گا جنگل میں بیٹھے رہو گے اور جیکی تمہارے تمام دشمنوں سے نمٹتا رہے گا۔ دیکھو بیٹے! چولہا جلایا نہ ہانڈی چڑھائی اور ڈش تیار ہو گئی۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔

☆☆☆

جینی جوزف اسپتال میں تھی۔ اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ مل رہا تھا۔ اس ملک کے نامی گرامی ڈاکٹر اور سرجن اسے اٹینڈ کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ریاست کی طرف پرواز کرنے والے تھے۔ ایک خاص طیارہ اس کے لیے رن وے پر کھڑا تھا۔ اس طیارے میں ایک اسپتال اور آپریشن تھیٹر قائم کیا گیا تھا۔ تمام جدید آلات وہاں پہنچائے گئے تھے۔ جینی کے لیے آرام دہ بیڈ اور ایک زچہ کی ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔

وہ جہاز صبح دس بجے پرواز کرنے والا تھا۔ جینی تکلیف میں مبتلا تھی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق بچہ غیر معمولی جسامت رکھتا تھا اور بہت وزنی تھا۔ وہ بچے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ بیٹھی رہتی تھی یا لیٹی رہتی تھی۔ تمام ڈاکٹر اس بچے کے غیر معمولی ہونے پر حیران تھے۔ یہ طے تھا کہ میجر آپریشن کے ذریعے اسے نکالا جائے گا۔ ایک اندازے کے مطابق اب سے آٹھویں دن زچگی ہونے والی تھی۔ ایسی حالت میں زچہ کو سفر کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن جینی تکلیف میں مبتلا رہنے کے باوجود ضد کر رہی تھی کہ اپنے نادیدہ یار کے پاس جا کر بچے کو جنم دے گی۔

اس ملک کے اکابرین نے مراد سے وعدہ کیا تھا کہ اسے بہت آرام سے اور سہولت سے ریاست میں پہنچایا جائے گا۔ ان اکابرین نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ جینی کی ضد پوری کی جائے۔ وہ جیسی بھی حالت میں ہے، اسے وہاں سے لے جائیں۔ سفر کے دوران زچگی کا کیس بگڑے گا تو ان پر ذمے داری عائد نہیں ہوگی۔

اسے اسپتال سے نکال کر بڑے آرام سے جہاز کے اندر بیڈ پر پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنے نادیدہ یار کے پاس پہنچنے کے لیے ناقابلِ برداشت تکلیف کو برداشت کر رہی تھی۔ جب جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہوا تو تکلیف اور بڑھ گئی۔ وہ کراہنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر اسے اٹینڈ کر رہی تھی۔ وہ بیٹھنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ لیٹی ہی رہتی تھی۔

اس وقت وہ زمین اور آسمان کے درمیان تھی۔ حوصلہ ہار رہی تھی۔ جہاز کے اندرونی ماحول کو دھند لائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ہم زاد کو پکار رہا تھا۔ ''کہاں ہو میرے تنہائیوں کے ساتھی؟ آجاؤ۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارے پاس پہنچنے تک جی نہیں سکوں گی۔ تم غائب ہو کر کہیں بھی آجاتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے کوئی کرشمہ دکھا دو۔ آجاؤ۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ جنم لینے والا ہے میں دعا مانگ رہی ہوں کہ تمہاری طرح نادیدہ نہ ہو۔ میں اس کی صورت میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہیں۔ وہ نادیدہ نہیں ہوگا۔ میں اسے دیکھ کر جیسے تمہیں دیکھتی رہوں گی۔ وہ بالکل تمہارے جیسا ہوگا۔''

وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگی۔ پھر زور زور سے بولنے لگی۔ ''آجاؤ۔ میں نہیں بچوں گی۔ صرف ایک بار نادیدہ ہو کر آجاؤ۔''

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ جسے بلا رہی.... ہو، ہم اسی کے پاس تمہیں لے جا رہے ہیں۔ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تمہاری تکلیف کم سے کم ہوتی رہے۔''

جہاز جہاں سے چلا تھا، وہاں موسم پرواز کے لیے موافق تھا لیکن آٹھ سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اچانک ہوا کے دباؤ میں کمی ہوئی تو جہاز نے بمپنگ کی۔ یکلخت ایک جھٹکے سے ہزار فٹ نیچے آیا تو جینی تکلیف کی شدت سے چیخ پڑی۔

اگرچہ جہاز کی پرواز پھر نارمل ہو گئی تھی لیکن حاملہ کے بدن کو شدید جھٹکا پہنچا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیخ کر اپنے سینئر کو آواز دی۔ ''ڈاکٹر! ڈیلیوری ابھی ہوگی۔''

جینی درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔ دوسروں نے

اسے پکڑ رکھا تھا۔ یہ سب اتنی جلدی توقع کے خلاف ہو رہا تھا کہ سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔ جینی چیخیں مار رہی تھی۔ آسمان نامہرباں ہو گیا تھا۔ موسم کے تیور بگڑ گئے تھے۔ جہاز نے پھر ایک بار جمپنگ کی۔ وہ کئی سو فٹ نیچے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے آخری چیخ نکلی۔ بچہ بدن کی دیوار کو توڑتا پھوڑتا ہوا باہر آیا تو اسی لمحے میں ماں کا دم نکل گیا۔

جہاز کی محدود فضا میں خاموشی چھا گئی۔ اجل کو آرام آ گیا۔ جہاز کی پرواز نارمل ہو گئی۔ بچہ پیدا ہوتے ہی ایک نرس کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ وہ اتنا وزنی تھا کہ نرس نے اسے فوراً بیڈ پر ڈال دیا۔ ان ڈاکٹروں اور نرسوں نے ایسا لحیم شحیم بچہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ ایک طرف پڑا بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے خلا میں تک رہا تھا۔ عام بچوں کی طرح نہیں رو رہا تھا۔ دو نرسوں نے اسے اٹھا کر واش روم میں لے جا کر صاف ستھرا کیا۔

''عجیب بچہ ہے۔ ماں کو چھلنی کر کے نکلا ہے۔''

وہ اسے واش روم سے لے آئیں۔ وہاں جینی کی لاش پر سے آلودگیاں صاف کر کے اسے بڑی سی چادر میں لپیٹا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے نوزائدہ کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ''او مائی گاڈ......! وہ دیکھو بچہ حرکت کر رہا ہے۔''

سب اسے دیکھنے لگے۔ عام طور پر بچے پیدا ہونے کے بعد ساکت پڑے رہتے ہیں لیکن وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اسے کھول رہا تھا۔ ایسا کبھی کسی نوزائدہ بچے نے نہیں کیا۔ اس نے کئی بار ایسا کیا۔ پھر اس نے دائیں طرف کروٹ لی۔ وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ بچے پیدا ہوتے ہی کبھی از خود کروٹ نہیں لیتے۔ وہ پھر سیدھا ہو کر بائیں طرف کروٹ لے رہا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ یہ ایک عجوبہ ہے۔ اسے بھوک لگی ہو گی۔ اسے ذرا سا شہد کھلاؤ۔''

نوزائدہ بچوں کو پہلے شہد چٹایا جاتا ہے۔ ایک نرس نے اپنی انگلی شہد میں ڈبو کر اس کے منہ میں رکھی۔ پھر ہلکی سی چیخ مار کر انگلی باہر کھینچ لی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ بولی۔ ''اس کے مسوڑھے ایسے سخت ہیں جیسے دانت نکل آئے ہوں۔ اگر میں انگلی باہر نہ نکالتی تو یہ چبا جاتا۔''

سینئر ڈاکٹر نے ایک ٹارچ روشن کر کے بچے کے منہ کو کھولا۔ ایک انگلی سے مسوڑھوں کو دبا کر دیکھا پھر کہا۔ ''او گاڈ! اس کے مسوڑھے ایسے سخت ہیں جیسے دانت نکلنے والے ہوں۔''

وہ موبائل فون کے کیمرے سے اس کی تصویریں لینے لگے۔ ایک جونیئر ڈاکٹر کو حکم دیا گیا کہ بچے کی تمام غیر معمولی باتوں کو اور حرکتوں کو ایک ڈائری میں نوٹ کیا جائے اور اس کی مووی تصویریں اتاری جاتی رہیں۔ اس کا مٹھی بند کرنا اور کھولنا پھر کروٹیں لینا پھر لیٹے ہی لیٹے سر گھما کر سب کو دیکھنا۔ یہ سب غیر معمولی حرکتیں تھیں اس کی ایسی حرکتوں کی متحرک فلم تیار ہو رہی تھی۔

پھر اس نے منہ سے آں آں کی آوازیں نکالیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اسے ابھی تک ماں کی گود کی گرمی نہیں ملی ہے۔ روزی! اسے گود میں لو۔''

نرس روزی نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''یہ بہت بھاری ہے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اسے اٹھایا تھا۔ سچ کہتی ہوں یوں لگا تھا جیسے بھاری پتھر اٹھا لیا ہو۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''تھوڑی دیر کے لیے سینے سے لگاؤ۔ ہم اس عجوبے کا ری ایکشن دیکھنا چاہتے ہیں۔''

روزی نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہ بچہ اس کے سینے پر ہاتھ مارنے لگا۔ دوسری نرس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ کچھ کہہ رہا ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''شاید دودھ مانگ رہا ہے اس کا فیڈر تیار کرو۔''

حکم کی تعمیل کی گئی۔ فیڈر تیار ہو گیا۔ اسے بیڈ پر لٹا کر فیڈر کی نپل کو اس کے منہ میں ڈالا گیا۔ اس کی متحرک فلم تیار ہو رہی تھی۔ پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ بچے نے فیڈر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی حرکتوں سے حیران کرتا جا رہا تھا۔ پھر ایک منظر دیکھنے میں آیا۔ بچے کو نپل کے ذریعے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے مسوڑھوں سے دبا کر کھینچا تو نپل فیڈر سے الگ ہو گئی۔ دودھ اس پر گرنے لگا لیکن اس نے فیڈر کو منہ سے لگا لیا۔ نپل کے بغیر غٹا غٹ پینے لگا۔

سب ہی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ گم صم سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک بچہ اتنا سمجھدار نہیں ہوتا کہ فیڈر کو اپنے ہاتھوں سے تھام لے۔ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ نپل سے تھوڑا تھوڑا دودھ مل رہا ہے۔ وہ نپل کے بغیر پیے گا تو گھونٹ بھر بھر کر پیے گا۔

جب فیڈر خالی ہو گیا، تب بھی اسے منہ سے لگائے رکھا اور اوں اوں کی آوازیں نکالتا رہا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ اور مانگ رہا ہے۔ اس بار گلاس میں دودھ لاؤ اور اسے گود میں بٹھا کر پلاؤ۔ اس کی خوراک عام بچوں سے زیادہ ہے!''

ایک نرس گلاس بھر کر دودھ لے آئی۔ دوسری نرس نے اسے گود میں بٹھایا۔ پھر گلاس کو اس کے ہونٹوں سے لگایا گیا۔ وہ لپک لپک کر پینے لگا۔ ایک ڈاکٹر اس کی ڈائری لکھ رہا تھا۔ ایک اسٹیوارڈ اس کی مووی اتار رہا تھا۔ گلاس خالی ہوا تو بچہ پھر اوں اوں کہنے لگا۔ وہ اور دودھ مانگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''مائی گاڈ! اس کی خوراک حیرت انگیز ہے۔ بڑی عمر کے بچوں سے بھی زیادہ ہے۔''

بہرحال وہ دوسرا گلاس پینے کے بعد مطمئن ہو گیا۔ وہ لوگ پانچ گھنٹے کے سفر میں بڑے ناقابلِ یقین اور دلچسپ تماشے دیکھتے رہے۔ انہوں نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے ریاست کے حکمران کو جینی کی موت کی اطلاع دی اور کہا کہ بچہ خیریت سے ہے اور وہ بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ ذہین اور متحرک ہے۔ ایک جگہ ساکت نہیں رہتا ہے۔ کروٹیں بدلتا رہتا ہے یا ہاتھ پاؤں ہلاتا رہتا ہے۔

ہم زاد ائرپورٹ آیا تھا۔ جینی کی تدفین کے انتظامات کر چکا تھا۔ پہلے ایک ڈاکٹر بچے کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے جہاز سے باہر آیا۔ اسے ہم زاد کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا۔ ''یور ہائی نس! یہ ایک جن کی اولاد ہے۔ بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے لیکن بے چاری جینی جوزف کی موت کا افسوس کر رہا ہوں۔''

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہم توقع کر رہے تھے کہ ایک ہفتے بعد ڈیلیوری ہوگی لیکن راستے میں موسم خراب ہو گیا تھا۔ جہاز کے بمپنگ کرنے کے باعث شدید جھٹکا پہنچا تھا۔ ہم بیان نہیں کر سکتے کہ بچہ کس طرح زبردستی باہر آیا ہے۔ ماں وہ تکلیف برداشت نہ کر سکی تھی۔ اسی وقت اس کا دم نکل گیا تھا۔''

ہم زاد نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر کہا۔ ''اللہ تعالیٰ جینی کو ان تکالیف کے عوض جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ یہ بچہ کچھ زیادہ ہی وزنی لگ رہا ہے اور دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے یہ چھ ماہ کا ہو۔''

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ محل میں چلیں۔ ہم اس کی ویڈیو فلم دکھائیں گے۔ آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔''

ایک ڈاکٹر دور کھڑا فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ''یور ہائی نس! میں یہودی ہوں۔ ابھی ہمارے ربی نے کہا ہے کہ جینی جوزف ہمارے دینی مقاصد کے لیے بھاری عطیات دیا کرتی تھیں۔ اس کی تدفین ہمارے قبرستان میں ہونی چاہیے۔ کیا ہم اس کی میت لے جا سکتے ہیں؟''

ہم زاد نے کہا۔ ''یہاں نہ یہودیوں کی عبادت گاہ ہے، نہ قبرستان ہے۔ آپ لے جا سکتے ہیں۔''

اس نے جہاز کے اندر آ کر جینی کا آخری دیدار کیا۔ وہ یورپ کی ٹاپ ماڈل تھی۔ اس کا حسن بے مثال تھا لیکن موت نے اسے مرجھا دیا تھا۔ ویسے پھول مرجھا کر بھی پھول رہتا ہے۔ وہ اسے بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''تم نے مجھے ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ تم میرے بیٹے کی صورت میں زندہ رہو گی۔''

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر جہاز سے باہر آ گیا۔ ایک سینئر ڈاکٹر اس کے ساتھ محل میں آیا۔ وہاں ہم زاد کے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر بولا۔ ''تمام دنیا میں اس بات کا چرچا ہے کہ ایک ریاست کے دو حکمران ہیں اور دونوں ہم شکل ہیں۔ آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے بچے کی جو ویڈیو فلم بنائی تھی، اسے کمپیوٹر میں ٹرانسفر کیا پھر اسے اسکرین پر دکھایا۔ مراد اور ہم زاد حیرانی سے دیکھنے لگے۔ وہ نوزائدہ بچہ مٹھیاں بند کر رہا تھا اور کھول رہا تھا اور کروٹیں بدل رہا تھا۔ مراد اور ہم زاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ فیڈر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رہا تھا۔ اس کی نپل کو مسوڑھوں سے دبا کر اسے فیڈر سے الگ کر کے گھونٹ بھر بھر کر پی رہا تھا۔ پھر یہ کہ اس نے فیڈر کے علاوہ دو گلاس بھر کے دودھ پیا تھا۔

ایسے وقت محل کی ایک کنیز نے کہا۔ ''یہ دیکھیں۔ یہ شہزادے میاں بار بار اپنی کمر کے نیچے ہاتھ مار رہے ہیں۔''

سب نے اسے دیکھا۔ وہ بیڈ پر اوندھا ہو گیا تھا اور اپنی پشت پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''شاید یہ پوٹی کرے گا۔''

دو کنیزیں اسے اٹھا کر واش روم میں لے گئیں۔ واقعی اس نے عام بچوں کی طرح بیڈ پر پوٹی نہیں کی تھی۔ نہ خود کو ناپاک کیا تھا۔ ٹوائلٹ میں جا کر فارغ ہوا تھا۔

مراد نے اسے اٹھا کر چوم کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایمان والا ہے۔ اپنی پیدائش کے پہلے دن سے پاک رہنے لگا ہے۔ ہم پوری توجہ سے اس کی پرورش کرتے رہیں گے۔''

ڈاکٹروں کی آنے والی ٹیم جینی کی میت لے کر وہاں سے چلی گئی۔ مراد نے ہم زاد سے کہا۔ ''میرے رب نے چاہا تو یہ بچہ دین دار عبادت گزار ہوگا۔ اس کا نام عابد علی منگی

رکھا جائے۔ اس کی نگرانی اور پرورش کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دو۔ اس ٹیم میں عالم دین، ماہر نفسیات اور ماہر تعلیم ہوں گے۔ تم بھی زیادہ سے زیادہ وقت عابد علی کو دیتے رہو گے۔ میں بھی توجہ دیتا رہوں گا۔ یہ بچہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔"

ہم زاد نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں ہی مختلف معاملات میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ آج سے تیسرے دن مجھے پاکستان کے دورے پر جانا ہے۔"

"تم نہیں جاؤ گے۔ عابد علی کو اہمیت دو۔ میں نے پلاننگ بدل دی ہے۔ میں پاکستان جاؤں گا۔"

عابد علی منگی اپنی پیدائش کے پہلے دن سے ثابت کر رہا تھا کہ وہ غیر معمولی ہے۔ نہ سمجھ میں آنے والا بچہ ہے۔ آگے چل کر مراد اور ہم زاد سے کہیں زیادہ اپنی شخصیت کا سکہ جمائے گا اور غیر معمولی شہرت حاصل کرے گا۔

دوپہر کو جیکی براؤن نے فون کے ذریعے مراد سے کہا۔ "میں یور ہائی نس کی شرط پوری کر رہا ہوں۔ وہ دس شیطان مختلف ملکوں میں تھے۔ میرے شوٹرز نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میں نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی ریاست سے آگے تھے۔ ان کی لاشوں کو ریاست میں بھیجا جائے۔ اس طرح آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرلیں گے کہ میں نے شرط پوری کی ہے۔ دوسری شرط کے مطابق مجرموں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے یہ بات پھیلائی ہے کہ مراد علی منگی نے ان دس شیطانوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے گوریلا جنگ لڑنے کا خواب نہ دیکھیں۔ ورنہ ان دس شیطانوں کے بعد مراد کا رخ تمہاری طرف ہوگا۔ یور ہائی نس! ان شیطانوں کی موت کے بعد مجرموں کا اتحاد کمزور پڑ گیا ہے۔ اس اتحاد میں میری اہمیت زیادہ تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اپنی آنے والی نسلوں کو داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ لہٰذا میں نے یور ہائی نس سے سمجھوتا کرلیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "تم بہت دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہو۔ میں اپنے رب کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں۔ میرے ریوالور کی گولی تمہاری اور تمہاری اولاد کی طرف نہیں آئے گی۔ میری طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔"

اس نے فون بند کر کے خود اطمینان کی سانس لی۔ آخر اس نے ایک مدت سے دردِ سر بن کر رہنے والے دشمن کا راستہ نامعلوم مدت کے لیے روک دیا تھا۔ سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے بھی اطمینان تھا۔ انہیں اچھی طرح عبرت حاصل ہوگئی تھی۔ آئندہ وہ اس سے دشمنی کرنے کی حماقت کرنے والے نہیں تھے اور یہ کہ دوسرے دن ان دس شیطانوں کی ہلاکت کا چرچا ہوا تو پھر جنات کی دہشت طاری ہوگئی۔ ان کی معلومات کے مطابق مراد ریاست میں تھا اور وہ دس ہلاک ہونے والے مختلف ممالک میں تھے۔ وہ ایک ہی دن میں وہاں جا کر انہیں ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے یہ یقین ہوگیا کہ اس کے تابعدار جنات نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ جب مراد نے ماہ نور کے ساتھ پاکستان کی سمت پرواز کی تو آسمان صاف اور روشن تھا اور زمین دشمنوں سے پاک تھی۔

☆☆☆

اس کا ذاتی طیارہ کراچی کے ائرپورٹ میں پہنچا تو اس کے استقبال کے لیے حکومت کے اکابرین آئے تھے۔ سیاسی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود گلے ملتے رہو تاکہ گلا کاٹنے میں آسانی ہو۔ وہ ان سب سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشدلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ائرپورٹ کے باہر لاکھوں افراد اس کا استقبال کرنے اور اسے دیکھنے آئے تھے۔ ان سب کو یہ فخر تھا کہ ایک پاکستانی نے ملک سے باہر جا کر ارض اسلام کے نام سے اپنی حکومت قائم کی ہے۔ وہ سب اسے دیکھتے ہی مراد علی منگی زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ان کی محبتوں اور عقیدتوں کا جواب مسکراہٹوں سے دے رہا تھا۔ اسے وہاں سے لے جانے کے لیے بلٹ پروف کار آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں کھلی گاڑی میں جاؤں گا تاکہ ہر محبت کرنے والا مجھے واضح طور پر دیکھتا رہے۔"

ایک سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "می لارڈ! اس شہر میں پہلے بھی آپ کی جان کو خطرہ تھا۔ آج بھی ہو سکتا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "پہلے مجھے قانون کے محافظ پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے خطرہ تھا۔ تم سب مجھے دیکھتے ہی گولی مارنے والے تھے اور آج تم سب مجھے سیلوٹ کر رہے ہو اور سیکیورٹی دے رہے ہو۔ پھر مجھے کون گولی مارے گا؟"

تمام پولیس افسران اور انٹیلی جنس والے کچھ شرمندہ سے ہوئے۔ ایک افسر نے کہا۔ "ہم حکم کے بندے ہیں۔ اوپر سے جو احکامات صادر ہوتے ہیں، ان پر ہمیں عمل کرنا پڑتا ہے۔"

مراد کے لیے کھلی گاڑی منگوائی گئی، وہ ائرپورٹ سے

وی آئی پی گیسٹ ہاؤس تک انہیں دیکھتا رہا اور ان کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر محبت کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے محبوب سے کہہ دیا تھا کہ پروگرام بدل گیا ہے۔ اب یہاں ہم زاد نہیں، وہ خود آ رہا ہے۔ اس نے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ کر فون پر کہا۔ ''محبوب صاحب! میں آ گیا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''ہم ایک ٹی وی چینل پر تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تمہارا شاندار استقبال کیا گیا ہے۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس شہر میں میری گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا تھا۔ وہ گرفتار کرنے والے آج مجھے سیلیوٹ کر رہے ہیں۔ مجھے اسلام آباد آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آج صوبائی حکمرانوں کی طرف سے عشائیہ ہے۔ میں کل صبح دس بجے آپ سے ملنے آؤں گا۔''

وہ فون بند کر کے دوسرے کمرے میں ماہ نور کے پاس آیا۔ اس کی والدہ ملنے آئی تھی۔ ماں بیٹی بہت خوش تھیں۔ اس کی تمام زمین جائیداد کی نگرانی کے اختیارات محبوب کے نام کر دیے گئے تھے۔ وہاں گنے کی کاشت ہوتی تھی۔ معروف تجلی ان زمینوں پر بہت بڑی شوگر مل قائم کر رہا تھا۔ ماہ نور نے پہلے بھی ماں سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ ریاست میں چل کر رہے لیکن ان زمینوں سے مرحوم شوہر اور مقتول بیٹوں کی یادیں وابستہ تھیں۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کے باقی دن وہیں گزارنا چاہتی تھی۔

شام کو پریس کانفرنس میں ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے کارندے آئے تھے۔ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ ایک مقامی رپورٹر نے سوال کیا۔ ''آپ ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان آئے ہیں۔ آپ کے تاثرات کیا ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ میں نے ریاست کا حکمران بنتے ہی ایک دن میں اسلامی نظام قائم کر دیا۔ آپ سوچیں یہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوتا رہے گا؟ مگر میں اس پر کسی طرح کی تنقید اور تبصرہ نہیں کروں گا۔''

کسی نے کہا۔ ''آپ بنیادی طور پر پاکستانی ہیں۔ آپ کو اپنے وطن کی سلامتی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''پاکستان قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ انشاء اللہ قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔ پاک وطن کو کبھی میری ضرورت ہوئی تو میری ریاست کی پوری فوج یہاں آ جائے گی۔''

سب ہی لوگ تالیاں بجانے لگے۔ مراد نے دیگر معاملات میں بھی سوالات کے جوابات دیے۔ اس کے ہر جواب پر تالیاں بجتی رہیں۔ رات کو عشائیہ میں تمام حکمران محتاط ہو کر اس سے گفتگو کرتے رہے۔ وہ پریس کانفرنس میں بڑے ہی ڈھکے چھپے انداز میں ان حکمرانوں کو کرپٹ کہتا رہا تھا۔ طے شدہ شیڈول کے مطابق دوسرے دن اسلام آباد جانا تھا لیکن اس نے کہا آج کا دن میرے فرشتہ صفت محسن محبوب علی چانڈیو کے لیے ہے۔ میں دوسرے دن اسلام آباد جاؤں گا۔

اس نے پاکستان آنے سے پہلے سیکرٹ سروس کے بارہ جاں نثاروں کو کراچی بھیج دیا تھا۔ وہ سب ہز ہائی نس مراد کے مشیر اور مختلف شعبوں کے ماہرین بن کر آئے تھے۔ وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ بظاہر تفریحی انداز میں آزادی سے گھوم پھر رہے تھے لیکن بڑی ذہانت اور مہارت سے مخالفین کو تاڑ رہے تھے۔

پولیس اور انٹیلی جنس والے پہلے ہی جھنجلائے ہوئے تھے۔ وہ مجرمانہ زندگی گزارنے کے دوران کبھی ان کی گرفت میں نہیں آیا تھا اور اب آ کر ان سے سیلیوٹ کروا رہا تھا۔ پھر یہ کہ پریس کانفرنس کے بعد حکمران اس سے تپ رہے تھے۔ اس سے کسی طرح کی شکایت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ ریاست کا حکمران نہ ہوتا تو اس سے گن گن کر بدلہ لیتے۔ اسے قتل کر دیتے یا ملک سے باہر کر دیتے۔ ابھی وہ بے بس تھے۔ وہ نادان نہیں تھا۔ یہ خوب سمجھتا تھا کہ مجبور ہو جانے والے دشمن ہی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں اور پیچھے سے سازشوں کے جال بنتے رہتے ہیں پھر پہلے سے زیادہ مستحکم ہو کر اچانک جان کو آ جاتے ہیں۔

اس کے لیے کراچی شہر پہلے کی طرح غیر محفوظ تھا۔ قانون کے رکھوالے اب بھی اسے مجرم سمجھتے تھے۔ ان کی پہلی خواہش یہی تھی کہ مراد کا شاہانہ جاہ و جلال اچانک ختم ہو جائے وہ پھر سے عام شہری بن جائے گا تو اسے مجرم ثابت کر کے گولی ماردی جائے گی۔ وہ اپنے وطن میں تھا۔ اپنے لوگوں میں تھا اور اپنے لوگوں میں کانٹے زیادہ چبھتے ہیں۔

وہ سرکاری پروٹوکول کے بغیر محبوب کی کوٹھی میں آیا۔ محبوب، سمیرا اور معروف تجلی نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ماروی اس سے پردہ کرتی تھی۔ اس نے ماہ نور کو گلے سے لگایا۔ چاچی منی اور چاچا ماروی کے ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے ماہ نور کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ ماروی اس کے ساتھ بیٹھ کر بڑی اپنایت

سے باتیں کرنے لگی۔

ماہ نور نے باتوں کے دوران میں کہا۔ ''میں بہت خوش نصیب ہوں۔ مراد نے عام بادشاہوں کی طرح محل میں حرم سرا نہیں بنایا ہے۔ عیاشی ان کی فطرت میں نہیں ہے۔ انہوں نے کوئی کنیز یا داشتہ نہیں رکھی ہے۔ محل میں چند کنیزیں صرف میری اور زیب النساء کی خدمت گزاری کے لیے رکھی گئی ہیں۔ وہ مجھ پر کبھی سوکن نہیں لائیں گے۔ میں ان پر جتنا بھی فخر کروں' کم ہے۔''

ماروی کے دل میں درد سا اٹھا۔ مراد اس پر سوکن لانے والا تھا' تب ہی اختلافات پیدا ہوئے تھے۔ نتیجے کے طور پر طلاق ہوئی اور وہ بیگم محبوب علی چانڈیو بن گئی۔

ماہ نور نے کہا۔ ''دنیا کہتی ہے کہ مراد آپ کے دیوانے تھے۔ وہ آپ کی خاطر محبوب صاحب جیسے فرشتے کے بھی دشمن بن گئے تھے۔ وقت اچھے اچھوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مراد بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ ریاست میں ایک بہت ہی حسین لڑکی آئی تھی۔ وہ آپ کی ہم شکل تھی۔ دشمنوں نے اسے دوسری ماروی بنا کر محل میں بھیجا تھا لیکن مراد اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی طرح کی دیوانگی ظاہر کی۔ اس بے چاری کا اچانک ہی ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ میں تو اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں۔ عورت وہی خوش نصیب ہوتی ہے جسے نیک سیرت شوہر نصیب ہوتا ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''درست کہتی ہو۔ میں بھی خوش نصیب ہوں۔ مجھے محبوب جیسے فرشتہ سیرت مجازی خدا نصیب ہوئے ہیں۔''

باہر عظمت شاہ ملنے آیا تھا۔ مراد کے بیٹے شہزاد کو ساتھ لایا تھا۔ مراد' محبوب اور معروف نگی نے بڑی محبت سے ڈرائنگ روم میں بلا کر بٹھایا۔ عظمت شاہ نے مراد سے کہا۔ ''سائیں! آپ نے پہلے بھی اپنے بیٹے کو کبھی محبت اور توجہ نہیں دی۔ اب تو آپ بادشاہ بن گئے ہیں۔ یہ بچہ پانچ برس کا ہو گیا ہے لیکن اس نے باپ کو نہیں دیکھا ہے۔ میں اسے آپ کی تصویریں دکھاتا رہتا ہوں۔''

شہزاد ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ مراد اس کے سامنے آ کر گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ''بیٹے! مجھے پہچانتے ہو؟''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''سائیں! آپ ریاست ارضِ اسلام کے بادشاہ سلامت ہیں۔''

''میں تمہارا کون ہوں؟''

شہزاد نے سر گھما کر اپنے نانا عظمت شاہ کو دیکھا۔ نانا نے کہا۔ ''یہ مجھ سے بولتا ہے کہ اتنا بڑا بادشاہ اس کا باپ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ صرف ماروی کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس معصوم کو اسی سے ماں کی بھرپور ممتا ملتی رہی ہے۔''

ماروی نے دروازے کے پیچھے سے آواز دی۔ ''شہزاد......!''

اس نے یکلخت چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے دو یا ڈھائی برس کی عمر میں ماروی سے ممتا ملی تھی۔ اس کی ایک آواز سنتے ہی وہ پہچان گیا۔ صوفے سے اچھل کر دوڑتا ہوا دروازے کے پیچھے آیا۔ ماروی گھٹنوں کے بل ہو گئی۔ وہ ننھا شہزاد تڑپ کر بچھڑی ہوئی ماں سے لپٹ گیا۔ ان لمحات میں وہ رو پڑی۔ اس بچے کے باپ کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ حکمران بن گیا تھا۔ ماں پیدا کرنے کے بعد مر گئی تھی۔ ماروی سے ممتا ملی تو وہ بھی بچھڑ گئی تھی۔ وہ اس دنیا میں آ کر ماں باپ کے بغیر زندگی گزار رہا تھا۔ یتیم نہ ہوتے ہوئے بھی یتیم و یسیر ہو گیا تھا۔

وہ اسے چوم رہی تھی۔ لاشعوری طور پر کھوئی ہوئی محبتوں کی بھول بھلیوں میں پہنچ گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے بول رہا تھا۔ ''ماما! میں نہیں جاؤں گا۔ آپ کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔ گوٹھ میں رہنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں شہر میں رہوں گا۔''

چاچی اور چاچا بھی اس کے پاس گوٹھ میں رہتے تھے۔ کبھی ماروی کے پاس آ جاتے تھے۔ اس بچے کی بدنصیبی تھی کہ اسے رشتوں کی محبت نہیں مل رہی تھی۔

محبوب نے وہاں آ کر ماروی سے کہا۔ ''یہاں آؤ' میری ایک بات سنو۔''

ماروی اس کے ساتھ لاؤنج کے ایک گوشے میں آئی۔ محبوب نے کہا۔ ''میری میڈیکل رپورٹ تمہیں معلوم ہے۔ میں باپ نہیں بن سکوں گا اور شادی سے پہلے ہی اس بچے سے تمہاری ممتا کی تسکین ہوتی رہی ہے۔ ہم عظمت انکل سے بات کرتے ہیں۔ تم اسے گود لے لو۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''خدا گواہ ہے۔ میری بہت بڑی کمی پوری ہو جائے گی۔ آپ جائیں بات کریں۔''

اس نے شہزاد کے پاس آ کر پھر اسے سینے سے لگا لیا۔ محبوب ڈرائنگ روم میں آ کر عظمت شاہ کے پاس بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں۔ اتنے برسوں کے بعد بھی اس نے ماروی کے پیار کو نہیں بھلایا ہے۔''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''یہ تو گوٹھ میں بھی ماروی کو یاد کرتا رہتا ہے۔ مجھ سے ضد کرتا ہے کہ اسے یہاں لاؤں۔''

محبوب نے کہا۔ ''آپ سے گزارش ہے۔ اسے

یہاں رہنے دیں۔ یہ بھی شہری زندگی گزارنا چاہتا ہے۔"

نانا نے اپنے داماد مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو بچے کی صرف پرورش کا ذمے دار ہوں۔ اس کی آگے کی زندگی کا فیصلہ سائیں بادشاہ ہی کریں گے۔"

مراد نے کہا۔ "شہزاد کو ایک عرصے تک یہاں ممتا ملتی رہی ہے آئندہ بھی ماں کی کمی پوری ہوتی رہے گی۔ میں دل و جان سے اپنے بیٹے کو محبوب صاحب کے حوالے کرتا ہوں۔"

چاچی نے آکر اس کی بلائیں لیں۔ "مراد بیٹے! جگ جگ جیو۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو اور محبوب میاں بھی جانتے ہیں۔ میری ماروی اسے کلیجے سے لگا کر رکھے گی۔ ماروی نے اس کا نام شہزاد رکھا تھا۔ تم بادشاہ بن گئے ہو تو یہ سچ مچ شہزادہ بن گیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "میری شریک حیات ماہ نور میڈیکل رپورٹ کے مطابق ماں نہیں بن سکے گی اور میں اولاد کے لیے بھی دوسری شادی نہیں کروں گا۔ شہزاد میرا جانشین ہے۔ میرے بعد یہی ریاست کا حکمران ہوگا۔ خدا اسے لمبی عمر عطا کرے۔"

سب نے کہا۔ "آمین......!"

معروف تجلی نے کہا۔ "ریاست کا جانشین ہمارے سائے میں پرورش پائے گا۔ ہم اس کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے رہیں گے۔ اسے ایک شہزادے کے شایانِ شان بنائیں گے۔"

وہ سب خوش تھے۔ مراد کو جانشین مل گیا تھا۔ ماروی کی آغوش میں پھر جونیئر مراد آگیا تھا اور شہزاد کو اب ماں باپ کی محبت اور توجہ ملنے والی تھی۔ محبوب اور معروف کے یہ عزائم تھے کہ اس بچے کو ایک شہزادے کے شایانِ شان تعلیم و تربیت دی جائے گی۔

ایسے وقت کہتے ہیں "سامان سو برس کا...... پل کی خبر نہیں۔"

☆☆☆

ایک بند کمرے میں خفیہ کانفرنس جاری تھی۔ کانفرنس میں چار ملکی اکابرین تھے اور دو غیر ملکی تھے۔ انتہائی رازداری سے باتیں ہو رہی تھیں اور منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ "ایک عیار مجرم بادشاہ سلامت بن کر سلامتی حاصل کر رہا ہے اور قانون کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ہمارے لیے چیلنج بن گیا ہے۔ ہم اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں پہنا سکتے۔ اس کے برعکس اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "اس نے روپوش رہ کر ہمارے ایک ہوم منسٹر کو قتل کیا تھا اور ہمارے ہاتھ نہیں آیا تھا۔"

تیسرے نے کہا۔ "صرف ہوم منسٹر کو ہی نہیں، عمر کوٹ سے لے کر انڈین بارڈر تک درجنوں سپاہیوں کو اور چار افسران کو ہلاک کیا تھا۔ پھر بارڈر کراس کر کے انڈیا چلا گیا تھا۔"

ایک اور نے کہا۔ "وہ زبردست پلاننگ پر عمل کرتا ہوا ایک ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ کر بھی خواب جیسا لگ رہا ہے۔ اس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔"

ایک غیر ملکی نے کہا۔ "اس کے آگے صرف آپ ہی نہیں سپر پاور بھی مجبور ہو گیا ہے۔"

"ہمیں اسی بات کو سمجھنا ہے کہ وہ سپر پاور سے بھی زیادہ سپر مین کیسے بن گیا ہے؟ اس کی طاقت، ذرائع اور اختیارات کیا ہیں؟ وہ اچانک بڑی طاقتوں پر کیسے حاوی ہو گیا ہے؟"

"یہ ایک عجیب اور ناقابلِ یقین بات ہے کہ اس نے پراسرار علوم سے جنات کو تابعدار بنایا ہے۔"

ایک نے ناگواری سے کہا۔ "یہ سراسر بکواس ہے۔ ہماری دنیا میں ہزاروں پراسرار علوم جاننے والے ہیں۔ وہ شیطانی قوتوں کے حامل ہیں۔ ایسے خطرناک لوگ اپنے اپنے ملک کے حکمران کیوں نہیں بن جاتے؟"

دوسرے غیر ملکی نے کہا۔ "پہلے ہمیں بھی یقین نہیں تھا۔ ہم جن بھوت اور جادو ٹونے پر یقین نہیں کرتے تھے۔ جب ہمارے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو فضا میں پرواز کے دوران تباہ کیا گیا۔ جب ایک ہی رات میں چند گھنٹوں میں سیکڑوں فوجی کسی دشمن سے لڑے بغیر ہلاک ہو گئے۔ لاکھوں ڈالرز کے اسلحے کے گودام تباہ ہو گئے تو یہ ماننا ہی پڑا کہ تنہا مراد ایسی تباہیاں نہیں لا سکتا تھا۔"

ایک اور غیر ملکی نے کہا۔ "ابھی ہم چھپ کر بہت محتاط رہ کر اس میٹنگ میں یہ کہنے آئے ہیں کہ سپر پاور اور کوئی اتحادی ملک مراد کے خلاف آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔ مگر ہاں، آپ اگر کامیاب ہو جائیں گے۔ مراد کو ختم کر دیں گے تو آپ کے چھ ارب روپے کے قرضے معاف کر دیے جائیں گے۔ عالمی بینک سے مزید قرضے دیے جائیں گے۔ آپ کی پانچ برس کی حکومت پکی ہے۔ اگر مراد سے نجات دلائیں گے تو اس ملک میں الیکشن نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آپ آئندہ دس برسوں تک حکومت کرتے رہیں گے۔"

بہت بڑی سیاسی سودے بازی تھی۔ معاملات طے ہو گئے ایک نے کہا۔ "آئندہ ہم خفیہ ملاقات کے لیے نہیں

آئیں گے۔ ان لمحات میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اس کے جنات اچانک یہاں آ کر ہمیں دبوچ لیں گے۔"

ایک نے کہا۔ "آپ بے خوف و خطر یہاں سے جائیں۔ کوئی جن آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آئے گا اور اگر واقعی کوئی جن ہے تو اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ آپ اس سازش میں شریک ہیں۔"

وہ دونوں غیر ملکی ان سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "کیا آپ مانتے ہیں کہ ہماری دنیا میں جنات کا وجود ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "اس پہلو سے مانتا ہوں کہ وہ کبھی نظر نہ آنے والی مخلوق سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کے سر پر سوار ہوگئی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہمارے اربوں روپے کے قرضے معاف ہوں گے اور ہم آئندہ دس برسوں تک حکومت کرتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جنات کو دعائیں دیں۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ مراد نے اپنے طور پر حفاظتی انتظامات کیے تھے۔ اس کے بارہ جاں نثار اس کے آس پاس رہتے تھے۔ ان میں سے چھ جاں نثار جب جاگتے تھے تو چھ نیند پوری کرتے تھے۔ جب مراد محبوب کی کوٹھی میں آیا تو تین جاں نثار کوٹھی کے احاطے میں گن لیے ٹہلنے لگے۔ تین اس کوٹھی کے چاروں طرف دور تک گھومنے پھرنے اور لوگوں کو تاڑنے لگے۔ باقی چھ آرام کرتے رہے۔

مراد اس کوٹھی میں ایک دن ایک رات گزار کر دوسرے دن اسلام آباد جانے والا تھا۔ واردات کرانے والے اکابرین نہ گولی چلانا چاہتے تھے، نہ ائرکنڈیشنڈ محلوں میں کرائے کے قاتلوں کو بلا کر ان سے ڈیل کرنا چاہتے تھے۔ یہ کام ان کے رازدار کارندے کر رہے تھے۔ ان کارندوں نے ایسے شوٹرز سے رابطہ کیا جو غیر ملکی ایجنٹوں کے لیے کام کرتے تھے۔ ان بدنام مجرموں میں لنگڑا جانی سرفہرست تھا۔ دو کارندوں نے محل سے دور ایک کوٹھی میں سات شوٹرز سے ملاقات کی۔ ان میں جانی اور اس کے دو ساتھی تھے۔

ایک کارندے نے کہا۔ "انتہائی سیکرٹ مشن ہے۔ ایک بہت بڑی ہستی کو قتل کرنا ہے۔ تم ساتوں اسپیشل برانچ والوں کی بلیک لسٹ میں ہو لیکن غیر ملکی آقاؤں کی مداخلت کے باعث گرفتاری سے بچتے رہتے ہو۔"

دوسرے کارندے نے کہا۔ "یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ ہمارے خفیہ مشن کے بارے میں باہر کوئی زبان کھولے گا تو اسپیشل برانچ کے جاسوس اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"جتنی رازداری سے یہ کام ہو رہا ہے، اتنی ہی رازداری سے تم مارے جاؤ گے۔ اگر ہمارا ذکر کسی سے کرو گے۔"

جانی نے کہا۔ "ہم رازدار بن کر رہتے ہیں۔ اسی لیے آپ جیسے حضرات ہم سے قتل جیسی بھیانک واردات کراتے ہیں۔ پلیز آپ ہمیں موت کی دھمکی نہ دیں۔ ہم کسی کو بھی قتل کرنے سے پہلے یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کھیل میں ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔"

ایک کارندے نے کہا۔ "جو ہمارا ٹارگٹ ہے، وہ کل صبح اسلام آباد جانے کے لیے آٹھ یا نو بجے تک اپنی کوٹھی سے نکلے گا۔ ہم نے ٹھیک اس کے سامنے والی کوٹھی خالی کرائی ہے۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان تقریباً ستر گز کا فاصلہ ہے۔ کوٹھی کی بالکونی یا چھت سے اس کا نشانہ لیا جاسکتا ہے۔"

ایک شوٹر نے کہا۔ "اپنی گن سے ٹیلی اسکوپ منسلک کی جائے گی تو وہ بہت ہی آسان ٹارگٹ ہوگا۔ میں اسے شوٹ کروں گا۔ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ وہاں جاؤں گا۔"

کارندے نے کہا۔ "جسے ٹارگٹ بنانا ہے، وہ قسمت کا دھنی ہے کئی بار ماہر شوٹرز کی گولیوں سے بچتا آرہا ہے۔ اگر کسی وجہ سے تمہارا نشانہ خطا ہوگا تو باقی تم پانچ شوٹرز ائرپورٹ تک اس کا تعاقب کرو گے۔"

جانی نے پوچھا۔ "کیا وہ ایک بار فائرنگ سے بچنے کے بعد ائرپورٹ جانے کی جرأت کرے گا؟"

"ہاں۔ وہ بہت ہی ضدی اور جنگجو ہے۔ دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر معلوم کرتا ہے کہ کون اس سے دشمنی کر رہا ہے۔ یاد رکھو اس کے نشانے پر نہ آنا۔ وہ ہلاک نہیں کرے گا۔ زخمی کرے گا پھر تمہارے ذریعے ہم تک پہنچ جائے گا۔"

جانی نے کہا۔ "یا خدا! ایسا خطرناک شخص کون ہے؟"

"کیا تم ڈر گئے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ ایسے جیالے کے ساتھ موت کا کھیل کھیلنے کا مزہ آئے گا۔ وہ ہے کون؟ اس کا نام، پتا ٹھکانا بتائیں۔"

"دنیا کے تمام مجرم اس کے نام سے اور اس کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تم لوگوں کو بھی معلوم ہوگا۔ آج وہ مجرم ایک ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔"

جانی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''مراد علی منگی......؟''

''ہاں۔ وہی مراد جو یہاں ہوم منسٹر کا مرڈر کر کے درجنوں سپاہیوں اور پولیس افسروں کو موت کے گھاٹ اتار کر فرار ہو گیا تھا۔ اب بادشاہ سلامت بن کر آیا ہے۔''

جانی نے کہا۔ ''آپ حضرات کو دشواری کیا ہے؟ اس کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا تھا۔ آپ ہمارے ملک کے قانون کے مطابق اسے گرفتار کر سکتے ہیں۔''

کارندے نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''اب تو... انٹرپول کہلانے والا بین الاقوامی ادارہ بھی ایک ریاست کے حاکم اعلیٰ کو چشم دید گواہوں کے بغیر اور ٹھوس ثبوت کے بغیر گرفتار نہیں کر سکے گا اور نہ ہی عالمی عدالت اسے سزا دے سکے گی۔''

ایک شوٹر نے کہا۔ ''وہ کوٹھی سے ائرپورٹ جائے گا تو مسلح گارڈز کی گاڑیاں اس کے آگے پیچھے ہوں گی۔ ہم میں سے کوئی اس پر گولی نہیں چلا سکے گا۔''

کارندے نے کہا۔ ''ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ کوٹھی کے ڈرائیور کو خرید لیا گیا ہے۔ وہ ائرپورٹ جانے کے راستے میں ایک پیٹرول پمپ کے پاس یہ کہہ کر گاڑی روک دے گا کہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے وقت کے لیے تم سب پلاننگ کرو۔ تم میں سے دو ساتھی دور سے حملے کرتے ہوئے دستی بم پھینکتے ہوئے فرار ہو جاؤ گے۔ تمام مسلح گارڈز میں سے کچھ تمہارا پیچھا کریں گے اور کچھ مراد کو کار سے نکال کر کسی محفوظ جگہ لے جانا چاہیں گے۔ ایسے وقت مراد اپنے مزاج کے مطابق خود ہی ایکشن میں آئے گا۔ تم باقی تین ساتھی کہاں کہاں سے چھپ کر اس پر گولیاں چلاؤ گے، یہ تم ابھی طے کر لو۔''

ایک شوٹر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہ ناقص پلاننگ ہے۔ مراد پر دور سے حملہ کرنا گویا سوئے ہوئے شیر کو جگانا ہے۔ وہ ہمیں ناکام بناتا ہوا بچ نکلے گا۔''

کارندے نے کہا۔ ''نہیں بچ سکے گا۔ اسے سیکیورٹی دینے والے گارڈز بھی ہمارے ہی آدمی ہیں۔ وہ تم لوگوں پر اس طرح گولیاں چلائیں گے کہ ایک بھی گولی کسی کو نہیں لگے گی۔ تم سب سلامتی سے مراد پر حملے کرتے رہو گے۔''

دوسرے کارندے نے کہا۔ ''وہ کسی طرح بھی نہیں بچ سکے گا۔ اگر تم لوگ ناکام ہوتے رہو گے تو ان مسلح گارڈز میں سے کوئی مراد کو گولی مار دے گا۔ وہ ہماری سیکیورٹی فورس پر بھروسا کر کے مارا جائے گا۔ ہم یہ بیان دیں گے کہ وہ چند دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کی گولی سے مارا گیا ہے۔''

جانی نے دل میں کہا۔ ''اس طرح ہمیں قاتل اور دہشت گرد کہہ کر گرفتار کیا جا سکتا ہے اور ہماری زبان کھلنے سے پہلے ہی ہمیں گولی ماری جا سکتی ہے۔ اس کے بعد تم بڑے لوگوں پر کسی طرح کا الزام نہیں آئے گا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''واہ جناب! زبردست پلاننگ ہے۔ ہمیں منظور ہے۔ کل مراد کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

پھر لین دین کی باتیں ہونے لگیں۔ کارندے نے کہا کہ مراد جس کی گولی سے مارا جائے گا، اسے ایک لاکھ روپے دیے جائیں گے۔ باقی شوٹرز کو بھاگ دوڑ کے سلسلے میں اور رازداری برتنے کے سلسلے میں بیس بیس ہزار ادا کیے جائیں گے۔

معاملات طے ہونے کے بعد لنگڑا جانی وہاں سے آ گیا۔ پھر اس نے ایک جگہ بیٹھ کر محبوب سے فون پر رابطہ کیا اور کہا۔ ''سر! آپ کے مہمان مراد صاحب کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ کل ان پر قاتلانہ حملے کیے جائیں گے۔''

جانی تفصیل سے بتانے لگا کہ کیسی پلاننگ ہو چکی ہے۔ مراد فون کے اسپیکر سے تمام باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ محبوب کی کوٹھی کے سامنے ایک کوٹھی کا نمبر بی تھارٹی ٹو ہے۔ اسے خالی کرا دیا گیا ہے۔ کل وہیں سے مراد صاحب پر گولی چلائی جائے گی۔

پھر اس نے محبوب کے ڈرائیور کے بارے میں بھی بتایا کہ اسے خرید لیا گیا ہے اور وہ ائرپورٹ جانے کے راستے میں گاڑی روکنے والا ہے۔ وہاں دستی بموں سے حملے ہوں گے اور مراد صاحب کو ہلاک کرنے تک کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہے گی۔ مراد صاحب کو سیکیورٹی دینے والے گارڈز بھی دشمن ہیں۔ اگر شوٹرز ناکام ہوتے رہیں گے تو وہ گارڈز انہیں گولی ماریں گے اور قتل کا الزام نامعلوم دہشت گردوں پر عائد کیا جائے گا۔

مراد نے کہا۔ ''جانی! تم سب سات شوٹر ہو۔ سات میں سے دو شوٹرز اس خالی کوٹھی میں جا کر مجھ پر گولی چلائیں گے۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ تم ہمارے ہو۔ یہ بتاؤ، باقی چار شوٹرز کو بھاری رقم دے کر خرید سکتے ہو؟''

وہ بولا۔ باقی چار میں دو میرے ساتھی ہیں۔ وہ آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ صرف دو رہ جائیں گے۔ ان پر رقم ضائع نہ کریں۔ وہ دو غلے ہیں۔ رقم لے کر مکر جائیں گے۔''

''تو پھر انہیں جہنم میں پہنچا دو۔''

''سر! ابھی کروں گا۔''

''ابھی نہیں۔ جب میں کہوں گا تب انہیں ختم کرو گے۔ میں تھوڑی دیر بعد اپنی پلاننگ بتاؤں گا۔''

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ محبوب نے کہا۔ ''جانی میرا برسوں کا قابلِ اعتماد وفادار ہے۔ میں اس کی ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہوں۔ آج اس نے بہت بڑے خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ آئندہ تم جو حکم دو گے، وہ تعمیل کرتا رہے گا۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میرے وطن میں میرے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور پریشانی اس بات کی ہے کہ مجھے سیکیورٹی دینے والے ہی میری جان کے دشمن ہیں۔ میں سیکیورٹی کے بغیر جانا چاہوں گا تو مجھے اپنے ذاتی طیارے تک پہنچنے نہیں دیا جائے گا۔ ساری دنیا سے کہا جائے گا کہ دہشت گردوں نے میرا کام تمام کیا ہے۔ میں اپنے ہی وطن میں آکر پھنس گیا ہوں۔''

اس نے فون پر ایک جاں نثار کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اسے بتایا کہ کل کیا ہونے والا ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیے؟

وہ آنے والا کل آ گیا۔ دوسری صبح محبوب نے کوٹھی کے ایک خالی کمرے میں ڈرائیور کو بلایا پھر اسے مراد کے پاس چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ مراد نے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

وہ دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر بولا۔ ''عبدالغنی۔''

''آج میری گاڑی ڈرائیو کرو گے...... کیا مجھے ائرپورٹ تک لے جا سکو گے؟''

''جی جناب!''

''گاڑی اچھی طرح چیک کی ہے؟ کوئی خرابی تو نہیں ہے؟''

وہ ذرا پریشان ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مراد کو دیکھا پھر اس کی گھورتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''عالی جناب! گاڑی بالکل ٹھیک ہے لیکن حضور مشین کا کیا بھروسا؟ کسی وقت بھی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔''

''آج ائرپورٹ جاتے وقت کارساز کے قریب خرابی پیدا ہو جائے گی۔ تم ڈرائیو نہیں کر سکو گے۔ گاڑی روک دو گے؟''

وہ کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا۔ خوف سے کانپنے لگا۔ یہ جانتا تھا کہ مراد کتنا ظالم ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ کسی طرح وہاں سے بھاگ جائے۔ بھاگنے والے پاؤں کانپ رہے تھے۔

مراد نے قریب آکر پوچھا۔ ''کس کے ساتھ ڈیل ہوئی تھی؟''

''م...... میں نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔''

ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور فرش پر گر پڑا۔ مراد نے ڈانٹ کر کہا۔ ''چل اٹھ۔ باتھ روم میں جا۔''

وہ فوراً ہی اٹھ کر دوڑتا ہوا باتھ روم میں آیا۔ مراد نے حکم دیا۔ ''شاور کھولو اور بولتے رہو۔ دیر کرو گے تو ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالوں گا۔''

وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''میں بول رہا ہوں مگر آپ مجھے نہیں ماریں گے تو وہ مار ڈالے گا۔ بہت بے رحم افسر ہے۔ ساؤتھ زون کا ایس پی ہے۔ اس کا نام سلطان احمد ہے۔ اس نے حکم دیا تھا کہ یہ کام کرنا ہے۔ میں انکار کروں گا، کسی سے بولوں گا تو وہ مجھے ٹارچر سیل میں الٹا لٹکا دے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

وہ رو رہا تھا۔ مراد کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بھیگے ہوئے لباس میں آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ایس پی سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟''

''اس نے ایک سپاہی کو بھیج کر اپنے گھر میں بلایا تھا۔''

''اس کے گھر کا پورا پتا بتاؤ۔''

ڈرائیور نے اس کی رہائش گاہ کا پتا بتایا۔ مراد نے فون پر اپنے ایک جاں نثار کو ایس پی کا نام اور پتا ٹھکانا بتا کر کہا۔ ''اس کی رہائش گاہ کی لوکیشن، اچھی طرح دیکھ لو۔ میں کسی وقت کال کروں گا۔ تم اسی وقت اسے گولی مار دو گے۔''

پھر اس نے فون بند کر کے ڈرائیور سے کہا۔ ''وہ تمہیں ٹارچر سیل میں لے جانے سے پہلے مر جائے گا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اس وقت تک اسی کمرے میں رہو۔''

اس نے کمرے سے باہر آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر محبوب سے کہا۔ ''آپ کا ڈرائیور وفادار ہے لیکن بزدل ہے کیونکہ غریب ہے۔ وردی والے کی دھونس میں آ گیا ہے۔ میں چند گھنٹوں میں اس کا خوف دور کر دوں گا۔ اس بے چارے کو معاف کر دیا جائے۔''

اس خالی کوٹھی میں وہ دو شوٹر آ گئے تھے۔ بالکونی میں آکر پوزیشن لے رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اگر ایک کا نشانہ چوکتا تو دوسرا اپنے ٹارگٹ کو اڑا دیتا۔ ویسے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے شاذ و نادر ہی نشانہ چوکتا ہے۔

اس بالکونی سے نیچے ان کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہ

دونوں گولی مارتے ہی بالکونی سے کود کر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو سکتے تھے۔ ان کی نظریں سامنے محبوب کی کوٹھی پر تھیں۔ کوٹھی کا پورچ اور بیرونی دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے سے مراد باہر آتا تو ٹیلی اسکوپ کے ذریعے بالکل قریب دکھائی دیتا۔

کسی کی جان لیتے وقت یا اپنی جان کی بازی لگاتے وقت صرف سامنے نہیں دیکھنا چاہیے۔ پیچھے کی بھی خبر رکھنی چاہیے لیکن وہ مطمئن تھے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ اس خالی اور بند کوٹھی میں کوئی نہیں آئے گا۔ ان کا اطمینان غارت ہو گیا۔ اچانک دونوں کے حلق سے کراہیں نکلیں۔ دو گولیاں بڑی خاموشی سے آ کر ایک کے دائیں بازو میں پیوست ہوئی۔ دوسرے کی پشت میں گھس کر آگے سینے سے باہر نکل گئی۔ وہ انہی لمحوں میں پھڑ پھڑا کر مر گیا۔ دوسرا زندہ تھا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی فرش پر گر کر بائیں ہاتھ سے لباس کے اندر چھپا ہوا ریوالور نکالا۔ پھر کھسکتا ہوا بالکونی کے سلائیڈنگ ڈور کے پیچھے چھپ کر دور تک کمرے میں نظریں دوڑانے لگا۔

کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوتوں کی کھٹ پٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے فرش پر بہت سے لوگ ڈانس کر رہے ہوں۔ وہ تین جاں نثار تھے۔ فرش پر ناچنے کے انداز میں پاؤں پٹخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں میگا فون تھے جن کے ذریعے آوازیں یوں گونج رہی تھیں جیسے وہ بالکونی والے کمرے میں ہوں اور نظر نہ آ رہے ہوں۔

وہ زخمی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر قہقہے سنائی دیے۔ ''ہی ہی ہی ہی۔ ہاہاہاہا۔ جن نات...... ہاہاہاہا جن...... نات......''

اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

پھر اسے خیال آیا۔ وہ کئی آوازیں سن رہا ہے اس نے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

جواباً وہی قہقہے سنائی دیے۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے خود کو جنات کہہ رہے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ جنات مراد کے قابو میں رہتے ہیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا تھا۔ زخمی بازو کے باعث بالکونی سے کود کر موٹر سائیکل تک نہیں جا سکتا تھا۔ اپنے ریوالور سے گولی چلاتا تو فائرنگ کی آواز سے لوگ ادھر آنے لگتے۔ وہ کمرے میں آ گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہاں سے کسی طرح نکلنا تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

اس بار نہ کوئی جواب ملا۔ نہ قہقہے سنائی دیے۔ اس نے دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ۔ یہ دیکھو میں ہتھیار پھینک رہا ہوں۔''

اس نے کھلے ہوئے دروازے سے ریوالور کو دوسرے کمرے میں پھینک دیا۔ پھر ایک ایک قدم چلتا ہوا اس کمرے میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے زخمی بازو سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے کراہتے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پھر آواز دی لیکن جواب نہیں ملا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے کوٹھی کے مختلف حصوں میں جانے لگا۔ جاں نثاروں نے اپنے جوتے اتار دیے تھے۔ دبے قدموں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ اس کی نظروں میں نہیں آ رہے تھے۔ یہ تاثر دے رہے تھے کہ وہاں جنات ہیں۔

اس نے فون نکال کر ایک کارندے سے رابطہ کیا پھر کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں زخمی ہوں۔ میرا ساتھی ایک گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔ میں اس کوٹھی میں تنہا ہوں۔ باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ میرا ابھی آخری وقت آ گیا ہے۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے تم پر حملہ کیا ہے؟ اس خالی کوٹھی میں کون آ سکتا ہے؟''

''خالی مکانوں میں جنات ہی رہتے ہیں اور وہ یہاں ہیں۔ نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''جو میرے ساتھ ہو رہا ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔ پہلے مجھے بھی یقین نہیں تھا کہ مراد کے قابو میں جنات ہیں۔ اب آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور دیکھوں گا کیا؟ وہ نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔''

''دیکھو۔ اب یہاں میری طرف نہ آنا۔ وہ حملہ کرنے والے جو بھی ہیں' تمہارے پیچھے یہاں چلے آئیں گے۔''

''میں پناہ لینے اور کہاں جاؤں گا۔ آپ مجھے سیکورٹی دیں۔''

''یو شٹ اپ۔ یہاں پہنچنے سے پہلے تمہیں گولی ماری دی جائے گی۔ میں وارننگ دے رہا ہوں۔ مجھ سے دور رہو۔''

کارندے نے فون بند کر دیا۔ شوٹر اسے گالیاں دینے لگا۔ ایسے وقت وہ تینوں جاں نثار اس کے سامنے آ گئے۔ ایک نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کس سے ڈیل ہوئی تھی...... فوراً بولو؟''

اس نے کہا۔ ''ضرور بولوں گا۔ وہ مجھے دلدل میں پھینک کر کہتے ہیں کہ ان کی طرف نہ آؤں۔ دو آدمیوں سے

ڈیل ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک ہوم منسٹر کی کوٹھی کا سیکیورٹی افسر ہے۔ دوسرا اسی کوٹھی کا منتظم اعلیٰ ہے۔"

ایک جاں نثار نے پوچھا۔ "اب تک تم نے کتنے مرڈر کیے ہیں؟ کتنے زندہ انسانوں کو مٹایا ہے؟"

"میں نے کبھی حساب نہیں کیا۔"

"چلو اب یوم حساب کے لیے جاؤ۔"

انہوں نے اسے بے آواز اسلحے سے ختم کر دیا پھر فون پر مراد کو وہاں کی روداد سنائی۔ مراد سننے کے بعد کمرے کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے پاس آیا۔ اسے ایک فون دیتے ہوئے بولا۔ "یہ سرونٹ کوارٹر میں تھا۔ کیا تمہارا فون ہے؟"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں۔ میرا فون ہے۔"

اس نے کہا۔ "ابھی تم ایس پی سے باتیں کرو گے۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے اچھی طرح یاد کرو۔ پھر اسے کال کرو۔"

مراد اسے سمجھانے لگا کہ فون پر کیا کہنا ہے اور کس انداز میں کہنا ہے۔ وہ مراد کے مطابق بول رہا تھا۔ کبھی بھول رہا تھا کبھی اٹک رہا تھا۔ بار بار ریہرسل کرنے کے بعد اسے تمام باتیں ازبر ہو گئیں۔ پھر اس نے اپنے فون پر ایس پی کے نمبر پنچ کیے۔

فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ ایس پی نے کہا۔ "عبدالغنی! تم اس وقت کال کر رہے ہو؟ کیا اس کی کار ڈرائیو نہیں کر رہے ہو؟"

ڈرائیور رابطہ ہوتے ہی تکلیف سے کراہنے لگا۔ ایس پی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ تم تکلیف میں ہو؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "صاحب جی! کوئی میری پٹائی کر رہا تھا اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مجھے الٹا لٹکا دیا ہے۔ میں کوٹھی کے گیراج میں لٹک رہا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے تمہاری پٹائی کی ہے۔ وہ تمہیں نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

"صاحب جی! جنات کسی کو نظر نہیں آتے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ جنات وِنات فضول سی باتیں ہیں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

"آپ کا بھی دماغ الٹنے والا ہے۔ وہ جنات آپ کی طرف آ رہے ہیں۔ آپ کہیں چھپ جائیں۔" پھر وہ گھبرا کر بولنے لگا۔ "ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ایس پی نے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"کسی جن نے میرے ہاتھ سے فون چھین لیا ہے۔ کیا آپ کو میری آواز آ رہی ہے؟"

"ہاں۔ تم فون سے دور ہو کر بول رہے ہو۔ فون کہاں ہے؟"

"وہ فضا میں معلق ہے۔ مجھ سے دور ہو...... ہو......"

اس کی آواز گم ہو گئی۔ ایس پی ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے فون کو بند کر کے ایک اعلیٰ حاکم سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ "جناب عالی! ہمارا منصوبہ شاید ناکام ہو رہا ہے۔ جو ڈرائیور مراد کو ائرپورٹ لے جانے والا تھا، وہ تکلیف میں مبتلا ہے۔ کوٹھی کے گیراج میں الٹا لٹکا ہوا ہے اور الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ جنات نے اس کی پٹائی کی ہے۔ وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔ یہ کوئی ماننے والی بات نہیں ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔"

عالی جناب نے کہا۔ "ماننا ہوگا۔ ابھی ہوم منسٹر نے فون پر بتایا ہے کہ جنات نے ان دو شوٹرز کو ہلاک کر دیا ہے جو سامنے والی کوٹھی سے مراد پر گولی چلانے والے تھے۔ سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ مراد پراسرار علوم جانتا ہے۔ اب ہمیں بھی یقین کرنا ہوگا۔"

ایس پی اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فون بند کر کے سوچنے لگا۔ 'مراد پراسرار علوم جانتا ہے' اسی لیے کبھی گرفت میں نہیں آتا ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جنات کا وجود ہے۔'

پھر وہ چونک کر بڑبڑایا۔ "او گاڈ! وہ ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ اسے الٹا لٹکانے والے جنات میری طرف آ رہے ہیں۔"

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے فی الحال کھلی فضا میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں کچھ دیر تک کمرے میں بند رہوں گا۔"

اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہوتے ہی حلق سے کراہ نکل گئی۔ دیدے پھیل گئے۔ اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ خون فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ کرسی پر گرتا ہوا لان کی گھاس پر گر کر بے دم ہو گیا۔ سانسوں سے خالی ہو گیا۔

اسی وقت مین گیٹ پر دو گارڈز مارے گئے۔ اچانک حملوں سے کوئی نہیں بچتا۔ وہ اپنے اسلحے سمیت زندگی سے محروم ہو گئے۔ ایک جاں نثار دوڑتا ہوا ایس پی کی لاش کے پاس آیا۔ پھر اس کا فون اٹھا کر چھلانگیں مارتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس ایک گاڑی میں پہنچ گیا۔ نہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں، نہ کسی نے وہاں موت کا تماشا دیکھا تھا۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے آئے تھے، خاموشی سے چلے گئے۔

مراد نے ایک ریاست کے حکمران کی حیثیت سے فون پر کہا۔ "میں ہوم منسٹر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی،

اسی وقت......"

فوراً ہی رابطہ کرایا گیا۔ منسٹر کی آواز سنائی دی۔ "یور ہائی نس نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ میں حاضر ہوں۔"

مراد نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں اب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔ تمہارے شوٹر کیڑوں مکوڑوں کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد تمہاری باری ہے۔"

وہ اندر سے پریشان ہوا لیکن اس نے انجان بن کر حیرانی ظاہر کی۔ "یور ہائی نس! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں زیادہ نہیں بولوں گا۔ میرا یہ فیصلہ سن لو۔ جب تک تمہیں جہنم میں نہیں پہنچاؤں گا، اس ملک سے نہیں جاؤں گا۔"

فون بند ہو گیا۔ منسٹر پریشان ہو کر اپنے گونگے فون کو دیکھنے لگا۔ مراد کے پاس ایس پی کا فون پہنچ گیا۔ اس نے آخری بار جسے کال کی تھی، اس کا نام اور نمبر فون میں محفوظ تھا۔ اس کا فون نمبر پنچ کیا گیا۔ دوسری طرف سے پرسنل سیکریٹری نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"ریاست ارضِ اسلام کا حاکمِ اعلیٰ مراد علی منگی۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر عالی جناب کی آواز سنائی دی۔ "السلام علیکم یور ہائی نس!"

مراد نے کہا۔ "ہم مسلمان سلام کے ذریعے ایک دوسرے کے لیے سلامتی کی نیک خواہش کا اظہار کرتے ہیں لیکن میں نام نہاد مسلمانوں کو سلامتی نہیں دیتا۔ میری عدالت سے تمہارے لیے سزائے موت کا حکم سنایا گیا ہے اور تم سے پہلے ایس پی کو یہ سزا مل چکی ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "آ...... آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو یقین۔ کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت......"

وہ بات کاٹ کر سخت لہجے میں بولا۔ "نو آرگیومنٹس۔ کوئی صفائی پیش نہ کرو۔ یہ لکھ لو کہ جب تک تمہیں جہنم میں نہیں پہنچاؤں گا، اس ملک سے نہیں جاؤں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ محبوب فون کے ذریعے پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا سے رابطے کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میری کوٹھی کے سامنے آج شام پانچ بجے ہز ہائی نس ... مراد علی منگی آپ سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں.... ہز ہائی نس کی زندگی میں اچانک ہی ایک ہنگامی سچویشن پیدا ہو گئی ہے۔ آپ حضرات ضرور تشریف لائیں۔"

مراد نے اسکائپ کے ذریعے ہم زاد سے کہا۔ "فوراً میری ویڈیو فلم تیار کرو۔ میں جو بیان دے رہا ہوں اسے فوراً ریاستی چینل سے نشر کرو۔"

اس نے فوراً ہی .... ریکارڈنگ کے انتظامات کیے۔ مراد نے کہا۔ "میں اس وقت پاکستان میں ہوں۔ یہ میرا وطن ہے لیکن یہاں آتے ہی میرے لیے یہ زمین تنگ کر دی گئی ہے۔ میرے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور مجھ پر قاتلانہ حملے بھی ہو رہے ہیں۔ میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے آیا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ میری میزبانی کرنے والے حکومت کے چند اعلیٰ عہدیدار میرے مخالف ہو گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں مارا جاؤں یا ایک مجرم کی طرح یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ایک ریاست کے حکمران کی توہین کرنے والوں کو سزائے موت دینے کے بعد ہی اس ملک سے جاؤں گا یا پھر یہاں کی عدالت ان عہدیداروں کو میرے سامنے سزائیں دے جو میرے دشمن ہیں۔ چونکہ وہ ڈھکی چھپی سازشیں کر رہے ہیں ان کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ہیں اس لیے میں ہی ان سے اپنے طور پر نمٹتا رہوں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے میرے پاکستان سے نکل جانے پر مجبور نہیں کر سکے گی۔ میں حکومت کے ایسے چند شر پسند عہدیداروں سے جنگ جاری رکھوں گا جو مجھ جیسے بے گناہ لوگوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں۔ ہمیں مرجانے پر یا یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں بھی مجبور ہو کر اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب دنیا کی کوئی عدالت مجھے مجرم نہیں کہہ سکتی۔ میں اپنی پاک دامنی منوا کر اپنی دھرتی کی گود میں آیا ہوں تو شر پسند عناصر مجھے قانون کے خلاف جنگ لڑنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ تو پرانی کہاوت ہے کہ مائٹ از رائٹ۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس مملکت خداداد میں صرف وہی سر اٹھا کر جی رہا ہے، جس کی لاٹھی مضبوط ہے۔ باقی عوام کو بھیڑ بکریاں بنا دیا گیا ہے۔ میں یہاں رہ کر ثابت کروں گا کہ میری لاٹھی کتنی مضبوط ہے۔ میں پاکستان کے عوام کی طاقت اور حوصلہ بن کر رہوں گا۔"

مراد کی یہ باتیں ریاستی چینل سے نشر ہوئیں تو دوسرے کئی ٹی وی چینل سے ان کی ریکارڈنگ پیش کی جانے لگی۔ حکمران بوکھلا گئے تھے۔ بیان دے رہے تھے کہ ہز ہائی نس مراد علی منگی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کے لیے مضبوط سیکیورٹی کے انتظامات کیے گئے تھے لیکن وہ ہماری سیکیورٹی سے منکر ہو کر ایک ارب پتی تاجر کی کوٹھی میں رہنے گئے ہیں۔

مراد نے جواباً کہا۔ "مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔ یہ

میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ جو سیکیورٹی گارڈز تھے، وہی درپردہ دشمنی کررہے تھے۔ انہوں نے کرائے کے قاتلوں کو میرے پیچھے لگا دیا تھا اور دنیا کو دکھانے کے لیے میرے محافظ بنے ہوئے تھے۔ اگر میں ایک افسر کو اور کرائے کے قاتلوں کو ٹھکانے نہ لگاتا تو وہ مجھے ہلاک کرچکے ہوتے۔''

حکمرانوں نے سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک سے اپیل کی کہ مراد کو سمجھائیں۔ اسے اپنی ریاست میں جانے کو کہیں۔ ورنہ آرمی آکر اس کوٹھی کا محاصرہ کرے گی جہاں وہ پناہ لے رہا ہے۔

پھر یہی ہوا۔ آرمی نے اسے تحفظ فراہم کیا۔ اس نے محبوب اور معروف جگی سے گلے مل کر چاچی چاچا کی دعائیں لیں۔ اپنے بیٹے کو پیار کیا۔ پھر ماہ نور اور اپنے بارہ جاں نثاروں کے ساتھ آکر اپنے ذاتی طیارے میں بیٹھ گیا۔

اس نے محبوب سے کہہ دیا تھا۔ ''میرے جانے کے بعد آپ پر اور ماروی پر ایک ذرا آنچ نہیں آئے گی۔ اگر اس ملک کے اکابرین نے آپ سے عداوت کی تو مجھے ایک کال کریں۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے یہاں آجاؤں گا۔''

پھر اس نے ائرپورٹ میں آرمی کے اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''میں نے سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک کی فوج کو شکست دی ہے لیکن یہ میرے وطن کی فوج ہے۔ میں اپنی فوج کو سلام کرتا ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ محبوب علی چانڈیو اور ان کی فیملی کو شرپسندوں سے محفوظ رکھیں۔ اگر ان پر ذرا سی بھی آنچ آئے گی تو میں یہاں عذاب بن کر نازل ہوجاؤں گا۔''

پاکستان میں اس کی موجودگی سے بڑے ہنگامے جنم لینے والے تھے۔ فی الحال معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ماروی اور محبوب اپنے ہی وطن میں غیر محفوظ ہوگئے تھے۔ آئندہ انہیں کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھتا تو مراد فوراً ہی ڈھال بننے کے لیے آجاتا۔

اس نے شوٹرز کو ہلاک کرنے کے لیے جنات کا ڈراما پلے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب تمام مخالفین یہ سوچ رہے تھے کہ اس کے ہاتھ میں پراسرار جنات کی قوت ہے تو وہ پسپا ہو کر واپس کیوں جارہا ہے؟ جو بڑے عہدیدار اس کے خلاف سازشیں کررہے تھے، اسے مار ڈالنا چاہتے تھے جنات نے ان عہدیداروں سے انتقام کیوں نہیں لیا؟

بہرحال جنات کا طلسمی ڈراما ختم ہو رہا تھا۔ دو غلے دوست ممالک پھر دشمن بننے والے تھے۔ وہ اور اس کی ریاست ہر طرف سے گھیراؤ میں آنے والی تھی۔ آئندہ بھی بڑے ممالک اپنی فوج سرحد پر لاتے اور فوج کشی کرتے تو ریاست کی فوج ان کا مقابلہ نہ کرپاتی۔ اب وہاں جناتی قوت نہیں رہی تھی۔

وہ ماہ نور اور اپنے جاں نثاروں کے ساتھ ریاست میں آگیا۔ ہم زاد، بشریٰ اور بلا اس کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ اس نے محل میں آکر موجودہ حالات پر ان سے گفتگو کی اور مستقبل میں جو اندیشے تھے، ان پر تبادلہ خیال کیا۔ سب ہی کو حالات کی سنگینی پر تشویش ہو رہی تھی۔

ہم زاد نے کہا۔ ''کسی بھی۔ ریاست کو پہلے اندر سے طاقتور بنانا پڑتا ہے۔ اندر کی طاقت یہ ہے کہ پوری قوم دینی احکامات پر سختی سے عمل کرے۔ اسی لیے ہم نے یہاں اسلامی نظام قائم کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں روحانی سکون اور توانائیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ دوسری اندرونی طاقت حاصل کرنے کے لیے قوم کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں پر لازم ہے کہ وہ تعلیم، ہنر اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کریں۔ ہماری کوششوں سے ریاست کے سب ہی لوگ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی تعلیم کے لیے بیرونی ممالک جاتے ہیں۔''

بلے نے بڑے عزم سے کہا۔ ''بیرونی حملوں سے نمٹنے کے لیے ہم اپنی آرمی کو جدید ہتھیاروں سے لیس کررہے ہیں۔ ہمارے تمام مشیر گہرا سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ وہ سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک کے سیاسی داؤ پیچ کو خوب سمجھتے ہیں اور ان سے نمٹنے کی راہیں بھی نکالتے رہتے ہیں۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم اندر سے بہت مضبوط ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ دشمن ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

مراد بشریٰ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''خوش رہو۔ تم لوگوں کی باتوں سے مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ ہمارا دین ہماری سب سے مضبوط ڈھال ہے۔ ہم اپنی روحانی اور مادی قوتوں میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ اب ماروی اور محبوب کے موجودہ حالات پر غور کرو۔ وہاں دشمن میٹھی چھری بن کر مختلف ہتھکنڈوں سے انہیں پریشان کرتے رہیں گے۔ طرح طرح سے ان کا سکون برباد کرتے رہیں گے۔ ہم یہاں بیٹھ کر ان کے کس

طرح کام آسکتے ہیں؟''

بلے نے کہا۔ ''ان کے کام آنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم ان کے قریب رہیں۔ اگر وہ چھپ کر مارتے ہیں تو ہم بھی چھپ کر جوابی کارروائی کریں۔ انہیں کبھی معلوم نہ ہوسکے کہ ماروی اور محبوب صاحب کے پیچھے کتنی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''میں یہی چاہتا ہوں کہ ہم محبوب صاحب کی نادیدہ قوت بن کر رہیں۔ جس طرح سیکرٹ فورس یہاں ہماری قوت ہے، اسی طرح وہاں ایک خفیہ فورس قائم ہوجائے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''پاکستان ہمارا وطن ہے۔ ہمیں شرپسندوں کے خلاف طاقتور بن کر رہنا چاہیے۔ بشریٰ اور بلے وہاں جاکر ہماری ایک سیکرٹ فورس قائم کرسکتے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''بشریٰ اور بلا کراچی کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ تمام زبانیں بولتے ہیں۔ وہاں ان پر کوئی شبہ نہیں کرے گا کہ یہ چھپ کر بارڈر کراس کرکے آئے ہیں۔''

بلے نے کہا۔ ''ہم ضرور وہاں جائیں گے۔ یہاں چار جاں نثار ایسے ہیں جو روانی سے اردو بولتے ہیں۔ ہم انہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں جاکر جاں نثاروں کی تعداد بڑھاتے رہیں گے۔''

''بلے! میں تمہارے جانے سے مطمئن رہوں گا۔ تم سب اپنے چہرے تبدیل کرو۔ یہاں کتنے ملکوں کے طیارے آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں سے کسی طیارے میں ایران جاؤ۔ وہاں آسانی سے سرحد پار کرکے پاکستان جاسکو گے۔ بھاری رقم دے کر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا کر وہاں کے پکے شہری بن جاؤ گے۔''

وہ اسی سلسلے میں مزید تبادلہ خیال کرنے لگے۔ ایسے وقت مراد نے حیرانی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ہم زاد کا بیٹا دو کنیزوں کی انگلیاں پکڑے کھڑا ہوا تھا۔

مراد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''یا خدا...... ! یہ سیدھا کھڑا ہے۔ ابھی کتنے دنوں کا ہوچکا ہے؟''

ہم زاد نے مسکرا کر کہا۔ ''صرف دس دنوں کا ہے۔ اس عمر کے بچے بستر سے اٹھ نہیں سکتے۔ اسے بٹھاؤ تو بیٹھ جاتا ہے۔ کھڑا کرو تو ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے۔''

مراد نے اس کے پاس آکر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا۔ ''ہیلو عابد علی منگی! تم تو اپنی عمر سے زیادہ تیز بھاگ رہے ہو۔''

ہم زاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ پارہ صفت ہے۔ ہلتا رہتا ہے۔ یہ دیکھو کیسے ہل رہا ہے۔ پاؤں پٹخ رہا ہے۔ ہاتھ ہلا رہا ہے۔ پورا جسم ہولے ہولے متحرک رہتا ہے۔ صرف نیند کے وقت بیاکت پڑا رہتا ہے۔''

مراد نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں آگے بڑھایا۔ پھر دوسرا پاؤں آگے کیا اور مراد سے آکر لگ گیا۔ وہ اسے چوم کر بولا۔ ''یا خدا...... ! یہ تو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ اس کی ویڈیو فلم دکھائی جائے تو کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ دس دنوں کا بچہ ہے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کی متحرک فلم اتارتا رہتا ہوں۔ دو روز پہلے اس کی ایک متحرک فلم اپنے ٹی وی چینل کے ذریعے دکھائی تھی۔ لوگ حیران ہورہے تھے۔ یقین نہیں کررہے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزر کے ڈاکٹروں کی ٹیم کل میرے بیٹے کی اسٹڈی کرنے آرہی ہے۔''

''تم تو اپنے بیٹے کو تماشا بنارہے ہو۔''

''میں کیا بناؤں گا۔ یہ آگے چل کر خود تماشا بنتا رہے گا۔''

دوسرے دن دس ڈاکٹروں کی ٹیم وہاں آئی۔ ان میں چار لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ اسے جو دیکھتا تھا حیران رہ جاتا تھا۔ وہ تمام ڈاکٹر بھی گم صم سے ہوکر اس کی اسٹڈی کررہے تھے۔ مختلف آلات اور مشینوں کے ذریعے اس کی دماغی قوت کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ ان کے چہرے بتارہے تھے کہ انہوں نے پہلی بار ایسا عجوبہ دیکھا ہے۔ وہ بھی اس کی متحرک فلم شوٹ کررہے تھے۔

جو ڈاکٹر جہاز میں اس کی پیدائش کے وقت تھے، انہوں نے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ دیا تھا جس کے مطابق وہ گیارہ دنوں کا تھا۔ ڈاکٹروں کی ٹیم میں تین لیڈی ڈاکٹر اور چار میل ڈاکٹرز یہودی تھے۔

ایک ڈاکٹر نے مراد سے کہا۔ ''اس بچے کی ماں یہودی تھی اور باپ نامعلوم ہے...... گمنام ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ ایک جن ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا۔''

ایک لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''سنا ہے، آپ نے پراسرار علم کے ذریعے اسے قیدی بنا کر رکھا ہے۔ کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ یہ میرے خفیہ معاملات ہیں۔ آپ دوسری بات کریں۔''

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہودی تنظیم نے اور ہمارے مذہبی پیشوا نے کہا ہے کہ یہ عجیب و غریب بچہ یہودی ہے۔

اسے ہمارے پاس پرورش پانا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔''اس کا باپ مسلمان ہے۔''

''تو پھر وہ نادیدہ باپ منظرِ عام پر آکر اپنی آواز سنائے اپنی زبان سے بولے کہ وہ مسلمان ہے اور اس بچے کا باپ ہے۔''

''سوری، میرے پراسرار عمل کے کچھ خفیہ تقاضے ہیں۔اس بچے کا باپ منظرِ عام پر نہیں آئے گا۔''

ایک ڈاکٹر نے مراد کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔''اس میں ہماری صیہونی تنظیم کی اپیل ہے کہ بچے کے باپ کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ اگر وہ حاضر نہیں ہوگا، اپنی زبان سے خود کو مسلمان نہیں کہے گا تو پھر یہ بچہ اپنی یہودی ماں کے فرقے میں رہے گا۔''

دوسرے یہودی ڈاکٹر نے کہا۔'' آپ بادشاہ سلامت ہیں۔اپنی بادشاہت کے معاملات دیکھیں۔ایک ایسے بچے سے دلچسپی نہ لیں جس کا کوئی باپ نہیں ہے اور ماں یہودی ہے۔''

مراد نے اس لفافے کو پھاڑ کر اس کے دو ٹکڑے کیے پھر انہیں ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھ کر کہا۔''ایک یہودی عورت کو بچہ جننے کے لیے یہاں بھیجتے وقت یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ اس کے باپ کو پیش کیا جائے۔اب آپ حضرات کو طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ بچہ عجیب و غریب بھی ہے اور غیر معمولی ذہانت کا حامل تو اسے یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔'' وہ لوگ خاموش ہو گئے۔

مراد نے کہا۔''اب ایک لفظ بھی کہے بغیر یہاں سے جاؤ اور لفافے کے ٹکڑے اپنی صیہونی تنظیم کے سربراہ کو دے دو۔''

وہ پوری ٹیم چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔ سمندر جب چپ رہتا ہے تو اس کی خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔اب ایک نیا یہودی محاذ کھلنے والا تھا۔

☆☆☆

وقت ازل سے سست رفتار ہے۔ بہت آہستہ آہستہ گزرتا ہے اور جب گزر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، دیکھتے دیکھتے عمر گزر گئی ہے۔ ریاست میں بھی وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مراد اور ہم زاد بڑے آرام و سکون سے حکمرانی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور سیاسی داؤ پیچ سیکھتے جا رہے تھے۔

بشریٰ اور بلا پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کراچی میں مصروف تھے۔ پاکستان کے عوام مراد علی منگی کے پرستار تھے۔ فخر سے کہتے تھے کہ ہمارا ایک پاکستانی بھائی ایک مضبوط ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔وہاں دین اسلام ہے۔امن و امان ہے۔اسے اپنے ملک میں آکر یہاں بھی اسلامی نظام قائم کرنا چاہیے۔

مراد کا جو بھی پرستار جنگجو طبیعت کا ہوتا تھا یا بہت زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ ہوتا تھا، اسے بشریٰ اور بلے سیکرٹ فورس میں داخل کر لیتے تھے اور انہیں ٹریننگ دیتے رہتے تھے۔

یوں رفتہ رفتہ جاں نثاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ محبوب اور بلے ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔ صرف فون کے ذریعے رابطہ رکھتے تھے۔ وہ روزانہ ایک بار محبوب کی خیریت معلوم کرتا تھا۔ کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تو محبوب اسے کال کرتا تھا۔

اس کے کاروباری معاملات میں مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ مراد کے دشمن بڑی خاموشی اور رازداری سے اسے پریشان کر رہے تھے۔ کبھی اس کے لاکھوں روپے کے مال کی شپمنٹ روک دی جاتی تھی، کبھی انکم ٹیکس والے پریشان کرنے لگتے تھے۔

بلے نے پوچھا۔'' آپ کے مال کی شپمنٹ کون روکتا ہے؟ اس افسر کا نام پتا اور فون نمبر بتائیں۔''

محبوب نے نام اور فون نمبر بتا کر کہا۔''یہ افسر رشوت لے کر میرا کام فوراً ہی کر دیا کرتا تھا۔ اب مجبور ہے، رشوت نہیں لیتا ہے۔ کہتا ہے اوپر سے میرے خلاف حکم آیا ہے کہ میرے مال کے کنٹینرز کو کئی کئی دنوں تک روکنے کے بعد جہاز پر چڑھایا جائے۔''

''اسے اوپر سے کون حکم دیتا ہے؟''

''وہ خوف زدہ ہے، نام بتانے سے انکار کرتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اس سے اگلوا لوں گا۔ آپ انکم ٹیکس کے متعلقہ افسر کا نام اور فون نمبر سینڈ کریں۔''

محبوب نے اس کا نام اور فون نمبر سینڈ کر دیا۔ بلے نے اسے کال کی۔ اس نے پوچھا۔''ہیلو کون؟''

''میرا نام موت ہے۔ مجھے اس شخص کا نام اور پتا بتاؤ جس نے محبوب علی چانڈیو کا مال روکنے کا حکم دیا ہے۔''

''مجھے کسی نے حکم نہیں دیا ہے۔ میں کسی کا مال نہیں روکتا ہوں۔ تم کون ہو؟ کیوں بکواس کر رہے ہو۔''

''میرا فون نمبر تمہارے فون میں آ گیا۔ ایک گولی آکر تمہیں لگے گی۔ تمہیں صرف زخمی کرے گی۔ اس کے بعد بھی تم نے اس کا نام اور پتا نہ بتایا تو دوسری گولی موت بن جائے گی۔''

فون بند ہوگیا۔ وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا۔ 'اس شہر میں روز ہی ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے۔ فون پر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی دہشت گرد ہے۔ میں کیا کروں؟'

ایک ہی بات عقل میں آئی کہ جب تک زندگی ہے' جینا چاہیے۔ حرام موت نہیں مرنا چاہیے۔

اس نے پلے کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''بھائی! میں بہت مشکل میں ہوں۔ اس کا نام بتاؤں گا تو وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے سپاہی مجھے مار ڈالیں گے۔''

پلے نے اس سے وعدہ کیا۔ ''اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔''

اس نے اس جناب عالی کا نام بتایا جو مراد کے مرڈر کے لیے ایک ایس پی اور ڈرائیور عبدالغنی سے کام لے رہا تھا۔ اس نے کہا کہ جناب عالی کے ایک پولیس افسر داؤد اکبر نے اس کے پاس آکر محبوب کے مال کی شپمنٹ روکنے کو کہا تھا۔ اس نے داؤد اکبر کا فون نمبر اور پولیس اسٹیشن کا نام بتایا۔ پلے نے کہا۔ ''شاباش۔ زندہ رہو۔''

پھر وہ اپنے فون کے ذریعے پولیس افسر داؤد اکبر تک پہنچ گیا۔ ''ہیلو..... ہیلو!

داؤد اکبر نے کہا۔ ''ہیلو.....!''

پلے نے کہا۔ ''ہیلو.....!''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''ہاں۔ بولتے کیوں نہیں؟ کون ہو تم؟''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''کس بات کا شکریہ؟''

''اس بات کا کہ تم پولیس والے وردی پہن کر سوتے رہتے ہو۔ ہمیں ٹارگٹ کلنگ کی کھلی چھٹی ملتی رہتی ہے۔''

''وہاٹ نان سنس۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''اس شہر میں ہر دوسرے تیسرے دن دو چار بے گناہ شہری مارے جاتے ہیں۔ ان بے گناہوں میں ایک تم بھی ہو۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ ہماری لسٹ میں تمہارا نام آگیا ہے۔ تم آج یا کل کسی بھی وقت مارے جاؤ گے۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''کبھی تیرے باپ نے بھی گولی چلائی ہے؟ سالے! میرے سامنے آ۔ میں تو تیری.....''

وہ آگے نہ بول سکا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی تھی۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ چند لمحوں تک بدحواس رہا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ فون کے ذریعے بالکل کان کے اندر فائر کی آواز گونجی تھی۔ پلے نے اپنے فون کے قریب ٹریگر کو دبایا تھا۔

اس نے گرتے ہوئے فون کو اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ ''میں پولیس والا ہوں۔ فائرنگ کی آواز سے کسی بچے کو ڈراؤ۔ پاگل کے بچے! تو ہے کون؟''

''ریاستِ ارضِ اسلام کا حاکمِ اعلیٰ مراد علی منگی۔''

اس آفیسر کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''ابے کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ وہ سالا مجرم بادشاہ تو یہاں سے جا چکا ہے۔''

''جانے والا واپس آگیا ہے۔ یقین نہ ہو تو عالی جناب سے پوچھو۔ میں نے کہا تھا۔ جب تک اسے جہنم میں نہیں پہنچاؤں گا' اس ملک سے نہیں جاؤں گا۔''

''میں ابھی پوچھوں گا مگر سچ بولو کون ہو۔ اگر وہی مراد ہو تو مجھے کیوں فون کیا ہے؟''

''تمہیں وارننگ دینے کے لیے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو محبوب علی چانڈیو کے مال کے کنٹینرز کو نہ روکو۔ انہیں جانے دو۔ اگر ابھی اسی وقت تم نے وہ رکاوٹ دور نہیں کی تو کسی وقت بھی ایک اندھی گولی تمہارے سینے میں اتر جائے گی۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ داؤد اکبر خلا میں تکتے ہوئے سوچنے لگا۔ 'کیا مجھے یقین کرنا چاہیے کہ ابھی مراد علی منگی بول رہا تھا؟ اگر یہ مراد ہی ہے تو ضرور مجھ پر گولی چلائے گا۔'

اس نے عالی جناب کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر پی اے نے اس کا نام پوچھا پھر انتظار کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد عالی جناب کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟''

''حضورِ والا! وہ مجرم بادشاہ مراد علی منگی واپس آگیا ہے۔''

عالی جناب چونک کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

''اس نے مجھ سے فون پر بات کی ہے۔ مجھے دھمکی دی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ میں محبوب علی چانڈیو کے کنٹینرز نہ روکوں۔ انہیں جانے دوں۔ اگر ابھی اور اسی وقت میں نے وہ رکاوٹ دور نہیں کی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔''

''او گاڈ.....! تم کیسے بچ گئے؟''

''وہ سامنے نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر گولی چلائی تھی۔ میرے کان ابھی تک بج رہے ہیں۔''

''وہ کوئی بہروپیا ہوگا۔ مراد بن کر فون پر بول رہا ہوگا۔''

''حضورِ والا! وہ آپ کا حوالہ دے رہا تھا۔ کیا اس

نے آپ سے کہا تھا کہ جب تک حضور کو ہلاک نہیں کرے گا، اس ملک سے نہیں جائے گا؟''

''ہاں۔ اس نے یہ کھوکھلا دعویٰ کیا تھا۔ پھر یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ سب ہی جانتے ہیں، وہ یہاں سے چلا گیا ہے۔''

''وہ کہہ رہا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد واپس آیا ہے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ عالی جناب سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اس کا فون نمبر بتاؤ۔''

اس نے نمبر بتائے۔ رابطہ ختم ہو گیا۔ بلا ایک جاں نثار کے ساتھ داؤد اکبر کی کوٹھی کے پاس چھپا ہوا تھا۔ ارادہ تھا کہ وہ رکے ہوئے کنٹینرز کو ریلیز نہیں کرائے گا تو اسے اپنی کوٹھی میں داخل ہونے نہیں دے گا۔ اس سے پہلے ہی گولی چلا کر زخمی کر کے خوف زدہ کرے گا۔

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ انجانے نمبر تھے۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔ پی اے کی آواز سنائی دی۔ ''کیا آپ مراد علی منگی ہیں؟''

''ہاں۔ میں مراد بول رہا ہوں۔''

''ہولڈ کریں۔ عالی جناب بات کریں گے۔''

بلے نے حیرانی سے خلا میں دیکھا۔ یہ توقع نہیں تھی کہ عالی جناب سے براہِ راست بات ہو گی۔ جلد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو..... کون ہو تم؟''

وہ مراد کی آواز اور لہجے میں بولا۔ ''میری آواز سے پہچان سکتے ہو تو پہچان لو۔ ورنہ کسی دن کسی وقت ایک سنسناتی ہوئی گولی میری شناخت بن جائے گی۔ میں نے کہا تھا' تمہیں جہنم میں پہنچانے کے بعد ہی اس ملک سے جاؤں گا۔ دیکھ لو کہ اس نیک کام کے لیے واپس آ گیا ہوں۔''

''تمہیں ساری دنیا پہچانتی ہے۔ یہاں کس طرح چھپ کر آئے ہو؟ میں کیسے یقین کروں؟''

''جنات مجھے چھپا کر لائے ہیں۔ انہوں نے میری صورت اور میرا حلیہ بدل دیا ہے۔ کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور ملاقات ہو گی۔ تم مجھ سے آخری بار ملو گے پھر زندگی کا چراغ بجھ جائے گا۔ انتظار کرو اور فوراً محبوب علی چانڈیو کے کنٹینرز کو ریلیز کراؤ۔''

عالی جناب نے فون بند کر کے آئی جی آف پولیس سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''محبوب علی چانڈیو کی کوٹھی کا فوراً محاصرہ کرو۔ مراد علی منگی واپس آ گیا ہے۔ وہاں چھپا ہوا ہو گا اور یہ معلوم کرو کہ اس شہر میں محبوب کی کتنی کوٹھیاں' مکانات اور دفاتر ہیں۔ وہ ایسی ہی کسی جگہ گرفت میں آئے گا۔''

وہ فون بند کر کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ مراد کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دھن کا پکا ہے۔ جس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اسے قبر میں پہنچا کر رہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے اطلاع ملی کہ داؤد اکبر اپنی گاڑی سے اتر کر کوٹھی کے اندر جانے والا تھا۔ اسی وقت اسے ایک گولی آ کر لگی ہے۔ اسے اسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔

ایسی اطلاع کے بعد پورا یقین ہو گیا کہ مراد موت بن کر آ گیا ہے۔ اس نے فون پر آئی جی سے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''سر! پولیس فورس محبوب کی کوٹھی کا محاصرہ کرنے گئی ہے۔ وہ اگر وہاں چھپا ہو گا تو فرار نہیں ہو سکے گا۔ میں ابھی اس کی گرفتاری کی خبر سناؤں گا۔''

محبوب نے فون پر بلے سے کہا۔ ''پولیس نے کوٹھی کو گھیر لیا ہے۔ سرچ وارنٹ کے بغیر اندر گھس آئے ہیں۔ کوٹھی کے ایک ایک حصے میں مراد کو تلاش کر رہے ہیں۔''

بلے نے کہا۔ ''محبوب صاحب! ان کی یہ زیادتی برداشت کر لیں۔ آج کے بعد وہ کبھی آپ کی طرف رخ نہیں کریں گے۔''

محبوب کی کوٹھی کے آس پاس چار جاں نثار چھپے رہتے تھے۔ انہوں نے بھی بلے کو یہی اطلاع دی۔ اس نے کہا۔ ''ان کی گاڑیوں میں ٹائم بم رکھو۔ اندازہ کرو۔ وہ سب کتنی دیر میں کوٹھی سے باہر آ کر گاڑیوں میں بیٹھیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق بلاسٹنگ کا ٹائم مقرر کرو۔ میں چاہتا ہوں بلاسٹنگ کوٹھی سے بہت دور جانے کے بعد ہو تو بہتر ہو گا۔''

آدھے گھنٹے بعد پی اے نے عالی جناب سے کہا۔ ''حضور والا! آپ کی کال ہے۔ آئی جی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آئی جی نے کہا۔ ''جناب والا! مراد نے بہت ہی شاکنگ اٹیک کیا ہے۔ جو افسران اور سپاہی اسے گرفتار کرنے گئے تھے وہ ناکام ہو کر واپس آ رہے تھے۔ گذری کے قریب ان کی دو گاڑیاں بم دھماکے سے تباہ ہو گئیں۔ ایک افسر اور تین سپاہی ہلاک ہوئے ہیں اور دس زخمیوں کو اسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔''

عالی جناب کھڑا ہوا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فون سے آواز آ رہی تھی۔ ''مراد کا یہ حملہ چیلنج کر رہا ہے کہ جو اسے تلاش کرنے جائے گا، اسے ایسی ہی دل ہلا دینے والی موت

ملے گی۔ ہم اس کی دھونس میں نہیں آئیں گے۔ اسے تلاش کریں گے ضرور گرفتار کریں گے اور اسے کتے کی موت ماریں گے۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ناکام ہونے اور حملے سے بچ جانے والے افسران کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہے تھے۔

ایسے وقت پی اے نے انٹرکام پر کہا۔ ''جنابِ والا! مراد علی منگی کی کال ہے۔''

اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو......!''

بلے نے مراد کی آواز اور لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ہیلو سن کر یوں لگ رہا ہے، ہل کر رہ گئے ہو۔''

وہ بولا۔ ''بے شک تم نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھ سے کوئی ڈیل کرو۔''

''ڈیلنگ یہ ہوسکتی ہے کہ جب تک محبوب علی چانڈیو کو اور ان کی فیملی کو پریشان نہیں کیا جائے گا، تب تک میں تمہاری طرف موت بن کر نہیں آؤں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔ میں ابھی حکم دیتا ہوں۔ آج سے کوئی محبوب علی چانڈیو کو اور ان کی فیملی کو کبھی پریشان نہیں کرے گا۔''

اس نے کہا۔ ''ان کے تمام کنٹینرز کو ریلیز کرواور انکم ٹیکس والوں سے بولو کہ محبوب صاحب جو کھاتہ پیش کررہے ہیں اسے چپ چاپ تسلیم کریں۔''

''جو چاہتے ہو، وہی ہوگا اور ابھی ہوگا۔''

عالی جناب فون بند کرنے کے بعد یہی کرنے لگا۔ اس کے احکامات کے مطابق محبوب کے روکے ہوئے تمام کنٹینرز کو جہاز پر لوڈ کرادیا گیا۔ محبوب کو فون کے ذریعے یہ خوش خبری سنائی گئی۔ انکم ٹیکس کے اعلیٰ عہدیدار نے بھی فون پر محبوب سے کہا کہ انکم ٹیکس کا کوئی جھمیلا نہیں ہے۔ وہ آزاد ہیں۔

آئی جی نے فون پر کہا۔ ''جنابِ والا! مراد کو گرفتار کرنے کا ایک راستہ ہے۔ ہم محبوب علی چانڈیو کو حوالات میں ڈالیں گے تو مراد اس کی رہائی کے لیے مقابلے پر سامنے آئے گا۔ ہم اسے......''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''ہرگز نہیں۔ آئندہ محبوب اور اس کی فیملی کی طرف نہ جانا۔ ان کے لیے کوئی پرابلم پیدا نہ کرنا۔ میں سختی سے منع کررہا ہوں۔''

بلے کی جدوجہد سے وہ کامیابی حاصل ہوئی، جو مراد چاہتا تھا۔ آئندہ کوئی دشمن محبوب کو پریشان کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا لیکن درپردہ بڑی رازداری سے مراد کو تلاش کیا جارہا تھا۔ ادھر بلا اور جاں نثاروں نے طے کرلیا تھا کہ کچھ عرصے تک اسلحے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ پرامن شہریوں کی طرح وقت گزارتے رہیں گے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ مراد علی منگی کراچی شہر میں واپس آگیا ہے۔ سپر پاور اور دیگر ممالک کے اکابرین اسکائپ کے ذریعے مراد سے رابطہ کررہے تھے۔ اسے اسکائپ کے ذریعے ریاست کے محل میں دیکھ رہے تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ''آپ اپنی ریاست میں ہیں۔ پھر پاکستان میں کون ہے؟''

اس نے کہا۔ ''یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ہم دو ہیں۔ ایک مراد یہاں آپ کے سامنے نظر آرہا ہے۔ دوسرا مراد کراچی میں ہے۔''

دوسرے حاکم نے کہا۔ ''پاکستانی حکام ہم سے اپیل کررہے ہیں کہ ہم آپ کو پاکستان سے چلے جانے پر راضی کریں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا آپ اپنا وطن چھوڑ کر کہیں جانا پسند کریں گے۔ میں آپ تمام اکابرین سے پوچھ رہا ہوں۔''

''نہیں۔ کوئی اپنا ملک چھوڑ کر نہیں جاتا۔''

''میں چاہتا ہوں، آپ حضرات ان حکام سے پوچھیں، وہ مجھ سے خوف زدہ کیوں ہیں؟ کیا میں ان سے دشمنی کررہا ہوں یا وہ مجھ سے کررہے ہیں؟ انہوں نے محبوب علی چانڈیو کو طرح طرح کے مسائل میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کے اربوں روپے کے بزنس کو تباہ کردینا چاہتے تھے۔

''میں نے دشمنی کرنے والوں کو سزائیں دیں۔ کسی کو ہلاک کسی کو زخمی کرکے چھوڑ دیا تو وہ سیدھے ہوگئے۔ اب کوئی محبوب صاحب سے دشمنی کرنے کی جرأت نہیں کررہا ہے۔''

وہ قائل ہوکر بولا۔ ''آپ درست فرما رہے ہیں۔ وہاں جو دشمن تھے، انہیں آپ نے سیدھا کردیا ہے۔ اگر ہم محبوب علی چانڈیو کی سلامتی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت لیں، ان کے کاروبار کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ رعایتیں اور سہولتیں فراہم کرتے رہیں تو کیا آپ ہم پر بھروسا کرکے مسٹر محبوب کی طرف سے مطمئن ہوکر اپنی ریاست میں واپس جانا پسند کریں گے؟''

وہ سوچ میں پڑگیا پھر اس نے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے بعد آپ حضرات سے رابطہ کروں گا۔''

اس نے اسکائپ کو آف کرکے ان مشیروں کو دیکھا

جو اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور سیاسی چالیں چلنے کے ماہرین تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ حضرات کیا فرماتے ہیں؟''

ایک نے کہا۔ ''مسٹر محبوب علی چانڈیو کی سلامتی کی بہت بڑی ضمانت مل رہی ہے۔ وہ سپر پاور کی چھتر چھایا میں محفوظ رہیں گے۔ وہاں کوئی ان سے دشمنی نہیں کرے گا۔''

دوسرے مشیر نے کہا۔ ''محبوب صاحب کو کاروبار میں بڑی رعایتیں اور سہولتیں حاصل ہوتی رہیں گی۔ ان کے منافع کا گراف اوپر ہی اوپر جاتا رہے گا۔''

تیسرے مشیر نے کہا۔ ''آپ محبوب صاحب کی بھرپور سیکیورٹی چاہتے تھے۔ اب ان کے کاروبار کو بھی تحفظ حاصل ہوتا رہے گا۔''

سب ہی بہترین مشورے دے رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''آپ سپر پاور پر اعتماد کر کے اس سے دوستی کو اور مستحکم کریں گے اور یہی کرنا چاہیے۔ جنات کا طلسمی حربہ کمزور ہو گیا ہے۔ پلے نے وہاں مراد بن کر زبردست دہشت طاری کی ہے۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ مراد علی منگی جنات کے بغیر پہلے بھی میدان مارتا آیا تھا۔ اب بھی وہ اپنا ڈنڈا بجا رہا ہے۔''

''یور ہائی نس! آپ مراد علی منگی کو یعنی پلے کو وہاں سے واپس بلالیں۔ محبوب صاحب کو بھی مشورہ دیں کہ وہ سپر پاور کی دوستانہ آفر کو قبول کرلیں۔''

مراد نے اسکائپ کے ذریعے دوبارہ رابطہ قائم کیا اور کہا۔ ''میں آپ تمام اکابرین پر بھروسا کرتا ہوں۔ اپنے محسن محبوب صاحب کی سلامتی اور بہتری کی خاطر پاکستان سے واپس آرہا ہوں۔''

تمام اکابرین خوش ہو گئے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''بے شک آپ سیاسی حکمت عملی کو خوب سمجھنے لگے ہیں۔ تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے اپنی ریاست کے عوام کے ساتھ امن و امان سے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کی پرسکون ذاتی زندگی میں اور سیاسی زندگی میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہو۔''

دوسرے نے کہا۔ ''لیکن ہلچل کے بغیر زندگی گزرتی نہیں ہے کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ آپ کے سامنے بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہودیوں کی کئی تنظیمیں آپ کے خلاف عالمی عدالت میں مقدمہ دائر کر چکی ہیں۔ وہ اس عجیب وغریب بچے کو حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ بائی داوے آپ کو بتادوں کہ میں یہودی ہوں۔''

ایک اور ملک کے اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''تھینکس گاڈ! میں بھی یہودی ہوں۔''

تیسرے نے کہا۔ ''تمام ممالک کے اکابرین میں یہودیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بچہ ایک گمنام باپ کا ہے۔ وہ کہیں نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے سامنے حاضر ہو سکتا ہے۔ آپ ایک یہودی عورت کے بچے کو اس کی قوم اور اس کے مذہب میں رہنے دیں۔''

ایک اور نے کہا۔ ''وہ بچہ آپ کا نہیں ہے پھر آپ اس میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''

مراد نے کہا۔ ''صرف اس لیے کہ وہ ایک مسلمان باپ کا بیٹا ہے۔ اسلامی ماحول میں رہے گا۔''

''اس کا مسلمان باپ کہیں نہیں ہے۔ عدالت یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ اس کا باپ نادیدہ تھا۔ اگر نادیدہ تھا تو اس کے مسلمان ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''میں عدالت میں حاضری نہیں دوں گا لیکن ثبوت پیش کردوں گا کہ اس کا باپ مسلمان ہے اور وہ ابھی زندہ ہے۔''

''کیا آپ اسے عدالت میں پیش کریں گے؟''

''میں نے کہا نا' عدالت میں حاضری نہیں دوں گا۔ اس کے باپ کو ساری دنیا کے سامنے پیش کروں گا۔''

''آپ کیسے پیش کریں گے جبکہ وہ نادیدہ ہے؟''

''جب اسے پیش کروں گا تو وہ نادیدہ نہیں رہے گا۔ اسے پوری دنیا دیکھے گی اور کچھ......؟''

''یہ کیسے ثابت کریں گے کہ وہی اس بچے کا باپ ہے۔ بچے کا باپ کون ہے' یہ صرف ماں ہی کہہ سکتی ہے اور ماں نہیں رہی ہے۔''

''وہ زمانہ گزر گیا کہ ماں جس مرد کی طرف انگلی اٹھاتی تھی اسی کو بچے کا باپ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اب ماں کے بغیر بھی بچے کے باپ کی شناخت اور تصدیق ہو جاتی ہے۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے......اور کچھ؟''

سب کو چپ لگ گئی۔ مراد نے پوچھا۔ ''اس کے بعد آپ کی یہودی تنظیمیں کیا کریں گی؟ ان سے بولیں، عدالت میں جا کر وقت اور رقم ضائع نہ کریں۔ آرام سے بیٹھیں۔ اپنا ایک یہودی ڈاکٹر بھیج دیں۔ ہمارا ایک مسلمان ڈاکٹر یہاں ہوگا۔ دونوں کی موجودگی میں ڈی این اے

ٹیسٹ ہوگا۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔''

ایک نے کہا۔ ''ہمارے اطمینان کے لیے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزر کے ڈاکٹروں کی ٹیم آپ کے پاس آئے گی۔ اس ٹیم میں یہودی، عیسائی، ہندو اور مسلمان ڈاکٹر ہوں گے۔''

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے لیکن یہ پہلے طے کرلیں کہ جب یہ بچہ مسلمان کا بیٹا ثابت ہوگا اور اس کا باپ موجود ہوگا تو پھر یہودی دعویٰ نہیں کریں گے۔ اس بچے کو بھول جائیں گے۔''

ایک یہودی حاکم نے کہا۔ ''ہم اپنے پیشوا اور ربیوں سے بات کرنے کے بعد ڈاکٹروں کی ٹیم یہاں سے روانہ کریں گے۔''

اسکائپ کا رابطہ ختم ہوگیا۔ اسکرین تاریک ہوگئی۔

☆☆☆

وہ ننھا فتنہ جب سے پیدا ہوا تھا تب سے محل میں ہلچل سی مچی رہتی تھی۔ اس کی عجیب وغریب حرکتیں سب ہی کو حیران کرتی رہتی تھیں۔ اس کا نام عابد علی منگی تھا۔ اسے عابی کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت کو یادگار کے طور پر ویڈیو فلم میں ریکارڈ کیا جارہا تھا۔

اب وہ چھ ماہ کا ہوچکا تھا اور چلنے پھرنے لگا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس عمر کا کوئی بچہ خود سے اٹھ نہیں سکتا۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ جب تک بچے کا ذہن قوی نہیں ہوتا، جب تک اس کے اندر اٹھنے کی یا کروٹ لینے کی تحریک پیدا نہیں ہوتی، وہ بستر پر ہی پڑا رہتا ہے۔

ویسے ہماری دنیا میں ایسے ذہین بچے پیدا ہوتے ہیں جو پیدائش کے پہلے دن سے متحرک ہوجاتے ہیں۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔ معمولی اور غیر معمولی تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔ اس خالقِ کائنات نے بے شمار غیر معمولی طاقت اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والے انسان پیدا کیے ہیں۔

الجیریا کے عبدالرحمان فرح نے تین برس کی عمر میں قرآن مجید کو حفظ کیا تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس کا ذہن اتنا حساس تھا کہ وہ اپنے آس پاس کی آوازوں کو کیچ کرلیتا تھا۔ بولنے والوں کے الفاظ اس کے ذہن میں نقش ہوجاتے تھے۔

پاکستان میں بھی تین برس کے ایک بچے نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ تو ہے ذہنی طاقت اور صلاحیت۔ جسمانی قوت کے حوالے سے ایک بچہ لائم ہوسترا اپنی عمر کے بچوں سے چالیس فیصد زیادہ جسمانی قوت رکھتا ہے۔ چار برس کی ایک لڑکی وروارا اکولوا دو سو... بیس پونڈ کا وزن اٹھا لیتی تھی۔ آج بھی وہ یوکرائن کی شہری ہے ایسی ہی ایک لڑکی آئندہ اس داستان میں آنے والی ہے۔ عابی جب دس دن کا بچہ تھا۔ تب ورلڈ ہیلتھ آرگنائزر سے ڈاکٹروں کی ٹیم نے آکر اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ مختلف آلات اور مشینوں کے ذریعے اس کے دل اور دماغ کے فنکشنز کو معلوم کیا تھا۔ یہ نتائج سامنے آئے تھے کہ وہ آگے چل کر غیر معمولی ذہانت کا حامل ہوگا اور عمر گزرنے کے ساتھ جسمانی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہودی دجال کو اپنا نجات دہندہ کہتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ عابی نظر نہ آنے والے باپ کا بیٹا تھا اور یہودی کہہ رہے تھے کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے صرف یہودی ماں تھی۔ مراد نے چیلنج کیا تھا کہ اس کا باپ ہے اور اب دنیا والوں کے سامنے آئے گا۔

دوسرے دن پھر ایک بار ڈاکٹروں کی ٹیم آنے والی تھی۔ وہ بچہ پوری یہودی قوم کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ ان کے لیے ایک انعام تھا۔

ادھر عابی پارہ صفت تھا۔ کبھی ایک جگہ سکون سے نہیں رہتا تھا۔ نہ جانے آئندہ کیا گل کھلانے والا تھا۔ ابھی تو ننھے پیروں سے چلتا ہوا اپنے بیڈروم سے باہر آجاتا تھا۔ محل کی کنیزیں اور ملازمین اس کے آگے پیچھے دوڑتے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی صوفوں، الماریوں اور پردوں کے پیچھے جاکر چھپ جاتا تھا اور ایک بار تو وہ گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہوگیا تھا۔ محل کے صرف ملازمین اور کنیزیں ہی نہیں، مراد اور ہم زاد بھی پریشان ہوگئے تھے۔ عابی..... عابی کہہ کر آوازیں دے رہے تھے۔ انہوں نے پورا محل چھان مارا تھا لیکن اس کا سایہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ دنیا میں آنے سے پہلے ماں کی کوکھ میں اس کی بنیاد پڑتے وقت اس کا باپ نادیدہ رہا کرتا تھا۔ اس لیے اب بیٹا بھی نادیدہ ہوگیا تھا۔ وہ محل سے کہاں غائب ہوگیا تھا؟ مسلح گارڈز نے بھی اس ننھے سے وجود کو محل سے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔

یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ پھر ان سب کو محل کے خانساماں کی چیخ سنائی دی۔ ''پرنس بابا یہاں ہیں۔ حضور! عالی جناب! یور ہائی نس! پرنس بابا یہاں ہیں۔ جلدی آئیں......''

مراد، ہم زاد اور محل کے سب ہی لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ خانساماں نے کسی ضرورت سے فریج کو کھولا تھا۔ تب وہ نظر آیا تھا۔ وہ اندر بیٹھا ہوا ایک پلیٹ میں رکھی ہوئی کھیر کو مٹھی میں لے کر منہ بھر رہا تھا۔

سب اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ساری پریشانیاں بھول گئے۔ ہم زاد نے اسے فریج سے نکال کر چوما پھر مراد سے کہا۔ ''تعجب ہے۔ یہ بند فریج کے اندر جانے کتنی دیر سے تھا۔ اس کا دم نہیں گھٹ رہا تھا۔ ایسی سخت سردی کے موسم میں اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی۔''

مراد نے کہا۔ ''خدا کی شان ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے، کبھی بیمار نہیں ہوا۔ اس کے لیے کوئی ڈاکٹر اب تک محل میں نہیں آیا ہے۔''

عابی کو مراد اور ہم زاد دو باپ کا پیار مل رہا تھا۔ سمجھا جائے تو وہ ایک ہی باپ کا پیار پا رہا تھا۔ مراد اور ہم زاد ایک ہی ہستی کے دو روپ تھے۔ ہم زاد کیا تھا؟ مراد کے اندر کا ہی نیگیٹو پازیٹو کردار تھا دونوں کا دل اور دماغ ایک ہی تھا۔ لہو بھی ایک تھا۔ اگر ٹیسٹ کرایا جاتا تو دونوں کا ڈی این اے ایک ہی ہوتا۔ دونوں ہی عابی کے باپ ثابت ہوتے۔

دو باپ کی طرح عابی کو دو ماؤں کا پیار بھی مل رہا تھا۔ ہم زاد کی شریک حیات زیب النساء اسے بھرپور ممتا دیتی تھی۔ ماہ نور بھی اسے سینے سے لگا کر ماں کا پیار دیتی تھی۔ وہ کبھی ماہ نور کے پاس آکر کبھی لیٹ جاتا تھا۔ کبھی زیب النساء کے ساتھ سوتا تھا۔ کبھی دونوں ماؤں سے کبھی دونوں باپ سے دور بھاگتا رہتا تھا۔

مراد کے ساتھ یہ عجیب سی بات تھی کہ اس کے دو بیٹے تھے۔ شہزاد کی بھی ماں نہیں تھی اور عابی بھی پیدا ہوتے ہی ماں سے محروم ہو گیا تھا۔ ان دونوں بیٹوں کو ماروی، ماہ نور اور زیب النساء کی ممتا کا سایہ مل رہا تھا۔

دوسرے دن ڈاکٹروں کی ٹیم آگئی۔ کئی اخبارات اور کئی ٹی وی چینلز کے رپورٹرز اور کیمرا مین بھی آئے تھے۔ ہم زاد ان سے مراد بن کر حکمران کی حیثیت سے ملاقات کر رہا تھا۔

وہ ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے آئے تھے۔ اس لیے عابی کو اسپتال میں لایا گیا۔ ہم زاد سے پوچھا گیا۔ ''یور ہائی نس! اس بچے کا باپ کہاں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''یہاں ہے۔ میں ہوں اس کا باپ۔''

سب نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر ایک نے بڑے ادب سے کہا۔ ''آپ کیسے ہو سکتے ہیں جناب عالی! اس کا باپ تو نادیدہ تھا۔''

''میں ہی نادیدہ ہو کر جینی کے پاس جایا کرتا تھا۔''

ایک لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''آ...... آپ...... کیا آپ غائب ہو جاتے ہیں؟''

''ہاں۔ پراسرار علوم کے ذریعے غائب ہو جاتا تھا۔ اب نہیں ہوتا کیونکہ نادیدہ ہونے کے لیے چالیس دنوں تک چلہ کشی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ فی الحال ریاست کے معاملات سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ جب مخالفین کی دشمنی چیلنج بن جائے گی، تب چلہ کشی کے لیے وقت نکالوں گا۔ بائی داوے میں اس سلسلے میں اور کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ کے تمام سوالات کا جواب ڈی این اے ٹیسٹ سے مل جائے گا۔''

وہ سب ریاست کے بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس کے منہ پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ باتیں بنا رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے کہا۔ ''بحث نہ کی جائے۔ سانچ کو کیا آنچ؟ ابھی ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے حقیقت معلوم ہو جائے گی۔''

وہاں گفتگو کے دوران تمام ڈاکٹر گہری نظروں سے عابی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہ ایک جگہ نہیں ٹک رہا تھا۔ ادھر سے ادھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ ان ڈاکٹرز کو اس کی عمر معلوم تھی۔ وہ حیران تھے کہ سات ماہ کا بچہ کھڑا نہیں ہو پاتا۔ اپنے بل پر بیٹھ بھی نہیں سکتا اور عابی دوڑتا پھر رہا تھا۔ اسپتال کے زینے تک پہنچ کر ایک ایک پائدان پر چاروں ہاتھ پاؤں سے چڑھتا جا رہا تھا۔

طبی معائنے اور ٹریٹمنٹ کے دوران اسے بڑی مشکلوں سے قابو میں رکھا گیا تھا۔ ٹیم کے دس ڈاکٹروں میں چھ ڈاکٹر یہودی تھے۔ تین ڈاکٹر عیسائی اور ایک مسلمان تھا۔ ان کے علاوہ ریاست کے دو مسلمان ڈاکٹر تھے۔ ان کی موجودگی میں یہودی ڈاکٹر کوئی ہیرا پھیری نہیں کر سکتے تھے۔

وہ یہودی پوری دیانت داری کے ساتھ میڈیکل پروسس سے گزر رہے تھے۔ پھر توقع کے خلاف تمام ڈاکٹروں کی مشترکہ رپورٹ نے ثابت کر دیا کہ ریاست کا حکمران مراد علی منگی واقعی عابد علی منگی عرف عابی کا باپ ہے۔

سپر پاور اور تمام بڑے ممالک کے علاوہ یہودی پیشوا، ربی اور ان کی تمام تنظیموں کے افراد بڑی بے چینی سے میڈیکل رپورٹ کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔

ریاست کے ٹی وی چینل کے ذریعے مراد نے کہا۔ ''یہ عجیب و غریب بچہ جسے ایک یہودی ماں جینیفر عرف جینی نے جنم دیا تھا، یہ ننھا معصوم متنازعہ بن گیا تھا۔ یہودیوں کے پیشوائے اعظم اور صیہونی تنظیم کے اکابرین کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ یہودی ہے۔ اسے ان کے مذہب میں اور ان کے ماحول میں پرورش پانا ہے۔ جبکہ بچے باپ کے مذہب اور ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔ اس متنازعہ بچے کا باپ مسلمان

ہے۔ وہ پہلے نادیدہ تھا۔ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ اب نظر آرہا ہے۔ ابھی ان لمحات میں ساری دنیا اس چینل پر اسے دیکھ رہی ہے۔ جی ہاں۔ میں آپ کو نظر آرہا ہوں اور جینی نے جس بچے کو جنم دیا ہے، اس کا باپ میں ہوں۔''

یہ چونکا دینے والی بات کہہ کر وہ ذرا چپ ہوا۔ زیر لب مسکراتا رہا، پھر بولا۔ ''یہ جو آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے، یہ اسلامی جمہوریہ ریاست ارضِ اسلام کا حکمران مراد علی منگی اس بچے کا باپ ہے۔''

وہ پھر ذرا چپ ہوا۔ یہ جانتا تھا کہ اس کی باتیں سننے والے اور اسے اپنی اپنی ٹی وی اسکرین پر دیکھنے والے آپس میں کچھ نہ کچھ بول رہے ہوں گے۔

اس نے بڑے فخر سے مسکرا کر کہا۔ ''میں کھوکھلا دعویٰ نہیں کررہا ہوں۔ دنیا کے مشہور و معروف اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی ٹیم نے آکر ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد تسلیم کیا ہے کہ یہ بچہ کسی شک و شبہے کے بغیر میرا بیٹا ہے۔ ابھی میرے معزز ناظرین کے سامنے وہ تمام معزز اور مستند ڈاکٹرز آکر اپنے بیانات دیں گے۔ ان تمام حضرات کی مشترکہ تحریری رپورٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ آپ ان کے بیانات سماعت فرمائیں۔''

وہ اسکرین سے آؤٹ ہوگیا۔ اس کی جگہ ایک بوڑھا عیسائی ڈاکٹر آکر مراد کے بیان کی تصدیق کرنے لگا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے عیسائی، مسلمان اور یہودی ڈاکٹرز آکر میڈیکل رپورٹ کے مطابق مراد علی منگی کو عابی کا باپ تسلیم کرنے لگے۔

ایسا ٹھوس ثبوت اور ایسے معزز اور مستند گواہ پیش کیے گئے تھے کہ تمام یہودی اکابرین کو چپ لگ گئی لیکن وہ آئندہ دم سادھ کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ بچہ ان کی روح تھا۔ ان کی جان تھا۔ ان کے نجات دہندہ دجال کا تحفہ تھا۔ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بڑی مکاری سے منصوبے بنانے لگے۔ گھوم پھر کر یہی بات ان کے دماغوں میں آرہی تھی کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا تو انگلی ٹیڑھی کی جائے گی۔ بڑے صبر و تحمل سے مناسب وقت دیکھ کر اس بچے کو اغوا کیا جائے گا۔

وہ بڑے صابر تھے۔ انتظار کررہے تھے اور وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ جب عابی ایک برس کا ہوا اور بولنے لگا تو مراد نے اسے کلمہ پڑھایا۔ وہ اور ہمزاد یہ دیکھتے آرہے تھے کہ وہ بہت ذہین ہے۔ جو دیکھتا ہے جو سنتا ہے اسے یاد کرلیتا ہے۔ اس نے بھی یکے بعد دیگرے چھ کلمے پڑھنے کے بعد انہیں ازبر کرلیا۔ پھر وہ اپنے سامنے اسے بٹھا کر پہلا سیپارہ پڑھنے اور اسے پڑھانے لگے۔ صرف ایک ہی بار پڑھنے کے بعد وہ سیپارہ اس کے ذہن میں نقش ہوگیا تھا۔ جیسے اس کے دماغ کی کتاب پر چھپ گیا تھا۔ وہ پھر اسے بھولنے والا نہیں تھا۔

وہ ہمیشہ پاک و صاف رہ کر ان کے ساتھ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے لگا تھا۔ دو معلم مختلف اوقات میں آکر اسے دینی تعلیم دے رہے تھے۔ ان مصروفیات کے علاوہ اس کی شرارتیں اور اچھل کود جاری رہتی تھی۔

وہ دو برس میں فرفر بولنے لگا تھا۔ بڑی روانی سے کلام پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ چال میں بھی روانی تھی۔ تیر کی طرح چلتا تھا اور دیوار پر ماری جانے والی گیند کی طرح تیزی سے پلٹتا تھا۔ کئی فٹ لمبی چھلانگیں مارتا تھا اور بلّی کی طرح زمین سے اچھل کر چھ فٹ کی بلندی پر پہنچ جاتا تھا۔

یہ اندازہ ہورہا تھا کہ اور دو چار برس میں اس سے بھی زیادہ بلندیوں پر پہنچ جایا کرے گا۔ وہ دو سو پچاس کے جی کا وزن دونوں ہاتھوں سے اٹھالیا کرتا تھا۔ یوکرائن کی ورورا کو گرل ہرکولیس کہا جاتا ہے۔ وہ بھی ہرکولیس کہلانے والا تھا۔

اس دوران یہودی فتنہ اٹھا رہے تھے۔ یہ اعلان کررہے تھے کہ ڈی این اے کی رپورٹ درست نہیں ہے۔ ریاست کے حکمران نے تمام ڈاکٹروں کو خرید لیا تھا۔ جو یہودی ڈاکٹر وہاں گئے تھے انہیں گن پوائنٹ پر جھوٹی میڈیکل رپورٹ لکھنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ مراد پراسرار علوم کے ذریعے تمام ڈاکٹروں کے دماغوں پر مسلط ہوگیا تھا۔ بے چارے ڈاکٹروں نے سحر زدہ ہوکر مراد کے حق میں میڈیکل رپورٹ لکھی ہے۔

ڈاکٹروں کی ٹیم میں جو ایک مسلمان اور تین ڈاکٹر تھے، انہیں رازداری سے ہلاک کردیا گیا تھا اور الزام دیا جارہا تھا کہ مراد نے سچ کو چھپانے کے لیے ان ڈاکٹروں کو مار ڈالا ہے۔ لہٰذا اس بچے کو لندن کے اسپتال میں لایا جائے۔ مراد بھی آئے۔ وہاں ان کا ڈی این اے ٹیسٹ دوبارہ ہوگا۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مراد اپنی جان کا خطرہ مول لینے کے لیے کبھی لندن نہیں آئے گا اور نہیں آئے گا تو اس کی طرف سے پیش کی جانے والی میڈیکل رپورٹ ہمیشہ جھوٹی کہلاتی رہے گی۔

مراد نے اپنے چینل سے کہا تھا۔ ''چیختے چلاتے رہو۔

دوبارہ ڈی این اے ٹیسٹ کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا۔ میں وارننگ دیتا ہوں۔ میرے خلاف بیان دینے اور چیخنے چلانے تک محدود رہو۔ حد سے بڑھو گے، سازشیں کرو گے تو میں تم لوگوں کا جینا حرام کردوں گا۔''

اب عابی ساتویں برس میں تھا۔ بہت پہلے ہی حافظ قرآن ہوچکا تھا۔ اب کمپیوٹر کے علوم میں مہارت حاصل کررہا تھا۔ علم ریاضی کا کتنا ہی مشکل اور پیچیدہ حساب ہو' اسے حل کرلیتا تھا۔ دنیا کے نقشے میں جتنے ممالک ہیں ان کے متعلق کتابیں پڑھتا تھا۔ مختلف چینلز کے ذریعے ان ممالک کو دیکھتا تھا پھر مراد سے اور ہمزاد سے ضد کرتا تھا۔

''میں وہاں جاؤں گا۔ تمام ملکوں میں جاؤں گا۔ پوری دنیا دیکھوں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''تمہیں پوری دنیا کو ضرور دیکھنا چاہیے لیکن ابھی نہیں۔ پہلے گھر میں رہ کر دنیا والوں کے بدلتے ہوئے مزاج کو بدلتے ہوئے رویوں کو سمجھو۔ انسانی نفسیات کے علوم میں مہارت حاصل کرو۔ پھر جوان ہوجاؤ گے تو ہم سوچیں گے کہ ریاست سے باہر کیسے جاؤ گے؟''

ہمزاد نے کہا۔ ''ابھی اپنی ریاست میں محفوظ ہو۔ باہر کی دنیا میں بے شمار جانے انجانے دشمن ہیں۔ تمہیں ان دشمنوں کو بھی باہر سے اور اندر سے سمجھنا ہوگا۔''

وہ اسکائپ کے ذریعے محبوب اور ماروی سے باتیں کرتا تھا۔ وہ دونوں اس کی غیر معمولی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ اس سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے۔ شہزاد دس برس کا ہوگیا تھا۔ وہ لندن میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔ عابی اسکائپ کے ذریعے اس سے بھی باتیں کرتا تھا اور کہتا تھا۔'' بھائی جان'' میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ ہم دونوں ساتھ رہا کریں گے۔''

مراد اور ہمزاد اسے فی الحال ریاست سے باہر بھیجنے والے نہیں تھے۔ وہ مختلف علوم اور ہنر میں ایسی مہارت حاصل کررہا تھا کہ اس کے لیے بیرونی ممالک سے بڑی بڑی اسناد اور ڈگریاں حاصل کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔

وہ دس برس کا ہوا تو ساڑھے پانچ فٹ کا قد آور نوجوان دکھائی دینے لگا۔ آثار بتارہے تھے کہ اگلے پانچ چھ برسوں میں قطب مینار بن جائے گا۔

اب وہ محل میں صرف رات گزارتا تھا۔ ورنہ تمام دن ریاست کے طول وعرض میں گھومتا پھرتا تھا۔ کار اور بائیک چلانا جانتا تھا لیکن جوگنگ کرنے کے انداز میں دوڑتا رہتا تھا۔ کسی سے کوئی بات کہنا ہوتی تو رک جاتا تھا۔ ریاست کے بھی لوگ اسے اچھی طرح جان گئے تھے۔ وہ جہاں سے گزرتا تھا' وہاں کی عورتیں' مرد' بچے اور بوڑھے سب ہی ہاتھ ہلا کر وش کرتے رہتے تھے اور اس کے ساتھ تھوڑی دور تک دوڑتے ہوئے جاتے تھے۔

کبھی وہ اتنی تیزی سے دوڑتا تھا کہ ایک گھنٹے میں ریاست کی ایک سرحد سے دوسرے سرے کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ریاست کی ایک سمت گھنا جنگل تھا۔ وہ جنگل میں بھی وقت گزارتا تھا۔ زمین سے چھلانگ لگا کر درختوں کی اونچی شاخوں تک پہنچ جاتا تھا پھر بندروں کی طرح ایک شاخ سے لٹک کر جھولتا ہوا دوسری شاخوں تک جاتا رہتا تھا۔

ایک بار وہ ایک درخت کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ کر دور تک دیکھنے لگا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ کئی اقسام کے پرندے اڑتے پھر رہے تھے۔ ادھر سے ایک دریا بہتا ہوا سرحد کے پار ایک پڑوسی ملک مالدوا کی سمت جارہا تھا۔ تب اس کی نگاہیں دریا کے ایک ساحلی حصے پر ٹھہر گئیں۔ وہاں ایک حسینہ نہارہی تھی۔ اس کے بدن پر کم سے کم لباس تھا اور وہ بالشت بھر کا لباس نہ ہونے کے برابر تھا۔

وہ غصے میں بڑبڑایا۔ ''بڑی بے شرم ہے۔ مردوں کے سامنے اس طرح نہارہی ہے۔''

اس عورت سے دور کئی مسلح شخص نظر آرہے تھے۔ ساحل پر چار اسپیڈ بوٹس لنگرانداز تھیں۔ وہ درخت سے کود کر زمین پر آیا پھر دوڑتا ہوا دریا کی طرف جانے لگا۔

مسلح افراد نے اسے دور سے دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی اپنی اپنی گنیں سنبھال لیں۔ پھر ریاست کے شہزادے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جسے اغوا کرنے آئے تھے۔ وہ خود ان کی طرف آرہا تھا۔

وہ سیدھا اس عورت کے پاس آکر بولا۔ ''اے...... تجھے شرم نہیں آتی۔ سب کے سامنے اس طرح نہارہی ہے۔ چل فوراً باہر آ اور پورے کپڑے پہن۔''

اس عورت نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ہمیں درست اطلاع ملی تھی کہ یہ آج بھی جنگل کی طرف آئے گا۔ دیکھو میرے بدن میں کتنی کشش ہے۔ یہ مجھے دیکھ کر آیا ہے۔ تم لوگوں کے سامنے پارسا بن رہا ہے۔''

پھر وہ پانی سے نکلتے ہوئے کنارے پر آکر بولی۔ ''زبردست باڈی بلڈر ہے لیکن ابھی تک مونچھیں نہیں نکلیں۔''

عابی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ ہاتھ نہیں ہتھوڑا تھا۔ اس حسین چہرے کے دانت ٹوٹ گئے۔

چہرے کی کھال پھٹ گئی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ زمین پر گر کر ایک ذرا پھڑپھڑائی پھر اس کا دم نکل گیا۔

وہ آٹھ مسلح افراد تھے۔ ان میں ایک اور عورت تھی۔ ان سب نے اسے نشانے پر رکھ لیا تھا اور سب ہی حیرانی سے اس مرنے والی کو دیکھ رہے تھے۔ دو افراد نے لاش کے پاس آکر اسے قریب سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ ''ریٹا کا چہرہ پھٹ گیا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس نے صرف ایک ہاتھ مارا تھا۔''

ایک گن مین نے کہا۔ ''اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بچپن سے عجیب وغریب ہے۔''

ایک نے عابی کے قریب آکر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر کہا۔ ''اے! اپنا ہاتھ دکھاؤ۔''

ہاتھ دکھانا ایک محاورہ ہے۔ عابی نے دکھا دیا۔ ایک کراٹے کا ہاتھ اس کی کنپٹی پر رسید کیا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔ زمین پر پھڑپھڑانے لگا۔ اس کی کنپٹی کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ دماغ کو ناقابل برداشت جھٹکا پہنچا تھا۔ ذرا دیر پھڑپھڑانے کے بعد اس کے بھی دیدے پھیل کر ساکت ہوگئے۔

دو مر گئے۔ چھ رہ گئے۔ انہوں نے اس کے دائیں بائیں اور پیچھے رہ کر اسے نشانے پر رکھا۔ ایک نے کہا۔ ''اب کسی پر حملہ کرو گے تو مارے جاؤ گے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں زندہ لے کر آئیں۔ تم قابو میں نہیں آؤ گے تو ہم مجبور ہو کر تمہیں زخمی کر کے لے جائیں گے۔''

ایک گن مین دوڑتا ہوا ایک بوٹ کے پاس گیا پھر وہاں سے ایک ہتھکڑی لا کر اس کی کلائیوں میں پہناتے بولا۔ ''ہمیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ تم اتنے طاقتور اور خطرناک ہو۔''

ایک نے بندوق کی نال کو اس کے جسم سے لگا کر کہا۔ ''سلامتی چاہتے ہو تو اس بوٹ میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ گن پوائنٹ پر چلتا ہوا ایک بوٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ تین گن مین بیٹھ گئے۔ باقی دشمن تین بوٹس میں چلے گئے۔ عابی نے پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو؟''

ایک نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں دنیا دکھانے لے جا رہے ہیں۔''

وہ تمام بوٹس اسٹارٹ ہو کر آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ عابی سوچ رہا تھا۔ ''میں بابا اور پاپا جانی دونوں سے کہتا ہوں، مجھے دنیا دیکھنا ہے لیکن وہ ٹال دیتے ہیں۔ یہ اچھا موقع ہے۔ میں خطرات مول لے کر دنیا دیکھتا رہوں گا۔''

وہ سوچ رہا تھا اور بوٹ چلانے والے کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح ڈرائیو کر رہا ہے۔ باقی دو اس کے سامنے گن تانے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''تم لوگوں نے دیکھا ہے۔ میرا ہاتھ فولاد کی طرح سخت ہے لیکن یہ دیکھو، میرا ہاتھ ربڑ کی طرح نرم اور لچکیلا بھی ہے۔''

وہ ایک ہاتھ ہتھکڑی سے نکالنے لگا۔ دونوں نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کا ہاتھ ربڑ کی طرح دبتا ہوا ہتھکڑی سے نکل آیا تھا۔ ایسا کبھی دیکھا گیا تھا، نہ سنا گیا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی اپنی اپنی گن کے ٹریگر پر انگلیوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے للکارا۔ ''خبردار! دوسرا ہاتھ ہتھکڑی سے نہ نکالنا۔ ہم گولی چلا دیں گے۔''

اس نے دونوں رائفلوں کی نال کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو رائفلیں ہاتھوں سے نکل گئیں۔ پلک جھپکتے ہی پانی میں چلی گئیں۔ انہوں نے فوراً ہی اس پر چھلانگ لگائی مگر تکلیف سے کراہنے لگے۔ عابی نے دونوں کے پیٹ کو مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مٹھیاں ان کے پیٹ کے اندر گھسنے والی ہوں۔ وہ ہاتھ ایسے فولادی تھے کہ وہ خود کو چھڑا نہیں پا رہے تھے۔

ڈرائیو کرنے والا للکار رہا تھا۔ ''اے چھوڑو۔ ان کو چھوڑو۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔''

وہ بوٹ کے اسٹیئرنگ کو چھوڑ کر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ عابی کی مٹھیوں نے دونوں کو پیٹ کی طرف سے اوپر اٹھایا۔ اپنے سر سے بلند کیا پھر انہیں پانی میں پھینک دیا۔

ڈرائیو کرنے والا بوٹ کی رفتار کو کم کر کے اس کی طرف گھوم کر گن چلانا چاہتا تھا۔ اس کے سر پر ایک گھونسا پڑا تو سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ ڈرائیور کو بھی اٹھا کر پانی میں پھینکنے کے بعد اسٹیئرنگ کے پاس آگیا۔ اسٹیئرنگ کے ذریعے بوٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے رفتار بڑھانے لگا۔

پیچھے آنے والی دو بوٹس کے گن مین چیخنے لگے۔ ''وہ خطرناک بن گیا ہے۔ اس پر فائر کرو۔''

فائرنگ ہونے لگی۔ عابی آندھی طوفان کی رفتار سے دور نکلتا جا رہا تھا۔ آگے جانے والی بوٹ میں صرف ایک عورت تھی۔ وہ جنگ لڑنا جانتی تھی لیکن پریشان ہوگئی تھی۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے فائر نہیں کر سکتی تھی۔ عابی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس عورت نے ایک ہاتھ سے ریوالور کو تھام لیا لیکن بوٹ لہروں پر اچھلتی جا رہی تھی۔ اس نے مجبور ہو کر دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ ایسے وقت عابی اپنی بوٹ سے چھلانگ

لگا کر اس کے پاس آ گیا۔ اس کی گود میں رکھے ہوئے ریوالور کو اٹھا کر بولا۔ ''مجھے یہ کھلونے اچھے نہیں لگتے۔''

اس نے ریوالور کو دور اچھال دیا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم زبردست ہو۔ میں ایسا ہی مرد چاہتی ہوں۔ میرا بدن چھو کر دیکھو۔ آگ ہوں آگ......''

عابی نے بدن کو چھولیا۔ ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ پڑی۔ اس نے دوسرا ہاتھ اس کی کمر کے نیچے لے جا کر اسے سر سے اوپر اٹھایا پھر اسے بھی پانی کی لہروں میں پہنچا دیا۔ اب دو رہ گئے تھے۔ وہ بھی اپنی اپنی بوٹ میں تنہا تھے۔ لہروں پر اچھلتے ہوئے اس کا صحیح نشانہ نہیں لے سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام ساتھیوں کا انجام دیکھا تھا۔ اب اس سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔

پھر وہ دونوں بوکھلا گئے۔ عابی بوٹ کو یوٹرن دے کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی بوٹس کے انجن بند کر دیے۔ آنے والے کو ایک ایک ہاتھ سے اپنی رائفلیں دکھاتے ہوئے اور دوسرا ہاتھ لہراتے ہوئے ہتھیاروں کو پانی میں پھینک دیا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

عابی ان کے قریب آ کر ایک چھلانگ لگا کر دوسری بوٹ میں آ گیا پھر بولا۔ ''ہاں، بتاؤ مجھے کہاں لے جاؤ گے؟''

وہ سہم کر بولا۔ ''ہم تمہیں واپس لے جائیں گے۔''

دوسرا اپنی بوٹ بالکل قریب لے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہم سے دوستی کرو۔ ہم سے جو کہو گے، ہم کریں گے۔''

عابی نے کہا۔ ''میں واپس نہیں جاؤں گا۔ تم دونوں بھی جہاں سے آئے ہو، وہاں واپس نہ جاؤ۔''

''پھر ہم کہاں جائیں؟ تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں پوری دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی یہاں سے جو ملک قریب ہے، مجھے وہاں لے چلو۔ اس کے بعد دوسرے ملک میں جاؤں گا۔ اسی طرح تیسرے چوتھے ملکوں میں جاتے ہوئے تمام دنیا کی سیر کرتا رہوں گا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ ٹی وی پر دیکھا ہے۔ یہ دنیا بہت خوبصورت ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''بے شک بہت خوبصورت ہے اور بہت خطرناک بھی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''جس ملک میں جاؤ گے وہاں زیادہ سے زیادہ کرنسی کی ضرورت ہو گی۔''

عابی نے کہا۔ ''میں نے بہت علوم حاصل کیے ہیں۔ بہت ہنر مند ہوں۔ تم لوگوں کو بھوکا نہیں رہنے دوں گا۔''

''لیکن ہم پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر کسی ملک میں نہیں جا سکیں گے، چھپ کر جائیں گے تو پکڑے جائیں گے۔''

عابی نے چند لمحوں تک کچھ سوچا پھر کہا۔ ''تم لوگ مجھے اغوا کر کے کس ملک میں لے جانے والے تھے؟''

''آگے جو سرحدی چوکی ہے، وہاں تمہیں اغوا کرانے والے موجود ہیں۔ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ادھر جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

''تو پھر مجھے اغوا کر کے لے چلو۔ وہ لوگ اس سرحدی چوکی سے مجھے کسی نہ کسی ملک میں لے جائیں گے۔''

''وہ تمہیں اسرائیل کے شہر تل ابیب لے جائیں گے۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ بیچ میں کئی ممالک ہیں۔ دریا، پہاڑ اور سمندر ہیں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''ارے واہ! میں ان تمام ملکوں کی سیر کرتا ہوا جاؤں گا۔ چلو بوٹ اسٹارٹ کرو۔''

دونوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ انہوں نے اب سے پہلے قتل اور اغوا کی کئی وارداتیں کی تھیں۔ انہیں پہلی بار ایسا سر پھرا ملا تھا جو اپنی مرضی سے اغوا ہو رہا تھا۔

وہ بوٹ کو اسٹارٹ کر کے آگے چل پڑے۔

☆☆☆

مراد اور ہم زاد پہلے کی طرح عابی کے پیچھے پریشان نہیں رہتے تھے۔ اس نے دس برس کی عمر میں عربی، اردو اور انگریزی زبانیں اچھی طرح سیکھ لی تھیں۔ وہ دس برس کے نادان بچوں کی طرح کسی کے بہلانے پھسلانے میں نہیں آ سکتا تھا۔ وہ کسی کو بھی اس کی آنکھوں سے اور باتوں سے سمجھ لیتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ ایسی قدرتی صلاحیتوں کے پیش نظر اسے محل سے باہر گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی گئی تھی۔

اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ صبح نماز کے بعد کہیں بھی جائے لیکن ظہر کی نماز محل میں آ کر اپنے باپ کے اور مراد کے ساتھ پڑھے۔ نماز کے بعد اسے دینی اور دنیاوی تعلیمات دینے والے اساتذہ آتے تھے۔

اس روز وہ وقت مقررہ پر نہیں آیا۔ مراد اور ہم زاد نے اس کے بغیر نماز پڑھی۔ پھر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہ بہت ہی سعادت مند اور فرمانبردار تھا۔ دونوں باپ اور دونوں باؤں کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ اس نے پہلی بار حکم عدولی کی تھی۔ انہوں نے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو حکم دیا کہ اسے تلاش کریں اور فون کے ذریعے اس سے بات کرائیں۔

وہ اپنے پاس فون نہیں رکھتا تھا۔ بہت اچھا نشانہ باز تھا لیکن اسلحہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ انگوٹھی اور گھڑی بھی نہیں پہنتا تھا۔ اس کے بدن پر صرف لباس ہوتا تھا اور پاؤں میں جوگرز پہنتا تھا تاکہ دوڑنے اور اچھلنے کودنے میں آسانی رہے۔

جلد ہی ایک پولیس افسر نے فون پر مراد سے کہا۔ ''حضور والا! یہاں دریا کے کنارے ایک عورت اور ایک مرد کی لاشیں پڑی ہیں۔ پرنس بابا کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔''

مراد اور ہم زاد تیر کی طرح وہاں پہنچے۔ انہوں نے دونوں لاشوں کو دیکھا۔ عورت کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی مرد کی کنپٹی کا زخم بھی کہہ رہا تھا کہ ایسا حملہ ان کا بیٹا ہی کر سکتا ہے۔ لاش کے پاس جو گن پڑی ہوئی تھی، اس میں سے ایک بھی گولی چلائی نہیں گئی تھی۔

وہاں قدموں کے نشانات بتا رہے تھے کہ کئی اور مسلح افراد ہوں گے۔ وہ عابی کو گن پوائنٹ پر لے گئے ہوں گے۔ دو سپاہی دور سے دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''عالی جناب! ادھر دریا کنارے دو لاشیں جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ پرنس بابا ادھر بھی نظر نہیں آرہے ہیں۔''

یہ یقین ہو گیا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور وہ اغوا ہوتے وقت دشمنوں کی لاشیں گراتا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گئے۔ ان کا عجیب و غریب معمولی صلاحیتوں کا حامل بیٹا ہاتھوں سے نکل گیا تھا اور وہ پورے یقین سے کہہ رہے تھے کہ یہ یہودیوں کی کارستانی ہے۔

ہم زاد نے غصے سے کہا۔ ''ہمارا بیٹا جتنا ذہین ہے، اتنا ہی الو کا پٹھا ہے۔ میں نے دوبارا اسے موبائل فون دیا تھا لیکن اس نے پھینک دیا۔ ابھی اس کے پاس ہوتا تو ہم رابطہ کر سکتے تھے۔ اسے گائڈ کر سکتے تھے۔ یا میرے اللہ......! وہ اتنی کمسنی میں پہلی بار دشمنوں سے ٹکرا رہا ہے۔ ان کی لاشیں گرانے کے باوجود قیدی بن گیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''غصہ نہ دکھاؤ۔ وہ میری اور تمہاری راہنمائی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ چار لاشیں بتا رہی ہیں کہ وہ اغوا کرنے والوں کے بارہ بجا رہا ہے۔''

''دشمن بھی اس کے بارہ بجا سکتے ہیں۔''

''کبھی نہیں۔ وہ اس کے بدن پر ایک خراش بھی نہیں آنے دیں گے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ہمارا بیٹا ان کے نجات دہندہ دجال کا نمائندہ ہے۔ وہ عابی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ سر پر بٹھائیں گے۔''

وہ دونوں محل میں آ گئے۔ سپر پاور اور دوسرے تمام ممالک کے اکابرین سے فون پر بولنے لگے۔ ''ہمارے بیٹے عابد علی منگی عرف عابی کو اغوا کیا گیا ہے اور ہم سو فیصد یقین سے کہتے ہیں کہ یہ یہودیوں کی شرارت ہے۔ ہم سب بڑے امن و امان سے تھے۔ اب طوفان اٹھے گا۔ ان کے پیشوا' ان کے ربی اور فری میسن کے اعلیٰ عہدیداروں کی موت آ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم حرکت میں آئیں، آپ حضرات انہیں سمجھائیں اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے ہمارے بیٹے کو واپس نہ کیا تو پھر نہیں جانتے کہ ہم ان پر کیسی تباہیاں لائیں گے۔ صرف چوبیس گھنٹے......''

سپر پاور کے اکابرین کہنے لگے۔ ''پلیز آپ طیش میں نہ آئیں۔ چوبیس گھنٹے کی ڈیڈ لائن نہ دیں۔ ہم ضمانت دیتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہم ابھی ان سے بات کرتے ہیں۔ پھر آپ کو کال کریں گے۔''

مراد اور ہم زاد انتظار کرنے لگے۔ یہ پلان کرنے لگے کہ دشمنوں نے عابی کو واپس نہ بھیجا تو وہ جوابی کارروائی کے طور پر کیسا طوفانی ردعمل پیش کریں گے؟

اس نے ہم زاد سے کہا۔ ''تم تیار رہو۔ تمہیں چہرہ اور حلیہ بدل کر جانا ہوگا۔ اس سے پہلے معلوم کرنا ہوگا کہ وہ عابی کو کس ملک میں لے جا کر چھپا کر رکھیں گے؟''

''اسے تلاش کرنا آسان نہ ہوگا۔ البتہ اس طرح آسان ہو سکتا ہے کہ عابی موقع پا کر کہیں سے ہمیں کال کرے۔''

مراد نے سر ہلا کر کہا۔ ''مجھے امید ہے' اسے ہماری ناراضگی کا خیال ہوگا۔ وہ ضرور ہم سے رابطہ کرے گا۔''

ایک گھنٹے بعد سپر پاور کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''یور ہائی نس! فری میسن کی ایک برانچ سے ہمارا رابطہ ہے۔ عابی ابھی تک ان کے پاس نہیں پہنچا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق آٹھ مسلح افراد اسے اغوا کرنے گئے تھے۔ آپ کا بیٹا بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔ اس نے چھ افراد کو مار ڈالا ہے اور دو افراد کو زندہ رہنے دیا ہے۔ یور ہائی نس! ایک ایسی بات ہے جسے سن کر آپ یقین نہیں کریں گے۔ پرنس عابی نے ان دونوں کو اس شرط پر زندہ رکھا ہے کہ وہ اسے اغوا کر کے لے جائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ سراسر بکواس ہے۔ ہمارا بیٹا ایسا احمق نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اپنی مرضی سے اغوا ہونا چاہے گا۔''

''ہم جانتے ہیں' آپ یقین نہیں کریں گے۔ پرنس نے ان سے کہا ہے کہ وہ پوری دنیا کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ راضی خوشی جا رہے ہیں۔''

مراد اور ہم زاد نے حیرانی سے ایک دوسرے کو

دیکھا۔ وہ ان سے دنیا دیکھنے کی ضد کرتا رہتا تھا اور وہ دونوں اسے ٹالتے رہتے تھے۔ اب وہ فون کال سن کر قائل ہو رہے تھے۔ عابی ایسی حرکتیں کر رہا ہوگا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''جب شہزادہ عابی فری میسن کی اس برانچ میں پہنچے گا، تب وہ لوگ فون پر اس سے آپ کی بات کرائیں گے۔ ابھی تو وہ خود پریشان ہیں۔ اسے آسانی سے حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔''

وہ دونوں اپنے بیٹے کی رپورٹ سن رہے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ فون پر کہا جا رہا تھا۔ ''یور ہائی نس...... ان کے چھ آدمی مر چکے ہیں۔ باقی دو شہزادے کے رحم و کرم پر ہیں۔ پلیز آپ ہماری اگلی کال کا انتظار کریں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ ''عابی کئی بار ریاست سے باہر جانے اور دنیا دیکھنے کی ضد کر چکا ہے۔ دیکھو کیسا شیطان ہے۔ اس نے اپنی من مانی کرنے کا راستہ نکال لیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''ہم اسے ٹالتے رہے۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ ضدی ہے۔ اب سے پہلے بھی ہم اس کی جو بات نہیں مانتے تھے، وہ اسے بڑی ہیرا پھیری سے منوا لیا کرتا تھا۔''

ہم زاد نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''ہمیں دوپہر دو بجے معلوم ہوا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا۔ اب رات ہو گئی ہے اور وہ ابھی تک اغوا کرانے والوں تک نہیں پہنچا ہے۔ وہ بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ کس طرح انہیں کبھی نچا رہا ہوگا۔''

''اس سے رابطہ نہ ہوا تو ہم بھی اس کے لیے ناچتے پھریں گے۔ ہماری نیندیں بھی اڑنے والی ہیں۔''

مراد نے پریشانی سے سر تھام کر کہا۔ ''اس کی غیر معمولی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کے باوجود دل نہیں مان رہا ہے۔ وہ ابھی بہت کم سن ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ پہلی بار تنہا اس دنیا کی دلدل میں گیا ہے۔''

وہ دونوں تصور کی آنکھوں سے عابی کو دیکھ رہے تھے۔ سوچ رہے تھے۔ وہ ابھی کہاں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا؟

☆☆☆

وہ دس برس اور دس ماہ کا تھا۔ اس عمر کے بچے نادان ہوتے ہیں۔ گھر سے باہر کم نکلتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور وہ تھا کہ دشمنوں سے کھیلتا جا رہا تھا۔ اسپیڈ بوٹ دریا کی لہروں سے کھیلتی ہوئی ایک مخصوص رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ دو دشمن جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے اغوا کرنے آئے تھے، دوست بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک بوٹ کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسرا پچھلی نشست پر عابی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم قد آور جوان ہو۔ بہت تگڑے ہو لیکن چہرے سے بہت کم سن لگتے ہو۔ تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''دس برس دس مہینے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیوں مذاق کرتے ہو برادر...... کوئی بھی دیکھنے والا بولے گا کہ تم بائیس یا چوبیس برس کے جوان ہو۔ لیکن نہیں، تمہاری ڈاڑھی مونچھیں نہیں ہیں۔ تم پندرہ یا سولہ برس کے ضرور ہو۔''

''میری عمر کا حساب نہ کرو۔ کام کی باتیں کرو۔ ہم ریاست کی سرحد سے دور نکل آئے ہیں۔ اب یہ دریا کس ملک میں بہہ رہا ہے؟ وہ پولیس چوکی کہاں ہے؟''

''ہم مالدووا میں ہیں۔''

''یہ مالدووا کیا ہے؟''

''یہ اس ملک کا نام ہے۔''

''یہ دنیا کے نقشے میں کہاں ہے؟''

''آپ کی ریاست شمال میں ہے۔ ہم جنوب کی سمت سفر کر رہے ہیں۔ اس ملک کے مشرق میں تاجکستان ہے۔ مغرب میں رومانیہ اور ہنگری ہیں۔ جنوب میں بحیرۂ اسود ہے۔ اس دریا کا نام (بک) ہے۔ ابھی ہم جس علاقے میں پہنچ رہے ہیں اس کا نام کوڈری ہے۔''

آگے ساحل پر ایک بڑا سا اسٹیمر کھڑا ہوا تھا۔ اس جہاز کے عرشے سے اسپیڈ بوٹ کو رکنے کا سگنل دیا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ مالدووا کی پہلی پولیس چوکی ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رکنا ہوگا۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

بوٹ اس اسٹیمر کے قریب آ کر رک گئی۔ اس ملک کی آرمی کے دو چار افسران اور کئی مسلح سپاہی دور تک نظر آ رہے تھے۔ وہ تینوں بوٹ سے اتر کر ساحلی دفتر میں آئے۔ ایک افسر نے کہا۔ ''یہاں سے آٹھ آدمی گئے تھے۔ دو عورتیں تھیں اور چھ مرد۔ اب تین واپس آئے ہو۔ باقی پانچ کہاں ہیں؟''

ایک نے کہا۔ سر! ہم تین نہیں دو واپس آئے ہیں۔ یہ تیسرا وہی بچہ ہے جسے ہم اغوا کرنے گئے تھے۔''

دوسرے افسر نے گھور کر کہا۔ ''یہ بچہ ہے؟ ایک گبرو جوان کو بچہ کہہ رہے ہو؟''

''سر! یہ جوان دکھائی دے رہا ہے لیکن ابھی دس برس دس مہینے کا ہے۔''

افسر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا ہم اندھے ہیں؟ کیا

تمہارے کہنے سے اسے دس برس کا مان لیں؟''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''کیا دس برس کے بچے ایسے قد آور اور باڈی بلڈر ہوتے ہیں؟ آخر چکر کیا ہے؟ آٹھ گئے تھے اور دو واپس آئے ہیں اور ایک بچے کی جگہ جوان کو یہاں سے لے جا رہے ہیں؟ ہم اس جوان کو نہیں جانے دیں گے۔''

''سر! آپ منسٹر صاحب سے پوچھ لیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ اپنی عمر سے زیادہ لمبا چوڑا ہو گیا ہے۔''

عابی چپ چاپ سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔ ایک افسر فون پر اس ملک کے ایک منسٹر سے رابطہ کرنے لگا۔ دوسرے افسر نے کہا۔ ''تمہارے چھ ساتھی کہاں ہیں؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''وہ مارے گئے ہیں۔ ریاست کی بارڈر پولیس سے زبردست مقابلہ ہوا تھا۔ ہم نے بھی ان کے سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ کاؤنٹر فائرنگ کے دوران میں ہم اس بچے کو پکڑ کر بوٹ میں ڈال کر لے آئے ہیں۔''

افسر نے غصے سے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''یہ بچہ نہیں ہے، دور سے دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا کسرتی بدن بہت سخت ہے۔ لڑنا بھی جانتا ہوگا۔ اسے آسانی سے کیسے لے آئے؟ تم دونوں کے پاس ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ یہ تمہارے قابو میں کیسے آیا ہے؟''

''سر! یہ دیکھنے میں ہٹا کٹا پہلوان دکھائی دے رہا ہے۔ حقیقتاً بہت ہی کمزور اور بزدل ہے۔ اسے گھور کر دیکھو تو یہ خوف سے کانپنے لگتا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہم نے اس کے کان پکڑے تو یہ سر جھکا کر ہمارے ساتھ بوٹ میں آ کر بیٹھ گیا۔''

ایک نے کہا۔ ''یہ ہتھیار کو دیکھ کر خوف سے رونے لگا تھا۔ بالکل ہی بچہ ہے۔ ہم نے اپنے ہتھیار بوٹ میں چھپا دیے۔''

افسر نے اپنی گن عابی کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اے! کیا تم بندوق سے ڈرتے ہو؟''

عابی خوف زدہ ہو کر اپنے ساتھ آنے والوں کے پیچھے آ کر رونے لگا۔ ''مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ۔ یہ بندوق بہت زور سے آواز کرتی ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔''

وہ بول رہا تھا اور اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ دوسرا افسر غصے سے بولا۔ ''اسے چپ کراؤ۔ منسٹر سے رابطہ ہو رہا ہے۔''

عابی اور زور زور سے رونے لگا۔ افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ ''نان سینس۔ اسے باہر لے جاؤ۔''

دو سپاہی اسے پکڑ کر باہر لے گئے۔ افسر نے فون پر کہا۔ ''ہیلو سر! میں آپ کا خادم جیکب بول رہا ہوں۔ یہاں سے آٹھ یہودی گئے تھے۔ ادھر مقابلے میں چھ مارے گئے ہیں۔ دو واپس آئے ہیں لیکن کسی بچے کو اغوا نہیں کیا ہے، ایک جوان کو لے کر آئے ہیں۔ کہتے ہیں، یہ جوان دس برس کا ہے۔''

منسٹر نے کہا۔ ''صیہونی تنظیم کے اکابرین نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بچہ عجیب و غریب ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ قد آور اور طاقتور ہے۔ وہ جسے لا رہے ہیں اسے لانے دو۔ ان واردات کرنے والوں میں سے کسی سے بھی بات کراؤ۔''

افسر نے فون کا ریسیور ایک یہودی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''منسٹر صاحب سے بات کرو۔''

اس نے ریسیور لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''سر! میں یہاں کے حالات تنہائی میں بتا سکوں گا۔''

منسٹر نے کہا۔ ''تو پھر ان سب سے دور جا کر اپنے فون پر بات کرو۔ ریسیور افسر کو دو۔''

افسر نے ریسیور لے کر کہا۔ ''یس سر! حکم کریں۔''

''اسے ایک موبائل فون دو۔ وہ مجھ سے تنہائی میں باتیں کرے گا۔ اس کے بعد ان تینوں کو یہاں آنے دو۔''

اسے ایک موبائل فون دیا گیا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر کے منسٹر کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''میں آپ کا خادم بول رہا ہوں۔ جناب عالی! یہ مراد علی منگی کا بیٹا بہت خطرناک ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ کتنا طاقتور ہے۔ جسے ایک ہاتھ مارتا ہے، وہ پھڑ پھڑا کر مر جاتا ہے۔ وہ کسی اسلحے کا محتاج نہیں ہے۔ اس نے ہم سب کا اسلحہ چھین کر پانی میں پھینک دیا۔ ہمارے ساتھیوں کو ایک ہاتھ سے اٹھا اٹھا کر یوں پانی میں پھینکا ہے جیسے وہ پلاسٹک کے کھلونے ہوں۔ میں اور ڈی سلوا اپنی قسمت سے زندہ ہیں۔''

منسٹر نے پوچھا۔ ''تعجب ہے اس نے تم دونوں کو زندہ کیوں چھوڑا ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا سر! وہ کہتا ہے کہ پوری دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے ہمارے ساتھ رہ کر پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک جا سکے گا۔ اس لیے اپنی مرضی سے اغوا ہو کر آ رہا ہے۔''

منسٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا دنیا کی سیر کرنے کے لیے وہ تمہارے ساتھ آ رہا ہے؟ کیا اتنی عقل نہیں ہے کہ اغوا کرنے والے دشمن ہوتے ہیں؟''

''اس کا خیال ہے کہ وہ دشمنوں سے چھپتا رہے گا اور پوری دنیا میں گھومتا رہے گا۔''

''ہوں۔اسے بھاگنے اور چھپنے کا موقع نہ دینا۔ وہ قابو میں نہ آئے اور ہاتھ سے نکلنے والا ہو تو اسے زخمی کر دینا۔ پھر وہ بھاگنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسے ہر حال میں یہاں سے رومانیہ پہنچانا ہے۔''

''وہ ہمیں دوست سمجھ رہا ہے۔ ہم سے چھپ کر کہیں نہیں جائے گا۔ پھر بھی ہم محتاط رہیں گے۔ آپ یہاں کے افسر سے بولیں۔ مجھے ایک پستول دیں۔ میں اسے لباس میں چھپا کر رکھوں گا۔''

وہ رابطہ ختم کرنے کے بعد افسر کے پاس آگیا۔ وہ فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے حکم کے مطابق ایک الماری سے پستول نکال کر دیا۔ اس نے اپنے لباس میں اسے چھپالیا۔ وہ وقتِ ضرورت عابی کو زخمی کر کے اسے شہ زور سے کمزور بنا سکتا تھا۔

وہ آفس سے باہر آگیا۔ عابی ایک دیوار کے سامنے قبلہ رو ہو کر مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ ایک افسر اور کئی سپاہی اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس ملک میں مسلمان برائے نام تھے۔ انہوں نے کسی مسلمان کو یوں کھلے عام کسی دفتر میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ دوسرے افسر نے دفتر سے باہر آکر اسے دیکھا۔ پھر ناگواری سے پوچھا۔''یہ کیا کر رہا ہے؟''

عابی کے ساتھ آنے والے ساتھیوں نے کہا۔''یہ مسلمانوں والی عبادت کر رہا ہے۔''

افسر نے ناگواری سے کہا۔''یہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن یہ کوئی عبادت کی جگہ نہیں ہے۔ تم لوگوں کو جانے کی اجازت ہے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ نماز ادا کرنے کے بعد کلام پاک کی کوئی ایک آیت کی تلاوت کرتا تھا۔ وہاں ننگے فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑی قرائت کے ساتھ سورۃ رحمان کی تلاوت شروع کی۔

''الرحمٰن...... اس رحمٰن نے اِس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔''

اس کی آواز اتنی خوبصورت تھی گلے میں ایسا درد اور دل میں ایسا سوز تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے سب گم صم سے ہو کر سننے لگے۔ وہ ایک ایک حرف کو صحیح مخرج سے ادا کر رہا تھا۔

''سورج اور چاند ایک ترتیب کے پابند ہیں۔ ستارے اور درخت سب ہی سجدہ ریز ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔ انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرو۔''

وہ بڑی غنایت اور لحن سے تلاوت کر رہا تھا۔ آیت سمجھا رہی تھی کہ میزان میں خلل نہ ڈالو۔

ایک افسر نے خلل ڈالا۔ گرجتے ہوئے بولا۔''یہ کیا پڑھ رہا ہے؟''

دوسرے افسر نے کہا۔''یہ اپنی مذہبی کتاب پڑھ رہا ہے۔''

اس نے حکم دیا۔''اسے گھسیٹ کر لے جاؤ۔ یہ راستے میں پڑھتا جائے گا۔ یہ ہمارا آفس ہے۔ عبادت گاہ نہیں ہے۔''

اس کے حکم کی تعمیل کے لیے دو سپاہی آئے۔ پھر دو اطراف سے اس کے بازوؤں کو پکڑ کر اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی انسان نہیں چٹان رکھی ہوئی ہے۔ وہ دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر پڑھ رہا تھا۔

افسر نے گرج کر سپاہیوں سے کہا۔''حرام کا کھاتے ہو اور ایک آدمی کو زمین سے اٹھا نہیں سکتے۔''

دونوں افسران نے عابی کی طرف آتے ہوئے غصے سے کہا۔''ایسی کیا بات ہے کہ یہ زمین سے اٹھایا نہیں جا رہا ہے؟''

انہوں نے آکر اس کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ وہ سخت پتھر لگ رہا تھا۔ ان دونوں نے اسے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر شرمندہ سے ہو کر سپاہیوں سے نظریں چرانے لگے۔

تلاوت جاری تھی۔ عابی خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب بے اختیار پیچھے ہٹ گئے۔ اس کی تلاوت میں ایسا وزن تھا جس کے نیچے ان کے دماغ دب گئے تھے۔ وہ عربی زبان نہ جانتے تھے۔ نہ سورۃ رحمٰن کے معنی و مفہوم سمجھ رہے تھے لیکن نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات کی دھند ان کے دماغوں پر چھا گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر برآمدے سے اتر کر جانے لگا تو تمام ہتھیار والے دور ہٹ گئے۔ تلاوت کی ایمانی صدا تسلسل سے گونج رہی تھی۔

وہ مسلح آرمی کے سمندر میں ایک پہاڑ کی طرح اونچا اٹھ کر جا رہا تھا۔ وہ بوٹ ساحل پر لنگر انداز تھی اور ساحل اس دفتر سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ تنہا ادھر جانے والا انہیں یہ تاثر دے رہا تھا کہ ہر ذی روح فانی ہے لیکن تمہارے ہتھیار مجھے فنا نہیں کر سکیں گے۔ میری جان میرے جان دینے والے کے ہاتھوں میں ہے۔

اچانک ایک افسر نے اپنے سر کو یوں جھٹکا جیسے غفلت

سے اچانک ہوش میں آیا ہو۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”یہ جادوگر ہے۔ ہمیں بے دست و پا بنا رہا ہے۔ اسے ہماری سرحد کے اندر ہمارے ملک میں نہ آنے دو۔“

بوٹ بھاری بھرکم اسٹیمر کے قریب تھی۔ ادھر جاتے وقت تلاوت گونج رہی تھی۔

جھٹلانے والوں پر اللہ کی آخری کتاب ہدایت کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس افسر نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ وہ گولی سنسناتی ہوئی آئی۔ عابی یکبارگی اچھل کر فضا میں قلابازی کھاتا ہوا اسٹیمر کے قریب آگیا۔

پھر تو کئی افسروں اور سپاہیوں نے تڑاتڑ گولیاں برسائیں، وہ دوسری بار فضا میں اچھل کر قلابازیاں کھاتا ہوا اسٹیمر کی چھت پر پہنچ گیا۔ افسران چیخ رہے تھے۔ ”اسے اسٹیمر سے باہر نہ آنے دو۔ وہیں اسے چھلنی کر دو۔“

عابی چھت پر نہیں تھا۔ انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ تمام مسلح سپاہی اسٹیمر کے اندر جانے کے لیے دوڑ لگا رہے تھے۔ اسٹیمر کے اندر جانے والے سپاہیوں نے دیکھا۔ جو مسلح سپاہی پہلے سے جہاز کے اندر تھے، وہ زندگی سے باہر ہو گئے تھے۔ ان میں سے کسی کا چہرہ پھٹ گیا تھا۔ کسی کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کوئی دروازے اور چوکھٹ کے درمیان پھنس کر مر گیا تھا۔ کوئی اسٹیمر کے انجن کے پاس مردہ پڑا تھا۔ وہ کسی ہتھیار سے نہیں مرے تھے۔ مرتے وقت ان کے اپنے ہتھیار اپنے ہی پاس رہ گئے تھے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن تلاوت کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کہیں آس پاس ہے۔

عابی کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر جنگ لڑ رہا تھا۔ اس دوران اس کی زبان سے تلاوت جاری رہی تھی۔ آیت میں آگ اور دھوئیں کا ذکر آیا تو وہ جہاز کے کچن میں گیا۔ اس نے گیس سلینڈر کی چابی گھما کر کچن سے باہر آکر ایک جلتی ہوئی تیلی اندر پھینک دی پھر یکبارگی آگ بھڑکتی ہوئی کچن سے باہر آکر دور تک پھیلنے لگی۔

سپاہی اپنی سلامتی کے لیے بھاگتے ہوئے اسٹیمر سے باہر جا رہے تھے۔ جو اندر تھے، وہ مارے جا رہے تھے۔ اس سرحدی چوکی میں دو افسر اور تیس سپاہی تھے۔ جن میں سے ایک افسر اور سولہ سپاہی مارے گئے تھے اچانک ہی اس اسٹیمر میں رہ رہ کر دھماکے ہونے لگے۔ وہاں اسلحہ، دستی بم وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہی دھماکے کا سبب بن رہے تھے۔ عابی نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا باقی آیت تحت اللفظ میں پڑھتا جا رہا تھا۔

وہ اسٹیمر پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ وہاں سے کوئی زندہ باہر نہیں آیا تھا۔ ساحل پر دو یہودی ایک پولیس افسر اور سات سپاہی رہ گئے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ ”وہ پاگل کا بچہ بھی اسٹیمر کے اندر مر گیا ہے۔“

دوسرے سپاہی نے کہا۔ ”وہ اپنے ساتھ ہمارے ساتھیوں کو لے مرا ہے، ہم صرف سات رہ گئے ہیں۔“

ایک یہودی نے کہا۔ ”میرے اندر یہ بات ہے کہ وہ بہت ہی ڈھیٹ اور ضدی ہے۔ آسانی سے جل کے نہیں مرے گا۔ وہ پانی میں چھلانگ لگا کر دور کہیں نکل گیا ہوگا۔“

افسر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ وہ بہت پھرتیلا ہے۔ دریا کے بہاؤ کی طرف تیرتا ہوا ہمارے ملک میں جا رہا ہوگا۔ جاؤ کنارے کنارے دوڑتے ہوئے اسے تلاش کرو۔“

وہ سب دریا کے بہاؤ کی سمت ساحل پر دوڑتے چلے گئے۔ جب وہ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو افسر بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اسٹیمر سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور بلندی پر دھواں پھیل رہا تھا۔

افسر نے شدید حیرانی سے دونوں یہودیوں کو دیکھ کر کہا۔ ”کیا تمہیں یقین آرہا ہے کہ دس یا گیارہ برس کے بچے نے ہماری پوری بارڈر فورس کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے؟ یہ جلتا ہوا اسٹیمر خواب جیسا لگ رہا ہے۔“

پھر اس نے دور ایک سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صرف یہ سات رہ گئے ہیں۔ یہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟“

ایک یہودی نے کہا۔ ”میں یقین سے کہتا ہوں۔ وہ انہیں واپس نہیں آنے دے گا۔“

افسر نے فون پر ایک سپاہی کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس سپاہی کی آواز سنائی دی۔ وہ بری طرح ہانپتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”کوئی نہیں رہا۔ میں بھی بچ نہیں سکوں گا۔ آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں......“

آواز سے پتا چلا کہ وہ جان بچانے کے لیے دوڑتا آرہا ہے۔ پھر اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید اس کے ہاتھ سے فون گر گیا ہوگا۔ شاید وہ زندگی سے چھوٹ کر موت کے قدموں میں گر گیا ہوگا۔ افسر فون بند کرتے ہوئے ادھر ادھر یوں دیکھنے لگا جیسے موت کی آہٹ سن رہا ہو۔ وہ بری طرح خوف زدہ تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہاں سے نہیں بھاگے گا تو دوسروں کی طرح مارا جائے گا اور بھاگنے کے لیے وہاں صرف اسپیڈ بوٹ رہ گئی تھی۔

اس نے یہودیوں سے کہا۔ ”یہاں سے چلو ورنہ

ہماری بھی موت ہوگی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تلاوت کی آواز سنائی دی۔ وہ اچھل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس بار وہ سورۃ الرحمٰن کا ترجمہ انگریزی زبان میں پڑھ رہا تھا۔

افسر نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "بھاگو یہاں سے......"

وہ بوٹ کی طرف بھاگنا چاہتا تھا۔ ایک یہودی نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ دونوں یہودیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ایک نے کہا۔ "وہ بھاگنے والوں کو مار ڈالتا ہے۔ ہماری طرح اس سے دوستی کرو۔ وہ معاف کر دے گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے اپنی گن سنبھالتے ہوئے بولا۔ "پاگل کے بچو......! موت کسی کو نہیں چھوڑتی۔ وہ بھی نہیں چھوڑے گا۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

ایک یہودی نے لباس کے اندر سے پستول نکال کر کہا۔ "یہ تم نے ہی مجھے دیا تھا۔ تمہارے ہی کام آرہا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر کو دبایا۔ یکے بعد دیگرے چار گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ وہ سرحدی چوکی کا آخری افسر بھی مارا گیا۔ یہودی نے پستول پھینکتے ہوئے کہا۔ "میں نے دشمنی کے خیال سے اسے چھپا کر رکھا تھا۔ اب توبہ کر رہا ہوں۔"

عابی دفتر کی چار دیواری کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس نے آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے اسٹیمر کو دیکھا، اس افسر کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ان یہودیوں کے قریب سے گزرتا ہوا بوٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ بھی دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ دوسرا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہ بوٹ آگے چل پڑی۔ ان کے پیچھے آگ، دھواں اور لاشیں رہ گئی تھیں۔

آگے جا کر ایک یہودی نے التجا کی کہ اس کے پیٹ میں مروڑ ہو رہی ہے۔ بوٹ کو روکا جائے۔ وہ رفع حاجت کے لیے جائے گا۔ عابی نے بوٹ کو روکنے کا حکم دیا۔ ڈرائیو کرنے والے نے اسے ساحل پر لا کے روک دیا۔ وہ اتر کر دوڑتا ہوا ذرا دور ایک جھاڑی کے پیچھے آگیا۔ وہاں وہ بڑی رازداری سے دھیمی آواز میں فون پر منسٹر سے بولنے لگا۔ وہ جن حالات سے گزر رہا تھا اور عابی کے ذریعے جو حیرت انگیز تماشے دیکھ رہا تھا، اس کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنے لگا۔

اس منسٹر کے پاس یہودی تنظیم فری میسن کے چند اعلیٰ عہدیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ حیرانی سے سن رہے تھے کہ عابی نے تنہا اس سرحدی چوکی کو تباہ کر دیا ہے۔ وہاں تیس مسلح سپاہی اور دو افسر تھے وہ سب کے سب مارے گئے تھے اور اس طرح مارے گئے تھے کہ عابی نے ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی۔ یہ سن کر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا اس نے کسی ہتھیار کے بغیر اپنے دو ہاتھوں سے مسلح فوجیوں کو ہلاک کیا ہے؟

ایک نے کہا۔ "رپورٹر کہہ رہا تھا۔ اس نے کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں تھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اور وہ رپورٹر کہہ رہا تھا کہ وہ جنگ جاری رہنے تک اپنی دینی کتاب کی آیتیں پڑھتا رہا تھا۔"

"یہ بات تشویش ناک ہے۔ ہم اسے یہودی بنانا چاہتے ہیں اور وہ لڑتے مرتے وقت اپنی اسلامی کتاب پڑھتا رہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام کو اس کی گھٹی میں گھول کے پلایا گیا ہے۔ اسے اپنی طرف موڑنے میں بڑا وقت لگے گا۔"

ایک نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا واقعی وہ دس یا گیارہ برس کا ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "ہاں۔ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا اور الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ جینی ایک عجوبہ کو جنم دینے والی ہے۔ تب سے ہم تحریر کے ذریعے اور آڈیو وڈیو کے ذریعے اس کا ریکارڈ مین ٹین کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت دس برس دس ماہ کا ہے۔"

"یعنی دو ماہ بعد گیارہ برس کا ہوگا۔ رپورٹر کہہ رہے ہیں کہ وہ بائیس یا چوبیس برس کا قد آور گبرو جوان نظر آتا ہے۔ وہ عجوبہ ناقابلِ یقین ہے۔ بائی دا وے یہاں کب تک پہنچے گا؟ ہم اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔"

"وہ ایک گھنٹے میں شہر فرونزا پہنچنے والے ہیں۔ وہ رات کے کھانے کے بعد آرام کرنا اور سونا چاہے گا۔ یہاں کل صبح تک آئے گا۔"

وہ سب ہی اسے دیکھنے کے لیے اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ اسے اپنی طرف مائل کرنے اور محبت کرنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے اس کا برین واش کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

معذور بازیگر

محمد علیم اقبال

بازی چاہے جو بھی ہو اور حال چاہے جیسا بھی ہو اگر چال چلنے کا گُر آتا ہو تو اس سے بڑا بازیگر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا بھی یہی حال تھا جس کا مستقبل اس کے ماضی سے وابستہ تھا۔ یہ بھی عجب قصہ ہے لوگ آگے کی جانب بڑھتے ہیں تو ترقی کرتے ہیں جبکہ اس کی نظر میں لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پیچھے ہٹنا ضروری تھا۔ لہٰذا اسے بھی ماضی کے در کھولنا پڑے۔

ٹوٹی پھوٹی چالوں سے بازی مات کرنے والوں کا ماجرا

لزی نے جب سولہویں سال میں قدم رکھا تو وہ صحیح معنوں میں ''سویٹ سکسٹین'' کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ اس کی جھیل سی نیلی آنکھوں میں غرقاب ہونے کو جی چاہتا تھا اور اس کے بالوں کے سنہری تاروں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے سورج کی روپہلی کرنوں نے بھی اپنا رنگ اسی سے لیا ہو۔ شباب تو اس کے انگ انگ سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سحر سے بچ جانے والا اس کی ملکوتی مسکراہٹ کے طلسم میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب وہ باوقار انداز سے متوازن قدم اٹھاتی ہوئی چلتی تو اس کی لچکیلی کمر خوبصورت لگتی تھی اور دیکھنے والوں کے دل جیسے دھڑکنا بھول جاتے تھے۔

لیکن عمر کے اس نازک دور میں جب دوشیزائیں آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر خود ہی شرم سے گلنار ہو جاتی ہیں اور جب کسی کو چاہنے کے ساتھ ساتھ چاہے جانے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے، لزی کا دل ایک ایسے کورے کاغذ کے مانند تھا جسے ابھی تک کسی تحریر سے آشنائی نہ ہوئی ہو یہ بھی نہیں تھا کہ دل کو چھو لینے والے نازک جذبات اس کے دل کے تاروں کو محبت کے مدھم سروں سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام ہو گئے تھے یا اس کے دل میں

محبت کے سوتے خشک پڑ گئے تھے بلکہ وہ بھی محل کی شہزادی کی طرح اپنے خوابوں کے شہزادے کے سفید گھوڑے کے ٹاپوں کی منتظر تھی۔ اس خوبرو شہزادے کا حیات آگیں لمس اس کے دلکش خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھر سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ بہت دور تک نکل جاتی۔ پھر جیسے وقت تھم جاتا اور ایک ننھے منے بچے کی قلقاریوں کی آواز سے وہ ایک دم اپنے خواب سے چونک جاتی اور جلدی سے گاہکوں کو نمٹانے لگتی۔

جلد ہی لزی نے محسوس کیا کہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک پختہ عمر، خوب صورت مرد اکثر اس آئس کریم شاپ کے گرد منڈلاتا رہتا تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس شخص کی۔۔۔ سیاہ آنکھیں لزی کے چہرے کا طواف کرتی رہتیں اور جب بھی آئس کریم خریدنے کے بہانے اس شخص کو لزی کے قریب آنے کا موقع ملتا تو وہ بقایا لینے کے دوران اپنی تیز نگاہیں اس کی آنکھوں پر گاڑ دیتا اور لزی کو اس کی نظریں اپنے جسم میں کھبتی ہوئی محسوس ہوتیں جبکہ اس شخص کے چہرے پر ایک پُراسراری مسکراہٹ رقصاں رہتی۔

آخر ایک روز لزی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے اس شخص سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں میں دوستانہ ماحول میں بات چیت ہوئی لیکن لزی کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہی۔

اس روز وہ اس پُراسرار شخص کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ اس کی توجہ ملحقہ شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں جمع ہونے والے لوگوں کے ایک جم غفیر کی طرف مبذول ہوگئی۔ جب اس نے بغور اس ہجوم کا جائزہ لیا تو اسے دائرے میں کھڑے ہوئے لوگوں کے سروں کے اوپر ایک آدمی تار پر کرتب دکھاتا ہوا نظر آیا۔ بازی گر کو تار پر چلتے دیکھنے کا شوق اسے کشاں کشاں ہجوم کی طرف کھینچ لایا۔ ایں یہ کیا......؟ باریک تار پر فن کا مظاہرہ کرنے والے کا چہرہ لزی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ تو وہی پُراسرار شخص تھا جو اکثر یک ٹک تکا کرتا تھا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی مگر یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔

''اس بازی گر کا کیا نام ہے؟'' اس نے اپنے آگے کھڑی ہوئی ایک عورت کو مخاطب کیا۔

''ولینڈا۔'' اس عورت نے مختصراً جواب دیا۔

''ولینڈا کیا ہوتا ہے؟'' لزی نے ہونٹ سکوڑے۔

جواب میں اس عورت نے بتایا کہ ولینڈا فیملی نے پچھلی دو صدیوں سے سرکس میں اپنے خطرناک کرتبوں کی بدولت دنیا کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا اور یہ بازی گر سٹیون ولینڈا ابھی اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ لزی حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑے یہ سب سن رہی تھی اور یہ جان کر تو اس کی حیرت دو چند ہوگئی کہ اسٹیون ولینڈا کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی درج ہوچکا تھا۔ وہ تار پر بے شمار کامیاب اور خطرناک مظاہرے کرکے شائقین سے داد و تحسین وصول کرچکا تھا لیکن اس کے سب سے زیادہ غیر معمولی مظاہرے کو ''موت کی دوڑ'' کا نام دیا گیا جس میں اس نے 60 میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتی ہوئی دو گاڑیوں کے درمیان تنی ہوئی تار پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔

تار پر کامیاب مظاہرے کے بعد اسٹیون ولینڈا نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر حاضرین کو جھک کر سلام پیش کیا جو کہ قدیم طرز کے اس شوبزنس میں اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے بعد اس نے حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تو آئس کریم کی دکان والی دوشیزہ پر نظر پڑتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے جس من موہنی صورت کے سپنے اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے تھے وہ مجسم حقیقت کا روپ دھارے اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے جلوہ گر تھی اور اپنی میٹھی نگاہوں سے اس کے جسم و جاں کو سرشار کررہی تھی۔

اسٹیون کا جی چاہا کہ وقت کی رفتار تھم جائے اور وہ اسے آنکھوں کے راستے اپنے دل میں اتارتا رہے لیکن کسی کے چاہنے سے وقت بھلا کب رکا ہے اور ایک دم اسے وقت گزرنے کا احساس ہوا تو اس نے لزی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پلیٹ فارم سے نیچے اتر آیا۔

''اچھا اب بتایئے جناب آپ مجھے کھا جانے والی نظروں سے کیوں گھورا کرتے تھے؟'' لزی نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

''دیکھو لزی!'' اسٹیون نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کی شیرینی سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو مجھے تمہاری صورت مانوس سی لگی جیسے ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ بس اسی وجہ سے میں آئس کریم کی دکان کے گرد منڈلاتا رہتا تھا اور تمہاری فرشتوں جیسی معصوم صورت دیکھتے ہی میں نے تمہارے لیے ایک بڑا خوب صورت نام منتخب کرلیا تھا ''مخمل''...... اور آئندہ میں تمہیں اسی نام سے پکارا کروں گا۔''

لیکن وہ لزی کو یہ نہ بتا سکا کہ اسے صرف لزی کی

صورت ہی مانوس نظر نہیں آتی بلکہ اس کے لمبے بال، نازک مخروطی ہاتھ، جھیل سی نیلی آنکھیں اور ملکوتی تبسم...... غرضیکہ اس کا انگ انگ جانا پہچانا سا نظر آتا تھا جیسے ان کی جنم جنم کی آشنائی ہو۔

یہ اسٹیون ولینڈا کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ باریک تار پر اپنی مہارت کا لوہا منوانے والے کے پاؤں خوشی سے زمین پر ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے لزی کو پہلی بار دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی ساری زندگی لزی کی سنہری زلفوں کے سنگ بتادے گا لیکن لزی کے ذہن میں ابھی دور دور تک ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اسٹیون کے ذریعے تار پر چلنا سیکھ لیا تو یہ اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا ایڈونچر ہوگا۔

اس رات وہ معمول کے مطابق جلد نہیں سو پائی بلکہ اپنے دل کے کورے ورق پر ابھرتی ہوئی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی اور اسٹیون کے خاکے میں رنگ بھرتی رہی۔ اسٹیون اگرچہ عمر میں اس سے کافی بڑا تھا لیکن لزی کو وہ بہت اچھا لگا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار کسی نے محبت سے پکارا تھا ورنہ والدین کا سایہ سر پر ہونے کے باوجود وہ ان کے دست شفقت سے محروم تھی اور اس خیال کے آتے ہی اس کا ذہن اپنے بچپن کی طرف گھوم گیا۔

20 مارچ 1968ء میں نیویارک کے ایک نواحی قصبے میں آنکھ کھولنے والی الزبتھ پنٹیا سات بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھی۔ اس کے والدین نے کمیونسٹ ہنگری سے فرار ہوکر امریکا میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ الزبتھ نے ہوش سنبھالنے پر سب سے پہلی دوستی غربت سے کی تھی۔ اس پر اس کے والد کا رویہ مستزاد تھا۔ غالباً ہنگری کی دہشت ناک یادیں ابھی تک اس کے باپ کے لاشعور کے کونے کھدروں سے اس کے شعور میں آنے کے لیے دھکم پیل کرتی رہتی تھیں اور نتیجتاً وہ بچوں کو تختۂ مشق بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔

جب وہ شام کو کام سے واپس آتا تو سب سے پہلے تمام بچوں کو بلوا کر اپنے سامنے قطار میں کھڑا کر دیتا اور پھر بڑی گہری نظروں سے ہر ایک کا جائزہ لیتا۔ اس وقت اس کے انداز میں دنیا جہاں کی کرختگی سمٹ آتی۔ بچے سہمے سکڑے ان ملزموں کی طرح کھڑے ہوجاتے جنہیں فردِ جرم پڑھ کر سنائی جانے والی ہو۔ وہ ہر بچے کو اپنے ہاتھ باہر نکالنے کو کہتا اور جب اس کے حکم کی تعمیل ہوجاتی تو وہ اپنی پتلون سے بیلٹ نکالتا اور اسے ہاتھ میں لے کر شڑاپ شڑاپ ان بچوں کے کومل ہاتھوں پر برسانا شروع کر دیتا۔

بچے پہلے تو آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتے رہتے اور پھر ایک دم چیخ وپکار شروع کر دیتے جو اس بات کی علامت ہوتی کہ ان کی آخری حد شروع ہوگئی ہے اور وہ بھی اپنے ہاتھ روک لیتا۔ بچوں نے مار سے بچنے کا یہ اچھا طریقہ ڈھونڈا تھا۔ سزا کے سلسلے میں لزی کے باپ کا یہ نظریہ تھا کہ بچوں نے اس کی عدم موجودگی میں ضرور کوئی نہ کوئی شرارت یا گڑبڑ کی ہوگی اور اس کے بقول بچے بہتر جانتے تھے کہ انہیں کس شرارت کی سزا دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں اس کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ گاہے بگاہے بچوں کی مرمت کرنے سے ان میں برداشت کا مادہ پیدا ہوگا اور ان کا جسم بھی مضبوط ہوگا۔

جہاں تک لزی کی ماں کا تعلق تھا وہ کمزور اور سدا کی بیمار عورت تھی۔ بعض اوقات وہ مداخلت کرکے بچوں کو شوہر کے بے رحم پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کرتی تو وہ اس مداخلت بے جا سے تلملا...... کر اسے بھی دو چار ہاتھ رسید کرنے سے نہ ہچکچاتا اور پھر اسے بیڈروم میں دھکیل کر باہر سے تالا لگا کر کام پر چلا جاتا۔

بیڈروم کے اندر لزی کی ماں شام تک سسکتی اور اپنے نصیبوں کو کوستی رہتی اور باہر بچے اپنی ماں کو بے بس دیکھ کر رونے لگتے اور جب وہ رو رو کر ہلکان ہوجاتے تو انہیں بھوک ستاتی لیکن چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ ایک وقت کا کھانا بہ مشکل پورا ہو پاتا تھا بچتا کہاں سے سب سے پہلے لزی کا باپ سارا کھانا ایک الگ کمرے میں منگوا لیتا اور جب وہ کھانے سے فارغ ہوچکتا تو اس کا بچا ہوا کھانا سب لوگ کھاتے تھے۔ ماں کی طرف سے مایوس ہوکر بچوں کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے خود ہی کچھ پکا کر زہر مار کرنا پڑتا۔ مزید برآں گھر کی جھاڑ پونچھ کا کام بھی بچوں کے نازک کاندھوں پر آجاتا۔

قدرت نے لزی کو بے پناہ خود اعتمادی کی دولت اور متوازن شخصیت سے نوازا تھا۔ برے سے برے حالات بھی اسے متزلزل کرنے میں ناکام رہے تھے کہ اتنے برے سلوک کے باوجود وہ اپنے باپ سے محبت کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ پیار کرنا جانتا ہی نہیں تو پھر اسے کیونکر دوش دیا جائے۔ لزی نے ہر قسم کے حالات میں خوش رہنا سیکھ لیا تھا اور اس کی یہی خصوصیت اسے ایک کامیاب زندگی گزارنے کی راہ دکھاتی تھی۔

پنٹیا خاندان کی کسمپرسی کے پیش نظر حکومت اس کے بچوں کو وقتاً فوقتاً سوشل سروس سسٹم کے تحت مختلف خاندانوں

کے ہاں پرورش کے لیے بھجوادیتی تھی۔ ابھی گول مٹول لزی کی عمر بہ مشکل ڈیڑھ سال ہوگی اور اس نے اپنی توتلی زبان میں ماما پاپا کہنا ہی سیکھا تھا کہ اسے ماما پاپا سے دور ایک اجنبی ماحول میں بھیج دیا گیا۔

ماں باپ سے علیحدگی پر اس نے رورو کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس کی سرپرست گھنٹوں اسے سینے سے لگائے لوریاں دیتی رہتی اور بڑی مشکلوں سے ننھی لزی کو چپ کروانے میں کامیاب ہوتی۔ دوبارہ تین سال کی عمر میں اس نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ہنس مکھ بچی کو نیو یارک کے ایک مہربان خاندان کا سایہ میسر آگیا۔ وہ وہاں بے حد خوش تھی۔ وہ لوگ بھی اس پر جان چھڑکتے تھے لیکن سوشل سروس کے کرتا دھرتاؤں نے صرف اٹھارہ ماہ بعد اسے کہیں اور منتقل کردیا اور اس طرح وہ شٹل کاک کی طرح ایک سرپرست سے دوسرے سرپرست کی طرف لڑھکتی رہی۔

لزی کو عام طور پر تعطیلات میں اور کبھی کبھی ویک اینڈ پر اپنے والدین سے ملنے کے لیے گھر بھیج دیا جاتا تھا لیکن چھٹیاں اس کے لیے کسی نوید کا پیغام نہیں لاتی تھیں۔ اسے یہ دن کاٹنے مشکل ہوجاتے اور گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا اور اس کا جی چاہتا کہ جلد از جلد چھٹیاں ختم ہوں اور وہ ہوسکے تو پر لگا کر اپنے سرپرست کے ہاں پہنچ جائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لزی کا باپ چھٹیاں منانے کا قائل نہیں تھا۔ تقاریب کا خیال ہی اس کے ذہن میں ہنگری کی خوف ناک یادوں کو تازہ کردیتا تھا جہاں اسے نفرت انگیز رسومات میں زبردستی شامل ہونا پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے ہاں کرسمس پر بھی تحائف کا تبادلہ نہیں ہوتا تھا۔ لزی کے لیے کرسمس خوشیوں کے بجائے افسردگی کا پیغام لے کر آتی اور سارا دن بدمزگی سے گزرتا۔

کہتے ہیں نا کہ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے معصوم ذہن دنیا کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتے وہ تو اپنے ننھے منے ذہن سے جو کچھ بھی سوچتے ہیں بس وہ حقیقت ہوتی ہے۔ اور جب بچوں کو ان کی من پسند چیزوں سے محروم رکھا جاتا ہے تو وہ تصور میں اپنے احساسِ محرومی کی تلافی کرنے کی سعی کرتے ہیں اور لزی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

جب وہ کرسمس کی چھٹیاں گزار کر اپنے سرپرست کے ہاں واپس جاتی تو وہ خالی ہاتھ ہوتی جبکہ اس کے سرپرست کے بچے انواع واقسام کے تحفوں سے لدے پھندے نظر آتے۔ وہ لزی کو باری باری تمام تحائف دکھاتے جو انہیں کرسمس پر ملے ہوتے اور جواباً لزی انہیں اپنے تخیلاتی تحائف کے بارے میں مزے لے لے کر جھوٹے سچے قصے گھڑ کر سناتی اور بچے حیرت کے مارے دانتوں میں انگلیاں داب کر اس کی باتیں سنا کرتے۔ ایک بار اس نے بچوں کو بتایا کہ اسے کرسمس پر ایک بڑا پیارا گڑیا گھر تحفے میں ملا تھا۔ بچوں کو بھی گڑیا گھر دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور انہوں نے استفسار کیا کہ وہ اتنا پیارا تحفہ اپنے ساتھ لے کر کیوں نہ آئی تو اس نے یہ کہہ کر ان کو مطمئن کردیا۔

”وہ کوئی چھوٹا موٹا گڑیا گھر تھوڑی ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اسے کار میں رکھ کر لے آؤں لیکن افسوس وہ کار میں پورا نہیں آسکا۔“

جلد ہی لزی کو احساس ہونا شروع ہوا کہ اسے دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے طور پر بھی کچھ کرنا چاہیے۔ وہ اپنے حقیقی اور منہ بولے والدین کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں سے تنگ آچکی تھی۔ وہ گھٹن کی اس فضا سے نکل کر اپنی ایک آزادانہ دنیا تخلیق کرنا چاہتی تھی جس میں اس کا ہر کام دوسروں کے بجائے اس کی اپنی مرضی سے ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی مرضی سے سوئے اور اپنی مرضی سے جاگے۔ وہ آزادی کے ایک ایک لمحے سے خوشیوں کو... کشید کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی بڑی بہن اینا اور اس کے تمام بھائی اپنے سرپرستوں کے ہاں سے بھاگ جاتے اور ہفتوں آوارہ گردی کرنے کے بعد جب جی میں آتی واپس آجاتے۔

اس طرح بھاگ جانے پر ان کی پٹائی بھی ہوجاتی لیکن لزی چپ چاپ مار پیٹ برداشت کرتی رہتی اور اُف تک نہ کرتی حالانکہ اپنے گھر میں ہونے والے تجربات کے بعد وہ یہ جان گئی تھی کہ مار سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اونچے سروں میں رونا شروع کردیا جائے لیکن ایسا لگتا تھا کہ مار پیٹ نے اس کے باپ کے نظریے کے مطابق اسے واقعی مضبوط بنادیا تھا اور وہ ڈھیٹ بنی مار کھاتی رہتی لیکن رو کر اپنی کمزوری کا اظہار نہ کرتی۔ دب کر رہنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

انہی دنوں لزی نے ہاروے کے گروہ میں بھی شمولیت اختیار کرلی۔ ہاروے انہیں کچھ تعداد میں ٹافیاں فراہم کردیتا جنہیں وہ اور اس کے بہن بھائی کاروباری مراکز کے پارکنگ لاٹس میں خود کو یتیم ظاہر کرکے لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ ہاروے کی ہدایات کے مطابق انہیں ایک ٹافی اڑھائی ڈالر میں بیچ کر پچاس سینٹ خود رکھ کر دو ڈالر فی ٹافی اسے دینے ہوتے تھے لیکن وہ لوگ بھی ایک کائیاں تھے۔ لزی اور اس کے بہن بھائیوں نے لوگوں کے جذبہ ترحم کو

ابھار کر ایک ٹافی تین ڈالر میں فروخت کرنی شروع کردی۔ اس طرح وہ فی ٹافی ایک ڈالر منافع بہ آسانی کمالیتے۔

کھیلنے کھلانے کی عمر میں ان بچوں کو زمانے کی ٹھوکروں نے وقت سے پہلے ہی شعور کی سطح پر لاکھڑا کیا تھا اور سارے داؤ پیچ سکھاڈالے تھے۔

لزی کی عمر تیرہ سال ہوگی جب اس نے اپنی بہن، اینا اور دو بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے سرپرستوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کے لیے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اپریل 1981ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ایک طرف بہار کی آمد آمد سے فطرت پر نکھار آگیا تھا۔ دوسری طرف آزادی کے تصور سے ان بچوں کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی اور وہ خوشی خوشی اسکول جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اسکول جاتے ہوئے وہ چوری چھپے کوڑا کرکٹ کے تھیلوں میں اپنا ضروری سامان بھی ساتھ لے گئے جس کی انہیں قدم قدم پر ضرورت پڑسکتی تھی۔

اسکول کے بجائے ان کا رخ نیویارک کے شمال مشرق کی طرف ہوگیا۔ ان کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی اور وہ شتر بے مہار کی طرح دندناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ان کی مٹرگشت کا اختتام مصروف ترین ہائی وے انٹراسٹیٹ 95 پر ہوا۔ تھکاوٹ سے چور ان بچوں نے ہائی وے کے دائیں جانب ڈیرا ڈال دیا اور درختوں کے درمیان صفائی کرکے اپنے کاٹھ کباڑ کی مدد سے ایک خیمہ سا کھڑا کرکے ایک نئی زندگی کا آغاز کردیا۔

یہ جگہ ان کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ ان کے واقف کاروں میں سے کسی کے بھی اس طرف پھٹکنے کا اندیشہ نہ تھا۔ یہاں ان کی آزادی میں مخل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ کھلے آسمان تلے آگ جلا کر اپنا کھانا بھی خود ہی تیار کرلیتے جس کا انہیں گھر میں پہلے ہی تجربہ ہوچکا تھا۔ آتے ہوئے وہ ہاروے سے کافی تعداد میں ٹافیاں بھی لیتے آئے تھے چنانچہ صبح وہ شاپنگ سینٹروں میں مسکین سی شکلیں بنا کر ٹافیاں بیچتے اور جو کماتے اسے شام کو فلم دیکھ کر اڑا دیتے یا اپنے کھانے پینے کے لیے کچھ بچا کر رکھ لیتے۔ انہوں نے یہ سوچنے کا تکلف بھی نہیں کیا کہ اس رقم میں سے ہاروے کا بھی حصہ نکلتا تھا بلکہ ساری کی ساری رقم ان کی جیب میں چلی جاتی اور اس طرح ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔

وہ اس خانہ بدوشوں کی سی بے پروا زندگی میں کچھ اس طرح مگن تھے کہ انہیں وقت گزرنے کا بھی پتا نہ چلا اور دبے پاؤں ایک ماہ گزر گیا۔ ان کی کوشش ہوتی کہ لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے احتراز کیا جائے کیونکہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی وہ بھی ایک دن پکڑ لیے گئے۔

ہوا یوں کہ لزی اور اینا تلاشِ معاش کے سلسلے میں ایک مقامی اسٹور پر پہنچے اور انہوں نے حصولِ ملازمت کے لیے اپنی عمروں کے بارے میں فراخ دلی سے جھوٹ بولا۔ اسٹور کے مالک کو ان پر شبہ گزرا اور اس نے پولیس کو اطلاع کردی اور تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اسی سسٹم کی طرف لوٹنا پڑا جس سے انہوں نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ لزی کو اس کے باپ کی تحویل میں دے دیا گیا اور زندگی پھر دلیسی گزرنے لگی۔

جب باپ کا رویہ اس کی برداشت سے باہر ہوجاتا تو وہ گھر سے باہر نکل آتی۔ اس نے اپنے شب و روز گزارنے کے لیے عجیب عجیب ٹھکانے ڈھونڈ رکھے تھے جن میں غلے کے ویران اسٹور اور بے آباد مکان شامل تھے۔ وہ کسی غیر مقفل کار میں داخل ہوکر چٹکی بجاتے سوجاتی اور نیند پوری کرکے باہر نکل آتی۔

ان دنوں وہ جذباتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھی۔ وہ بچپن اور جوانی کے سنگم پر کھڑی تھی۔ اسے والدین کی محبت کی حرارت درکار تھی جو اس کے دل کو گرما کر اسے دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کردے لیکن اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اسے سینے سے لگا کر پیار کیا ہو۔ شیرخوارگی میں اس کے باپ نے اسے کبھی پیار کیا ہو تو وہ بھی لزی کے لاشعور میں کہیں دفن تھا۔ جہاں تک اس کی ماں کا تعلق تھا، اس نصیبوں جلی کو اتنی پریشانیاں تھیں کہ اسے کبھی بھول کر بھی لزی کو پیار کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

فرار ہونے کے اگلے سال لزی کی ملاقات میری ایلن نامی ایک شفیق خاتون سے ہوئی۔ جس روز میری ایلن کی بیٹی لزی کو پہلی بار اپنے گھر لے کر گئی تو اس کا سوجا ہوا چہرہ دیکھ کر صاف نظر آتا تھا کہ کسی نے اسے بری طرح پیٹا تھا۔ میری ایلن اس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئی لیکن لزی کا اصرار تھا کہ وہ ٹھیک ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس نیک دل خاتون کی آنکھیں نم ہوگئیں اور اس نے اپنی آنکھوں میں تیرتی شبنم کو چھپانے کے لیے لزی کو سینے سے چمٹالیا لیکن لزی کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا بلکہ اس نے میری ایلن کو دلاسا دینے کی کوشش کی جیسے اس کے ساتھ نہ ہوا ہو۔

اس زمانے میں لزی کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آ گئی۔ وہ ہر ایک سے خوش دلی سے ملتی اور خاص طور پر بڑوں سے گفتگو کرنا پسند کرتی۔ شاید زمانے کے سخت تھپیڑوں نے اس سے بچپن کی ساری شوخی چھین لی تھی اور اسے ذہنی طور پر بالغ کر دیا تھا۔ اس کی فطرت کا ایک پہلو فیاضی بھی تھا۔ میری ایلن کے پاس لزی کا دیا ہوا پتھر کا ایک مجسمہ آج بھی بطور یادگار محفوظ تھا جو کہ اس نے اپنے پیسوں سے خرید کر تحفتاً دیا تھا۔

جلد ہی اس نے میری ایلن کو بھی خیر باد کہہ دیا اور اب وہ صحیح معنوں میں آوارہ گرد ہو گئی تھی۔ نہ اس کے دل میں کوئی ارمان رہا تھا اس کی کہانی کا کوئی عنوان نہیں رہا تھا۔ اس آوارہ گردی نے اسے بے شمار گرم سرد تجربات سے گزارا تھا اور یہ تجربات اس کی آئندہ زندگی میں اس کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ان تجربات سے گزرنے کے بعد وہ کندن بن گئی تھی۔ اس دور کے مصائب و آلام نے اسے زندگی سے مایوس ہونے کے بجائے زندگی سے محبت کا درس دیا۔ بچپن کی یہ یادیں اس کی زندگی کا عظیم سرمایہ تھیں اور وہ اپنے بچپن کی ان غیر معمولی یادوں کو دہراتے ہوئے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتی۔

اب لزی نے سولہویں سال میں قدم رکھ دیا تھا۔ حسن اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ اب وہ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر بالغ سمجھتی تھی اور ذمے داری سے زندگی بسر کرنے کی خواہاں تھی۔ اب وہ محض بچی نہیں رہی تھی بلکہ ایک بھرپور دوشیزہ بن چکی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ حوادث زمانہ نے اس کے رنگ روپ کو خوب نکھار دیا تھا اور راہ چلتے ہوئے لوگ رک کر اس کے دلکش سراپا پر ایک نظر ضرور ڈالتے تھے۔

اب اسے پیٹ کی فکر کے ساتھ ساتھ اپنے حسن کی حفاظت کی بھی فکر دامن گیر ہو گئی کیونکہ اب اسے لوگوں کی ہوس ناک نگاہوں کو پہچاننا آ گیا تھا۔ اب وہ تیرہ سال کی لزی نہیں رہی تھی جو کسی غیر مقفل کار میں چٹکی بجاتے سو جاتی۔ اسے سر چھپانے کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی چنانچہ جب میری ایلن نے دوبارہ اسے اپنے ہاں رہنے کی پیشکش کی تو اس نے بلا تامل قبول کر لیا اور ساتھ ہی اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے آئس کریم کی ایک دکان پر ملازمت اختیار کر لی تاکہ وہ میری ایلن پر بوجھ نہ بنے۔

میری ایلن کے مشفقانہ رویے کی بدولت لزی میں بہت سی صحت مند تبدیلیوں نے جنم لیا۔ دراصل میری ایلن کے اندر ایک ماممتا بھرا دل چھپا ہوا تھا اور وہ لزی کو بھی اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھی۔ وہ شروع ہی سے لزی کو منشیات کے استعمال سے منع کرتی آ رہی تھی اور اب جبکہ لزی نے دنیا کو بالغ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا، میری ایلن کی نصیحتوں کا خاطر خواہ اثر ہونے لگا۔ ایک بار میری ایلن کو ایک ایسے اسپتال میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ایسے بچوں کا علاج کیا جاتا تھا جنہیں ان کی نشے باز ماؤں نے جنم دیا تھا۔ ان بچوں کو دیکھ کر میری ایلن کا دل بھر آیا اور اسے خیال آیا کہ ان بچوں کا کیا قصور تھا جس کی سزا انہیں پیدا ہوتے ہی مل رہی تھی۔ ظاہر ہے سارا کیا دھرا ان کی ماؤں کا تھا اور اسی نکتے کو بنیاد بنا کر میری ایلن گھنٹوں لزی کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی کہ وہ نشے کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر لے اور بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور لزی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نشے سے توبہ کر لی اور اب چپکے سے اسٹیون ولینڈا اس کی زندگی میں در آیا تھا۔

ابتدا میں اسٹیون ولینڈا نے اسے اس فن کی بنیادی باتیں ہی سکھانے پر اکتفا کیا مگر لزی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تار پر چلنا سیکھ لے گی تاہم اسے تار پر چلنے کا آئیڈیا پسند آیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اسٹیون کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے تار پر چلنا شروع کر دیا۔ کام مشکل ضرور تھا لیکن اسٹیون کے مضبوط جسم کو تھام کر اسے تحفظ کا احساس ہوتا اور گرنے کا خوف جاتا رہتا۔ وہ خود بھی توازن اور اعتماد کی دولت سے مالا مال تھی اور اسٹیون ایسے ہی تو اس کا دیوانہ نہیں ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لزی ایک روز ایک عظیم فنکارہ بن کر ابھرے گی۔

لزی نہیں جانتی تھی کہ اپنے اس شیدائی کا کیا کرے لیکن میری ایلن ان کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے خائف تھی۔ اس نے لزی کو سمجھایا کہ اسٹیون ایک سیلانی آدمی ہے۔ ایسے آدمی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے اور وہ کہاں تک اس کے ساتھ ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ میری ایلن کے خیال میں اسٹیون اور لزی کا آپس میں جوڑ نہیں بنتا تھا اس لیے لزی کو اس سے الگ ہو جانا چاہیے لیکن دوسری طرف اسٹیون کے دل میں لزی کے لیے محبت کی جو چنگاری پیدا ہوئی تھی، اب وہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس آگ نے لزی کے وجود کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

پہلی ملاقات کے صرف چند روز بعد ہی اسٹیون نے ایک انوکھی پیشکش کر کے لزی کو حیران کر دیا۔

"اینجل! تم میرے ساتھ جمیکا چلوگی؟" اس نے بے تابی سے کہا۔ "وہاں میں ایک مظاہرے کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔"

"جمیکا......؟ اتنی دور میں کس طرح جاسکتی ہوں؟" لزی حیرت زدہ رہ گئی۔

"دور تو ہے لیکن اس سفر سے تمہیں اس فن کو سیکھنے کا ایک بہتر موقع مل سکتا ہے۔" اسٹیون نے آنکھوں میں امید کے دیے جلاتے ہوئے کہا۔

"میں زیادہ سے زیادہ نیوجرسی تک جاسکتی ہوں۔" لزی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ یہ بھی ایک طرح سے انکار ہی تھا لیکن لزی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ واقعی اسے نیوجرسی چلنے کے لیے کہتا تو وہ جانے کے لیے تیار بھی ہوجاتی۔ اسے انکار کرتے ہوئے افسوس تو ضرور ہوا تھا کیونکہ اس طرح نہ صرف وہ مزید سیکھنے کا ایک سنہری موقع کھو رہی تھی بلکہ اسٹیون کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھودینے کا خدشہ بھی نظر آرہا تھا جو کہ اس کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا تھا۔ مزید برآں اس کے ذہن میں کھدبدی ہونے لگی کہ ان کی ملاقات کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور اسٹیون نے اتنی بڑی پیشکش کس طرح کردی۔ کیا، اس نے مجھے بالکل ہی لاوارث سمجھ رکھا ہے کہ جدھر منہ اٹھا چلی جاؤں؟ اس نے سوچا۔

اسٹیون کو لزی کے انکار سے مایوسی تو ہوئی لیکن اس نے جو پروگرام مرتب کیا تھا، اب اسے ملتوی کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ لزی سے رخصت ہوا۔

جمیکا میں کام مکمل کر کے اسٹیون فی الفور نیویارک کے ایک علاقے میں آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ لزی سے ملنے کا پروگرام بناتا وہ خود ہی اخبار میں اس کی آمد کے بارے میں پڑھ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے آنے سے اسٹیون کو اپنی محبت پر یقین آنے لگا۔ باتوں سے نوبت ملاقاتوں تک پہنچی اور اگلے دو ماہ تک دونوں میں شدومد سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ روز بروز لزی کے دل میں کھبتا چلا گیا۔ لزی اس سے بے حد متاثر تھی کیونکہ اسٹیون اس کی زندگی میں پہلا شخص تھا جو خلوصِ دل سے اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اسٹیون نے کچھ عرصہ ویت نام میں جنگ کی حالت میں بھی گزارا تھا اور جنگ سے لوٹنے کے بعد بھی جنگ کے بد اثرات اس پر اس طرح چھائے رہے کہ وہ دنیا سے الرجک ہوتا چلا گیا۔ دراصل اس نے ویت نام میں انسانی خون کو اتنا ارزاں دیکھا تھا کہ اب اس کا زندگی سے ایمان ہی اٹھ گیا تھا اور وہ سکون کی خاطر الکوحل اور مسکن ادویات کا عادی ہوگیا تھا۔ چونکہ لزی خود اس تجربے سے گزر چکی تھی اس لیے اس نے منشیات کی لعنت سے چھٹکارا دلانے کی سنجیدگی سے کوشش شروع کردی اور لزی کے دم قدم سے نشہ اسٹیون کی زندگی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔

ان کی پہلی ملاقات کو ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اسٹیون نے لزی کو پروپوز کردیا۔ وہ ابھی جواب دینے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"اینجل! میں صرف تمہارے حسن کا ہی پجاری نہیں ہوں بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تم میرے ہی جسم کا ایک حصہ ہو اور تمہیں صرف اور صرف میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔"

اس کے بعد لزی کے لیے پس وپیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دنیاداری کے معاملات سے بخوبی آگاہ ہونے کی وجہ سے لزی نے پختہ عمر اسٹیون کو اپنی عمر سترہ کے بجائے اکیس سال بتائی تھی اور اسٹیون نے رتی برابر بھی شک وشبے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن جب وہ شادی کی غرض سے بذریعہ ٹرین نیویارک سٹی کی طرف سفر کررہے تھے تو لزی پر ایمانداری کا دورہ پڑ گیا اور اس نے اسٹیون کو حقیقتِ حال سے آگاہ کردیا۔

اب اسٹیون کا ذہن کھٹکا کہ لزی اس کی ملاقات اپنے والدین سے کیوں نہیں کرواتی تھی اور خود وہ اس بات کو ایک لحاظ سے اپنے حق میں بہتر ہی سمجھتا تھا کیونکہ میری ایلن نے پہلے ہی اس کے خلاف محاذ کھڑا کر رکھا تھا اور لزی کے والدین بھی ضرور مین میخ نکالنے کی کوشش کرتے تو مسئلہ پیدا ہوسکتا تھا اور مسئلہ تو پیدا ہوچکا تھا۔

قانون کی رو سے لزی ابھی نابالغ تھی اور اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بلوغت کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔ اسٹیون کو فکر ہوگئی کہ اس پر کہیں نابالغ لڑکی کو بھگا کر لے جانے کا الزام نہ لگ جائے چنانچہ نیویارک پہنچتے ہی اس نے لزی کے باپ کو فون کیا اور اپنا تعارف کروایا تو مسٹر پنٹیا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسٹیون نے اسے فون کیوں کیا تھا۔ اسٹیون نے اسے بتایا کہ اس کی بیٹی نے سرکس میں شمولیت اختیار کرلی تھی اور اگر اسے کوئی اعتراض ہے تو بتادے لیکن مسٹر پنٹیا نے چھوٹتے ہی کہا کہ لزی اس کی طرف سے آزاد تھی اور جو اس کے جی میں آئے کرے اسے کوئی

اعتراض نہیں۔ یہ سن کر اسٹیون نے اطمینان کی سانس لی۔ ویسے اس نے سرکس کی شمولیت کے بارے میں جھوٹ گھڑا تھا کیونکہ ان دنوں سرکس بند تھا۔ اس وقت لزی کو اپنے باپ سے ملے دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز اپنی مرضی سے کرسکتی تھی۔

اگست 1985ء میں الزبتھ پنٹیا سول میرج کے ذریعے ہمیشہ کے لیے اینجل ولینڈا بن گئی۔ دونوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی اور انہیں ایک دوسرے کی صورت میں جیسے خوشی کا ایک خزانہ ہاتھ آگیا تھا۔ دونوں بیک وقت طالب بھی تھے اور مطلوب بھی۔ ایسے میں کسے پڑی تھی کہ وقت کا شمار کرتا لیکن وقت کے گھوڑے کی تو دلکی چال ہی بہت کچھ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ کئی روز تک دونوں ایک دوسرے میں اس طرح کھوئے رہے کہ انہیں وقت گزرنے کا پتا نہ چلا اور وہ ہنی مون کے لیے ٹرپ پر بھی نہ جاسکے۔

چند روز بعد اسٹیون نیوجرسی کے ایک قصبے میں تار پر اپنے فن کا مظاہرہ کررہا تھا۔ ایک تار کو زمین سے 45 درجے کے زاویے پر 60 فٹ کی بلندی تک لے جا کر ایک کرین کی چوٹی سے منسلک کردیا گیا۔ اس کے بعد اسٹیون نے تار پر چڑھنا شروع کردیا۔ اس کا شو دیکھنے کے لیے لوگ دیوانہ وار امڈے پڑ رہے تھے۔ تار پر شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہ زمین پر واپس آیا اور اس نے اینجل کو بھی تار پر ایک چوتھائی راستہ طے کروایا۔ اس شو کے ذریعے اینجل پہلی بار اسٹیون کی بیوی اور پارٹنر کے طور پر لوگوں کے سامنے آئی۔ اسے تماشائیوں کو جھک کر سلام پیش کرنا، ان کے نعرے سننا اور ہاتھ ہلا کر ان کا جواب دینا بہت اچھا لگا۔ اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ ولینڈا کے ساتھ اس کی زندگی کتنی شاندار ہوگی۔

اس مظاہرے کے بعد جلد ہی یہ جوڑا مغرب میں کیلی فورنیا کی طرف ڈرائیو کررہا تھا۔ اینجل اپنی نئی زندگی سے بہت خوش تھی۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس نے نئے سرے سے جنم لیا ہو۔ دورانِ سفر صاف ستھرے موٹیلز میں رہنا، انٹراسٹیٹ 95 کے پہلو میں اکھڑے پھکڑے خیمے میں رہنے سے سو درجے بہتر تھا۔ جوانی کے دن تھے اور مرادوں کی راتیں۔

دس روز تک وہ جنوبی راستے پر گامزن رہے اور اس دوران گاڑی روک کر ان قابلِ دید مقامات کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے جن کا اینجل نے صرف نام سن رکھا تھا۔ وہ دریائے کالوریڈو پر تعمیر شدہ ہوور ڈیم کی سیر سے بھی محظوظ ہوئے لیکن بحرالکاہل کے دلکش نظارے نے تو اینجل کو مسحور کرکے رکھ دیا۔ قبل ازیں اسے ساحلِ سمندر پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پانی میں چھپاک سے چھلانگ لگانا اور تیرنا اینجل کے لیے ایک نہایت ہی خوش کن تجربہ ثابت ہوا۔ انہوں نے کئی ماہ لاس اینجلز میں مدہوشی کی سی کیفیت میں گزار دیے۔

بعدازاں وہ لاس اینجلز سے اڑھائی گھنٹے کی مسافت پر پہاڑوں میں واقع بگ بیئرسٹی پہنچے اور وہیں رہائش اختیار کرلی۔ اسٹیون نے نئے گھر کے قریب بلند شاخوں والے دو درخت تلاش کرلیے اور ایک تار لے کر اس کے سروں کو دونوں درختوں سے تین فٹ کی بلندی پر کس کر باندھ دیا۔ اینجل کو توازن قائم رکھنے کے لیے کچھ پونڈ وزنی بانس کی ضرورت تھی اور ٹریننگ کے دوران اسے یہ بانس مسلسل ہاتھوں میں اٹھائے رکھنا ہوتا تھا جو کہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ بانس کو آرام دہ انداز میں پکڑنے کے بجائے بازوؤں کو نیم وا کرکے ہاتھوں میں پکڑنا ہوتا تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور مستقل مزاجی سے پریکٹس کرتی رہی۔

شروع شروع میں اس نے تار پر اسٹیون کے پیچھے پیچھے چلنے اور اس کے کندھوں پر چڑھنے میں مہارت حاصل کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اینجل کا پانچ فٹ پانچ انچ قد تار پر چلتے ہوئے بازیگر کے کندھوں پر سوار ہونے کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن اسٹیون نے اپنی خاندانی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہونے دیا۔

جب اینجل نے تین فٹ بلند تار پر چلنا بخوبی سیکھ لیا تو اسٹیون نے تار کو دس فٹ کی بلندی پر لے جا کر باندھ دیا لیکن اینجل نے جیسے ہی دس فٹ کی بلندی سے نیچے زمین کی طرف نگاہ دوڑائی اسے جھرجھری آنے لگی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی ساری ٹریننگ بھول گئی ہو اور اسے دس فٹ کی بلندی پر نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا۔ دس فٹ بلند تار پر مشق کرتے ہوئے وہ کئی بار پھسلی لیکن وہ ہر بار تار کو اپنی گرفت میں لے لیتی اور اس طرح زمین پر گرنے سے بچ رہتی۔

اگرچہ ٹریننگ بہت سخت تھی مگر اینجل نے تار پر چلنے کو اپنا مشن بنالیا تھا۔ اس لیے ٹریننگ کے دوران پیش آنے والی تمام تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کررہی تھی۔ روزانہ تار پر نت نئے تجربات کرنا اسے بہت بھاتا تھا۔

چند ماہ سے اینجل کو سینے میں ہلکی ہلکی سی تکلیف محسوس

ہو رہی تھی جسے اس نے معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا لیکن ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا کہ جب بھی اسے کھانسی آتی تو منہ سے کچھ خون بھی آنے لگتا۔ اینجل اس صورتِ حال سے پریشان ہو گئی۔ اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ اس نے فوراً ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور متعدد ٹیسٹوں اور معائنے کے بعد جو تشخیص سامنے آئی، وہ اینجل کے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کا بھی باعث تھی۔ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اسٹیون کو پا کر اسے اپنے خواب کے ایک حصے کی تعبیر مل گئی تھی اور دوسرے کی تعبیر جلد ہی ملنے والی تھی۔

''ونڈرفل!'' اینجل نے ماں بننے کی خبر سن کر ڈاکٹر سے کہا۔ ''لیکن منہ سے خون آنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی؟''

ڈاکٹر نے بتایا کہ غالباً اس کے پھیپھڑے کی کسی چھوٹی رگ کے شق ہو جانے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس سلسلے میں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں تھی اور بچے کی پیدائش کے بعد خون آنے کی شکایت خودبخود رفع ہو جائے گی۔

سخت ٹریننگ کی وجہ سے اینجل کے دائیں ٹخنے کی ایک پرانی چوٹ نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل گیارہ برس کی عمر میں اس کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے بہت تکلیف محسوس ہوتی لیکن اس کی سرپرست خاتون نے اسے اس کی بہانے بازی پر محمول کیا اور توجہ نہ دی۔ اس کے بعد اینجل بھی بھول بھال گئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ٹخنے کے سامنے کے حصے میں ایک نرم سا گومڑ بن گیا جسے دبانے پر درد کی ٹیسیں ابھرتیں جو بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتیں۔

اب ٹخنے کی تکلیف بھی شدت اختیار کر گئی اور خون تھوکنا بھی جاری تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ایکسرے رپورٹ سے اس کے سینے یا ٹخنے میں کسی خرابی کی نشاندہی نہیں ہوتی تھی اور ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اگر بچے کی پیدائش کے بعد دونوں تکالیف خودبخود رفع نہ ہوئیں تو وہ اس کے لیے کسی اسپیشلسٹ کی سفارش کریں گے۔

اپنے پیٹ میں ہمکتے ہوئے بچے کا خیال اینجل کی پریشانیوں کو کم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچے کی تخلیق سے اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس کے دوستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ آنے والے بچے کا پیار ان تکلیف دہ علامات کو رفع کرنے میں معاون ثابت ہوگا مگر آنے والے حالات کسی بہت بڑے طوفان کی نشاندہی کر رہے تھے جن کا اینجل کے ڈاکٹروں کو سان گمان تک نہ تھا۔

اسٹیون ولینڈاٹو کی پیدائش کے بعد جلد ہی اینجل نے اپنی ٹریننگ کو از سرِنو شروع کر دیا۔ اس دوران اس کا گل گوتھنا سا بچہ بھی تار کے ایک طرف پالنے میں پڑا ہوتا۔ اب انہوں نے اپنے فن کے مظاہروں کی پلاننگ کرنی شروع کر دی تھی لیکن ٹریننگ کے سخت معمولات انہیں کسی اسپیشلسٹ کے پاس جانے سے روکے رہے۔ دراصل اینجل کی شکایات بچے کی پیدائش کے بعد برقرار تھیں لیکن ڈاکٹر کئی ماہ کی کوششوں کے بعد بھی اس کے مرض کی صحیح تشخیص کرنے میں ناکام رہے تھے۔

خدا نے اینجل کو بے پناہ قوتِ برداشت سے نوازا تھا اور وہ بیماری کو اپنی زندگی پر اثرانداز ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی لیکن تشخیص میں تاخیر اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسوں کو جنم دے رہی تھی جس کے باعث اسے اپنے کام پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ حقیقتِ حال اس پر واضح ہو جائے کیونکہ اس نے خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے تیار کر رکھا تھا لیکن جب ڈاکٹر اسی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو اینجل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ پھٹ پڑی۔ اس نے خود کو سان برنارڈینو کاؤنٹی میڈیکل سینٹر کے ایمرجنسی روم میں اپنے ریکارڈ کے ہمراہ پیش کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک عمارت سے قدم باہر نہیں نکالے گی جب تک وہ صحیح تشخیص نہیں کریں گے۔

ڈاکٹروں کے لیے اینجل ایک چیلنج بن کر سامنے آئی تھی۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کے مکمل حالات معلوم کیے اور پھر اس کے ٹخنے کی بائیوپسی کر کے منی سوٹا کے... کلینک میں معائنے کی غرض بھجوا دیا۔ اینجل بڑی شدت سے نتائج کی منتظر تھی اور ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہی تھی کہ میو کلینک سے رزلٹ کے بجائے دوسرے ٹخنے کی بائیوپسی طلب کی گئی۔ اس بار ڈاکٹروں نے نسبتاً گہری بائیوپسی کر کے اسے... کلینک کی طرف روانہ کیا۔

آخرکار رزلٹ کا دن بھی آن پہنچا اور جب ڈاکٹروں نے اسے نتائج سے آگاہ کیا تو اسے اپنے قدموں کی نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ اسے بتایا گیا کہ وہ ٹخنے کے خلیوں کے کینسر ''لیومیوسارکوما'' کا شکار تھی جو کہ شاذ ہی کسی کو ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے سرجری کروانے کا مشورہ دیا۔

اینجل نے تو سوچا تھا کہ اس کی آزمائش کے دن ختم ہو گئے تھے لیکن ابھی تو آزمائشوں کا آغاز ہوا تھا۔ اس کی بیس سالہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر بڑے سے بڑا واقعہ بھی

اسے متزلزل نہ کر سکا تھا اور اب بھی اسے اپنی بیماری کی پروا نہ تھی بلکہ اسے یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کی بیماری کا سن کر اسٹیون کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ اپنے محبوب شوہر کی زندگی پر کسی غم کا سایہ تک پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی پھر اسے اپنے ایک سالہ بچے کا خیال ستانے لگا۔ اگر معاملہ مزید بگڑ گیا تو اس کے ننھے اسٹیون کا کیا بنے گا؟ یہاں آکر اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا اور آگے سوچتے ہوئے وہ لرز جاتی۔

اب اینجل کو محسوس ہوا کہ محبت انسان کو کتنا کمزور بنا دیتی ہے۔ وہ جس نے لڑکی کے روپ میں آنسوؤں کو بھی اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دیا، آج اپنے شوہر کے سامنے اینجل کے روپ میں بلک پڑی۔ اسٹیون نے اس کے گلاب رخساروں کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا اور اپنے انگوٹھوں سے اس کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔ اسٹیون کے دلاسا دینے سے اینجل نے اپنے اوپر قابو پالیا اور آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

اینجل کو سرجری کے لیے سٹی آف ہوپ نیشنل میڈیکل سینٹر میں اگست 1987ء کے اوائل میں داخل کر دیا گیا اور ڈاکٹروں نے بتایا کہ کینسر کافی پھیل چکا ہے اور بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جاتی چنانچہ اگست 1987ء کے اواخر میں گھٹنے کے عین نیچے سے اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔

اب اینجل نے حالات کو ہمت سے قبول کر لیا تھا اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ کی طرح پُرامید تھی۔ وہ اپنی معذوری کو بوجھ بنا کر نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے خیالات اسی ایک نقطے کے گرد گھومتے رہتے کہ اسے تار پر دوبارہ چلنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے لیکن ڈاکٹروں نے اسے اس تلخ حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ وہ تار پر چلنے کا خیال دل سے نکال دے۔ اب وہ کبھی تار پر نہیں چل سکے گی اور وہ شاید ڈاکٹروں کی رائے کو کوئی اہمیت نہ دیتی اگر ولینڈا فیلی کا ایک تجربہ کار بازی گر اسے متنبہ نہ کرتا کہ اس کے لیے تار پر چلنے کی کوشش سراسر فضول ثابت ہوگی۔ اس ماہر کا یہ نقطہ نظر تھا کہ پاؤں کی حس اور ٹخنے کی لچک کی عدم موجودگی میں اینجل کے لیے تار پر چلنا ایک معجزہ ہی ہو سکتا تھا لیکن وہ نہ جانے کیوں یہ معجزہ دکھانے پر بضد تھی اور اپنی کارکردگی کے بارے میں پُریقین تھی۔

اب اسے اپنی مصنوعی ٹانگ کے لگنے کا انتظار تھا۔ پہلے تو کئی ماہ تک اس کی فزیکل تھراپی کی جاتی رہی۔ اس کے بعد اس نے بیساکھیوں سے چلنا سیکھا پھر اس نے چھڑی کا استعمال سیکھا اور آخر میں وہ اپنی مصنوعی ٹانگ سے چلنے کے قابل ہوئی۔ اس سارے عرصے کے دوران وہ تار پر چلنے کے تصور کو اپنے ذہن سے جھٹک نہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے قبل مصنوعی ٹانگ کے ساتھ تار پر چلنے کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں تھی پھر بھی وہ ناممکن کو ممکن بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں خوش آئند بات یہ تھی کہ اب وہ ہر لحاظ سے صحت مند تھی اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کینسر جڑ سے ختم ہو چکا تھا۔

آخر کار ٹانگ کاٹے جانے کے چار ماہ بعد اینجل اپنی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ تار پر چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس کا شوہر اسٹیون دھڑکتے دل کے ساتھ تار کے نیچے کھڑا تھا اور دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کر رہا تھا۔

اینجل نے اپنے مصنوعی پاؤں پر نظر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ تار پر قدم بڑھانے شروع کر دیے اور جب وہ بحفاظت تار کے دوسرے سرے پر پہنچی تو اسٹیون خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا۔

اینجل نے اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر واقعی ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ تار پر چلنے والوں کی تاریخ میں یہ واقعہ کسی معجزے سے کم نہ تھا لیکن یہ کیا...... اینجل نے مڑے بغیر ہی الٹے رخ تار پر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ نیچے اسٹیون کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ اس بے چارے کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اینجل شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی جب تار کے درمیان میں پہنچی تو اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو پہلے ہی ساکت و سامت کھڑا اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور اینجل نے پیار بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دی۔

اسی رات اینجل کے سینے کے درد نے شدت اختیار کر لی اور یکا یک اس کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں ایمرجنسی روم میں ڈاکٹروں نے پھیپھڑے کے انشقاق کی تشخیص کی۔ اینجل کے استفسار پر اسے بتایا گیا کہ اس بیماری کا خون تھوکنے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سخت جسمانی مشقت کرنے والا کوئی بھی شخص پھیپھڑوں کے انشقاق کا شکار ہو سکتا تھا۔ اینجل کے متاثر پھیپھڑے کو خون سپلائی کر کے ٹیسٹ شروع کر دیے گئے۔

اسپتال میں اینجل کی دوستی اپنی روم میٹ 33 سالہ ڈارلین وائٹ سے ہو گئی جو کہ سرجری کے سلسلے میں اسپتال

میں داخل تھی۔ دو ہی روز میں وائٹ انیس سالہ اینجل کی ہمت اور حوصلے کی معترف ہوگئی اسے حیرت تھی کہ اتنے نازک حالات میں بھی اینجل کی روایتی خوش دلی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا حالانکہ پھیپھڑوں کے کینسر کا قوی امکان تھا لیکن اس کے نزدیک مایوسی گناہ تھی۔ اسے امید تھی کہ ہر حال میں بہتری کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکل آئے گی۔

قدرت بھی شاید اینجل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے پر تلی ہوئی تھی۔ کوئی خطرناک بات نہ پاکر اسے جلد ہی فارغ کردیا گیا لیکن اس کی مثال ایسے ہی تھی جیسے سمندری طوفان آنے سے پہلے لہریں پُرسکون ہوجاتی ہیں۔ اینجل کی زندگی میں بھی ایسا ہی ایک خوف ناک طوفان آنے والا تھا جس کی تلاطم خیز موجیں اس کے چھوٹے سے گھروندے کو تہ و بالا کردینے کے لیے کافی تھیں۔

اسپتال سے فارغ ہونے کے تین ہفتوں بعد اسی پھیپھڑے میں دوبارہ تکلیف شروع ہوگئی۔ اینجل کو پھر اسپتال لے جایا گیا جہاں ایک ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مسئلہ اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے ضرور دال میں کچھ کالا ہے چنانچہ اینجل کو سٹی آف ہوپ نیشنل میڈیکل کالج کی طرف منتقل کردیا گیا اور نئے سرے سے ٹیسٹ لیے گئے۔

جلد ہی پھیپھڑے میں کینسر کی تشخیص کرلی گئی جو کہ بائیں پھیپھڑے میں سرایت کرچکا تھا۔ سرجنوں نے اس کے متاثرہ پھیپھڑے کا تقریباً نصف حصہ کاٹ کر نکال دیا۔ تین ماہ بعد ایک اور آپریشن کے ذریعے اس کے دائیں پھیپھڑے کا بھی کچھ حصہ نکال دیا گیا۔

اینجل کی صحت بحال ہونے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ پھیپھڑوں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اسے یہ غم بھی کھائے جارہا تھا کہ اس کا شوہر اس کے بغیر کیسے کام نمٹاتا ہوگا۔ اسٹیون کی نسبت اس کے بچے کو اینجل کی زیادہ ضرورت تھی۔ اتنی بے بسی اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کی تھی۔ دوسری طرف بعض ڈاکٹروں کی بے پروائی پر بھی اس کا پارہ چڑھنے لگتا لیکن اپنی فطری زندہ دلی کے باعث وہ جلد ہی اپنے منفی خیالات پر قابو پالیتی اور اس نے کبھی کسی ڈاکٹر پر اپنا غبار نکالنے کی کوشش نہیں کی۔

1988ء کا موسم بہار بھی ولینڈاز سے روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ ان دنوں ولینڈا خاندان معاشی اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ ایک طرف ڈاکٹروں کے بھاری بھرکم بل کمر توڑ دینے کے لیے کافی تھے اور دوسری طرف اسٹیون کام جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اینجل کے

نشان

ڈاکٹر نے ایک نوجوان عورت کے زخمی بازو کی ڈریسنگ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آپ کو کس جانور نے کاٹا ہے۔ نہ تو کتے کے کاٹے کا نشان ہے اور نہ بلی کے......''

عورت جلدی سے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہاں آپ کا تجربہ کام نہیں آئے گا۔ یہ تو ایک عورت کے کاٹے کا نشان ہے۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ۔ حسن ابدال

لیے اس عمر میں اتنے بڑے بحران پر قابو پانا انتہائی دشوار تھا لیکن وہ ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کی عادی تھی اور اس کے لیے روشن پہلو یہ تھا کہ کینسر کا قلع قمع ہوچکا تھا اور وہ تار پر چلنے کی کوشش کرسکتی تھی۔

شروع دن سے ان کا بیٹا اسٹیون ان کی ٹریننگ کے دوران تار کے قریب ہی پالنے میں پڑا ہوتا تھا اور اپنے ماں باپ کو تار پر کرتب کرتے دیکھ کر ان کی نقل اتارنے کی کوششیں کرتا تھا اور جب اسٹیون اسے تار کے اوپر سے آواز دیتا تو وہ خوشی سے قلقاریاں مارنے لگتا۔ بارہ ماہ کی عمر تک اسٹیون ٹو نے سہارے کے بغیر کھڑا ہونا شروع کردیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ رینگ کر چلنے کے بجائے اس نے جلد ہی پاؤں کے سہارے قدم قدم چلنا شروع کردیا تھا اور پھر دنیا کے سب سے کم عمر بازی گر کی حیثیت سے اس نے عوام کے سامنے ورزشی جھولے میں جھول کر دکھانا شروع کردیا۔ بعدازاں اس نے تین فٹ اونچے تار پر چلنے کی کوشش بھی شروع کردی اور اس دوران اس کا ایک ہاتھ اینجل کے ہاتھ میں ہوتا۔

جولائی 1988ء میں معاشی بحران کا شکار اس خاندان نے واپس نیویارک کے لیے رخت سفر باندھا اور وہاں اپنے عزیزوں کے ہاں رہائش اختیار کرلی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی ٹریننگ بھی جاری رکھی۔

عام حالات میں تار پر چلنے کے لیے اچھی خاصی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ توازن قائم رکھنے کے لیے بانس کا وزن (اسٹیون کے لیے 65 پونڈ اور اینجل کے لیے 35 پونڈ) ہی جسم کے پٹھوں کو تھکا دینے کے لیے کافی تھا۔

توازن قائم رکھنے کے لیے ہوا کے دباؤ اور تار کی حرکت پر بہت زیادہ ارتکاز کرنا پڑتا ہے اور اگر ایک تار پر ایک سے زیادہ افراد کرتب دکھا رہے ہوں تو ہر فنکار کو دوسرے فنکار کی انفرادی حرکت کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا اینجل اپنے نصف پھیپھڑے کے ساتھ یہ کام سرانجام دے سکے گی؟ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ عام حالات میں دوڑتے ہوئے جتنا فاصلہ بہ آسانی طے کر لیتے تھے، اب اس کا نصف طے کر کے ہی آپ کی سانس پھولنے لگے اور اینجل اتنی بلندی پر اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ مزید برآں جب وہ تھوڑی کو اوپر اٹھانے کی ورزش کرتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے سینے کے اندر اس کے پٹھے کھنچے جا رہے ہوں اور درد کی شدید لہر اٹھتی اور جب وہ اپنے ہاتھوں کو اپنے سر کے اوپر لے جانے کی کوشش کرتی تو اسے سینے کے اندر کھوکھلے پن کا احساس ہوتا جس سے اسے اپنے پھیپھڑوں کے کاٹ دیے جانے کا خیال آ جاتا اور مصنوعی ٹانگ اس سب پر مستزاد تھی۔

تاہم اینجل نے ان مسائل کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور گھنٹوں تار پر چلنے کی مشق کے بعد اپنے بے مثال عزم وہمت سے کام لے کر وہ اپنی تمام معذوریوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی اور ایک روز وہ چودہ فٹ بلند اور پینتیس فٹ لمبی تار پر اپنی پہلی سولو واک کے لیے تیار کھڑی تھی۔ تار کے نیچے اسٹیون اسے ہدایات دینے کے لیے موجود تھا۔

ابھی وہ پلیٹ فارم پر ہی تھی کہ زندگی میں پہلی بار اس پر خوف وہراس سے سکتہ طاری ہو گیا۔ یک بیک اسے طرح طرح کے وسوسوں نے گھیر لیا۔ اس کے ذہن میں ان لوگوں کا خیال آنے لگا جو چودہ فٹ کی بلندی سے گر کر موت کے منہ میں چلے گئے تھے یا پھر زندگی بھر کے لیے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے پھر اسے اسٹیون کے دادا کارل ولینڈا کا خیال آیا جو 1978ء میں دو دس منزلہ عمارتوں کے درمیان تنی ہوئی تار پر چلنے کے دوران گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے خوف سے جھرجھری لی اور اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

اس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے ابھی اس کا دل اس کی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا اور ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہونے لگا ہو۔ دو گھنٹوں کی اعصابی کشمکش کے بعد اس نے ہوا کے تیز ہونے کا بہانہ کیا اور کہا کہ وہ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہے جس کی وجہ سے تار پر چلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے ایک کتے کے بھونکنے کی بھی شکایت کی جو کہ اس کی توجہ میں خلل ڈال رہا تھا۔

یہ واقعہ اینجل کو اس کے مشن سے باز نہ رکھ سکا اور ایک بار پھر وہ خود کو تار پر چلنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ اس بار اس نے جی کڑا کر کے تار پر قدم رکھ ہی دیا اور پُراعتماد انداز سے چلتی گئی لیکن اس بار اس نے ایک بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی۔ وہ یہ کہ اس نے بہت زیادہ رک رک کر فاصلہ طے کیا۔ پینتیس پونڈ وزنی بانس کے ساتھ یہ فاصلہ پچیس منٹ میں طے ہونا تھا جسے اس نے پینتیس منٹ میں طے کیا۔ تھکن سے چور وہ پلیٹ فارم سے اتری اور خوشی سے چلاتے ہوئے اسٹیون کے بازوؤں میں جا گری۔ اب جبکہ اس کی توانائی بحال ہو چکی تھی تو اس میں خوداعتمادی کی پرانی کرنیں جگمگانے لگیں اور یہ سب اس کی پُرعزم فطرت کے مرہونِ منت تھا۔

اپنی آخری سرجری کے چھ ماہ بعد اینجل اپنے فن میں اس قدر طاق ہو چکی تھی کہ اسے ایک ٹی وی شو میں مظاہرے کے لیے پیش کیا گیا اور اس نے ہزاروں ناظرین کو اپنی بے مثال کارکردگی سے مسحور کر کے رکھ دیا۔

بعدازاں اس نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے معذور افراد میں نئی روح پھونکنے کے مشن کا آغاز کر دیا۔ لوگ اس معذور بازی گر کی جرأت وعظمت کی داستان سن کر بہت متاثر ہوئے اور انہیں ایک پُرجوش زندگی گزارنے کی راہ سجھائی دی۔ بے شمار لوگوں نے خطوط اور کارڈز کے ذریعے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثات بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ اینجل نے ہر ایک کو انفرادی طور پر جواب دیا۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں شتر بے مہار کی سی زندگی گزارنے والی آوارہ لڑکی اب مایوس افراد کی راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ وہ اینجل کی صورت میں واقعی لوگوں کے لیے فرشتہ بن کر آئی تھی۔

سترہ سالہ رینی رابل موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ ضائع ہو جانے کی وجہ سے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے لیے زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اس نے اخبار میں اینجل ولینڈا کی داستانِ حیات کا مطالعہ کیا تو جوش سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا چنانچہ اس نے چھ بار

اس آرٹیکل کا بغور مطالعہ کیا۔ اینجل کی تکالیف کے سامنے اسے اپنی معذوری بالکل بے وقعت سی لگی۔ اینجل کی عزم وہمت کی داستان نے اس کے اندر بجلیاں سی بھر دیں اور اس کی مایوسی ہوا ہوگئی۔

کینسر سے جان چھڑا کر اینجل نے سکھ کا سانس لیا تھا اور فن کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے شوہر اور بیٹے پر بھرپور توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ایک بار پھر خوشیاں لوٹ آئی تھیں لیکن کینسر کسی طور اس کی جان چھوڑتا نظر نہیں آرہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی جن بھوت کی طرح اس پر فریفتہ ہوگیا ہو اور آخر کار یہ جان کا روگ بن گیا۔ اینجل کے تار پر آنے کے سات ماہ بعد جون 1989ء میں اس کے سینے میں پھر وہی درد اٹھنے لگا اور منہ سے خون بھی آنے لگا۔

فوری طور پر نیویارک کے ایک ڈاکٹر سے رابطہ کیا گیا۔ اینجل کا خیال تھا کہ اس کی پھیپھڑوں کی تکلیف عود کر آئی تھی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر نے اس کی علامات کو معمولی جان کر توجہ نہ دی۔ اس نے ڈاکٹر سے ملتجیانہ انداز سے کہا کہ وہ غور سے معائنہ کرے کیونکہ پہلے بھی اس کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا تھا لیکن ڈاکٹر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

ان دنوں ولینڈاز نے سینٹرل پنسلوانیا کی پہاڑیوں میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے تنگ آکر اینجل نے ایک مقامی ڈاکٹر بروس بوسیلی سے رابطہ قائم کیا جس نے بغور اس کی رام کہانی سنی، نئے ٹیسٹ لیے اور اس موضوع پر میسر مواد کا جانفشانی سے مطالعہ کیا اور کینسر کے دوبارہ لوٹ آنے کی نشاندہی کی۔

پنسلوانیا کے سرجنوں نے سٹی آف ہوپ میں اینجل کے ڈاکٹروں کی ٹیم سے رابطہ کیا کیونکہ آپریشن کے لیے کیلی فورنیا کے ڈاکٹر زیادہ موزوں تھے جو کہ پہلے بھی اینجل کے پھیپھڑوں پر کام کر چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے اسے اپنے تجرباتی منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا جس کے مطابق اس کے پھیپھڑوں کا اتنا زیادہ حصہ نکال دیا جاتا کہ اسے جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے مستقلاً آکسیجن سے منسلک ہونا پڑتا۔ اینجل کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ اس طرح کم از کم اس کی زندگی تو بچ سکتی تھی اور وہ اپنی زندگی کسی اچھے مصرف میں لانا چاہتی تھی۔

اسٹیون ولینڈا کوئی لینڈ لارڈ شخص نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے خاندان کی روایت کو نبھاتے ہوئے اس فن کے ساتھ وابستہ تھا۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ پہلے ہی اینجل کے آپریشن کے اخراجات میں اٹھ چکی تھی۔ اب پھر آپریشن کے سلسلے میں پیسوں کا مسئلہ آن پڑا تھا۔ یعنی 1990ء کا موسم بہار بھی ولینڈا کے لیے زیادہ خوش آئند ثابت نہ ہوا۔

آخر کار اینجل نے علاج کے لیے اپنے فن کے ذریعے فنڈ اکٹھا کرنے کا پروگرام بنایا۔ مارچ 1990ء میں وہ مینسفیلڈ یونیورسٹی (پنسلوانیا) میں شائقین کے سامنے تار پر مظاہرہ کر رہی تھی۔

تاریک پرفارمنس ہال میں اینجل ولینڈا کے فیروزی مخملیں لبادے پر پڑنے والی روشنیوں کی جھلملاہٹ میں اس کا خوب صورت جسم چھلکا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے تار پر چل رہی تھی۔ تب اچانک عین درمیان میں اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے اور اس کے چہرے سے خوف و استعجاب جھلکنے لگا۔ ہال میں موجود سیکڑوں تماشائیوں کے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ اب کیا ہوگا......؟ ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال کلبلا رہا تھا اور اس کا جواب سوچنے کی کسی میں ہمت نہ تھی کیونکہ اگر وہ نیچے سخت فرش پر گر جاتی تو اسے سنبھالنے کے لیے کوئی جال وغیرہ بھی موجود نہیں تھا۔

اچانک ایک تیز آواز نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ”لائٹوں کو اس کے چہرے سے ہٹالو۔“

اینجل کا شوہر چلایا۔ لائٹیں نیچے ہوگئیں تو اینجل کا توازن بحال ہوگیا اور اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے دوبارہ خود اعتمادی کے ساتھ تار پر چلنا شروع کر دیا۔ دراصل نیچے کھڑے ہوئے ایک بے پروا لائٹ آپریٹر نے براہ راست اس کی آنکھوں میں روشنی پھینکنا شروع کر دی تھی جس سے اسے تار پر اپنا پاؤں دیکھنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور نتیجتاً اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے تھے۔

اگرچہ تار پر چلنے کا اصول یہ ہے کہ آپ اس طرح تن کر سیدھے کھڑے ہوں کہ آپ کا سر اوپر کو اٹھا ہوا اور آپ اپنے پاؤں کو براہ راست دیکھنے کے بجائے صرف اپنے پاؤں کی جلد کے تار سے رابطے سے ہی اس کی صحیح جگہ کا تعین کرتے رہیں لیکن اینجل کا دایاں پاؤں تو سرے سے موجود ہی نہیں تھا لہٰذا اس کا مصنوعی پاؤں ہر قسم کے احساس سے عاری تھا اس لیے اسے ہر قدم پر اپنے دائیں پاؤں کے مقام کو دیکھنا پڑتا تھا اسی لیے آنکھیں چندھیا جانے کی وجہ سے اسے تار پر چلنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

جب اینجل دوبارہ تار پر رکی تو اس کا چہرہ اعتماد کا آئینہ دار تھا۔ ہجوم سے توصیفی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس نے

اپنی داہنی ٹانگ ہوا میں لہرائی اور بائیں پاؤں پر کھڑی ہو کر حاضرین کو ایک دلفریب مسکراہٹ سے نوازا۔ اس کے بعد جب وہ بڑی تمکنت سے تار پر چلتی ہوئی تار کے دوسرے سرے پر موجود پلیٹ فارم پر پہنچی تو تالیوں میں شدت آگئی۔ اسٹیون سرعت سے اس کی طرف بڑھا اور اس کا منہ چوم لیا۔

اس کے بعد میاں بیوی ہجوم میں گھل مل گئے اور اپنے مداحوں کو آٹو گراف دینے اور ان سے بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اینجل ہر ملنے والے سے گرم جوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ کینسر کا شکار اکیس سالہ اینجل تین سال سے بھی کم مدت کے دوران چوتھی مرتبہ سرجری کے تکلیف دہ تجربے سے گزرنے والی تھی۔ لوگ اس کی پُرکشش شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ہر شخص کے لب پر اس کی سلامتی کی دعائیں تھیں اور ذہن میں ایک ہی سوال کہ اتنی مایوس کن صورتِ حال میں کون سی قوت تھی جس سے کام لے کر یہ حوصلہ مند خاتون اتنی خوش دلی سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی جیسے اسے کبھی کوئی غم نہ رہا ہو۔

جب یہی سوال لوگوں کے ذہنوں سے نکل کر زبان پر آیا تو ایک لمحے کے لیے اینجل کی چمک دار نیلی آنکھیں ساکت ہو گئیں اور اس کے چہرے پر شوخی کی جگہ غور و فکر کی لہریں نمودار ہوئیں۔

''جب میں اپنی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ اتنے باریک اور بلند تار پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہوں تو لوگ مجھے تار پر چلتا ہوا دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ میں اپنی زندگی کو بہتر انداز سے گزارنے کی کوشش کر رہی ہوں اور یہ چیز انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔''

اب اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی مسکراہٹ میں دلکشی اور آواز میں کھنک پیدا ہو گئی تھی اور وہ بڑی سادگی سے کہتی۔ ''میرے یہاں موجود ہونے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔''

16 مارچ جمعے کے روز اینجل اپنے شوہر اور بیٹے کے ہمراہ ملی جلی کیفیات کے ساتھ سٹی آف ہوپ پہنچی جو اپنے نام کی مناسبت سے واقعی اس کی امیدوں کا مرکز تھا اور جب اس کی ملاقات اپنے سرجنوں کی ٹیم کے ایک ڈاکٹر سے ہوئی تو اسے یہ جان کر ایک گونہ خوشی ہوئی کہ وہ اس کی توقع سے زیادہ ہی پُرامید نظر آ رہا تھا۔ اس نے اینجل کے لیے ٹیسٹوں کا ایک لمبا چوڑا شیڈول مرتب کر رکھا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ ٹیسٹوں کے نتائج اینجل کے اندازے سے کہیں زیادہ بہتر ہوں گے۔

ٹیسٹوں کے صبر آزما مرحلے سے گزرنے کے بعد نتائج کو اسپتال کے ٹیومر بورڈ کے سامنے فیصلے کی غرض سے پیش کر دیا گیا۔ اس سے اگلے روز تینوں ولینڈا رپورٹ حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر کے آفس میں گئے۔ اینجل امید و بیم کی کیفیت کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوئی جہاں سرجری کے آلات سے لیس ڈاکٹر اس کا منتظر تھا۔ وہ ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ڈاکٹر کے چہرے پر چھائی ہوئی گمبھیرتا زبانِ بے زبانی سے بہت کچھ بتا رہی تھی۔ آخر ڈاکٹر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

''مسز ولینڈا! مجھے افسوس ہے کہ آپریشن کی بالکل گنجائش نہیں ہے کیونکہ کینسر آپ کے پھیپھڑوں میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ اب معاملہ ہمارے بس سے باہر ہے۔''

چند لمحوں کے لیے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ آخر کار اینجل نے سکوت توڑا۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے کہا۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر نے کیموتھراپی طریقہ علاج کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ اس ضمن میں کسی اسپیشلسٹ سے اس کا اپائنٹمنٹ کروا دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طریقہ علاج کو اپنانے سے کینسر کی نشوونما کی رفتار میں تیس تا چالیس فیصد کمی آنے کا امکان تھا اور کئی مریضوں کو اس سے افاقہ بھی ہوا تھا۔

''میں ایسے کسی طریقے پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔'' اینجل یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ڈاکٹر اب اسے طفل تسلیوں کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے اور وہ ان کے رحم و کرم پر اپنی زندگی کو معطل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ وہ جان گئی تھی کہ خدا کے بعد اسے کسی دوسرے پر نہیں بلکہ ہمیشہ کی طرح اپنی قوت ارادی پر بھروسا کرنا ہوگا اور وہ دنیا کو دکھا دے گی کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیسے جیا جاتا ہے۔

اینجل اور اسٹیون لٹے پٹے قدموں سے اپنے موٹیل میں واپس پہنچے اور کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی فرطِ غم سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اسٹیون اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے خود اپنے الفاظ کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے اور اینجل کو بھی اس کی آواز دور کسی کنوئیں سے

آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں جان گئے تھے کہ ڈاکٹروں کے جواب دینے کے بعد کوئی معجزہ ہی اینجل کے جسم میں کینسر کے عفریت کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔ ننھا اسٹیون اس سانحے سے بے خبر فرش پر کھیل رہا تھا۔

اسی اثنا میں اینجل کی نظر الماری میں پڑے ہوئے درجنوں گلاب کے پھولوں پر پڑی اور صبح کے واقعات اس کے ذہن میں آنے لگے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ صبح وہ لوگ اسپتال جانے والے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور موٹیل کے منیجر ژنگ کانگ نے انہیں لابی میں آنے کو کہا۔ وہاں اس نے اس عظیم فنکارہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے درجنوں گلاب کے پھول اور موم بتیوں سے آراستہ کیک پیش کیا۔ اس روز اینجل کی بائیسویں سالگرہ تھی۔ اس روز وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف سالگرہ کی صورت میں نئی زندگی کی نوید اور دوسری طرف کینسر کی صورت میں موت کے خوفناک پنجے تیزی کے ساتھ اسے دبوچنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔

یہ اکتوبر 1990ء کا ایک خوشگوار دن تھا۔ پنسلوانیا کی اونچی پہاڑیوں میں مختلف پھولوں کی خوشبو سے رچی ہوئی فضا ہر ذی روح کو معطر کر کے گزر رہی تھی۔ ایک بلند چوٹی پر واقع ولینڈا کے خوب صورت مکان میں اینجل اپنے چار سالہ جگر گوشے اسٹیون ولینڈا دوم کو تار پر چلنے کی مشق کروا رہی تھی۔ وہ ایک سال تک حفاظتی اقدامات کے تحت تار پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ہزاروں تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر چکا تھا لیکن وہ آج کسی جال کے بغیر تار پر چلنا چاہتا تھا چونکہ تار کی بلندی صرف چار فٹ تھی اس لیے اس کے والدین نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

تیس فٹ طویل تار پر پندرہ پونڈ کے وزنی بانس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار اسٹیون ولینڈا کا باپ تار کے دوسرے سرے پر کھڑا اپنے بیٹے کو ضروری پوائنٹ بتا رہا تھا۔ اچانک اسٹیون نے اپنے ہونٹ سکیڑ لیے اور اس کے چہرے کے اعصاب تن گئے جو کہ ایک معصوم بچے کے نرم و نازک چہرے پر عجیب سا لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ بڑے متوازن انداز سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا تار پر گامزن ہو گیا.... اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان کی وسعتوں میں ایک عقاب کا بچہ محو پرواز تھا اور اس کے پر ہوا کے ساتھ اسی طرح حرکت پذیر تھے جس طرح اس بچے کی تار پر حرکت، کشش ثقل کی قوت کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ اس بچے کے ننھے منے جسم میں کام کرنے والے جینز ہر ولینڈا کو صدیوں سے تار پر رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔

جب وہ کامیاب و کامران تار کے دوسرے سرے پر پہنچتا ہے تو اس کے والدین تالیاں بجا کر اسے داد دیتے ہیں۔ خوشی سے لڑکے کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اینجل اپنے بیٹے کی اس کامیابی پر خوشی سے کھلی جا رہی تھی اور آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا ہے۔

اینجل نے اپنے بیٹے کو بتدریج اپنی بیماری اور اس کے متوقع اثرات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ دراصل وہ اپنے بیٹے کو اپنی موت سے پیدا ہونے والے خلا کے لیے پہلے سے تیار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اسٹیون کو سیدھے سادے انداز میں خدا اور جنت کے بارے میں بتا دیا۔ ان تمام باتوں سے اس کے بیٹے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی ماں کی روح تر و تازہ ہے لیکن کینسر اس کے جسم کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اور اسی خیال کے پیش نظر اس نے سوال کیا۔

”ممی! کیا اگلے جہان میں جا کر آپ کو نیا جسم مل جائے گا؟“

”کیوں نہیں۔“ اینجل اسے بتاتی ہے۔ ”لیکن افسوس تم مجھے دیکھنے کے لیے وہاں موجود نہیں ہو گے۔“

کل کی ننھی منی لڑکی پنٹیا اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر آج کی میچور اینجل ولینڈا کے نام سے شہرت پانے کے باوجود اپنے بچپن کو فراموش نہیں کر پائی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بچہ بھی اس کی طرح اپنی ماں کی شفقت سے محروم رہ جائے جبکہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ موت کے ظالم پنجے کسی بھی وقت اسے اس کے بچے سے چھین کر دور لے جا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے بیٹے کے لیے کیا نصیحت چھوڑ کر جائے گی۔

وہ بچی جس نے بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی رونا نہ سیکھا تھا اس سوال کا جواب دیتے ہوئے آنکھوں میں تیرتی ہوئی شبنم کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دینے لگی۔

”کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن بنیادی طور پر میں اسے یہ نصیحت کرنا چاہوں گی کہ وہ کبھی اس بات سے فکرمند نہ ہو کہ وہ فلاں کام نہیں کر سکتا بلکہ اس کا دھیان اس طرف ہونا چاہیے کہ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے اور یہی میری زندگی کا مقصد بھی ہے۔“

ابو سفیان ثوری

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کی رحمت اور محبت پر اگر انسان کا کامل ایمان اور مصیبتوں میں اس پر توکّل ہو تو بڑے سے بڑا امتحان بھی انسان دے سکتا ہے مگر اسی توکل اور محبت پر جو ذرا بھی غرور و تکبر میں مبتلا ہوا تو گویا اس نے خود ہی تباہی کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ بس یہی وہ نکتہ تھا جسے سمجھنے اور سمجھانے میں ابو سفیان ثوری نے اپنی زندگی تمام کردی۔ آپ کو نہ شاہی رعب و دبدبے نے متاثر کیا اور نہ ہی شاہانہ نوازشوں اور عہدوں نے مرعوب کیا۔ آپ کا یہی استقلال بہت سے لوگوں کو مشتعل کردیتا تھا مگر آپ نے ثابت کردیا کہ صراط مستقیم پر چلنے والا کسی جلال اور اشتعال سے خوفزدہ نہیں ہوسکتا۔

اپنی عبادتوں کے قبول نہ ہونے کے خوف میں مبتلا ایک

زاہد کا تقویٰ

کوفے میں سعید بن سروق علم حدیث میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی بیوی بھی زہد و تقویٰ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ 96ھ میں ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دونوں نے اس بچے کا نام سفیان رکھا۔ سفیان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ماں نے بڑی حوصلہ مندی دکھائی۔ معیشت کا مسئلہ چرخا کات کات کر حل کیا۔ سفیان کو یہ

دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی کہ ماں تو شب و روز کام کرتی رہیں اور سفیان ہر طرف سے بے نیاز ہو کر حصولِ علم میں لگے رہیں۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ بھی کام کریں۔ آخر ایک دن انہوں نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ''ماں! اب میں اس قابل ہوں کہ کام کر کے کچھ پیدا کروں۔''

ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ''سفیان! کیا تجھے کوئی پریشانی لاحق ہے؟ اگر ہے تو بتا تاکہ میں اس کا حل بتاؤں۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''ہاں ماں میں بہت پریشان ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ کو محنت و مشقت میں مصروف دیکھ رہا ہوں چنانچہ میری خواہش ہے کہ اب آپ آرام کریں اور میں کام کروں۔''

ماں نے محبت سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''سفیان! تجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ بیٹے! میری یہ بات یاد رکھ کہ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ پیٹ کے لیے کام دھندا یا دنیا اور آخرت کے لیے تحصیلِ علم۔ تو پہلے علم حاصل کرے گا، بعد میں کچھ اور کرے گا۔ میں چرخا کات کات کر تیرے اخراجات پورے کر رہی ہوں۔''

سفیان نے عرض کیا۔ ''ماں! میں تحصیلِ علم کے ساتھ ہی کام کاج بھی کر سکتا ہوں، آپ مجھ پر اعتبار کریں۔''

ماں نے بیٹے کو سمجھایا۔ ''سفیان! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں تو اس علم کو بھی پسند نہیں کرتی جو وسیلہ روزگار بنے۔ میں تو اس علم کے حق میں ہوں جو تیرے اور مخلوق کے اخلاق و کردار کے سنورنے کا سبب بن جائے۔ یہ انسانوں کو بگاڑے نہیں، ایسا علم جو عبادت میں کام آئے، تجارت میں نہیں۔ وہ علم جو یار، مار نہ ہو۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

''اگر علم کو تن پروری کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ مہلک سانپ (یعنی زہر) ہے لیکن اگر اسے نفس کشی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ ایک محب صادق اور ہمدرد ساتھی ہے۔''

بیٹے نے پوچھا۔ ''ماں! مجھے یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ میں جو کچھ پڑھ رہا ہوں، اس کا مجھ پر اثر ہو بھی رہا ہے یا نہیں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! جب تم اتنا علم حاصل کر لو کہ تم خود یہ محسوس کرنے لگو کہ ہاں تمہیں کچھ ملا ہے تو پھر اس بات کا اندازہ لگاؤ کہ اس سے تم میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے یا نہیں، اگر یہ محسوس کرو کہ تم کچھ بدل گئے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تم کامیاب ہو رہے ہو اور اگر یہ محسوس کرو کہ تم پہلے ہی جیسے ہو تو یہ سمجھ لینا کہ تمہاری محنت اکارت جا رہی ہے۔''

سفیان نے ماں کی نصیحتوں پر عمل پیرا ہو کر تحصیلِ علم شروع کر دی اور آپ کی علمیت کا شہرہ چہار دانگِ عالم میں ہو گیا۔ علوم کی تحصیل کے ساتھ ہی عبادت و ریاضت میں بھی محنت و مشقت جاری رہی۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا، اس پر عمل بھی کیا اور اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بھی سنیں اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔

سفیان نے ایک دن بے خیالی میں مسجد میں داخل ہوتے وقت الٹا پاؤں اندر رکھ دیا۔ اسی وقت ان کے کانوں میں کسی کی تہدید آمیز آواز آئی۔ ''اے ثور (بیل) یہ کیا گستاخی ہے، ذرا ہوش میں آ اور سیدھا پاؤں مسجد میں پہلے داخل کر۔''

سفیان اس آواز سے بے ہوش ہو گئے۔ نمازی حیرت زدہ تھے کہ یہ انہیں ہو کیا گیا۔ کئی آدمی انہیں اٹھا کر ایک طرف کنارے لے گئے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو ایک شخص نے پوچھا۔ ''سفیان! خیریت تو ہے؟ یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟''

سفیان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ کسی سے آنکھ بھی نہیں ملا رہے تھے۔ آپ کی خاموشی سے تنگ آ کر کسی نے پھر وہی سوال کیا۔ ''سفیان! یہ تم بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''لوگو! میں برباد ہو گیا۔''

کسی نے پھر پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو سہی!''

سفیان نے ایک سرد آہ کھینچی اور جواب دیا۔ ''میں نے غلطی سے مسجد میں داخل ہوتے وقت الٹا پاؤں آگے بڑھا دیا تھا، اس پر کسی نے مجھے ڈانٹا کہ 'اے ثور! یہ کیا گستاخی ہے۔' جس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیشہ کے لیے میرا نام دفتر انسانیت سے خارج کر دیا گیا۔ لوگو! اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

لوگوں نے آپ کو بے حد سمجھایا لیکن آپ پر بدستور رقت طاری رہی اور ہفتوں زار و قطار روتے رہے۔ اس کے بعد

آپ کا نام ہی سفیان ثوری ہو گیا۔
ابھی آپ جوان ہی تھے کہ کمر جھک گئی اور کوبڑ نکل آیا۔ دیکھنے والے حیرت کرتے تھے کہ ایسا کیوں ہو گیا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے پوچھتا۔ ''حضرت! یہ آپ کی کمر قبل از وقت کیوں جھک گئی اور کوبڑ کیوں نکل آیا؟''
آپ کسی بیمار کی عیادت کو تشریف لے گئے تو بیمار آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سے پوچھا۔ ''اے سفیان! اگر آپ محسوس نہ فرمائیں تو میں آپ سے ایک سوال کروں؟''
سفیان نے جواب دیا۔ ''تو شوق سے سوال کر، میں انسان سے نفرت نہیں ہوں۔''
مریض نے کہا۔ ''حضرت! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ پھر یہ کمر قبل از وقت کیوں جھک گئی اور یہ کوبڑ کیوں نکل آیا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں یہ راز کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کو سامع میری تسلی پر محمول کرتا، مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ میرے استاد کی جب طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی اور امیدِ زیست باقی نہ رہی تو میں ان کی عیادت کو گیا۔ میں نے دیکھا وہ بہت آزردہ تھے۔ میں نے ان سے آزردگی کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''سفیان! میں نے پچاس سال تک بے لوث و بے ریا خدا کی عبادت کی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تو ہماری بارگاہ کے قابل نہیں ہے۔''
مریض آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔
آپ نے ذرا سا سکوت اختیار کیا، پھر فرمایا۔ ''اسی طرح میرے تین استاد، جو حد درجہ عابد و زاہد تھے اپنی آخری عمر میں یہودی، نصرانی اور آتش پرست ہو گئے۔ مجھ پر ان واقعات نے اتنا شدید اثر کیا کہ مارے دکھ کے میں کبڑا ہو گیا اور میری کمر جھک گئی۔ اب میں ہر وقت سلامتی ایمان کی دعا مانگتا رہتا ہوں۔''
آپ علم حدیث میں یگانہ روزگار تھے۔ لوگ دور دور سے آپ کے پاس آتے اور آپ سے احادیث سن کر اپنی پیاس بجھاتے۔ آپ کسی سے نہ تو اس کا معاوضہ لیتے اور نہ ہی کسی قسم کا تحفہ قبول فرماتے۔
آپ کے ارادت مندوں میں سے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کیا اور بڑی عاجزی سے کہا۔ ''امید ہے کہ آپ اسے قبول فرما کر میرا دل رکھ لیں گے۔ اگر اسے قبول نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔''
اس شخص نے کہا۔ ''حضرت! آپ نے تو مجھے کبھی کوئی نصیحت تک نہیں کی جو یہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔ پھر اس تحفے کو قبول نہ کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! یہ درست ہے کہ میں نے تجھے کبھی کوئی نصیحت نہیں کی لیکن تیرے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تو راستہ دکھاتا رہا ہوں۔ اگر میں تیرا تحفہ قبول کر لوں تو ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں تیری رغبت پیدا ہو جائے اور اسی کا نام دنیا ہے لہٰذا میں خدا کے سوا کسی اور طرف راغب نہیں ہونا چاہتا۔''
وہ شخص اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آپ نے اس کا تحفہ واپس کر دیا۔
آپ اپنے گھر میں سربسجود تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد آپ دروازے پر گئے اور دستک دینے والے سے پوچھا۔ ''اے شخص! خیریت تو ہے، تو پریشان کیوں ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کے پڑوسی کا انتقال ہو چکا ہے آپ کو اس کے جنازے میں شرکت فرمانی ہے۔''
آپ اسی وقت اس شخص کے ساتھ ہو لیے۔
جنازے میں کافی لوگ تھے۔ جب جنازہ اٹھا تو آپ نے محسوس کیا مرحوم کی بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ آپ اپنے پڑوسی سے اچھی طرح واقف تھے مرحوم کا ذکرِ خیر کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ بہت اچھا آدمی تھا حالانکہ وہ بہت برا آدمی تھا اور اس کی بداخلاقی سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔
آپ نے ذکرِ خیر کرنے والوں سے پوچھا۔ ''حضرات! کیا آپ اس شخص کو بہت قریب سے جانتے تھے؟''
ایک شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں مرحوم کو بہت قریب سے جانتا تھا۔''
آپ نے درشت لہجے میں فرمایا۔ ''تو جھوٹا ہے، غلط بیانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔''
ان صاحب میں سے کسی نے کہا۔ ''حضرت! مرنے کے بعد تو تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''منافقت کی بابت تیری کیا رائے ہے؟''
صاحب خانہ نے جواب دیا۔ ''منافقت بہت ہی بری شے ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جب منافقت بہت بری چیز ہے تو تم لوگ اس کے مرتکب کیوں ہو رہے ہو؟ مرنے والا جیسا کچھ بھی تھا اس سے تم بھی واقف ہیں۔ پھر اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے خوامخواہ منافقت اختیار کرنا کہاں کی عقلمندی اور دین داری ہے۔ اگر بولنا ہی ہے تو سچ بولو، اور اگر مرحوم کے عیب چھپانا ہیں تو خاموش رہو۔ آخر میں بھی تو خاموش ہوں۔''
آپ کے طرز استدلال نے سب کو خاموش کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
آپ نے فرمایا۔ ''افسوس کہ اگر مجھے ان باتوں کا علم پہلے سے ہو جاتا تو میں یہاں نہ آتا کیونکہ میں ان جیسا نہیں بن سکتا۔''
آپ کی باتیں عام و خاص میں مشہور ہو رہی تھیں۔ امرا آپ سے خوش نہیں تھے۔ یہ امرا خلیفہ وقت کو بھی بدظن کرتے رہتے تھے۔ آپ کو کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ آپ کو خشیت الٰہی کے علاوہ کسی کا بھی خوف نہیں تھا۔
آپ حج کے لیے جا رہے تھے دل پر خشیت الٰہی طاری تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہمسفر ان کی گریہ وزاری سے حیران تھے، جو ان سے واقف نہیں تھے وہ انہیں گناہ گار سمجھے۔ ایک نے آپ کو نصیحت کی۔ ''جناب! گناہ گار تو میں بھی ہوں لیکن میں آپ کی طرح آنسو نہیں بہاتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ حج کے بعد میرے سارے گناہ دھل جائیں گے اور میں پاک صاف ہو جاؤں گا۔''
آپ نے اس شخص کو حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ''کیا تجھ کو یقین ہے کہ تیرا حج قبول ہو جائے گا؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''اس میں شک و شبہ کی کیا بات ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ہم دونوں میں بس یہی فرق ہے کہ تجھے یہ یقین ہے کہ تیرا حج قبول ہو جائے گا اور مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ میرا حج قبول بھی ہوگا یا نہیں کیونکہ مجھے یہی نہیں معلوم کہ میرے ایمان میں صداقت ہے یا نہیں۔ رہ گیا گناہوں کا معاملہ تو اس کی میں اس لیے فکر نہیں کرتا کہ رحمتِ خداوندی کے مقابلے میں گناہ ایک بے حقیقت سی شے ہے۔''
یہ جعفر منصور کا زمانہ تھا، عباسیوں کا باجبروت خلیفہ۔ اس کی علمیت اور سیاست کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے بھی سفیان کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے آپ کو طلب کیا تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ کے آدمی نے کہا۔ ''حضرت! آپ چلے چلیں کیونکہ اسی میں آپ کی بہتری ہے، اگر نہیں جائیں گے تو امیر المومنین آپ کو جبراً بلوا لیں گے۔''
آپ مجبوراً چلے گئے لیکن یہ کہہ دیا کہ ''میں حق گوئی سے باز نہیں آؤں گا۔''
ابو جعفر منصور نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوال کیا۔ ''اے سفیان! تم میں وہ کیا چیز ہے جس پر تم اکڑتے پھرتے ہو؟''
سفیان نے جواب دیا۔ ''خود شناسی، لیکن میں اکڑا پھرتا ہوں، یہ غلط ہے۔''
ابو جعفر نے کہا۔ ''میں نے تو یہی سن رکھا ہے۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس کی تردید جو کر رہا ہوں۔''
ابو جعفر نے کہا۔ ''خوش اخلاقی کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟''
سفیان نے جواب دیا۔ ''رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو خوش اخلاق نہیں، وہ ہم میں سے نہیں۔''
ابو جعفر نے کہا۔ ''پھر بھی آپ نے اپنے اخلاق پر غور فرمایا؟''
سفیان نے جواب دیا۔ ''میرے اخلاق میں کیا کمی دیکھی تم نے؟''
ابو جعفر نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ میرے بلانے پر تم نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے انکار کر دیا تھا کیونکہ تمہارے بلاوے میں بد اخلاقی بھی تھی اور اکڑ بھی، حالانکہ اخلاق کا تقاضا یہ تھا کہ تم خود چل کر میرے پاس آتے۔''
حاضرین دربار میں سے کسی نے کہا۔ ''امیر المومنین! یہ گستاخ آپ سے کس بے ادبی سے باتیں کر رہا ہے۔ حکم دیجیے کہ اس کی گردن مار دی جائے۔''

ابوجعفر نے درباری کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ سفیان سے کہا۔ ''اگر میں تمہیں کوئی منصب دوں تو کیسا رہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں اسے قبول نہیں کروں گا کیونکہ میں نے دنیا کو چھوڑ رکھا ہے۔''
ابوجعفر نے جز بز ہو کر کہا۔ ''تم صوفیوں نے دین کو معلوم نہیں کیا سمجھ رکھا ہے۔ بہر حال اب تم جا سکتے ہو، مگر خبردار جو تم نے لوگوں کو ورغلایا اور میرے خلاف باتیں کیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''غیبت انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ میں تیری برائی کر کے خود کو گناہ گار نہیں کروں گا۔''
آپ دربار سے واپس آئے تو آپ کے واقف کاروں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ ان میں ایک پڑوسی بھی تھا اور اس کو آپ نے ابوجعفر منصور کے دربار میں دیکھا تھا۔ اس شخص نے لوگوں کو بتایا کہ ''بڑی خیریت گزری ورنہ ربیع بن یونس نے تو امیر المومنین سے ان کے قتل کی اجازت طلب کر لی تھی۔''
سفیان نے پوچھا۔ ''تو وہاں کیوں گیا تھا؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں تو اس دربار سے وابستہ ہوں اور روز ہی حاضری دیتا ہوں۔''
آپ نے اسے نصیحت کی۔ ''خدا کا خوف کر۔ دربار کے گناہوں میں تو خواہ مخواہ حصہ دار بن رہا ہے۔''
اس شخص نے عرض کیا۔ ''میاں جی! میں دربار کی وابستگی پر مجبور ہوں۔ عیال دار آدمی ہوں، بیوی بچوں کے لیے یہ سب گوارا کرنا پڑ رہا ہے۔''
آپ نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ ''حضرات! آپ اس شخص کی باتیں سن رہے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو اس کے بیوی بچوں کو روزی ملے گی اور جب اللہ کی فرمانبرداری کرے گا تو یہ اپنے بیوی بچوں سمیت ہلاک ہو جائے گا۔''
وہ شخص شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ آپ نے حاضرین کو نصیحت کی۔ ''لوگو! کبھی کسی عیال دار کی اقتدا نہ کرنا۔ کیونکہ بہت کم عیال دار ایسے ہیں جو حرام کی آمیزش سے بچے ہیں اور مشتبہ اور حرام کے کمانے میں ہمیشہ ان کا یہی عذر ہوتا ہے کہ ہم بال بچے والے ہیں۔''

☆☆☆

جب آپ حج کے لیے جا رہے تھے تو اس قافلے میں ابوجعفر منصور بھی اپنے حشم و خدم کے ساتھ چل رہا تھا۔ مکہ کے قریب ان لوگوں نے قیام کیا۔ پھر اذان ہوئی اور نماز باجماعت کے لیے سفیان بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک میدان میں کھڑے ہوئے، ابوجعفر منصور بھی اس جماعت میں شامل تھا اتفاق کی بات کہ سفیان اور ابوجعفر منصور پاس پاس کھڑے ہوئے۔
نماز کے دوران ابوجعفر منصور نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ نماز کے خاتمہ پر سفیان نے ابوجعفر منصور سے کہا۔ ''ابوجعفر! ایسی نماز قطعی بے حقیقت ہے اور قیامت کے روز یہ تیرے منہ پر ماری جائے گی۔''
ابوجعفر نے انہیں ڈانٹا۔ ''سفیان! تم خاموش رہو، میں تمہاری باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''حق گوئی میں خاموشی کیسی؟''
ابوجعفر نے کہا۔ ''یہ حق گوئی نہیں گستاخی ہے۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ حق گوئی ہے لیکن تو جو خلیفہ بھی ہے اسے گستاخی سمجھ رہا ہے۔''
ابوجعفر اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن بعد میں حاضرین نے خلیفہ کو خوب بھرا اور کہا۔ ''اس طرح تو امیر المومنین کا رعب اور دبدبہ کم ہو جائے گا۔ سفیان اپنی صاف گوئی اور گستاخی کا ذکر اپنے پرستاروں میں کرے گا تو ان کے دلوں سے امیر المومنین کا رعب دور ہو جائے گا۔ لوگوں کی عبرت کے لیے سفیان کو عبرتناک سزا دینا ضروری ہے۔''
ابوجعفر دیر تک سفیان کے بارے میں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سفیان کو سزا دینا ضروری ہے، اس نے اپنے جلاد کو بلایا اور کہا۔ ''صوفی سفیان ثوری کو میں قتل کرانا چاہتا ہوں۔''
جلاد نے مؤدبانہ عرض کیا۔ ''امیر المومنین کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں انہیں اسی وقت قتل کر دوں گا۔''
ابوجعفر نے کہا۔ ''لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ان کا خون زمین پر بہے۔''
جلاد نے عرض کیا۔ ''پھر انہیں کس طرح ہلاک کیا جائے؟''
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''بڑھئی کو بلا، وہ ان کے لیے سولی کھڑی کرے گا اور تو سفیان کو پھانسی دے دے گا۔''

جلاد اسی وقت بڑھئی اور چند سپاہیوں کو لے کر سفیان کی تلاش میں نکل گیا۔

سفیان ایک خیمے میں اپنے ہم عصر دو مشہور صوفیوں کے ساتھ قیام فرما تھے۔ فضیل بن عیاض اور اپنے ہم نام سفیان عینیہ کے ساتھ جلاد انہیں تلاش کرتا ہوا جب ان کے خیمے میں پہنچا تو دیکھا سفیان ثوری سو رہے ہیں۔ ان کا سر فضیل بن عیاض کی ران پر اور دونوں پاؤں سفیان کی گود میں تھے۔

جلاد نے ان دونوں صاحبان سے کہا۔ ''حضرات! ہمیں خلیفہ نے سفیان ثوری کی تادیب کے لیے بھیجا ہے۔''

فضیل بن عیاض نے جواب دیا۔ ''ثوری ابھی سو رہے ہیں۔ انہیں بیدار ہو لینے دو۔''

جلاد نے اصرار کیا۔ ''جناب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ انہیں بیدار کر دیجیے۔''

دونوں کی باتوں سے آپ کی آنکھ کھل گئی پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

جلاد نے عرض کیا۔ ''جناب بڑھئی میرے ساتھ ہے اور امیرالمومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو گستاخی کی سزا دوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں وہاں آپ کو پھانسی دی جائے گی۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''بڑھئی سے کہہ سولی تیار کرے، میں آتا ہوں۔''

جلاد بڑھئی کے ساتھ باہر آ گیا اور سولی کھڑی کرنے لگا۔

سفیان نے کعبے کی طرف منہ کر کے اپنے رب کو مخاطب کیا۔ ''اے اللہ! کیا میں نے ابوجعفر سے واقعی گستاخی کی تھی؟ اگر میں نے غلطی کی ہے تو اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن اگر میں بے گناہ ہوں تو پھر مجھے اس سزا سے بچا۔''

جلاد اور بڑھئی ایک ساتھ خیمے میں داخل ہوئے اور سفیان کو مطلع کیا کہ ''سولی کھڑی کی جا چکی ہے۔ باہر چلیے تاکہ امیرالمومنین کے حکم پر عمل کیا جائے۔''

آپ ان دونوں کے ساتھ باہر نکلے اور جلاد سے کہا۔ ''اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ مجھے سولی پر چڑھانے کا حکم دینے والا اللہ کے دربار میں طلب کیا جا چکا ہے کیونکہ میرا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش کیا جا چکا ہے۔''

جلاد نے کہا۔ ''آپ کچھ بھی کہیں میں آپ کو سولی پر چڑھا کر رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نادان انسان! ضد نہ کر، اللہ نے تیرے امیرالمومنین کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

جلاد ہنسا۔ ''آپ مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نادان! میں تجھ کو دھوکا نہیں دے رہا۔ خدا نے خلیفہ کی روح قبض کرائی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے جو تجھ سے جواب طلب کرے۔''

جلاد نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت کہ امیرالمومنین اب اس دنیا میں نہیں ہیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تو ذرا دیر صبر کر اور توقف سے کام لے۔ میری بات کی صداقت کا تجھے خود ہی علم ہو جائے گا۔''

کچھ دیر بعد ہی چند گھڑسوار وہاں پہنچے اور جلاد کو مطلع کیا کہ ''امیرالمومنین اچانک رحلت فرما گئے تم لوگ واپس چلو۔''

جلاد، بڑھئی اور سپاہی سفیان ثوری کے قدموں میں گر گئے۔ روتے ہوئے معافی مانگی۔ ''حضرت! ہم لوگ حکم کے پابند۔ جیسا حکم ملا تھا اس کی تعمیل کرنے آ گئے تھے۔ آپ ہمیں معاف فرما دیں۔''

سفیان نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ میری دعا ہے کہ خدا بھی تمہیں معاف کر دے۔''

خلیفہ ابوجعفر منصور کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے مہدی نے بار خلافت سنبھالا۔ سفیان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس کا بڑا چرچا ہوا چنانچہ حج کے بعد جب آپ بغداد واپس پہنچے تو روپوشی اختیار کر لی کیونکہ انہیں یہ خبر مل چکی تھی کہ مہدی کو سفیان کی تلاش ہے۔

لوگوں نے پوچھا۔ ''سفیان! آپ مہدی سے چھپتے کیوں پھر رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ وہ میرے سپرد کچھ خدمات نہ کر دے اور میں انہیں انجام نہ دے سکوں۔''

انہی میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو مہدی کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ آپ اس سے مہدی کا حال پوچھا کرتے تھے، وہ آپ کو ساری تفصیل سنا تا رہتا تھا۔

ایک دن آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''کیا تجھے مہدی کی صحبت میں کراہیت نہیں محسوس ہوتی؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے تو کبھی بھی کراہیت محسوس نہیں کی۔''
آپ نے فرمایا۔ ''لیکن میری بات یاد رکھ کہ مہدی کی بداعمالیوں میں تم سب کو شریک اور شامل سمجھا جائے گا۔''
اس شخص نے اپنے کانوں پر ہاتھ دھرے، بولا۔ ''واللہ میں مہدی کی بداعمالیوں سے بری ہوں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''
آپ نے غصے میں فرمایا۔ ''واللہ تو جھوٹا ہے کیا تو نے مہدی کی فضول خرچیاں نہیں دیکھیں؟ کیا تو نے اس کی قیمتی زرتار پوشاک پر اسے کبھی کچھ کہا؟ کیا تو نے مہدی سے یہ کہا کہ وہ اپنے نوکروں اور خدمت گاروں پر جو کچھ خرچ کر رہا ہے وہ فضول خرچی ہے؟ کیا تو نے مہدی سے یہ کہا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ناجائز ہے اور بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس میں سے جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے وہ خیانت ہے؟''
اس شخص نے کہا۔ ''بھلا یہ باتیں امیرالمومنین سے کون کہہ سکتا ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو دولتِ ایمان سے مالامال ہو۔''
اس شخص نے چڑ کر کہا۔ ''حضرت! پھر آپ ہی زحمت کریں اور خلیفہ سے یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ یوں بھی امیرالمومنین کو آپ کی بڑی تلاش ہے۔''
یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا، آپ نے فرمایا۔ ''اس شخص کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ میرا پتا مہدی کو ضرور بتا دے گا اور کچھ دیر بعد اس کے آدمی میری تلاش یہاں تک آجائیں گے۔''
آپ کی بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ لوگوں نے مشورہ دیا۔ ''حضرت! آپ کہیں روپوش ہوجائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''یہ وقت اظہارِ کلمۃ الحق کا ہے۔ میں چھپ کر خود کو گناہ گار نہیں کروں گا۔''
کچھ دیر بعد خلیفہ کے سوار اور پیادے سفیان کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے اور کہا۔ ''حضرت! امیرالمومنین نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔''
آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں تم لوگوں کا انتظار ہی کر رہا تھا، چلو چلتا ہوں۔''
آپ ان کے ساتھ مہدی کے دربار میں پہنچ گئے۔ وہاں وہ شخص بھی موجود تھا، وہ آپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ آپ نے درباری آداب کو بالائے طاق رکھا اور السلام علیکم کہہ کر مہدی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔
مہدی نے وعلیکم السلام کہا۔ اس کے پیچھے وزیر برہنہ تلوار لیے کھڑا تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''امیرالمومنین حکم دیجیے کہ میں اس گستاخ کی گردن اڑا دوں۔''
مہدی نے کہا۔ ''نہیں، میں نے انہیں اس لیے نہیں بلایا۔ ابھی تو میں ان سے چند باتیں کروں گا۔''
مہدی نے سفیان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''شیخ! لوگ کہتے ہیں کہ میرے والد ابوجعفر کا انتقال آپ کی بددعا سے ہوا۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ بات غلط ہے کیونکہ میں نے اس کو کبھی بھی بددعا نہیں دی۔ وہ اللہ کی پکڑ کا شکار ہوگیا اور پھر اللہ کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا۔''
مہدی نے پوچھا۔ ''پھر آپ چھپتے کیوں پھر رہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ میں دنیادار نہیں ہوں، اور دنیادار مجھ سے ازراہ حسد ناخوش ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ذلیل و خوار کریں۔ ان حالات میں اگر وہ تیرے ذریعے مجھے ذلیل و خوار کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو تیرے نامہ اعمال میں کچھ گناہوں کا خواہ مخواہ اضافہ ہوجاتا۔''
مہدی نے کہا۔ ''اے سفیان! ایک بات اور۔ تم مجھ سے اِدھر اُدھر چھپتے پھرے لیکن اب تم میرے سامنے اور میرے قبضہ و اختیار میں ہو۔ بتاؤ اب تم مجھ سے کس طرح بچ سکو گے۔ اب موقع ہے کہ میں تم سے تمہاری گستاخیوں کا انتقام لوں۔ تم میرے دربار میں کس طرح اکڑے ہوئے کھڑے ہو، تمہیں جلال شاہی کی کچھ بھی پروا نہیں۔''
سفیان ثوری نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کہ تجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو مجھے قتل کردے یا چاہے تو مجھے چھوڑ دے۔ مگر یہ بھی یاد رکھ کہ ایک دوسرا حاکم بھی ہے جو تجھ سے ہی نہیں سب سے بڑا ہے۔ وہ زبردست قدرت والا عزیز و منتقم ہے اور وہ حق و باطل میں بخوبی فیصلہ کرسکتا ہے۔''
وزیر نے آپ کا جواب سنا تو فرطِ غضب سے کانپنے لگا، بولا۔ ''امیرالمومنین! بے ادبی اور گستاخی کی حد ہوگئی، آخر تامل

کیوں۔ اس گستاخ اور بے ادب کے قتل کا حکم کیوں نہیں صادر فرماتے۔ میری برہنہ شمشیر اس کی گردن اتارنے کے لیے بے تاب ہے۔''

مہدی نے اپنے وزیر کی طرف دیکھا۔ ''تم خاموش رہو اور میرے اور سفیان کے معاملے میں دخل مت دو۔ اگر میں ایسے انسانوں سے بدسلوکی کروں گا تو شقی اور ظالم کہلاؤں گا۔''

اس کے بعد مہدی نے اپنے حاجب سے ایک حکم نامہ لکھوایا۔ اس حکم کی رو سے سفیان ثوری کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا اور کوفے والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ سفیان ثوری کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ مہدی نے اس حکم نامہ پر دستخط کیے اور مہرِ خلافت ثبت کر کے سفیان کے حوالے کیا اور کہا۔ ''اے سفیان! میری نظر میں تم اس منصب کے حق دار ہو اس لیے تم کو یہ منصب دے کر میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔''

سفیان ثوری حکم نامہ لے کر باہر نکلے، اسے پڑھا اور رونے لگے۔ بہ آوازِ بلند یہ حدیث پڑھی۔

''جو شخص لوگوں پر حاکم بنایا گیا وہ چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا۔''

آپ نے اس حکم نامہ کو پھاڑ کر دریائے دجلہ میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''خلیفہ مجھے قاضی بنا کر امامت کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈالنا چاہتا ہے اور مجھے عیوب اور جرائم کے جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔''

اس کے بعد آپ روپوش ہو گئے۔ مہدی نے انہیں بہت تلاش کرایا۔ جب یہ نہیں ملے تو ان کی جگہ کسی اور کو قاضی کوفہ مقرر کر دیا۔

☆☆☆

کسی نے سفیان کو سمجھایا۔ ''حضرت آپ اگر دربار سے راہ و رسم رکھیں تو اس سے مخلوق کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ آپ ان کو ظلم کرنے سے باز رکھیں گے، نصیحتیں کریں گے اور ممنوعات سے روکیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خوب! گویا میں دریا میں کود کر اپنے آپ کو بھیگنے سے محفوظ رکھوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ دربار میں میری بڑی آؤ بھگت ہوگی اور میں ان کی طرف جھک جاؤں گا۔ اس طرح میں بھی انہی میں شامل ہو جاؤں گا۔''

ایک شخص نے آپ کے سامنے اپنی مصیبتوں کا رونا شروع کیا۔

آپ اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا۔ ''کیا تیری نظر میں مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی اور نہیں تھا۔ جو اللہ کا شکوہ میرے سامنے شروع کر دیا۔ یہ جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر صبر کر اور خدا کا شکر ادا کر، جس نے تجھ کو اتنے مصائب دیے کہ تو انہیں برداشت کرنے کا اہل نکلا۔''

آپ فرمایا کرتے تھے کہ علما کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک وہ جو اللہ اور اللہ کے حکم کا عالم ہوتا ہے۔ یہ اللہ سے ڈرتا ہے اور حدود کے اندر رہتا ہے۔

دوسرا وہ جو اللہ کا عالم تو ہوتا ہے مگر اس کے اوامر کا عالم نہیں ہوتا۔ یہ اللہ سے ڈرتا تو ہے مگر اس کے حدود سے تجاوز بھی کر جاتا ہے۔

تیسرا وہ جو اللہ کے احکام کا عالم تو ہوتا ہے مگر اللہ کا نہیں۔ یہ نہ تو اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے حدود کا خیال رکھتا ہے۔

کسی ارادت مند نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی دو تھیلیاں ارسال کیں اور یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ آپ میرے والد کے دوست ہیں اور وہ فوت ہو چکے ہیں، ان کی ہدایت کے بموجب ان کی پاکیزہ کمائی میں یہ تھیلیاں ارسال ہیں۔ آپ ان کو اپنے اخراجات میں لائیے۔

آپ نے دونوں تھیلیاں واپس کر دیں اور جواب میں کہلا دیا۔ ''صاحبزادے! آپ کے والد سے میرے تعلقات صرف دین کے لیے تھے، دنیا کے لیے نہیں، اس لیے تھیلیاں واپس ہیں۔''

آپ سفر کرتے ہوئے عقلان تشریف لے گئے۔ آپ وہاں تین دن تک رہے، اس دوران آپ کے پاس ایک شخص بھی ایسا نہیں آیا جو آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا۔ آپ کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور اپنے ساتھی سے فرمایا۔

''میرا اس شہر میں قیام ہو چکا۔ یہ عجیب شہر ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس شہر میں علم یا تو مر چکا ہے یا عنقریب مر جائے گا۔''

آپ نے عقلان کو چھوڑ دیا۔ واقعی عقلان سے کوئی عجوبہ روزگار ہستی نہیں اٹھی۔

ایک دن آپ نے ایک نوجوان کو دیکھا جو سرد آہیں بھرتا پھر رہا تھا۔ آپ نے اس کی آہ میں سوز محسوس کیا۔ اس کو روک کر پوچھا۔ ''نوجوان! یہ سرد آہیں کیوں بھرتے پھر رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''اس کا تعلق میرے خدا سے ہے آپ کو میری آہ سے کیا غرض؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بھائی! تیری آہ کی سوزش میں اپنے دل پر محسوس کر رہا ہوں۔ میں تو اس آہ کا ترسا ہوا ہوں اور مدت العمر سے اس کی تمنا کر رہا ہوں۔''

نوجوان خاموش ہو گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''نوجوان! میں نے چار حج کیے ہیں، میں ان چار حجوں کا اجر تجھ کو دینے پر تیار ہوں، اگر تو اپنی آہ کا اجر مجھے دیدے۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا دو اجروں کا تبادلہ ممکن ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''سادہ لوح نوجوان! بس تو ہاں کر دے، بقیہ کام میرا ہے۔''

نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر ایسا ممکن ہو۔''

آپ اسی وقت وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گئے اور رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر بارگاہ رب العزت میں عرض کرنے لگے۔ ''رب العالمین! میں اس نوجوان جیسی آہ کا ترسا ہوا ہوں۔ یہ نوجوان مجھے چار حجوں کے تبادلے میں اپنی آہ کا اجر دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ خدایا اس تبادلے کو ممکن بنا دے۔''

وہ دیر تک روتے گڑگڑاتے رہے، آخر انہیں کچھ ایسا محسوس ہوا گویا ان کے دل کو قرار آ گیا ہے اور اضطراب دور ہو گیا، خوشی میں چلائے۔ ''خدا نے میری دعا قبول کر لی، اب میں خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔''

نوجوان سرد آہ بھرتا ہوا کہیں چلا گیا۔ آپ اس سے بہت متاثر ہوئے۔

آپ نے شادی کر لی اور چند سالوں میں صاحب اولاد بھی ہو گئے لیکن آپ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کھانے کے لیے بیٹھتے تو اپنے پالتو کتے کو اپنے سامنے بٹھا لیتے اور اس کو روٹی کے ٹکڑے ڈالتے رہتے۔ پہلے کتا کھاتا اس کے بعد خود کھاتے۔ لوگ یہ عجیب و غریب تماشا دیکھتے لیکن خاموش رہتے کیونکہ وہ سفیان سے سوال جواب کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

آپ کے ایک عزیز نے جو یہ منظر دیکھا تو ان کی بیوی سے پوچھا۔ ''آخر سفیان تم لوگوں کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''یہ سوال انہی سے کرو، وہی اس کا جواب دیں گے۔''

عزیز نے کہا۔ ''آخر کبھی تو اس موضوع پر سفیان سے بات ہوئی ہو گی؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس موضوع پر اس گھر میں کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔''

یہ عزیز سفیان کے پاس پہنچ گیا اور انہیں شرمندہ کرنے کی غرض سے بولا۔ ''سفیان! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس کا جواب دیں گے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''ضرور جواب دوں گا کرو سوال۔'' عزیز نے کہا۔ ''میں کیا ایک زمانہ یہ عجیب و غریب منظر ہر روز دیکھتا ہے کہ آپ کھانے میں ایک کتے کو تو شریک فرما لیتے ہیں لیکن بیوی بچوں کو شامل نہیں کرتے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

سفیان نے جواب دیا۔ ''بھائی میرے! میری بیوی بچے میری عبادت میں حارج ہوتے ہیں جبکہ یہ کتا مجھ سے چند لقمے حاصل کر کے میری نگہبانی کرتا ہے اور میں بے فکری سے خدا کی عبادت میں مشغول رہتا ہوں۔''

آپ کے اس جواب نے اس شخص کو لاجواب کر دیا۔ وہ منہ لٹکا کر آپ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

آپ کے پاس لوگ طرح طرح کے سوالوں کے ساتھ آتے اور جوابوں سے مطمئن ہو کر واپس چلے جاتے۔ کئی شخص دور دراز کا سفر کر کے آپ کے پاس آئے اور سوالات کرنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا کوئی بادشاہ کسی زاہد سے بلند مرتبہ ہو سکتا ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بالکل ہو سکتا ہے۔ زہاد کی صحبت اختیار کرنے والا بادشاہ اس زاہد سے بہتر ہے جس کو بادشاہ کا قرب حاصل ہو۔''

دوسرے نے سوال کیا۔ ''مخلوق میں کون لوگ مقبول ہوتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پانچ قسم کے لوگ زیادہ ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ اول زاہد عالم، دوم فقیہہ صوفی، سوئم متواضع

تونگر، چہارم شاکر درویش، پنجم شریف سنی۔''

ایک شخص نے سوال کیا۔''انسان کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟''

جواب دیا۔''اس کو جو زیادہ زخم لگاتا ہے اور اس کی دولت پر قابض ہوجاتا ہے۔''

ایک شخص نے پوچھا۔''یقین کا مفہوم کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔''قلبی آواز کا نام یقین ہے۔ اہلِ یقین معرفت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور یقین کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ہر مصیبت کو منجانب اللہ تصور کرے۔''

کسی شخص نے پوچھا۔''رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ زیادہ گوشت خوروں کو خدا دشمن تصور فرماتا ہے آخر اس کا کیا مطلب ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔''یہاں گوشت سے مراد غیبت ہے۔ کیونکہ مسلمان کی غیبت کرنا ایسا ہے جیسے کسی نے مردار گوشت کھالیا ہو اور اہل غیبت کو اللہ دشمن خیال کرتا ہے۔''

آپ نے اپنے ہم عصر ایک دوسرے صوفی سے فرمایا۔''حاتم! میں تمہیں چار چیزوں سے آگاہ کرتا ہوں جن کو لوگوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے بھلا دیا ہے۔ اول یہ کہ لوگوں پر اتہام لگا کر برا بھلا کہنا۔ اس سے انسان احکام خداوندی سے غافل ہوجاتا ہے۔ دوم کسی مومن کے عروج پر حسد کرنا۔ یہ ناشکری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سوم ناجائز دولت جمع کرنا۔ اس سے انسان اپنی آخرت کو فراموش کر دیتا ہے۔ چہارم خدا کے ڈراوؤں سے خوفزدہ نہ ہونا۔ اس کے وعدوں سے مایوسی کا اظہار کرنا، اس سے کفر عائد ہوجاتا ہے اور یہ ساری چیزیں بہت ہی بری ہیں۔''

آپ ظہر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے جارہے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے ارادت مند بھی تھے۔ انہوں نے ایک جگہ ایک سپاہی کو سویا ہوا دیکھا۔ کسی ارادت مند نے عرض کیا۔''یا شیخ! یہ سپاہی سویا ہوا ہے اور ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ اگر اس کو جگا دیا جائے تو یہ بھی نماز باجماعت ادا کر لے گا۔''

آپ نے اسے منع کر دیا، فرمایا۔''اسے مت جگاؤ، سونے دو کیونکہ یہی اس کی عبادت ہے۔ اگر یہ جاگ گیا تو مخلوق کو ستانا شروع کر دے گا۔''

کسی نے آپ سے کہا۔''سفیان! لوگ چلے گئے اور ہم پسماندہ گدھوں پر پیچھے رہ گئے۔''

آپ نے جواب دیا۔''یہ بھی بہت اچھے ہیں بشرطیکہ راہ پر ہوں۔''

آپ نے اپنے ایک ارادت مند کو خط میں لکھا۔

''بھائی جان! دیکھو اپنے آپ کو امیروں کے پاس جانے اور کسی چیز میں ان سے خلط ملط کرنے سے بچاؤ۔ تم سے کہا جائے گا کہ تم امیروں کی صحبت میں رہ کر کمزوروں کی سفارش کرو گے۔ کسی مظلوم کو بچالو گے یا کسی ظلم کو موقوف کرادو گے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ شیطان کے دھوکے ہیں۔ مولویوں نے اس فقرے کو امیروں سے نزدیک ہونے کی سیڑھی اور دنیا کو شکار کرنے کی وجہ بنایا ہے۔

اگر لوگوں کی نسبت مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان کو علم سے خدا مقصود ہے تو میں ان کے گھروں میں جا کر علم سکھاتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ان کا علم مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو پھسلائیں، لوگوں کو بہلائیں۔ وہ ہر جگہ یہی کہیں گے کہ حدثنا سفیان (حدیث بیان کی ہم سے سفیان نے) لیکن جب ان سے یہ کہا جائے کہ حدیث بیان کیجیے تو کہتے ہیں کہ نہ تو میں تم سے حدیث سننے کا اہل پاتا ہوں اور نہ ہی خود کو حدیث بیان کرنے کے لائق سمجھتا ہوں۔''

بخارا میں کوئی عزیز آپ کا فوت ہوا۔ اس کا ورثہ شرعی طور پر آپ کو پہنچتا تھا۔ قاضی نے مال وراثت امانتاً جمع کر کے آپ کو اطلاع بھجوادی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ اس ورثے کو قبول نہیں کریں گے مگر آپ بخارا روانہ ہوگئے۔ جب بخارا میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور قاضی نے وہ مال آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اس مال کو بیچ کر اشرفیاں لے لیں اور انہیں لے کر واپس چلے آئے۔

لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ حضرت زندگی بھر مال و زر کی مخالفت اور مذمت کرتے چلے آئے ہیں اور اب اشرفیوں کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔

آپ نے جواب دیا۔''اس وقت میں اس کا جواب نہیں دوں گا لیکن وقت آنے پر اس کا جواب دوں گا ضرور۔''

آپ کے مخالفین نے طنزاً کہا۔ ''یہ ساری فضول باتیں ہیں ورنہ حقیقتاً آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔''
سفیان نے جواب دیا۔ ''صاحبان! ایسی بات نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا جواب وقت آنے پر دوں گا۔ آپ لوگ خوامخواہ بدظن نہ ہوں۔''
لوگ خاموش ہو گئے اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔ آپ بصرے کے بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک دکان پر پرندے کو پنجرے میں بند دیکھا جو آپ کو دیکھ کر زور زور سے بولنے لگا۔ آپ دکان پر گئے اور پرندے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''
وہ اور زور سے بولنے لگا۔
آپ نے دکاندار سے درخواست کی۔ ''بھائی! یہ پرندہ فریاد کر رہا ہے اس کو رہا کر دے۔''
دکاندار نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کو بڑے شوق سے پالا ہے پھر رہا کیوں کر دوں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''مجھ سے اس کی قیمت لے لے اور اسے آزاد کر دے۔''
کسی دوسرے دکاندار نے اس دکاندار سے پوچھا۔ ''کیا تو ان بزرگ کو جانتا ہے؟''
دکاندار نے نفی میں گردن ہلائی، جواب دیا۔ ''نہیں، میں ان سے واقف نہیں ہوں۔''
دوسرے دکاندار نے کہا۔ ''یہ سفیان ثوری ہیں۔ اس عہد کے نامور صوفی اور عالم حدیث۔''
دکاندار مرعوب ہو گیا اور اس نے پرندے کو اسی وقت رہا کر دیا۔ پرندہ اڑ کر دکان کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور سفیان کی طرف دیکھ کر آوازیں نکالنے لگا۔
آپ نے دکاندار سے پوچھا۔ ''اس پرندے کی قیمت بتا تاکہ میں ادا کر دوں۔''
دکاندار نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ مزید شرمندہ نہ کیجیے۔ جب تک میں آپ کو جانتا نہ تھا اس وقت یہ بات مجھے زیب دیتی تھی لیکن اب ایسی بات سوچنا تک میرے لیے گناہ ہے۔''
دکاندار نے آپ سے پرندے کی قیمت نہیں لی۔ پرندہ ... کچھ دیر منڈیر پر بیٹھا رہا اس کے بعد اڑ گیا۔
سفیان نے اس پرندے کو اس وقت پھر دیکھا جب آپ وضو کر رہے تھے۔ جب تک آپ وضو کرتے رہے، وہ پرندہ دیوار پر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ ہر اس وقت حاضر ہو جاتا جب آپ وضو کر رہے ہوتے۔

☆☆☆

جب کوئی آپ سے یہ کہتا کہ حضرت میں سفر پر جا رہا ہوں۔
تو آپ اس سے فرماتے کہ ''دیکھو اگر کہیں موت مل جائے تو میرے لیے خرید لینا۔''
آخری دنوں میں آپ کو پیچش کا عارضہ ہو گیا تھا۔ کسی نے حاکم بصرہ کو آپ کی بیماری سے مطلع کیا۔ حاکم بصرہ نے آپ کی تلاش شروع کر دی۔ آخر آپ کو حاکم بصرہ کے آدمیوں نے مویشیوں کے باڑے میں پایا۔ ان آدمیوں نے کہا۔ ''اے سفیان! آپ کو حاکم بصرہ نے بلوایا ہے۔ وہ آپ کا علاج کرانا چاہتا ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں زندگی بھر درباروں سرکاروں سے دور رہا ہوں۔ اب آخر وقت میں حاکم بصرہ کے پاس جا کر کیا کروں گا۔''
اس وقت آپ کی یہ حالت تھی کہ پیچش کی مروڑ آپ کو بہت زیادہ کرب میں مبتلا کیے ہوئے تھی اور آپ بار بار بیت الخلا جا رہے تھے۔ جب بیت الخلا سے نکلتے، وضو کرنے بیٹھ جاتے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! آپ کی حالت بہت نازک ہے اگر بار بار وضو نہ کریں تو یہ بہتر ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس لیے بار بار وضو کر رہا ہوں کہ کچھ پتا نہیں کس وقت خدا کے حضور طلبی ہو جائے اور میں بغیر وضو کے وہاں پہنچ جاؤں۔''
اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! میں ہمیشہ موت کا خواہش مند رہتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ موت کتنی کٹھن اور اذیت ناک چیز ہے۔ لاٹھی ٹیک کر دنیا بھر میں سفر کرنے سے دشوار چیز موت ہے۔''
لوگوں نے کہا۔ ''حضرت! آپ کو کس بات کی فکر، جنت مبارک ہو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جنت کے مستحق تو اور ہی لوگ ہوں گے۔ میری وہاں تک رسائی کہاں؟''

ایک صوفی عبداللہ بن مہدی اس وقت آپ کے پاس ہی تھے۔ جب آپ حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تو عبداللہ سے کہا۔ ”اے ابن مہدی! میرا چہرہ زمین پر رکھ دو۔“

عبداللہ بن مہدی کا رقت سے برا حال ہو رہا تھا، روتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ ایسی خواہش کیوں کر رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب میرا وقت بالکل قریب ہے۔“

عبداللہ بن مہدی نے آپ کا چہرہ زمین پر رکھ دیا اور آپ کے ارادت مندوں کو اطلاع دینے باہر چلے گئے۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں ایک ہجوم نظر آیا۔ عبداللہ بن مہدی کو ان آنے والوں پر حیرت تھی، پوچھا۔ ”آپ لوگ یہاں کیوں اور کس کے پاس آئے ہیں؟“

ان لوگوں نے جواب دیا۔ ”جناب! ہمیں خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ یہ سفیان ثوری کا آخری وقت ہے ان کے پاس پہنچ جاؤ۔“

عبداللہ بن مہدی نے ان سب کو اندر بلا لیا۔ اس وقت سفیان کی حالت بہت زیادہ نازک ہو چکی تھی۔

آپ نے بدقت تکیے کے نیچے سے اشرفیوں کی تھیلی نکالی اور عبداللہ ابن مہدی سے فرمایا۔ ”انہیں حاجت مندوں میں تقسیم کر دو۔“

ان میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو سفیان سے اختلاف رکھتے تھے مگر بادل ناخواستہ حاضر ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔ ”حضرت! آپ تو زندگی بھر دوسروں کو دولت جمع کرنے سے منع فرماتے رہے اور خود آپ نے اتنی ساری اشرفیاں جمع کر رکھی ہیں؟“

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”دوستو! یہ وہی اشرفیاں ہیں جو مجھے بخارا کے ایک متوفی کے ورثے سے ملی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک اشرفی بھی خرچ نہیں کی اور ان سے ایمان کے تحفظ کا کام لیا ہے کیونکہ جب شیطان مجھے ورغلاتا تھا کہ اب تم کہاں سے کھاؤ گے تو میں جواب دیتا کہ میرے پاس اشرفیاں موجود ہیں۔ جب شیطان مجھ سے کہتا کہ تمہیں کفن کہاں سے نصیب ہوگا۔ اس وقت بھی میں یہی جواب دیتا کہ میرے پاس اشرفیاں جو موجود ہیں۔ حالانکہ مجھے ان اشرفیوں کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن شیطانی وسوسوں سے نجات پانے کے لیے میں نے انہیں اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔“

باتیں کرتے ہی کرتے آپ نے ذرا سا سکوت اختیار کیا پھر کلمہ پڑھا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

جب آپ کا جنازہ اٹھا تو آزاد کیا ہوا پرندہ اچانک ایک طرف سے نمودار ہوا اور جنازے کے اوپر پرواز کرتا رہا پھر جب آپ کی تدفین عمل میں آگئی تو وہ پرندہ آپ کے مزار ہی پر رہنے لگا۔

☆☆☆

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ان کے فضل و کمال کے بے حد معترف تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ”اگر سفیان ابراہیم نخعیؒ (ابوحنیفہ کے استاد الاساتذہ) کے زمانے میں ہوتے تب بھی لوگ حدیث میں سفیان کے محتاج ہوتے۔“

امام احمد بن حنبلؒ بھی ان کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے، کسی نے پوچھا۔ ”سفیان ثوری احفظ تھے یا سفیان عیینہ؟“

جواب دیا۔ ”سفیان ثوری احفظ تھے اور بہت کم غلطی کرتے تھے اور سفیان عیینہ حافظ تھے۔“

امام مالکؒ فرماتے تھے۔ ”عراق نے ہم پر درہم و دینار کی بارش کی لیکن اس نے سفیان ثوری کے بعد علم کی بارش شروع کر دی۔“

چونکہ آپ شریعت و طریقت میں کامل اور علوم و رسالت کے وارث تھے اسی وجہ سے لوگوں نے آپ کو امیر المومنین کا خطاب دے دیا تھا۔

ماخذ

بھوت

بابر نعیم

جن لوگوں کو اپنی ذات اور اپنے کام پر بڑا زعم ہوتا ہے وہی اکثر پانی کے بلبلے کے مانند بے رنگ وبے وزن ثابت ہوتے ہیں جیسے کہ اس مصنف کا حال تھا جو خود کو معاشرے کا نبّاض سمجھتا تھا مگر اسے خود اپنی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی لیکن وقت... بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ایسی ایسی چالیں چل جاتا ہے کہ سارا زعم اپنی ہی آنکھوں میں مٹی کے ذرات بن کر چبھنے لگتا ہے پھر دل چاہتا ہے کہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا پا لیا جائے... ہے نا کیسی عجیب بات؟

ایک بلند عمارت کی ٹوٹ پھوٹ کا دلچسپ تماشا

میں نے ٹیلی فون کان سے لگایا تو دوسری جانب سے ایک آواز آئی۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔''

وہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔ اس لیے میں نے پوچھا۔ ''کون بول رہا ہے؟''

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے جس میں تمہیں بہت سارا پیسا ملے گا۔ کیا تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو؟''

پیسوں کا نام سن کر میرے منہ میں پانی آ گیا اور میں

جلدی سے بولا۔ ”یقیناً لیکن معلوم تو ہو کہ تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟“

”تم نے سا کرامینٹو کے قلب میں اولڈ سول کافی شاپ دیکھی ہے؟“

”ہاں۔“

”تم مجھے ایک گھنٹے کے اندر وہاں ملو۔“

”لیکن میں تمہیں کیسے پہچانوں گا؟“

”تم نے میری تصویریں اخبارات اور ٹی وی پر دیکھی ہوں گی اگر پھر بھی نہ پہچان سکے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں پہچان لوں گا۔“

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے کافی شاپ میں قدم رکھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کونے کی ایک میز پر تقریباً اسی برس کا سفید بالوں والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا گو کہ میں فوری طور پر اسے نہ پہچان سکا لیکن کسی حد تک مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہی وہ شخص ہے جس سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ جیسے جیسے اس کے قریب ہوتا گیا۔ مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا سا لگنے لگا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ امریکا کا عظیم ناول نگار گرانٹ ہیریسن ہے۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”اوہ میرے خدا۔“ میں فرطِ جذبات سے بولا۔ ”مسٹر ہیریسن۔ میں تمہارا بہت بڑا پرستار......“

”اچھا۔ اچھا۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت میں تعریف سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ یہ دو مصنفین کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے جس کا تعلق ایک کاروباری معاملے سے ہے۔ کیا تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو؟“

”یقیناً۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ہر اس بات سے دلچسپی ہے جو تم کہنا چاہتے ہو۔“

”میں نے حال ہی میں تمہاری کتاب پڑھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آرین فال آف ڈائمنڈز میرا خیال ہے کہ تم ایک ہونہار مصنف ہو گو کہ اس میں کہانی کی کمی ہے لیکن تحریر حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میں تمہاری تعریف نہیں کر رہا لیکن میرے نزدیک کسی بھی تحریر میں حقیقت نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔“

میں یہ سن کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”تم نے میری کتاب کیسے پڑھ لی؟“

”میں حال ہی میں اپنے پبلشر کے دفتر گیا تھا۔ وہاں میری نظر مسترد شدہ مسودوں پر پڑی جنہیں ان کے مصنفین کو واپس بھیجنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ میں نے ان کی ورق گردانی شروع کر دی کہ شاید ان میں کوئی خاص بات نظر آ جائے لیکن ان میں سے زیادہ تر فضول تھے پھر میرے ہاتھ تمہارا لکھا ہوا مسودہ آ گیا اور چند سطور پڑھنے کے بعد ہی مجھے اس کے کھرے پن کا اندازہ ہو گیا۔“

یہ سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ میرے اس ناول کو درجنوں پبلشر مسترد کر چکے تھے جس کے بعد میرے ایجنٹ نے بھی اپنی کوششیں ترک کر دی تھیں اور اب امریکا کا عظیم ترین ناول نگار اس کی تعریف کر رہا تھا۔ کیا وہ میرے ناول کو اپنے طور پر چھاپنا چاہ رہا ہے؟

شاید اس نے میرے خیالات پڑھ لیے اور بولا۔ ”کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری تحریر ضرور پسند آئی ہے لیکن یہ کتاب قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ اس کا مواد ناکافی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے پلاٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پلاٹ ہے۔ کچھ دلچسپ کردار اور عمدہ مکالمے بھی ہیں لیکن اچھی کتاب وہ ہوتی ہے جس کے ہر صفحے میں بھرپور مواد ہو اور قاری اسے پڑھے بغیر آگے نہ بڑھ سکے اور تمہاری کتاب میں یہ بات نظر نہیں آتی۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا شکر گزار ہوں کہ یہ بات بتانے کے لیے تم نے وقت نکالا۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں یہاں تمہاری کتاب کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا۔ جیسا کہ فون پر بتایا تھا۔ میں تم سے ایک کام کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے فرش پر رکھا ہوا چرمی بیگ اٹھایا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں میرے تازہ ترین ناول کا مسودہ ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ایک مرتبہ میری خاطر پڑھ لو۔“

”میں یہ سن کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”کیا تم اس کے بارے میں میری رائے جاننا چاہتے ہو کہ آیا اس میں کافی مواد ہے یا نہیں؟“

اس نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس کتاب کو پڑھ لو لیکن کسی کو اس کا پتا نہ چلے۔ تمہاری بیوی یا بیٹی کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیے۔“

میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اسے میری بیوی اور بیٹی کے بارے میں کس طرح معلوم ہوا۔ اس نے ایک بار پھر میرا چہرہ پڑھ لیا اور بولا۔ ”میں نے انٹرنیٹ سے

تمہارے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں اور پڑھ کر اندازہ ہوا کہ تم ادب کی دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے جدوجہد کر رہے ہو لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس وقت تمہاری بیوی ہی گھر کا کچن چلا رہی ہے۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں تا کہ تمہارے حالات بدل جائیں۔ اس بیگ میں مسودہ کے علاوہ ایک لفافہ میں پانچ ہزار ڈالرز بھی ہیں۔ تم رکھ لو۔ اس کے عوض کچھ نہیں کرنا ہوگا لیکن اگر تم اس سے بھی زیادہ پیسے کمانا چاہتے ہو تو گھر جا کر یہ ناول پڑھنا شروع کر دو۔ اس کے علاوہ میں چاہوں گا کہ ہفتہ کے آخر میں تم نیویارک کے لیے سیٹ بک کروالو۔ میں تمہیں لینے کے لیے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر گاڑی بھیج دوں گا جو تمہیں میرے گھر تک پہنچا دے گی۔ تمہیں ہفتے کے آخری دن میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ تمہارا کھانا پینا اور دیگر اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ جب تم یہ کتاب پڑھ لو گے تو میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھوں گا جس پر عمل کر کے تم بہت سارے پیسے کما سکتے ہو۔ کیا تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''خوب لیکن یاد رکھو کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میرے ناول کا مسودہ تمہارے پاس ہے میں نے اس پر کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے خفیہ طور پر پڑھو اور جب میرے پاس آنے لگو تو بیوی سے جھوٹ بول دینا کہ پبلشر تمہارے مسترد شدہ ناول کو چھاپنے پر تیار ہو گیا اور تم اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے نیویارک جا رہے ہو۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ گھر پہنچتے ہی لارا مجھ سے ضرور پوچھے گی کہ میں دن بھر کیا کرتا رہا اور میرے لیے اس سے کچھ چھپانا مشکل ہو جائے گا لیکن میں نے ہیریسن سے اس خدشہ کا اظہار نہیں کیا اور وعدہ کر لیا کہ کتاب پڑھنے کے بعد ہفتہ کے روز اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

☆☆☆

جب میں ہفتہ کے روز جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پہنچا تو وہاں ایک شوفر میرا منتظر تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سائن بورڈ پکڑا ہوا تھا جس پر میرا نام درج تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے لینے کے لیے وہ کسی سیاہ رنگ کی لیموزین میں آیا ہوگا لیکن اس نے مجھے ایک وین میں سوار کرا دیا۔ نیویارک کی سڑکوں پر بھاری ٹریفک کی وجہ سے کورن وال تک ساٹھ میل کا سفر تقریباً دو گھنٹے میں طے ہوا۔ شوفر نے مجھے ایک دو منزلہ پتھروں کی بنی ہوئی عمارت کے سامنے اتار دیا۔ میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور توقع کر رہا تھا کہ کوئی بٹلر میرا استقبال کرے گا لیکن اس کے بجائے ہیریسن نے خود ہی دروازہ کھولا۔

''اندر آ جاؤ اینڈریو۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے ہم پرانے دوست ہوں۔ ''تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ کیا تم نے کھانا کھا لیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کسی خانساماں کو بلائے گا لیکن وہ بولا۔

''آؤ۔ عقبی حصے کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں میں نے باربی کیو کا انتظام کر رکھا ہے۔''

میں نے کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ وین مجھے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میں نے اپنے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے کہاں رکھوں؟''

''فی الحال اسے یہیں راہداری میں چھوڑ دو۔ اپنے کمرے میں جاتے وقت اٹھا لینا۔''

اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اتنے بڑے گھر کا انتظام چلانے کے لیے ہیریسن کے پاس کوئی ملازم نہیں تھا۔ کیونکہ نہ تو کوئی شخص میرا سامان اٹھانے آیا اور نہ ہی میں نے کسی باورچی کو دیکھا جو ہمارے لیے کھانا بناتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اتنے بڑے گھر میں صرف میں اور ہیریسن ہی تھے۔ میں ہیریسن کے ساتھ ایک کشادہ راہداری سے گزرتا ہوا مکان کے عقبی حصہ تک پہنچا۔ جس کے بعد ایک مضبوط پتھروں کی اونچی دیوار تھی۔ ہیریسن نے مجھے ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کچن میں جا کر میرے لیے کھانا بنانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی میرے نتھنوں میں پارچے بھوننے کی خوشبو آئی اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہیریسن ایک ٹرالی سمیت باہر آیا۔ جس پر دو بھنے ہوئے پارچے، سلاد اور بیئر کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسری کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''شروع ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا تمہیں پسند آئے گا۔''

واقعی کھانا بے حد لذیذ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اسّی سالہ بوڑھا مصنف ایک اچھا باورچی بھی ہوگا۔ کھانے کے بعد بیئر کا دور چلا پھر اس نے جیب سے سگار کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے زندگی میں کبھی تمباکو نوشی نہیں کی تھی۔ اس لیے معذرت کر لی۔ اس نے

اپنے لیے سگار سلگایا اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''کتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم نے پڑھ تو لی ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ گرانٹ ہیریسن کے مخصوص طرز کا ایک شاندار ناول ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے اسے اس جواب سے خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے سگار کا گل جھاڑا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''گویا تم بھی اسے ایک مخصوص طرز کا ناول سمجھتے ہو۔''

''نہیں بالکل نہیں بلکہ میرا مطلب تھا کہ......''

اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا اور میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''معذرت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمہیں اسی لیے یہاں بلایا ہے۔ مخصوص طرز کا شاندار، یہ الفاظ سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ میرے ناولوں پر جو تبصرے کیے جاتے ہیں۔ ان میں تعریف کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے لیے ان بے چارے نقادوں کو موردِ الزام ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ میرا شمار دورِ حاضر کے لیجنڈ ناول نگاروں میں ہوتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اڑتیس سالہ زرخرید نقاد جسے میری کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا ہو وہ تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے کر غلطیوں کی نشاندہی کر سکے۔ وہ اس طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میرا پبلشر اور ایجنٹ دونوں ہی اس کاروبار میں غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں۔ اب میں اس مقام پر ہوں کہ کسی ایسے نقاد سے ناراض ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جو میری کتاب پر تنقید کرے لیکن جوانی کے دنوں میں ایک دو بار ایسا ہوا۔ میں کینہ پرور ہو گیا تھا۔ اگر کوئی نقاد میری کتاب پر تنقید کرتا تو میں ادبی محفلوں میں اس کا ناطقہ بند کر دیتا اور اپنے دوستوں سے کہہ کر ان تمام اخبارات وجرائد کے اشتہار بند کروا دیتا جو میری کتابوں پر منفی تبصرے چھاپتے تھے شاید یہی میری غلطی تھی کہ آج کوئی بھی نقاد میرے ناول کی کمزوریوں پر نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک زبانی طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہو لیکن کسی اخبار یا جریدے میں منفی تبصرہ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پیٹھ پیچھے تمہاری برائی کرتے ہوں گے؟''

''یقیناً ایسا ہوتا ہوگا لیکن کچھ لوگ میرے منہ پر بھی کہہ دیتے ہیں۔ کئی عشروں سے ڈومین فراسٹ کے ساتھ میری ادبی رقابت چلی آ رہی ہے۔ اس کی کتابیں میرے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ فروخت ہوتی ہیں لیکن میری طرح اسے نقادوں کی جانب سے پذیرائی نہیں ملتی لیکن وہ اسے ادبی سیاست کا حصہ سمجھتا ہے۔ دراصل میں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں موجودہ دور کے کچھ معروف مصنفین کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ استادوں کا چہیتا تھا اور میرا شمار اپنی کلاس کے ابھرتے ہوئے لکھنے والوں میں ہوتا تھا لہٰذا انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ذاتی طور پر میری کہانیاں نیویارکر، کے ولیم شان کو پڑھنے کے لیے دیں۔ انہوں نے میرے لیے ایجنٹ اور بہترین پبلشنگ ہاؤس کا بھی انتظام کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی بدولت میں کوئی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی امریکن لٹریری سوسائٹی کا ممبر بن گیا تھا۔ اس کے برعکس ڈومین فراسٹ کو ابتدا ہی سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکول سے نکلنے کے بعد اس نے کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ کئی برس معمولی معاوضہ پر محنت مزدوری کرتا رہا۔ فارغ وقت میں وہ کہانیاں لکھتا۔ اس کی بے شمار کہانیاں مسترد ہوئیں لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور ایک دن اسے اپنی محنت کا پھل مل ہی گیا جب صبر آزما انتظار کے بعد اس کی پہلی کہانی شائع ہوئی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر میں بھی صرف صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھتا تو کبھی بھی اوسط درجے کے ناول نگار سے آگے نہیں جا سکتا تھا اور شاید مجھے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے کسی تیسرے درجہ کے کالج میں لیکچرار کی ملازمت کرنا پڑتی۔''

''یقیناً تم نے اس بکواس پر دھیان نہیں دیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

اس نے سگار کا گہرا کش لگایا اور بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ پہلے میں بھی اپنے آپ کو دورِ حاضر کا بڑا مصنف سمجھا کرتا تھا لیکن اب مجھے اتنا زیادہ یقین نہیں ہے اور اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ تاکہ تم یہ جاننے میں میری مدد کر سکو کہ کیا میں واقعی دھوکے باز ہوں۔ جیسا کہ فراسٹ ہمیشہ مجھ پر الزام لگاتا رہتا ہے۔''

''میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں پڑھنے کے لیے جو کتاب دی تھی۔ اسے اپنے نام سے شائع کرواؤ۔''

''ایکسکیوزمی!'' میں نے کہا۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ میرا نیا ناول 'کریونگ ٹائم' تمہارے نام سے شائع ہو اور یہ فطری بات ہے کہ اس کی

فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی تمہارے حصے میں آئے گی۔''

''لیکن یہ تو سراسر غلط ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔'' ہیریسن نے کہا۔ ''تم کوئی چوری نہیں کر رہے بلکہ میں خود تمہیں یہ کتاب دے رہا ہوں۔''

''لیکن تم ایسا کرنا کیوں چاہتے ہو؟''

''شاید زندگی میں پہلی بار یہ جاننا چاہتا ہوں کہ لوگ میرے کام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اگر میں اسے اپنے نام سے شائع کروں گا تو ہمیشہ کی طرح کوئی بھی نقاد اسے پڑھنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ میری عمر تراسی سال ہو چکی ہے اور میں موجودہ دور کا وہ مصنف ہوں جسے بے شمار اعزازات مل چکے ہیں اس لیے تنقید کرتے وقت کوئی بھی میری حیثیت اور مرتبہ کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی میں اس عزت واحترام کا مستحق ہوں یا محض تقدیر کی مہربانی کا فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ کیا ڈومین فراسٹ کا کہنا درست ہے؟ کیا میری کتابیں ادبی معیار کے لحاظ سے اوسط درجے کی ہوتی ہیں۔''

''لیکن جب تم جیسے عظیم مصنف کی کتاب کسی دوسرے مصنف کے نام سے شائع ہوگی تو تم اس کا کریڈٹ نہیں لے سکو گے جب تک کہ اس دھوکا دہی کا اعتراف نہ کرلو اور اگر تم نے ایسا کیا تو ہم دونوں تباہ ہو جائیں گے۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے کسی تعریف وتوصیف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی پیسوں کی پروا ہے۔ میرے اب تک چودہ ناول، چھ مختصر کہانیوں کے مجموعے، چار مضامین کے مجموعے اور دو عدد یادداشتیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے یہ چھبیس کتابیں کافی ہیں لیکن کیا واقعی میں اس ساکھ کا مستحق ہوں؟ اس کا اندازہ مجھے اس کتاب پر ہونے والے تبصروں سے ہو جائے گا جو تمہارے نام سے شائع ہوگی۔ میں دل کا مریض ہوں اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو سال مزید زندہ رہ سکوں گا۔ اس لیے اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو یہ موقع دوبارہ نہیں مل سکے گا کیونکہ اس کے بعد میں کوئی دوسری کتاب نہیں لکھ رہا۔

''لیکن تم نے اس کام کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ تم اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو بھی یہ کتاب دے سکتے ہو تاکہ وہ اسے اپنے نام سے چھپوالیں۔''

''اس میں پکڑے جانے کا امکان ہے۔ کوئی بھی ہوشیار نقاد میرے اندازِ تحریر سے سمجھ جائے گا، مجھے تمہارا اندازِ تحریر پسند ہے تم گزشتہ بیس سالوں سے اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم درحقیقت ایک محنتی مصنف ہو اور اس کامیابی کے مستحق ہو جو اس کتاب کے ذریعے تمہیں مل سکتی ہے۔''

''کیا میں اس کتاب کو اپنے الفاظ میں تحریر کرسکوں گا۔''

''بالکل نہیں۔ تم اس کتاب میں ایک کوما یا فل اسٹاپ بھی تبدیل نہیں کرسکتے۔ یہ شرط ہمارے معاہدے میں شامل ہوگی۔ البتہ تمہیں سارے مالی فوائد حاصل ہوں گے۔ میں زندگی میں پہلی بار اپنی کسی کتاب پر ایسا تبصرہ پڑھنا چاہتا ہوں جس میں میری تعریف اور طرف داری سے کام نہ لیا گیا ہو۔''

میں نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یہ بالکل احمقانہ تجویز لگ رہی ہے۔ تمہیں فراسٹ کی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ تمہارے علاوہ درجنوں لکھنے والے ہارورڈ یونیورسٹی گئے ہوں گے لیکن ان سب نے تمہاری طرح اعزازات اور تمغے حاصل نہیں کیے۔ تم ان لوگوں کے مقابلے میں منفرد حیثیت رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم فراسٹ کی باتوں کو نظرانداز کر کے یہ کتاب اپنے ہی نام سے شائع کرواؤ۔ اگر تمہاری زندگی کے ایک دو سال باقی ہیں تو تم اس آخری کامیابی سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتے؟''

ہیریسن نے نیا سگار سلگایا اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''میں مرنے سے پہلے جاننا چاہتا ہوں کہ فراسٹ کے الزام میں کتنی حقیقت ہے۔ صرف تم ہی وہ شخص ہو جو اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں میری مدد کرسکتے ہو۔ میری تجویز پر عمل کرنے کی صورت میں تمہیں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔ اس کتاب کی فروخت سے تمہیں ایک خطیر رقم ملے گی۔ اس کے علاوہ کتاب کے کامیاب ہونے کی صورت میں تمہاری ساکھ میں بھی اضافہ ہوگا اور تم اپنی کتابیں بہ آسانی شائع کرواسکو گے۔ اس کے بعد تمہاری بیوی کو ملازمت نہیں کرنا پڑے گی اور تمہاری بیٹی کا مستقبل بھی روشن ہو جائے گا۔''

ہیریسن کے دلائل نے مجھے قائل کر ہی لیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہوتا چلا گیا تو یہ چھوٹا سا فراڈ میری زندگی اور کیریئر کو بدل کر رکھ دے گا۔ میں معاشی طور پر مستحکم ہو جاؤں گا بلکہ میرا کیریئر بھی اور مستحکم ہو جائے گا۔ البتہ اس پورے منصوبے میں مجھے ایک خامی نظر آ رہی تھی جس کی وجہ سے میری

امیدوں کا ئل چشم زدن میں زمیں بوس ہوسکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس حد تک انا پرست ہے۔ کیا میں اس پر بھروسا کرسکتا ہوں کہ وہ اس کتاب کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے گا۔ اگر اس ناول کو نقادوں نے حد سے زیادہ سراہا اور اسے متعدد ایوارڈز اور انعامات کے لیے نامزد کیا گیا تو کیا وہ خاموش رہ کر میری کامیابی کو برداشت کرسکے گا؟

ایسا لگتا تھا کہ اس نے میرے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ لی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اینڈریو اور میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اب مجھے کسی مالی منفعت یا شہرت کی تمنا نہیں میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ لوگ میرے کام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔''

مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''مجھے بہت نیند آرہی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہیں صبح اس سوال کا جواب دے سکوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''چلو۔ میں تمہیں کمرا دکھادوں۔''

☆☆☆

دوسرے دن میں گھر واپس آگیا۔ میں نے ہیریسن کی دی ہوئی ڈسک اپنے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کی اور مسودہ کا ایک پرنٹ نکال کر اپنے ایجنٹ کو بھیج دیا۔ اے رین فال آف ڈائمنڈز، کے مسترد کیے جانے کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میرے دوسرے ناول کو دیکھنے کی زحمت گوارہ کرے گا لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

تین ماہ بعد ایک اشاعتی ادارے سے میرا معاہدہ ہوگیا۔ انہوں نے مجھے ایک خطیر رقم بطور ایڈوانس دی لیکن اسے غیر معمولی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اگر یہ صرف پانچ ڈالرز ہوتی تب بھی میں پروانہ کرتا۔ یہ احساس ہی بڑا دل خوش کن تھا کہ میرا ابھی ایک ناول شائع ہونے والا ہے گو کہ میں نے اسے نہیں لکھا تھا لیکن اس کے باوجود میرے ساتھ ایک مصنف جیسا سلوک کیا جارہا تھا۔ ہر شخص کی نظریں بدل گئی تھیں۔ یہاں تک کہ میری بیوی کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔

اس ناول کی اشاعت نے کوئی غیر معمولی دھماکا نہیں کیا حالانکہ پبلشر نے اس کی تشہیر پر خاصی رقم خرچ کی تھی جس کی وجہ سے ناول کی فروخت پر اچھا اثر پڑا لیکن نقادوں کی جانب سے حوصلہ افزا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ دوردراز کے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات نے اس ناول پر تنقید کرتے ہوئے قدرے نرم لہجہ اختیار کیا جس کی وجہ سے ان علاقوں میں کتاب کی فروخت اچھی رہی لیکن بڑے اخباروں مثلاً نیویارک ٹائمز، ٹائم میگزین، نیوزویک وغیرہ نے متفقہ طور پر اسے مسترد کردیا۔ ان سب نے عام طور پر ایک ہی بات کہی کہ اس کتاب میں ایسا کچھ نہیں جو ہماری موجودہ زندگی سے مطابقت رکھتا ہو۔ مجھے ان تبصروں سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ یہ ہیریسن کی تحریر پر کیے گئے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان منفی تبصروں سے مجھے ایک طرح کا اطمینان ملا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر نقادوں نے اس ناول کی بہت زیادہ تعریف کردی تو ہیریسن جیسا انا پرست اس کتاب کے حوالے سے خاموش نہیں رہے گا، اگر یہ ناول نقادوں کی نظر میں ادبی شاہکار کا درجہ حاصل کرلیتا تو عین ممکن تھا کہ ہیریسن معاہدہ توڑ کر اصل حقیقت لوگوں کو بتادیتا اور اس طرح وہ ڈومین فراسٹ پر بھی یہ ثابت کردیتا کہ نقاد اس کے نام سے نہیں بلکہ کام سے متاثر ہوکر تعریفی تبصرے کرتے ہیں لیکن اب ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا بلکہ وہ تو خاموش رہنے میں عافیت سمجھے گا۔ اس کتاب کی اشاعت سے پبلشر کو مالی طور پر خاصا فائدہ ہوا اور اس نے مجھ سے ایک اور ناول کا تقاضا کردیا۔ میں نے اس پیشکش کو غنیمت جانا اور پوری توجہ سے نیا ناول لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ روز بعد مجھے ایک اور ٹیلی فون کال موصول ہوئی جس نے میری زندگی میں ڈرامائی تبدیلی پیدا کردی۔

میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمارے درمیان یہ طے ہوگیا تھا کہ دوبارہ رابطہ نہیں کریں گے۔''

''ہاں لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ کیا تم اس ویک اینڈ پر آسکتے ہو؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن مسئلہ کیا ہے؟'' میرا دل کسی نامعلوم اندیشے کے تحت تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''تمہارے آنے پر سب کچھ بتادوں گا۔ اس بارے میں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بیوی سے کہہ دینا کہ پبلشر سے ملنے نیویارک جارہے ہو۔''

''کوئی پریشانی والی بات تو نہیں؟''

''نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں ہفتہ کے روز تمہارا انتظار کروں گا۔''

☆☆☆

سب ٹھیک نہیں تھا۔ میں جب ہیریسن سے ملنے اس کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ خاصا مضطرب دکھائی دیا۔ وہ مجھے دوسری منزل پر واقع اپنے اسٹڈی روم میں لے گیا جہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ چاروں طرف اخبارات اور رسالے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر میں کریونگ ٹائم پر تبصرے شائع ہوئے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے یہ تبصرے پڑھ لیے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس میں وہی کچھ لکھا ہے جس کی توقع کسی غیر معروف مصنف کے پہلے ناول سے کی جا سکتی ہے۔ یہ ملے جلے تبصرے ہیں۔''

''تم انہیں ملے جلے تبصرے کہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو ان سب میں ایک جیسا معاندانہ انداز کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ انہیں ایک ہی آدمی نے لکھا ہے۔''

''تم صرف ان تبصروں پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہو جو نیویارک کے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں جبکہ دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات نے اس کتاب پر خاصے حوصلہ افزا تبصرے کیے ہیں۔''

''کیا تم یہ توقع کرتے ہو کہ میں ان غیر اہم اور غیر معروف نقادوں کے تبصرے پڑھ کر خوش ہو جاؤں گا۔ ملک کے نامور نقادوں کے تبصرے پڑھ کر میرا خون کھول رہا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انہوں نے اس ناول کو ایک نئے لکھنے والے کی تخلیق سمجھ کر بے رحمی سے تنقید کی ہے۔ اگر یہی ناول کولمبیا یونیورسٹی کے کسی فارغ التحصیل مصنف نے لکھا ہوتا جہاں کے سارے پروفیسرز معروف نقاد ہیں تو اس کتاب پر بھی مثبت تبصرے شائع ہوتے۔''

''کیا تم خود ایسا نہیں چاہتے تھے کہ اس کتاب کو پڑھ کر غیر جانبدارانہ تبصرہ کیا جائے۔''

''لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس پر منفی تنقید ہو۔''

''تمہیں اس بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کو اس سے کیا غرض کہ نیویارک کے چند دانشور اس کتاب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔''

''اگر مجھے ان نقادوں کی پروا نہ ہوتی تو میں یہ تجربہ ہی نہ کرتا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس ملک کے سنجیدہ نقاد میرے کام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس ملک میں زیادہ سے زیادہ درجن بھر ایسے لوگ ہوں گے جن کی رائے کی کوئی اہمیت ہے۔ جن نقادوں نے اس ناول کی تعریف کی ہے۔ ان کی رائے قطعی غیر اہم ہے۔ اس ملک کے ننانوے فیصد دانشور نیویارک میں رہتے ہیں اور ان کم بختوں نے صرف اس بنیاد پر میری کتاب کو ناکارہ قرار دیا ہے کہ اسے کسی غیر معروف مصنف نے لکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اب ہم اس بارے میں کیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں اس فریب کو فوراً ختم کرنا ہوگا۔ مجھے اپنے آپ کو اس کتاب کے مصنف کے طور پر ظاہر کر دینا چاہیے۔ ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں کئی ایسے نقادوں کو جانتا ہوں جو میری حمایت کریں گے۔ میں انہیں باور کرا سکتا ہوں کہ وہ غلطی پر تھے۔''

''تم اپنے ہوش میں تو ہو۔'' میں چلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پبلشر کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں جس میں حلفیہ اقرار کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا مصنف میں ہوں...... اگر ہم نے حقیقت ظاہر کر دی تو دونوں ہی دھوکا دہی کے الزام میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ شاید تمہیں اس کی پروا نہ ہو کیونکہ تمہاری بہت تھوڑی زندگی باقی رہ گئی ہے لیکن مجھے کافی عرصہ زندہ رہنے کی امید ہے اور میں یہ اعتراف کر کے اپنی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔''

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو اینڈریو۔ لوگ تمہیں نہیں بلکہ مجھے الزام دیں گے۔ میں لوگوں کو بتا دوں گا کہ اس دھوکا دہی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ تم میرے کہنے پر اس منصوبے میں شامل ہوئے تھے۔''

''خوب۔ گویا تم چاہتے ہو کہ لوگ مجھے ایسا احمق سمجھیں جو ایک طاقتور شخص کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ ہمیں اپنے معاہدہ کا احترام کرنا چاہیے۔''

''مجھے افسوس ہے اینڈریو لیکن میں خاموش بیٹھ کر یہ نہیں دیکھ سکتا کہ جس کتاب کو میں نے اپنی زندگی کے چھ سال دیے۔ اسے خون آشام بھیڑیوں کا غول یوں چیر پھاڑ کر رکھ دے۔''

''تم اس کتاب کی حمایت میں ٹائمز یا کسی دوسرے اخبار کو خط لکھ سکتے ہو بلکہ بہتر ہوگا کہ ایک مضمون لکھ کر اپنے حمایتی اخباروں میں چھپوا دو۔''

ہیریسن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے۔ میں لوگوں کو بتا دوں گا کہ یہ کتاب میں نے لکھی ہے اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ ذاتی طور پر یہ

اطلاع تمہیں دے سکوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تم نے جو کچھ میرے لیے کیا۔ اس کا مجھے کوئی احساس نہیں ہے۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی تم رکھ لو۔ اس کے علاوہ بھی میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔''

اس نے مجھے ایک لفافہ پکڑایا جس میں ایک لاکھ ڈالرز کا چیک رکھا ہوا تھا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنی بات میں کتنا سنجیدہ ہے۔

میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ہیریسن میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس راز پر سے پردہ نہ ہٹاؤ۔ ورنہ میں ساری عمر شرم کے مارے سر نہ اٹھا سکوں گا۔ میری بیوی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اپنے دوستوں اور رشتے داروں میں فخریہ طور پر میرا ذکر کرتی ہے۔ یہ حقیقت جان لینے کے بعد زندہ نہ رہ سکے گی۔''

''کیا مزید پچاس ہزار ڈالرز سے تمہاری پریشانی دور ہوسکتی ہے؟''

''بالکل نہیں۔ یہ پیسوں کا نہیں بلکہ میری ساکھ کا معاملہ ہے۔ میں صرف تمہاری مدد کے خیال سے اس منصوبے میں شامل ہوا تھا لیکن تم میرے خلوص کی قیمت لگا رہے ہو جو قطعاً قابلِ قبول نہیں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ تم اس طرح سوچ رہے ہو لیکن میں اپنا ذہن بنا چکا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ البتہ یہ میرا وعدہ ہے کہ ہمارے درمیان ہونے والے معاہدے کا انکشاف اس طرح کروں گا جس سے تمہاری ساکھ متاثر نہ ہو۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور اپنے دفتر کے دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں نے بھی اس کا تعاقب کیا۔

''مسٹر ہیریسن'' میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تم سے التجا کرتا ہوں کہ ایسا مت کرو۔ اگر لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگئی تو میں تباہ ہوجاؤں گا۔''

ہیریسن سیڑھیوں پر رک گیا اور میری طرف چہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے کہ اس طرح تمہاری قسمت کھل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہالی ووڈ کی جانب سے تمہیں یہ پیشکش ہو کہ تم انہیں اس واقعے کے بارے میں فلم بنانے کی اجازت دے دو۔ اس طرح تمہارا بریف کیس نوٹوں سے بھر جائے گا اور تمہاری بیوی بھی خوش ہوجائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

ہم اس وقت ایک طویل چکردار زینے کے اوپر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہیریسن کو اس کے منصوبے پر عمل کرنے دیا جائے تو میرا کیریئر مکمل طور پر ختم ہوجائے گا۔ میں اپنی بیوی کی نظروں میں بھی گر جاؤں گا۔ میری زندگی بالکل تباہ ہوجائے گی۔ مجھے ہر قیمت پر ہیریسن کو اس منصوبے پر عمل کرنے سے روکنا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ہیریسن سیڑھیاں اترنے لگا میں تیزی سے آگے کی طرف جھپٹا اور پوری قوت سے اسے دھکا دے دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ماربل کی سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ میں کافی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا ہیریسن کے ساکت جسم کو دیکھتا رہا لیکن مجھے اس میں کسی حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ نیچے کی جانب اترنا شروع کیا۔ میں نے ہیریسن کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا میں نے سوچا کہ فوری طور پر اپنی کرائے کی کار کے ذریعے نیویارک کے لیے روانہ ہوجاؤں۔ جہاں سے دو تین گھنٹے کے اندر مجھے کیلی فورنیا کے لیے جہاز مل سکتا تھا۔ ہیریسن کی لاش دریافت ہونے پر پولیس یہی سمجھتی کہ وہ حادثاتی طور پر سیڑھیوں سے پھسل گیا ہوگا لیکن اگر وہ گہرائی میں جا کر تفتیش کرتے تو بہ آسانی یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ہیریسن کی موت کے وقت میں اس مکان میں موجود تھا۔ ایئر لائن اور کرائے کے ریکارڈ سے میری موجودگی ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اس کی لاش کو مکان کے پچھلے حصے میں واقع سیبوں کے باغ میں دفن کر دیا جائے تو کئی ہفتوں یا مہینوں تک اس کا سراغ نہیں ملے گا اور اگر لاش مل بھی گئی تو اس قابل نہیں ہوگی کہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے ہیریسن کی موت کے وقت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ میں ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا اور ہیریسن کی دونوں پنڈلیاں پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا مکان کے عقبی حصے میں لے گیا۔

ہیریسن کا مکان شہر کے مضافات میں تھا اور اس کا عقبی حصہ اونچی دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ میں لاش کو گھسیٹ کر باغ کے انتہائی تاریک گوشے میں لے گیا۔ پھر میں کدال اور بیلچے کی تلاش میں باغ سے ملحقہ اسٹور میں گیا اور چند منٹوں کی تلاش کے بعد یہ دونوں چیزیں مجھے مل گئیں اور میں نے ہیریسن کے لیے قبر کھودنا شروع کر دی۔ جب تین فٹ گہرا گڑھا تیار ہوگیا تو میں نے ہیریسن کی لاش اس میں ڈال دی اور مٹی ڈال کر زمین کی سطح کو ہموار کر دیا پھر میں نے اردگرد سے درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اور پتے جمع کر کے اس جگہ پر پھیلا دیے۔ اس طرح اب کسی کو بھی وہاں قبر کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے کدال اور بیلچہ مقررہ جگہ پر لے جا کر واپس رکھ

دیے اور جیب سے رومال نکال کر ان کے دستے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا دیے۔ پھر میں نے کچن میں جا کر ایک بالٹی میں گرم پانی لیا اور اس میں صابن ملا کر وہ ساری جگہیں دھو ڈالیں جہاں جہاں ہیریسن کے خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح ایک تولیا سے اپنے قدموں کے نشان بھی صاف کر دیے۔ اس کے بعد میں نے وہ سب چیزیں اپنی گاڑی میں رکھیں۔ ان میں ربر کے دستانے، بالٹی، تولیا اور اسفنج وغیرہ شامل تھے اور نیویارک واپس جاتے ہوئے مختلف سنسان مقامات پر انہیں ایک ایک کر کے پھینکتا گیا۔

☆☆☆

خوش قسمتی سے چار ہفتے تک کسی کو بھی ہیریسن کی گمشدگی کا خیال نہیں آیا۔ پھر نیویارک ٹائمز میں ایک خبر شائع ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہیریسن کے قریبی دوست اور ایڈیٹر بیرنی نے گزشتہ کئی ہفتوں سے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا جس پر اسے تشویش ہوئی لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ہیریسن عجیب و غریب عادات کا مالک ہے اور وہ ماضی میں بھی کئی مرتبہ ہفتوں کے لیے غائب ہو چکا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنے کسی ناول کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ اس کے پاس دور دراز شہروں میں کئی چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں جہاں وہ تعطیلات گزارتا ہے۔ بیرنی کا خیال تھا کہ وہ ایسی ہی کسی جگہ پر چھپ کر اپنے آنے والے شاہکار کو آخری شکل دے رہا ہوگا۔ اس کے باوجود بیرنی اور پولیس، ہیریسن کے بارے میں پریشان تھے اور ان کی جانب سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی کو ہیریسن کے بارے میں کچھ علم ہو تو وہ انہیں فوراً مطلع کرے۔

ایک مہینا اور گزر گیا لیکن ہیریسن کا کچھ پتا نہیں چلا۔ پولیس نے ہر وہ جگہ دیکھ ڈالی جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ ہیریسن کے کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ ممکن ہے اس نے خود ہی گمشدگی کا ڈراما رچایا ہو۔ وہ کئی بار اعلانیہ طور پر کہہ چکا تھا کہ مشہور مصنف ایمبروز بائرس کی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر گزارنا پسند کرے گا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا یقین اور اعتماد پختہ ہوتا گیا کہ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

ایک بار پھر مشہور امریکی مصنف کی جانب سے ملنے والی فون کال نے میرا سکون غارت کر دیا۔ اس بار ہیریسن کی جگہ ڈومین فراسٹ بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسی

شہر میں ہے اور مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے ملاقات کی جگہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے بلا سوچے سمجھے اولڈ سول کافی شاپ کا نام لے دیا جہاں ہیریسن سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ فراسٹ نے مجھے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے گا۔

ڈومین فراسٹ کی شخصیت میں بڑے مصنفین جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ پستہ قد کا گنجا موٹا شخص تھا۔ مصافحہ کرنے اور چند رسمی جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''گرانٹ ہیریسن کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا؟''

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی لیکن میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بارے میں مختلف باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ تمہارے خیال میں وہ کہاں ہوسکتا ہے، وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ میرے پھانسے میں آجاتا۔''

اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی بچے ہو۔ میں کریونگ ٹائم، کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں اور اس کی اشاعت سے بہت پہلے ہی اس کا مسودہ پڑھ چکا ہوں۔ ہیریسن اور میرے درمیان دوستانہ رقابت ہے۔ ہم دونوں اکثر و بیشتر ملتے رہتے تھے۔ اسے اعتراف تھا کہ میری تحریریں عوام میں پسند کی جاتی ہیں لیکن نقادوں کو متاثر نہیں کرتیں۔ وہ اس بات پر بھی مجھ سے بہت زیادہ حسد کرتا تھا کہ میرے قارئین کا حلقہ بے حد وسیع ہے اور مجھ پر طنز کیا کرتا کہ میری کتابوں کو کوئی اعزاز کیوں نہیں ملا۔''

''یہ سب کچھ بہت دلچسپ ہے۔'' میں نے پُرسکون ہونے کی کوشش کی۔ ''لیکن ان سب باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''

''ایک سال پہلے میں نے ہیریسن سے کہا کہ اس کی شہرت میں صلاحیت سے زیادہ اس کی ساکھ کا دخل ہے اور میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا اگلا ناول کسی فرضی نام سے شائع کروائے تو اسے پتا چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور نقاد اس کی کتاب پر کیا تبصرہ کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار ہوگیا اور اس نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ عام طور پر ایک مشہور مصنف کے لیے قلمی نام سے لکھنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی شناخت فوراً ہی ظاہر ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہ کتاب کسی غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کروائے گا۔ چنانچہ اس نے ناشروں سے لے کر مختلف مسترد شدہ مسودے پڑھنا شروع کردیے۔ وہ کسی ایسے مصنف کی تلاش میں تھا جس کی تحریر میں جان ہوتا کہ لوگ یقین کرسکیں کہ اسی نے کریونگ ٹائم، جیسا ناول لکھا ہے۔ جب اس نے تمہارا ناول آرین فال آف ڈائمنڈز پڑھا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اسے لگا کہ اس کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ جب تمہارے ساتھ اس کے معاملات طے پاگئے تو اس نے فون کرکے مجھے اپنے گھر بلایا اور تمہارے ساتھ ہونے والے معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے اس راز میں اس لیے شریک کیا کہ وہ میری بات کو غلط ثابت کرنا چاہ رہا تھا کہ نقاد اس کی کتاب نہیں پڑھتے بلکہ نام دیکھ کر ہی تعریفی تبصرے کرتے ہیں۔ جب کتاب شائع ہوئی اور اس پر تبصرے آنا شروع ہوئے تو میں اسے چھیڑنے کی خاطر ہفتے میں کم از کم ایک بار فون کرکے اس تنقید کے بارے میں بتایا کرتا جو نیویارک کے بڑے اخبارات و جرائد میں اس کتاب پر کی جارہی تھی۔ تاہم میں نے زیادہ چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ غصے میں آکر حقیقت ظاہر نہ کردے۔ ایسی صورت میں اس کی ساکھ بری طرح متاثر ہوتی اور اس کی شہرت داغ دار ہوجاتی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کرنے کے بجائے غائب ہوجانے کو ترجیح دے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں اپنے ارادے کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا اور تم نے اسے باز رکھنے کی بھی کوشش کی ہوگی اور جب اس نے تمہاری بات نہیں مانی تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا ہوگا۔''

میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کتاب میں نے نہیں بلکہ ہیریسن نے لکھی تھی کیونکہ فراسٹ اس بارے میں سب کچھ جانتا تھا کیونکہ ہیریسن نے ہی اسے اس راز میں شریک کیا تھا لیکن میں اس کے قتل کا اعتراف نہیں کرسکتا تھا کیونکہ فراسٹ نے محض اپنا شک ظاہر کیا تھا اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

''میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے ہیریسن کی مدد کی اور ایک طرح سے تمہاری بھی۔ کیونکہ تم دونوں ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنا چاہ رہے تھے۔ مانتا ہوں کہ اس دھوکا دہی کے نتیجے میں مجھے کچھ آمدنی بھی ہوئی لیکن میں نے اسے مزید کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ ممکن ہے کہ وہ خود ہی لاپتا ہوگیا ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہیریسن اس قسم کا

آدمی نہیں ہے جو پُراسرار طور پر غائب ہو کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ چند روز کے لیے گوشہ گمنامی میں چلا جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''تم ہیریسن کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو اور تم نے یہ بات پہلے ہی واضح کردی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتے ممکن ہے کہ تم اس کی گمشدگی کے بارے میں کوئی کارروائی کرنا چاہو۔''

''تمہیں اتنا زیادہ دفاعی انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''میں پولیس کے سامنے اپنا شبہ ظاہر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہیریسن بوڑھا اور بیمار تھا اور اسے کسی وقت بھی موت آسکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اس کا کام آسان کردیا۔ عام طور پر جن مشہور شخصیات کی زندگی کا خاتمہ پُراسرار انداز میں ہو۔ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں شہرت دوام حاصل کرلیتے ہیں جنھیں بستر پر موت آئی ہو۔ گرانٹ ہیریسن بہت مشہور شخص تھا لیکن تم نے اسے غائب کرکے آنے والے کئی برسوں کے لیے شہرت کا بندوبست کردیا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے دھمکانے نہیں آئے تو پھر تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟''

''کیونکہ میں ایسی کہانیاں لکھتا ہوں جو لوگوں میں پسند کی جاتی ہیں۔ مجھے وہ کہانیاں پسند ہیں جن میں آغاز، درمیان اور انجام موجود ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ہیریسن کی کہانی کیسے شروع ہوئی۔ اس کی زندگی کے درمیانی حصے سے بھی مجھے ذاتی طور پر واقفیت ہے لیکن میں اس کی کہانی کے انجام کے بارے میں نہیں جانتا تھا مگر تم سے ملنے کے بعد اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہے کہ یہ کہانی کس طرح ختم ہوئی۔ میں یہی کچھ جاننا چاہ رہا تھا۔''

''اوہ۔ تو یہ بات تھی۔'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ تمہیں بلیک میل کرنے آیا ہوں۔ میرے پاس تم سے دس ہزار گنا زیادہ دولت ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ میں ہیریسن کو اتنا زیادہ پسند نہیں تھا کہ اس کی جگہ تم سے انتقام لوں۔ وہ جیسا تھا اور تم نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا۔ بہرحال اب وہ مرچکا ہے اور میرے کچھ کرنے سے واپس نہیں آسکتا اور نہ ہی تم اب اس صورتِ حال کو بدل سکتے ہو لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ جو کچھ ہوا، اسے بھول کر اپنے کام پر توجہ دو۔ ہیریسن اسی انجام کا مستحق تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نوجوان مصنف کو اس دھوکے میں شامل کرکے وہ اسے تخلیقی طور پر تباہ کررہا ہے لیکن اس نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے غلط ثابت کرکے اس کی انا کو جو تسکین ملے گی وہ تمہارے مستقبل سے زیادہ اہم ہے۔ وہ محض اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے تمہیں تباہ کرنے کا خواہاں تھا لیکن وہ خود ہی تباہ ہوگیا۔ تم صرف ایک پستول تھے جس سے اس نے اپنے سر میں گولی ماری۔''

''تمہاری باتیں سن کر مجھے کچھ سکون ملا ہے ورنہ ہیریسن کے لاپتا ہوجانے کے بعد سے میں نے ایک لفظ نہیں لکھا۔ لگتا ہے جیسے وہ ہم دونوں کو گولی ماردے گا۔''

''تم جس کیفیت سے گزر رہے ہو۔ اس میں عموماً ایسا ہوتا ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ فکرمند نہیں ہوں۔ کہتے ہیں کہ اچھی تحریر بہترین انتقام ہے۔ اگر تم واقعی ہیریسن کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہو کہ اس نے تمہیں تباہ کرنے کی کوشش کی تو لکھنے بیٹھ جاؤ۔ یہ تمہاری اپنی کتابیں ہوں گی اور اس طرح تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیریسن کے بھوت سے نجات حاصل کرسکو گے۔''

☆☆☆

اس ملاقات کو پانچ برس گزر چکے ہیں لیکن اب تک میں دوسری کتاب نہیں لکھ سکا۔ کچھ عرصہ تو میں اسی خوف میں مبتلا رہا کہ کہیں فراسٹ اس دھوکے کو دنیا کے سامنے ظاہر نہ کردے۔ وہ ہیریسن کی کہانی لکھ کر بے اندازہ دولت اور شہرت کما سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور دو سال بعد وہ مختصر علالت کے بعد چل بسا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی میں اس وہم میں مبتلا رہا کہ شاید اس نے کہانی کا مسودہ کسی ناشر کو دے دیا ہو کیونکہ وہ ہیریسن سے اتنی شدید نفرت کرتا تھا کہ اس اسکینڈل کو جان لینے کے بعد بھی اس کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا، رفتہ رفتہ فراسٹ کے خوف سے نجات ملی تو میں ایک بار پھر کمپیوٹر پر انگلیاں چلانے لگا لیکن میرا ذہن بری طرح منتشر ہوچکا تھا۔ میں کچھ سوچنے، اپنے خیالات کو مجتمع کرنے اور انہیں تحریری شکل دینے کے قابل نہیں رہا تھا، بار بار کمپیوٹر کی اسکرین پر ہیریسن کی شبیہ ابھرتی اور میرے خیالات کی رو بھٹکنے لگتی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہیریسن کی کہانی لکھ ڈالوں۔ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور میرا شمار بھی نامور مصنفین میں ہونے لگے گا لیکن میں ساری زندگی جیل میں نہیں گزار سکتا۔ کاش ہیریسن سے میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔

تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ بنانے والوں کی لہولہو داستان

سزائے موت

سلیم فاروقی

محبتوں کے مختلف روپ ہوتے ہیں اور جذبات اسے مختلف سمتوں میں بہا لے جاتے ہیں۔ اس شخص کو بھی ذرا احساس نہ تھا کہ جس رستے پر وہ چل نکلا ہے اس کی منزل کیا ہے۔ اس نے منزل کے تعین کا تردد بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے جینے کا جو بھی مقصد تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس کی حیات کا دائرہ بہت مختصر تھا مگر اس کے باوجود اس کے بلند ارادے اسے پیچھے نہ ہٹاسکے۔ جس سرزمین پر اس کا مسکن تھا وہ اسے بہت عزیز تھی اور کیوں نہ ہو...... ہر شخص کو اپنا گھر بہت پیارا ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے لیے اس نے بھی کچھ خواب دیکھ لیے تھے۔ اس کے بھیگے موسم، تپتی دھوپ اور خزاں، بہار یہ سارے اس کے آنگن میں بکھرتے رنگ تھے لیکن اچانک ان رنگوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تو...... گویا ہر موسم صحرا کے مانند تپنے لگا۔ بوندوں کی مدھر موسیقی گویا فائرنگ کے شعلوں میں کہیں بھسم ہوگئی...... چہروں پر اپنوں کا ماسک لگائے جان کے دشمن کہاں سے اس کی صف میں شامل ہوگئے، اسے کچھ خبر ہی نہ ہوسکی کہ اس کی آستین میں چپکے سے کب سانپوں نے بسیرا کرلیا۔ جو دوسروں کی بین پر لہراتے اور ڈستے پھرتے ہیں اور وہ خود کس قدر بے بس تھا۔ اس کا اندازہ اپنے گھر کی تباہی پر بہتے اس کے آنسوؤں سے ہوسکتا تھا۔
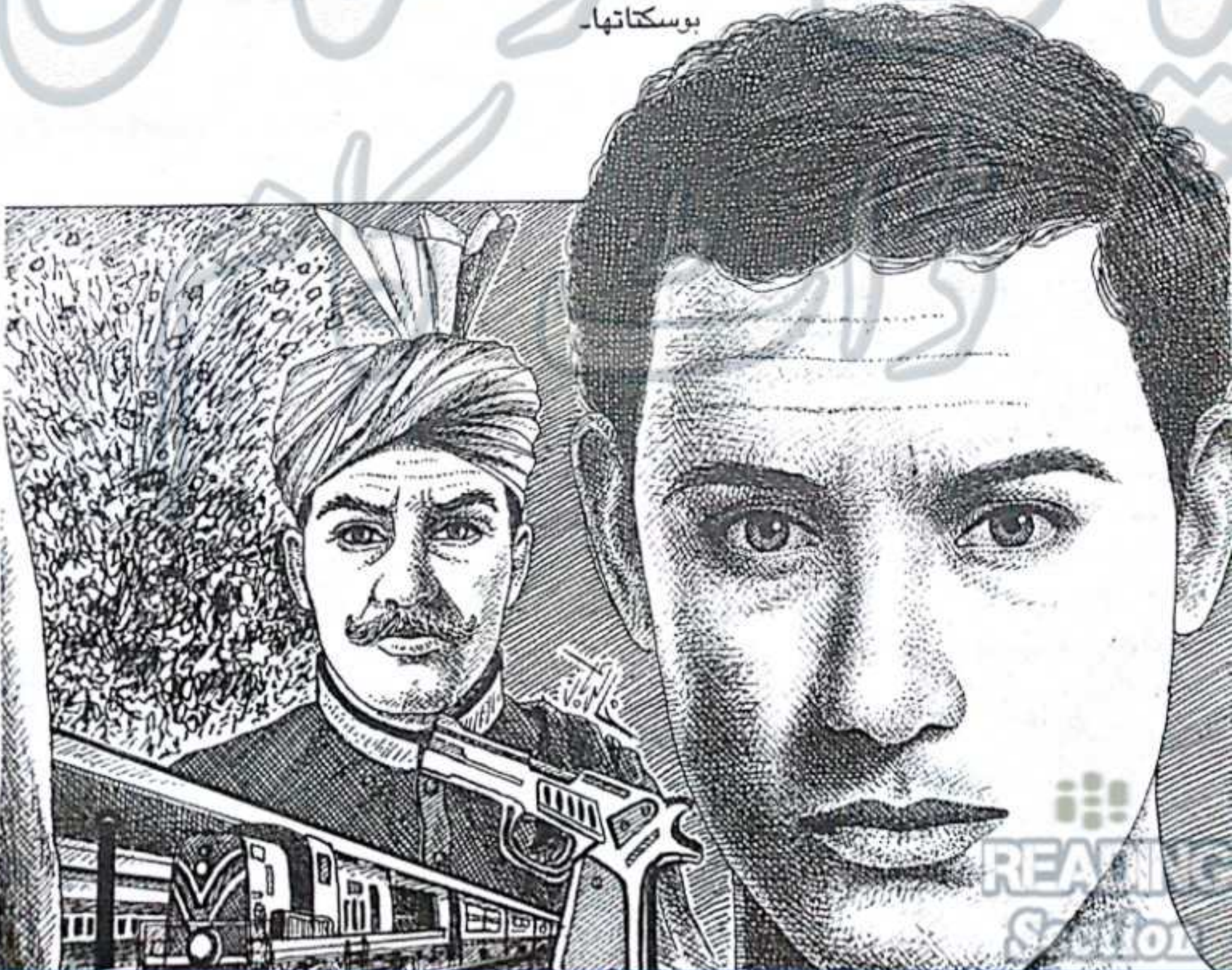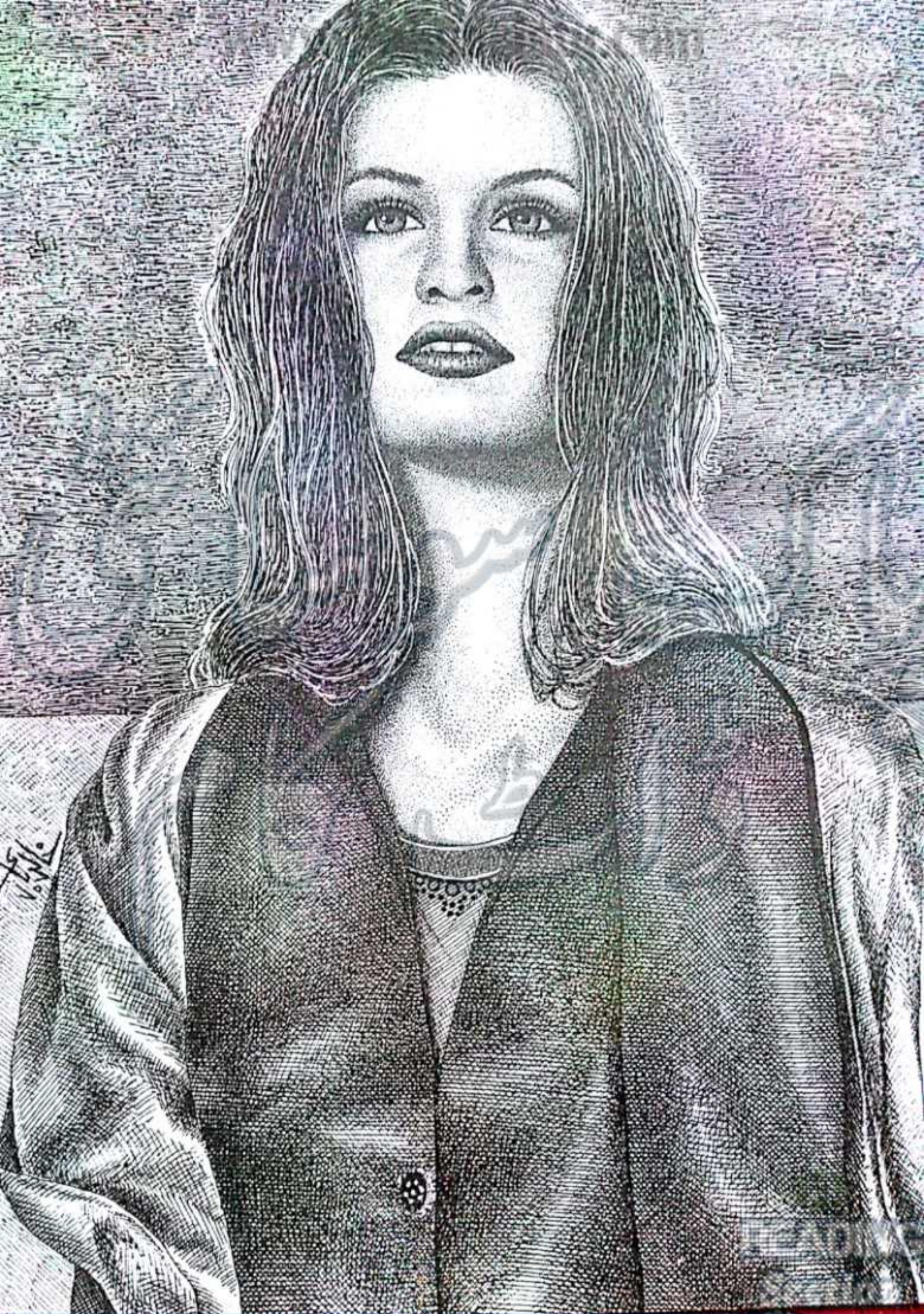
رات تاریک اور انتہائی سرد تھی۔ کول پور کے آؤٹر سگنل کے نزدیک چھوٹے سے کیبن میں سگنل مین امان اللہ نے انگیٹھی میں مزید کوئلے ڈالے، گھڑی دیکھی اور اٹھ کر سگنل کو نیچے کر دیا۔ سگنل میں سبز روشنی چمکنے لگی۔ امان اللہ نے اطمینان کا سانس لیا اور کیبن میں پڑے ہوئے مختصر سے بستر پہ بیٹھ گیا۔ سردی اس دن کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں تھا لیکن اس بار یہ سردی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

اسے کوئٹہ سے آنے والی مال گاڑی گزرنے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد صبح تک یہاں سے کوئی ٹرین اور مال گاڑی نہیں گزرتی..... وہ سوچ رہا تھا کہ مال گاڑی گزرنے کے بعد میں اطمینان سے لمبی تان کر سو جاؤں گا۔

وہ کیبن میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''حسنہ ہوگی۔ اسے لاکھ منع کیا ہے کہ اتنی شدید سردی میں میرے لیے کھانا مت لایا کر، مجھے بھوک لگے گی تو میں گھر آکر کھا لوں گا لیکن یہ سنتی ہی نہیں۔'' دستک دوبارہ ہوئی تو امان اللہ بولا۔ ''آ رہا ہوں بیٹا، ذرا صبر کر لے۔''

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے جسموں پر سیاہ لباس تھے، چمڑے کی جیکٹیں اور جینز، ان کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' امان اللہ نے پوچھا۔ ''اور کیا چاہتے ہو؟''

''گھبراؤ مت۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''ہمیں تم سے ایک کام ہے، اس کا معاوضہ بھی ملے گا اور اتنا ملے گا کہ تم نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔''

''کیسا کام؟'' بوڑھے سگنل مین نے چونک کر پوچھا۔ اسے وہ دونوں آدمی مشکوک لگ رہے تھے۔ بھلا ایک سگنل مین سے کسی کو کیا کام ہو سکتا تھا۔

''سگنل اپ کر دو۔'' سیاہ پوش نے کہا اور کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔''

''سگنل اٹھا دوں؟'' بوڑھے نے چونک کر پوچھا۔ ''لیکن کیوں؟'' اس نے ایک نظر ان دونوں مشکوک آدمیوں پر ڈالی۔ ''اس وقت تو صرف ایک مال گاڑی آ رہی ہے۔ اسے رکوا کر تم کیا کرو گے؟''

''تم بحث بہت کر رہے ہو۔ ہم تمہیں اتنے سے کام کے پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں۔ آئندہ بھی کام ہوگا تو اتنے ہی پیسے دیں گے۔ چلو سگنل اپ کرو۔''

''یہ کام میں نہیں کروں گا۔'' امان اللہ نے کہا۔ ''پانچ لاکھ روپے دو تب بھی نہیں کروں گا۔''

''کام تو تمہیں کرنا پڑے گا بڈھے۔'' سیاہ پوش کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''میں نے کہا نا، میں نہیں کروں گا۔''

''اتنی بحث کیوں کر رہے ہو؟'' سیاہ پوش کا دوسرا ساتھی بولا۔ ''کام نہیں کرنا ہے تو نہ کرے، اسے مار کے کسی کھائی میں پھینک دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں۔'' پھر وہ امان اللہ سے مخاطب ہوا۔ ''چلو سگنل اٹھاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے لمبی نال کا ایک ریوالور نکال لیا۔

بوڑھے سگنل مین کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں، پھر فوراً ہی اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا اور بولا۔ ''میں کسی بھی قیمت پر یہ کام نہیں کروں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' سیاہ پوش نے سفاک لہجے میں کہا اور ریوالور کا رخ اس کی جانب کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی سگنل مین کی چیخ ابھر... کر ڈوب گئی۔ وہ زمین پر گر پڑا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ گولی شاید براہِ راست اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھی۔

دور سے گاڑی کی سیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ سیاہ پوش نے خود ہی آگے بڑھ کر سگنل اٹھا دیا۔ سگنل کی لائٹ سرخ ہو گئی، مال گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی اور وہ رک گئی۔ سیاہ پوش سگنل مین کے کیبن سے باہر نکلا۔ باہر اس کے تین ساتھی مزید موجود تھے، چوتھا اس کے ساتھ ہی کیبن سے باہر نکلا تھا۔

سیاہ پوش نے اپنے ساتھ نکلنے والے سے کہا۔ ''تم جا کر گارڈ کو سنبھالو بس یہ دھیان رکھنا لاش کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔''

سیاہ پوش کا ساتھی اندھیرے میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا مال گاڑی کے گارڈ کے ڈبے تک پہنچا۔ ڈبے میں بہت مدھم سا ایک بلب روشن تھا۔ گارڈ اپنی سیٹ پر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ سیاہ پوش کے ساتھی نے جیب سے ریوالور نکالا، اس پر بھی سائیلنسر فٹ تھا۔ گارڈ اگر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے پلک جھپکتے ہی گولی مار دیتا مگر گارڈ تو سب سے بے خبر سیٹ پہ نیم دراز اونگھ رہا تھا ممکن ہے گہری نیند سو رہا ہو۔ وہ مال گاڑی رکنے پر اٹھا بھی ہوگا تو سگنل کی سرخ لائٹ دیکھ کر

پھر بیٹھ گیا ہوگا۔ مال گاڑیوں کا یوں رکنا کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔

ریوالور والے نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور ایک دفعہ آن کر کے فوراً ہی آف کردی۔ یہ گویا اپنے ساتھیوں کو سب کچھ کلیئر ہونے کا اشارہ تھا۔

سیاہ پوش نے بقیہ تین آدمیوں سے کہا۔ ''چلو تم لوگ اپنا کام شروع کرو لیکن بہت احتیاط سے۔''

تینوں آدمی تیزی سے نشیب میں اتر گئے۔ ان کے جسموں پر شلوار قمیص اور چمڑے کی موٹی موٹی جیکٹیں تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے انہوں نے سروں پر بھی ایسی اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جنہیں ''منکی کیپ'' (بندر والی ٹوپی کہا جاتا ہے) ان اونی ٹوپیوں میں صرف آنکھوں کی جگہ اور ناک کے پاس سوراخ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے چہرے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ ان میں سے ایک تیزی سے بے آواز دوڑتا ہوا مال گاڑی کے درمیانی ڈبوں کی طرف آیا اور اندازے سے ایک ڈبے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے جب پنسل ٹارچ نکالی اس کے گرد اپنے بائیں ہاتھ کا ہالا بنایا تاکہ روشنی کسی کو نظر نہ آسکے۔ بوگی کا نمبر کنفرم کرنے کے بعد اس نے فوراً ٹارچ بند کردی، اور دستانے اتار کے جیب سے جدید قسم کا ایک اوزار نکالا اور چند سیکنڈ میں بوگی کی سیل کھول کر تالا کھول لیا۔ اس دوران میں اس کے بقیہ دو ساتھی نشیب سے لاکر لکڑی کی کچھ پیٹیاں جمع کر چکے تھے۔ ان تینوں نے مل کر بہت احتیاط سے وہ پیٹیاں بوگی میں چڑھائیں۔ پھر تالا کھولنے والے نے بوگی کو لاک کر کے بہت مہارت سے پہلے کی طرح سیل کردیا۔ اب کوئی سیل کو دیکھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بوگی کی سیل کھولی گئی ہے۔ کام ہوتے ہی وہ تینوں نشیب میں اتر گئے اور ان میں سے ایک نے سگنل کیبن کی طرف رخ کر کے ایک مرتبہ پھر پنسل ٹارچ آن کر کے آف کردی۔

سیاہ پوش نے آگے بڑھ کر سگنل ایک مرتبہ پھر ڈاؤن کردیا۔

سگنل کی لائٹ سبز ہوتے ہی انجن سے تیز قسم کی غراہٹیں نکلیں۔ اس نے سیٹی بجائی اور گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی آؤٹر سگنل کراس کرگئی۔

دیکھا جائے تو یہ کام بہت جان جوکھوں کا تھا۔ کوئٹہ سے آنے والی یہ مسافر اور مال بردار گاڑی میں کول پور کے اسٹیشن پر دو انجن لگتے تھے اور واپسی میں وہیں سے دوسرا انجن علیحدہ ہوتا تھا۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ دوسرے انجن کا ڈرائیور اور اسسٹنٹ ڈرائیور بھی دوسرے انجن میں سوار ہوجاتے تھے۔ یوں ان مشکوک افراد کے لیے خطرہ مزید بڑھ جاتا تھا۔ جب گاڑی آؤٹر سگنل سے گزر گئی تو نشیب سے پھر سیاہ پوش کو پنسل ٹارچ کی روشنی سے اشارہ دیا گیا۔

وہ کیبن سے اتر کر باہر آیا جہاں اس کے چاروں ساتھی جمع ہوگئے تھے۔

''کام بہت کامیابی سے ہوگیا باس!'' ان چاروں میں سے ایک بولا۔

''ویری گڈ!'' سیاہ پوش نے کہا۔ ''اب تم لوگ سگنل کیبن میں جاؤ۔ وہاں سے اس بڈھے کی لاش اٹھا کر کسی کھائی میں پھینک دو اور وہاں سے خون کے ایک ایک داغ کی صفائی کردینا۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر پولیس کچھ معلوم کرنے کی کوشش بھی کرے تو اسے کیبن میں خون کے دھبے ملیں اور وہ چوکنا ہوجائے۔ ہمیں ابھی اس روٹ پر کافی کام کرنا ہے۔''

اس کے چاروں ساتھی سگنل کیبن کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے امان اللہ کی لاش اٹھا کر ایک بوری میں ٹھونسی اور وہاں سے خون کا ایک ایک دھبا صاف کر کے باہر نکل آئے۔ سیاہ پوش نے کیبن میں جاکر اس کا جائزہ لیا اور باہر نکل کر بولا۔ ''تم لوگوں نے بہت کم وقت میں بہترین کام کیا ہے۔ اب اس لاش کو کسی گہری کھائی میں پھینک دو اور اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ تمہیں اس کام کا اتنا معاوضہ ملے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔''

چاروں آدمی وہاں سے چلے گئے۔

سیاہ پوش ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر انہیں دیکھتا رہا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے وہ بوری اٹھا رکھی تھی جس میں امان اللہ کی لاش تھی۔ نزدیک پہنچ کر انہوں نے بوری کو اچھال کر کھائی میں پھینک دیا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔ گویا سگنل مین کی لاش کسی گہری کھائی میں ہمیشہ کے لیے گم ہوچکی تھی۔

☆☆☆

سبی کا اسٹیشن ماسٹر سبز لالٹین لیے پلیٹ فارم پہ ٹہل رہا تھا۔ اسے جمائیاں آرہی تھیں اور چہرے پہ شدید بیزاری کے تاثرات تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ مال گاڑی گزر جائے تو وہ اپنے دفتر میں جاکر گرم انگیٹھی کی حرارت میں بستر میں گھس جائے۔ اس نے اپنے کمرے میں ہی بستر لگا رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب صبح تک یہاں سے کوئی گاڑی نہیں گزرے گی۔

مال گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوتے وقت اس کی رفتار سست تھی۔ اسٹیشن ماسٹر نے چونک کر سگنل دیکھا وہ سبز تھا۔ اس نے گندی سی ایک گالی دی، پھر منہ ہی میں بڑبڑایا۔

''کیا مصیبت ہے؟ ایک تو یہ مال گاڑیاں بے وقت کی راگنی کی طرح چلی آتی ہیں، اوپر سے یہ گاڑی رک بھی گئی ہے۔''

اس نے دیکھا، انجن سے ڈرائیور اور اس کا اسسٹنٹ اتر کر اس کی طرف آرہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے پھر ایک گالی دی اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس سے پہلے کہ ڈرائیور اور اسسٹنٹ اس تک پہنچتے، اسے عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مال گاڑی کا گارڈ بھی اتر کر اس کی طرف آرہا تھا۔

ڈرائیور اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے کچھ فاصلے پر تھے اس لیے گارڈ ان سے پہلے اسٹیشن ماسٹر تک پہنچ گیا اور اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ ''یہ گاڑی رک کیوں گئی؟''

''پتا نہیں، کیوں رک گئی؟'' اسٹیشن ماسٹر کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''آپ ایس ایم ہیں، آپ کو علم ہونا چاہیے۔'' گارڈ نے جھنجلا کر کہا۔

''میں ایس ایم ہوں، کوئی غیب دان نہیں ہوں۔ سگنل کلیئر ہے۔ میں خود بھی گرین لائٹ لیے کھڑا ہوں۔ یہ تو ڈرائیور ہی بتائے گا کہ گاڑی کیوں رک گئی۔ ممکن ہے انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہو۔''

اس وقت تک ڈرائیور اور اسسٹنٹ ڈرائیور دونوں ایس ایم تک پہنچ چکے تھے۔ ایس ایم سے پہلے گارڈ نے پوچھا۔ ''آپ نے گاڑی روک کیوں دی۔ سگنل گرین ہونے کی صورت میں آپ کو گاڑی کسی بھی حال میں نہیں روکنی چاہیے۔''

''میں جانتا ہوں گارڈ صاحب!'' ڈرائیور نے کہا۔ ''لیکن مجھے اسٹیشن پر ایک اہم اطلاع دینی تھی۔''

''کیسی اہم اطلاع؟'' ایس ایم چونک کر بولا۔

''کول پور سے نکلنے کے بعد ہمیں آؤٹر سگنل ریڈ ملا تھا۔''

''اتنی سی بات کے لیے آپ نے ٹرین روک دی۔'' گارڈ نے جھنجلا کر کہا۔

''آؤٹر سگنل ریڈ تھا؟'' ایس ایم چونک کر بولا۔ ''ہو ہی نہیں سکتا، کول پور سے یہاں تک لائن بالکل کلیئر ہے۔ آخری ٹرین شام پانچ بجے گزری تھی۔''

''ممکن ہے سگنل مین کی آنکھ لگ گئی ہو۔ سردی بھی تو غضب کی ہے۔ اس کی آنکھ کھلی ہو تو......''

''ناممکن!'' ایس ایم نے کہا۔ ''میں امان اللہ کو گزشتہ بیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ انتہائی فرض شناس سگنل مین ہے۔ وہ اگر دم بھی توڑ رہا ہوگا تو اپنی ڈیوٹی ضرور پوری کرے گا۔''

''پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

گارڈ کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی تھی۔

''ایک بات اور......'' ڈرائیور نے کہا۔ ''میرے اسسٹنٹ نے گاڑی کے پاس اور نشیب میں پنسل ٹارچ کی روشنی کو آن اور آف ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے اس طرف متوجہ کیا تو میں نے بھی غور سے اس طرف دیکھا، حالانکہ اندھیرا بہت تھا اس کے باوجود میں نے کچھ انسانی سائے نشیب کی طرف حرکت کرتے دیکھے تھے۔''

''آپ نے گاڑی وہیں کیوں نہ روکی۔ آپ سیل فون پر کول پور کے ایس ایم سے رابطہ کرسکتے تھے۔'' ایس ایم نے کہا۔

''مجھے خدشہ تھا کہ وہ لوگ ہمیں اور گارڈ صاحب کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ہماری جان کو خطرہ تھا۔ آج کل جس قسم کے حالات ہیں، آپ بھی جانتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر ٹرین رکوائی تھی۔ ان کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔'' ایس ایم نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''ممکن ہے وہ لٹیرے ہوں۔'' گارڈ نے کہا۔ ''مال گاڑیوں میں بھی خاصا قیمتی سامان ہوتا ہے۔''

''لگتا تو نہیں کہ ان لوگوں نے اتنی جلدی مال گاڑی لوٹی ہوگی، ممکن ہے کہ خاص بوگی کا سامان لوٹا ہو۔'' ایس ایم نے کہا۔ ''چلیں، ہم پوری گاڑی چیک کرلیتے ہیں۔''

پھر اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ اسسٹنٹ ڈرائیور، ڈرائیور اور گارڈ نے جا کر پوری گاڑی کو اچھی طرح چیک کیا۔ مال گاڑی کے تمام ڈبے سیلڈ تھے۔

وہ سب ایک مرتبہ پھر ایس ایم آفس کے سامنے جمع ہوئے۔ ایس ایم نے کہا۔ ''گاڑی کی ہر بوگی سیل ہے۔ کسی بھی قسم کا کوئی نشان نہیں ملا۔ پھر بھی میں کول پور کے ایس ایم سے بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے ان کے علم میں کوئی ایسی بات ہو۔''

''ہاں ہوسکتا ہے۔'' گارڈ نے کہا۔ ''آؤٹر سگنل انہوں نے ریڈ کرنے کو کہا ہو۔''

وہ چاروں ایس ایم کے دفتر میں چلے گئے۔ دفتر میں کوئلے کی انگیٹھی ایک ہی تھی اور وہاں انتہائی خوشگوار حرارت تھی۔ ایس ایم کو اس وقت گرمی یا سردی کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کول پور اسٹیشن کا

نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف سے فوراً ہی کسی نے ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ ''ہیلو!''

''ایس ایم شفیق صاحب!'' اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

''جی بول رہا ہوں۔''

''شفیق صاحب، میں سبی کا اسٹیشن ماسٹر منیر احمد بول رہا ہوں!''

''جی......''

''منیر صاحب!'' شفیق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا گڈز ٹرین سبی سے گزر گئی؟''

''جی نہیں، ابھی یہیں کھڑی ہے۔'' پھر اس نے تفصیل سے شفیق کو بتایا کہ ٹرین وہاں کیوں کھڑی ہے؟

''منیر صاحب!'' ایس ایم شفیق نے کہا۔ ''مجھے تو کوئی بڑی گڑبڑ لگتی ہے؟''

''کیسی گڑبڑ؟'' ایس ایم منیر چونک کر بولا۔

''کول پور کے آؤٹر سگنل کا سگنل مین امان اللہ غائب ہے۔''

''غائب ہے؟'' ایس ایم منیر نے دہرایا۔

''ہاں اس کی بیوی اور بیٹی یہاں اسٹیشن پر موجود ہیں۔ اس کی بیٹی سلمٰی کا بیان ہے کہ وہ امان اللہ کے لیے کھانا لے کر جارہی تھی تو اس نے سگنل کیبن کے پاس پانچ سایوں کو دیکھا۔ مال گاڑی جاچکی تھی۔ لڑکی سہم کر وہیں رک گئی کہ جانے یہ کون لوگ ہیں اور ابا کے کیبن میں کیا کر رہے تھے۔ پھر کیبن میں دو آدمی گئے اور اندر سے ایک بوری لے کر برآمد ہوئے۔ بوری لے کر وہ پانچوں نشیب میں اتر گئے۔ سلمٰی ڈری سہمی ان کا پیچھا کرتی رہی۔ وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ انہوں نے بوری کو اچھال کر کھائی میں پھینک دیا۔ پھر ان میں سے چار آدمی، پانچویں سے کچھ بات کرتے رہے، اور نشیب میں اتر گئے۔ پانچواں ان کی مخالف سمت میں غائب ہوگیا۔ سلمٰی اس کے جانے کے بعد سگنل کیبن کی طرف بھاگی۔ امان اللہ کیبن میں موجود نہیں تھا۔ اس نے باہر نکل کر اردگرد کا جائزہ لیا کہ شاید امان اللہ رفع حاجت کے لیے گیا ہو۔ شدید سردی کے باعث سلمٰی کے ہاتھ پیر ٹھٹھر گئے تھے۔ اس نے کچھ دیر مزید انتظار کیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے سگنل مین کو آوازیں دیں۔ اسے خوف تھا کہ ان لوگوں میں سے کوئی وہاں موجود ہوا تو اس کی آواز سن کر وہاں آجائے گا۔ جب کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی امان اللہ واپس نہ آیا تو سلمٰی گھر کی طرف بھاگی۔'' کول پور کے ایس ایم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی کو یقین ہے کہ اس نے ان لوگوں کے ہاتھ میں کوئی بوری دیکھی تھی؟'' منیر نے کہا۔ ''ممکن ہے ان لوگوں نے کھائی میں کوئی اور چیز پھینکی ہو؟''

''ایس ایم صاحب! اسے یقین ہے۔ نشیب کی طرف جاتے ہوئے کسی نے پنسل ٹارچ بھی روشن کی تھی۔''

''یہ تو واقعی بہت سنگین بات ہے۔'' منیر نے کہا۔

''جی ہاں۔'' کول پور کا ایس ایم شفیق بولا۔ ''یہاں ریلوے پولیس کے ساتھ ساتھ ڈسٹرکٹ پولیس بھی تفتیش کر رہی ہے۔ امان اللہ کی گمشدگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کسی منصوبے کے تحت مال گاڑی رکوائی تھی۔ کیوں رکوائی تھی؟ اس کا بھی کوئی سبب ہوگا۔ آپ پوری گاڑی اچھی طرح چیک کروائیے۔''

''میں نے پوری گاڑی چیک کرالی ہے۔ مال گاڑی کی ہر بوگی کی سیل محفوظ ہے۔'' منیر نے کہا۔

''پلیز آپ گاڑی کو ایک مرتبہ پھر خوب اچھی طرح چیک کریں۔'' شفیق نے کہا۔

''آپ فکر مت کریں۔ میں پوری مال گاڑی کو ایک مرتبہ پھر بہت باریک بینی سے چیک کرتا ہوں۔ اس مرتبہ میں ریلوے پولیس اور ضرورت پڑی تو ڈسٹرکٹ پولیس کی مدد بھی لے لوں گا۔ جب تک میں مطمئن نہیں ہوجاؤں گا، گاڑی کو روانہ نہیں ہونے دوں گا۔'' منیر نے کہا۔

''زحمت نہ ہو تو اس کارروائی سے مجھے بھی مطلع کیجیے گا۔'' ایس ایم شفیق نے کہا۔

''زحمت کیسی شفیق صاحب!'' منیر نے کہا۔ ''آپ بھی مجھے امان اللہ کے بارے میں بتایئے گا کہ اس کا کوئی سراغ ملا یا نہیں؟''

''جی ضرور!'' شفیق نے کہا۔

منیر نے سلسلہ منقطع کرکے ریلوے پولیس اور دوسرے متعلقہ اداروں کو ٹیلی فون کردیا اور ایک مرتبہ پھر مال گاڑی کو چیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ مال گاڑی کے آنے سے جتنا بیزار تھا، اس وقت اتنا ہی سرگرم اور متحرک نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

راولپنڈی گڈز ڈیپارٹمنٹ کے کلرک عبدالرحمٰن نے بلٹی دیکھی اور بلٹی لانے والے شخص سے پوچھا۔ ''کیا سامان ہے؟''

''شیشے کا سامان ہے صاحب!'' وہ شخص جلدی سے بولا۔

''وہ تو میں نے بلٹی پر پڑھ لیا ہے۔'' عبدالرحمٰن کے

لہجے میں بیزاری تھی۔" میں پوچھ رہا ہوں کہ سامان کیا ہے؟"

"صاحب، کراکری ہے، لیمپ شیڈز ہیں، فانوس بلب اور دوسری سجاوٹ کی چیزیں ہیں۔"

"یہ سامان آیا کہاں سے ہے؟" عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"کوئٹہ سے آیا ہے صاحب!" بلٹی لانے والے نے جلدی سے کہا۔

"تو گویا یہ اسمگلنگ کا سامان ہے، ایران سے اسمگل کیا گیا ہے؟" کلرک کے لہجے میں طنز تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے صاحب! اس سامان پر پوری کسٹم ڈیوٹی دی گئی ہے۔" بلٹی لانے والا جلدی سے بولا۔

عبدالرحمٰن نے فائلیں الٹ پلٹ کیں اور ایک فائل کھول کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں، مال گاڑی تو آگئی ہے، ابھی اس سے سامان اتارا جا رہا ہے۔"

"ڈلیوری کب تک مل جائے گی جناب!" بلٹی والے نے عاجزی سے پوچھا۔

"ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" کلرک بے پروائی سے بولا۔ "اگلے ہفتے آکر معلوم کرلینا۔"

"اگلے ہفتے؟" بلٹی لانے والے کے لہجے میں مایوسی تھی۔

دوسری میز پر بیٹھے ہوئے کلرک نے اچانک کہا۔ "اور سنائیں رحمان صاحب کیا حال ہیں، آپ سے کئی دن سے ملاقات ہی نہیں ہو رہی۔"

"ملاقات کیسے ہوتی؟" عبدالرحمٰن مسکرایا۔ "آپ تو خود چھٹی پر تھے۔"

"ہاں، میں تو چھٹی پر تھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "آپ سنائیے، سب خیریت تو ہے؟"

"ارے صاحب، کیسی خیریت؟" عبدالرحمٰن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔

بلٹی لانے والا شخص ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"میری تو جان سولی پر ہے۔ دو مہینے بعد بیٹی کی شادی ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔" عبدالرحمٰن نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں رحمان صاحب! کیا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہوا؟"

"بندوبست کہاں سے ہوگا، یہاں تو کوئی کسی کو ایک روپیا بھی دینے کا روادار نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے بھائی اور سالے سے پیسے لے لوں گا۔ دونوں آج کل خوب کما رہے ہیں۔ بھائی نے تو کاروبار میں مندی اور بزنس نہ ہونے کا رونا رو کر انکار کر دیا۔ سالے صاحب نے کہا کہ آپ نے بتانے میں دیر کردی، ابھی کچھ دن پہلے ہی تو میں نے مکان کی دوسری منزل بنوائی ہے۔ سارا پیسا اسی میں خرچ ہوگیا۔ ہزار پانچ ہزار کی بات ہوتی تو کسی سے بھی ادھار لے لیتا لیکن بیٹی کی شادی کے لیے کم سے کم تین، چار لاکھ روپے تو چاہئیں۔"

"ہاں یہ تو ہے؟" سراج نے ہمدردی سے کہا۔ "میرا حال تو آپ جانتے ہی ہیں دو دو بیویوں کا خرچہ ہے ورنہ میں کچھ مدد ضرور کردیتا۔"

"سراج صاحب! میں جانتا ہوں۔ جو حال میرا، وہی آپ کا ہے۔ یہاں سے تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے؟" عبدالرحمٰن کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"آپ نے اپنے فنڈ سے روپیا نکلوانے کے لیے اپلائی کیا ہے؟" سراج نے پوچھا۔

"کیا ہے صاحب!" عبدالرحمٰن نے طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ سرکاری کام کیسے ہوتے ہیں، ہفتوں تو آپ کی فائل متعلقہ کلرک ہی دبائے بیٹھا رہے گا۔ ہاں، کچھ خرچہ کریں تو فائل کو پہیے لگ جاتے ہیں۔ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اکاؤنٹ آفس کے کلرک کو دے سکوں۔ وہ تو منہ پھاڑ کر مانگتا ہے۔ ہر طرف کرپشن ہے، ہر طرف لوٹ مار اور بے ایمانی ہے۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہیں رحمان صاحب!" سراج نے کہا۔ "اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دے گا۔"

"ہاں صاحب، اب تو اللہ ہی کے آسرے پر بیٹھے ہیں۔" عبدالرحمٰن نے کہا۔ "ادھر لڑکے والے جلدی کر رہے ہیں۔ لڑکے کو دبئی کی ایک بڑی کمپنی میں اسسٹنٹ انجینئر کی ملازمت مل گئی ہے۔ تین سال کا کنٹریکٹ ہے۔ وہ دبئی جانے والا ہے تین سال کے لیے۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ تین سال کس نے دیکھے ہیں؟ اس دوران میں لڑکے کی نیت ہی بدل جائے تو کوئی کیا کرے گا؟ یوں بھی آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں؟"

"یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔" سراج نے پھر ہمدردی جتائی۔ "تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"سوچتا ہوں مکان گروی رکھ دوں لیکن اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہ ہوسکا تو مکان سے بھی جاؤں گا۔ میری ریٹائرمنٹ میں بھی اب زیادہ وقت نہیں ہے، مشکل سے چار سال باقی ہیں۔ پھر تو مجھے سرکاری کوارٹر بھی خالی کرنا ہوگا۔ اپنا مکان نہ ہوا تو بیوی بچوں اور بوڑھی ماں کو لے کر کہاں جاؤں گا؟" عبدالرحمٰن نے کہا اور اس شخص کو اٹھ کر

دیکھا جو بلٹی لے کر آیا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا ہوا تھا۔

اچانک بلٹی لانے والے شخص نے جیب سے پھولا ہوا ایک لفافہ نکالا اور عبدالرحمٰن کے سامنے رکھ دیا۔ سراج نے جلدی سے نگاہیں چرا لیں اور فائلیں دیکھنے لگا۔

''کیا ہے یہ؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''یہ آپ کے لیے ہے۔'' بلٹی لانے والے نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے کھول کر تو دیکھیں۔''

اس شخص کا لہجہ اتنا پراسرار تھا کہ عبدالرحمٰن نے لفافہ اٹھا کر ہاتھ میز کے نیچے کیے اور لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس نے حیرت اور الجھن سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

''صاحب! اگر آج سامان نہیں ملا تو میری نوکری چلی جائے گی۔ پلیز کچھ کیجیے۔''

عبدالرحمٰن نے لفافہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو، میں دیکھتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شیڈ نمبر دو میں مال اتارا جارہا ہے۔''

وہ جانے لگا تو سراج نے کہا۔ ''عبدالرحمٰن صاحب! میں بھی ابھی جارہا ہوں۔ اگر زحمت نہ ہو تو میرا کام بھی ذرا دیکھ لیجیے گا۔ ویسے میرا کام کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

''آپ جائیں، میں دیکھ لوں گا۔''

عبدالرحمٰن نے کہا اور اجنبی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس نے چلتے ہوئے اجنبی سے پوچھا۔ ''شیشے کا سامان ہے نا؟''

''لفافے میں پورے پچاس ہزار روپے ہیں۔'' اجنبی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''میرا اندازہ بھی یہی تھا۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔

''آپ اگر مجھ سے تعاون کرتے رہے تو بیٹی کی شادی کے لیے کسی سے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''کیا مطلب؟'' عبدالرحمٰن چلتے چلتے رک گیا۔

''چلتے رہیے صاحب!'' اجنبی نے کہا۔

عبدالرحمٰن پھر چلنے لگا۔ اب اس کے قدم بوجھل ہورہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اجنبی سے بولا۔ ''مجھے تو کوئی گڑبڑ والا معاملہ لگتا ہے۔''

''آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے صاحب!'' اجنبی مسکرایا۔ ''پیڑ گن کر کیا کیجیے گا۔'' اس کے چہرے پر جو عاجزی تھی۔ اس کی جگہ اب مکاری نے لے لی تھی۔

''سامان میں براؤن شوگر، چرس یا اس قسم کی کوئی چیز تو نہیں ہے؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''اس بلٹی میں جن دو کریٹوں کا اندراج ہے، ان میں شیشے کا ہی سامان ہے۔'' اجنبی نے کہا۔

''تو پھر؟'' عبدالرحمٰن الجھ کر بولا۔

''سامان میں مزید دس کریٹ بالکل ویسے ہی ہیں۔ آپ مجھے پورے بارہ کریٹ کی ڈلیوری دلوائیے۔''

عبدالرحمٰن پھر رک گیا۔ ''جب تک مجھے معلوم نہ ہو کہ ان کریٹس میں کیا ہے، میں......''

''آپ پھر رک گئے!'' اجنبی نے کہا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ مزید نکالے، اپنا رخ دوسری طرف کر کے انہیں گنا اور ادھر ادھر دیکھ کر وہ نوٹ مٹھی میں بند کر کے خاموشی سے عبدالرحمٰن کی طرف بڑھا دیے اور بولا۔ ''یہ دس ہزار مزید رکھیں۔ بس اب زیادہ کرید مت کیجیے گا۔'' اجنبی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ پہلی مرتبہ ہے، آخری مرتبہ نہیں ہے۔ ہر بار آپ کو اتنے ہی روپے ملا کریں گے۔''

''یعنی ہر بار اتنے روپے؟'' عبدالرحمٰن کا دل بے قابو ہو کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''آزما کر دیکھ لیجیے گا۔'' اجنبی نے مکاری سے کہا۔

''یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ کسی بھی وقت گڑبڑ ہوسکتی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔

''بلٹی تو آپ ہی کے ہاتھوں میں آتی ہے عبدالرحمٰن صاحب! آپ ہی پکڑوا سکتے ہیں۔ کسی اور کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ دو پیٹیوں کی بلٹی پر آپ بارہ پیٹیاں دے رہے ہیں؟''

عبدالرحمٰن کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہو۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اگر مہینے میں کم سے کم دو بلٹیاں بھی آتی ہیں تو تقریباً ایک لاکھ کہیں نہیں گئے۔

پلیٹ فارم پہ لوگوں کا شور اسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ محسوس ہورہا تھا۔

''ایک بات اور!'' اجنبی نے کہا۔ ''ابھی وہ دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پریشان ہیں۔ اب آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ جب بیٹی کی شادی ہو تو مجھے بتائیے گا۔ میں شادی کے خرچے کی رقم یک مشت آپ کو دلوا دوں گا۔''

''کک...... کیا مطلب...... کس سے دلوا دو گے؟'' عبدالرحمٰن ہکلا کر بولا۔

''صاحب، میں کوئی سیٹھ نہیں ہوں، آپ کی طرح ملازم ہوں لیکن وہ میرے مالکان بہت سخی ہیں۔ وہ آپ کی پریشانی بھی دور کردیں گے۔''

پلیٹ فارم پہ اس وقت ایک میل ٹرین بھی آکر ٹھہری تھی۔ اس میں سے بھی مسافر یوں نکل رہے تھے جیسے چھتے

میں سے لاتعداد شہد کی مکھیاں نکل پڑی ہوں۔
عبدالرحمٰن لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ''کیا مصیبت ہے؟''
''ایک ہی پلیٹ فارم پر مال گاڑی کے سامنے ٹرین کھڑی کردی۔'' اجنبی نے کہا۔
''اصل میں یہ میل ٹرین کراچی سے آئی ہے اور پانچ گھنٹے لیٹ ہے۔ کسی اور پلیٹ فارم پر جگہ نہیں ملی ہوگی اس لیے اسے مجبوراً یہاں کھڑا کرنا پڑا۔'' عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔
''میل ٹرین پانچ گھنٹے لیٹ؟'' اجنبی حیرت سے بولا۔
''اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو بھائی؟'' عبدالرحمٰن مسکرایا۔ ''یہ پاکستان ہے جہاں اکثر ٹرین بارہ گھنٹے بھی لیٹ ہوجاتی ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ویسے یہ ٹرین اس لیے لیٹ ہوئی ہے کہ خانیوال پر کسی نے اسٹیشن ٹیلی فون کرکے ٹرین میں بم کی اطلاع دی تھی۔''
''بم کی اطلاع؟'' اجنبی حیرت سے بولا۔
''پھر وہاں پوری ٹرین خالی کروائی گئی۔ مسافروں اور عملے کو محفوظ جگہ پہنچایا گیا اور بم ڈسپوزل اسکواڈ نے بم کی تلاش شروع کردی۔ ان لوگوں نے تین گھنٹے تک ایک ایک بوگی کی تلاشی لی لیکن بم نہ مل سکا۔ کسی نے فضول میں یہ افواہ اڑادی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ نے اپنی تسلی کرنے کے بعد ٹرین کو روانگی کی اجازت دی۔'' پھر وہ چلتے چلتے بولا۔ ''بس یہی بوگی ہے۔''
وہ ایک جگہ ٹھہر کر بولا۔ ''ہاں، وہ کریٹ میرے ہیں جن پر سرخ رنگ سے "Handle With Care" لکھا ہے۔''
عبدالرحمٰن اور اجنبی دونوں اس بوگی کے سامنے رک گئے۔
اجنبی نے کریٹس گن کر کہا۔ ''سات کریٹ اتر چکے ہیں، پانچ ابھی اندر ہیں۔''
ریلوے کا ایک ادھیڑ عمر لوڈر مال گاڑی سے سامان اتار رہا تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو دیکھ کر کہا۔ ''السلام علیکم عبدالرحمٰن بابو! آج آپ خود ادھر چلے آئے۔ کیا کوئی خاص سامان آیا ہے؟''
''وعلیکم السلام!'' عبدالرحمٰن نے کہا۔ ''ہاں یہ میرے دوست ہیں۔ ان کا سامان ہے۔ یہ سرخ نشان والی پیٹیاں پہلے اتار دو غلام رسول!''
''ابھی اتارتا ہوں۔'' غلام رسول نے کہا۔
''کیا یہی لوڈر سامان اتارتا ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔
''ہاں، یہ تمام لوڈرز کا انچارج ہے اور سب سے سینئر ہے۔ آج لوڈر نے چھٹی کرلی ہوگی تو یہ خود آیا ہوا ہے۔''
''تو پھر اس سے بھی بات کرلیجیے۔'' اجنبی نے کہا۔ ''میں پانچ ہزار.... اسے بھی دے دوں گا۔ بس ہمیشہ میرا سامان احتیاط سے اتار کر باہر پہنچا دے۔''
''میں اس سے بات کرکے آتا ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے کہا اور غلام رسول کو آواز دی لیکن مسافروں کے شور میں عبدالرحمٰن کی آواز دب گئی۔ وہ خود بوگی کے اندر چلا گیا۔
اجنبی، ان کریٹس کا جائزہ لینے لگا جو مال گاڑی سے اترے تھے۔
سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک عورت زور زور سے رو رہی تھی اور ایک لڑکی اسے تسلی دے رہی تھی۔ ''روتی کیوں ہو اماں! تم ساتھ خیریت کے پنڈی پہنچ گئی ہو۔ بم کی تو صرف افواہ تھی۔''
''اللہ نہ کرے، یہ سچ ہوتا تو کیا ہوتا؟'' ایک دوسری عورت بولی۔
''کچھ بھی نہیں ہوتا بہن، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔'' اس کی ساتھی بولی۔ ''روز بم دھماکے ہوتے ہیں تو انہیں کون روک سکا ہے؟'' لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔
عبدالرحمٰن اجنبی کے پاس لوٹ آیا اور بولا۔ ''میں نے اس لوڈر غلام رسول سے بات کرلی ہے۔''
اجنبی نے جیب سے نوٹ نکالے اور پہلے کی طرح انہیں مٹھی میں دبا کر عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''غلام رسول کو آپ خود ہی یہ پیسے دے دیجیے گا۔''
عبدالرحمٰن نے وہ نوٹ بھی خاموشی سے جیب میں رکھ لیے۔
پھر اجنبی نے غلام رسول کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی رونق تھی۔ جسم میں گویا نئی توانائی بھر گئی تھی۔ اجنبی مسکرایا اور سوچا، پیسا بھی کیا چیز ہے۔ انسان کے جسم میں اس سے ایک نئی زندگی دوڑ جاتی ہے۔
غلام رسول بہت خوشی سے بقیہ کریٹوں کی طرف بڑھا اور بہت مستعدی سے ایک کریٹ اٹھا کر بوگی سے باہر آگیا۔
اس نے وہ کریٹ رکھا ہی تھا کہ ایک دوسرا لوڈر اندر رکھے ہوئے کریٹس میں سے ایک کریٹ اٹھانے لگا۔
غلام رسول نے بلند آواز میں کہا۔ ''لالو! یہ پیٹیاں رہنے دے تو دوسرا سامان نیچے اتار۔''
پھر خود اندر گھس گیا اور ایک ایک کر کے چار کریٹ بوگی سے اتار لیے۔

"شاباش!" اجنبی نے کہا۔ "اسی طرح احتیاط سے کام کرو، ہاں، یہ کریٹ گودام میں لے جانے کے بجائے یہیں سے ڈائریکٹ باہر پہنچا دینا۔"

"آپ جہاں کہو گے، وہاں پہنچا دوں گا صاحب!" غلام رسول نے مستعدی سے کہا۔

"غلام رسول!" عبدالرحمٰن نے کہا۔ "کریٹس تو تقریباً اتر ہی چکے ہیں۔ تم ذرا سامنے والے اسٹال سے تین کپ اچھی سی چائے لے آؤ۔ تم خود بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔ آج تو سردی کچھ زیادہ ہے۔" اس نے غلام رسول کو سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "اکبر سے کہنا کہ عبدالرحمٰن بابو نے چائے منگوائی ہے ورنہ وہ اچھی چائے نہیں دے گا۔"

"اس تکلف کو چھوڑیں صاحب!" اجنبی نے کہا۔ "مجھے ذرا جلدی بھی ہے۔"

"ارے صاحب! ایسی بھی کیا جلدی؟" عبدالرحمٰن ترنگ میں بولا۔ "ایک کپ چائے پینے میں بھلا کتنی دیر لگے گی۔ اب تو آپ سے ملاقات رہے گی۔ اس دفعہ آپ میری چائے پی لیں۔ آئندہ میں آپ سے پی لوں گا۔"

اس کی بات کا جواب دیے بغیر اجنبی گھڑی دیکھنے لگا۔

غلام رسول ٹرے میں تین کپ چائے لے آیا۔ کپ صاف ستھرے تھے، چائے بھی بہترین تھی۔ غلام رسول نے ایک ایک کپ عبدالرحمٰن اور اجنبی کو دیا اور اپنا کپ لے کر وہیں بکھرے ہوئے سامان کی ایک بوری پر بیٹھ گیا۔

اجنبی نے گرم گرم چائے حلق سے اتاری۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بہت جلدی ہو۔ اس نے غلام رسول سے بھی کہا۔ "جلدی کرو، مجھے ابھی بہت کام ہے۔"

غلام رسول نے بھی جلدی جلدی چائے پی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

غلام رسول ٹرے میں کپ رکھ کر واپس آیا اور ایک مرتبہ پھر بوگی میں گھس گیا۔ آدمی کی جیب میں پیسا ہو تو وہ ترنگ میں آجاتا ہے۔ غلام رسول بھی اسی ترنگ میں تھا اور عبدالرحمٰن بھی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

ترنگ میں گنگناتے ہوئے غلام رسول کا اترتے ہوئے پیر پھسل گیا۔ اجنبی حلق پھاڑ کر چیخا۔ "سنبھال کر......"

غلام رسول کریٹ سمیت پلیٹ فارم پر گرا۔ اس کے گرتے ہی اتنا زوردار دھماکا ہوا کہ اس کی آواز میلوں تک سنی گئی ہوگی۔ دھماکے کے ساتھ ہی پلیٹ فارم کا شیڈ یوں ہوا میں اڑ گیا جیسے کوئی کاغذ آندھی میں اڑا ہوا۔

عبدالرحمٰن، غلام رسول اور اجنبی سمیت سیکڑوں انسانوں کے جسم چیتھڑوں میں تبدیل ہو کر ہوا میں اڑتے ہوئے دور دور جا گرے۔ کسی کو چیخنے تک کی مہلت نصیب نہ ہو سکی۔ مال گاڑی اور سامنے کھڑی ہوئی میل ٹرین میں ایسی آگ لگی جیسے وہ بارود سے بھری کھڑی ہوں۔ پھر یکے بعد دیگرے پورے نو دھماکے ہوئے۔ ہر دھماکا پہلے دھماکے کی طرح لرزہ خیز تھا اور اس کی آواز میلوں دور تک سنی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مال گاڑی کے ڈبے کئی کئی سو گز دور جا گرے۔

اسٹیشن کے محفوظ حصوں پر گرنے والی بھاری چیزوں سے جو دھماکے ہوئے، ان سے سارے اسٹیشن پر قیامت کا شور برپا ہو گیا۔ لوگ وحشت زدہ انداز میں چیختے ہوئے یوں بھاگے کہ انہیں اپنے بچوں تک کا ہوش نہیں رہا۔ بہت سی عورتیں دیوانہ وار اپنے بچوں کا نام لے لے کر انہیں پکار رہی تھیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو پکار رہا تھا اور کوئی بیٹا اپنی بوڑھی ماں کو سنبھالے ہوئے چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔

ایک قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔

زندگی بھی کتنی ناپائیدار شے ہے۔ عبدالرحمٰن کو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ رشوت لی بھی تو اس کے کام نہ آسکی۔ اسے رشوت دینے والا اجنبی جس کی جیبوں میں شاید نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے، اس کا بھی کوئی نام ونشان نہیں رہا تھا۔ غلام رسول جو ترنگ میں آکر گنگنا رہا تھا، اس کا جسم بھی چیتھڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی زندگی کی آخری چائے پی رہا ہے۔

مسافروں میں بے شمار ننھے بچے اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔ بے شمار انسان کچلے ہوئے پلیٹ فارم پر پڑے تھے۔

وہ سانحہ اتنا خوفناک تھا کہ کافی دیر تک تو علاقے کی پولیس سمجھ ہی نہ سکی کہ اسے کرنا کیا ہے؟ پھر وہاں حرکت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے وہاں مختلف ایمبولینسیں پہنچیں۔ اس کے ساتھ ہی حکام کو بھی ہوش آیا اور انہوں نے ادھر ادھر ٹیلی فون گھمانا شروع کر دیے۔ پھر ہزاروں کی تعداد میں شہری اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑے۔

☆☆☆

کامریڈ کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں سو رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کروٹ بدل کر سیل فون کی طرف دیکھا۔ اس وقت تک گھنٹی خاموش ہو چکی تھی۔ وہ پھر سو گیا۔ سیل فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھا لیا اور اس کا بٹن دبا کر غنودہ لہجے میں بولا۔ "ہیلو!"

"تم اتنی گہری نیند سوتے ہو کہ تمہیں اردگرد کی کوئی

خبر نہیں رہتی۔'' دوسری طرف سے کوئی غضب ناک لہجے میں بولا۔

کامریڈ گھبرا کر اٹھ گیا اور ہکلا کر بولا۔''ب...... باس......وہ......!''

''کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے درشت لہجے میں کہا گیا۔''تم کراچی میں ہو۔ یہاں پنڈی میں قیامت آگئی ہے۔ وہ مال گاڑی دھماکے سے اڑ گئی جس میں ہمارا مال تھا۔ اس سے اتنی تباہی ہوئی ہے کہ تم وہاں بیٹھ کر اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔''

''کیا؟'' کامریڈ نے کہا۔''وہ مال گاڑی......''

''ہاں، وہ مال گاڑی پنڈی اسٹیشن پر دھماکے سے اڑ گئی ہے۔ پتا نہیں حرام زادے کیسے کام کرتے ہیں۔ پولیس اور دوسرے ادارے اس حادثے کی تحقیقات کریں گے، میڈیا بھی اپنے طور پر حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ خفیہ ایجنسیاں بھی حرکت میں آجائیں گی۔ تم فوری طور پر یہ کرو کہ اس حادثے کے شواہد اور ان لوگوں کو فوری طور پر منظر عام سے ہٹادو جن کے ذریعے کوئی تم تک پہنچ سکے۔''

''او کے سر!'' کامریڈ نے جلدی سے کہا۔

''اور ہاں، اگر تمہیں تباہی کا اندازہ لگانا ہے تو ٹی وی کھول کر دیکھ لو۔ ہر چینل پر اس حادثے کی خبر دکھائی جارہی ہے، حادثے کی تباہ کاری، ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اور جلی ہوئی گاڑیاں دکھائی جارہی ہیں۔ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھا کرو ورنہ کسی وقت یوں ہی سوتے رہ جاؤ گے۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

کامریڈ نے سیل فون سنبھالا اور یکے بعد دیگرے اس نے مختلف افراد کو بیس پچیس فون کر ڈالے۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ سیل فون رکھ کر اس نے بیڈروم فریج سے شراب کی بوتل نکالی اور پانی ملائے بغیر دو پیگ پی گیا۔ وہ تیسرا پیگ بنا رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شراب نے اس کی کھوپڑی گھمار کھی تھی۔ اس نے سیل فون اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی، پھر اس کا بٹن آن کر کے سیل فون کان سے لگالیا اور بولا۔''ہاں ڈارلنگ...... بولو۔''

دوسری طرف سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

''کیا ہوا؟'' کامریڈ نے تشویش سے پوچھا۔''تم رو کیوں رہی ہو؟''

''تم......تو کراچی میں...... بیٹھے ہو...... یہاں مجھ پر قیامت گزر گئی۔''

''کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو سہی؟'' کامریڈ کا نشہ ہرن ہونے لگا۔

''یہاں اسٹیشن پر بہت زبردست دھماکا ہوا ہے...... اس دھماکے میں......ابو، امی......اور بھائی......تینوں......'' وہ جملہ پورا کیے بغیر پھر رونے لگی۔

''صبر کرو ٹینا؟'' کامریڈ نے نرم لہجے میں کہا۔''تم اب کس کے ساتھ ہو؟''

''میں اب کس کے ساتھ موجود ہوں گی۔'' ٹینا نے روتے ہوئے کہا۔''اور میرا اس دنیا میں ہے کون۔''

''صبر کرو ڈارلنگ!'' کامریڈ نے کہا۔''میں تو ہوں۔ میں کل تک راولپنڈی پہنچ جاؤں گا۔ تم آرام سے گھر میں رہو، میں تمہارے لیے رقم بھجوا دیتا ہوں۔''

''میرے باپ، بھائی اور ماں اس حادثے میں مر گئے، میں آرام سے کیسے رہ سکتی ہوں۔ اللہ غارت کرے ملک کے دشمنوں کو۔ مجھے اگر وہ مل جائیں تو میں اپنے دانتوں سے ان کا نرخرا ادھیڑ دوں گی۔''

''اتنی جذباتی مت بنو ٹینا!'' کامریڈ نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن ہلائی۔''میں کل پنڈی پہنچوں گا، پھر ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

☆☆☆

ارسلان نے بلیک کافی کا گھونٹ لیا اور ٹی وی کا والیوم کچھ بڑھا دیا۔ وہ ٹی وی اسکرین پر نیوز کاسٹر کی آواز کے ساتھ تباہی کے مناظر دیکھتا رہا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔''ہمارے چینل کی ٹیم نے تباہی کے ان مناظر کو سب سے پہلے عوام تک پہنچایا ہے۔ ہم اپنے نمائندے سے بات کرتے ہیں۔''

پھر ٹی وی پر حیران پریشان سا ایک شخص نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چینل کا مائک تھا۔ نیوز کاسٹر نے اس سے پوچھا۔''یوسف! کیا صورت حال ہے جائے حادثہ پر؟''

یوسف یوں بولنے لگا جیسے رٹی رٹائی باتیں دہرا رہا ہو۔''یہاں ہر طرف تباہی ہی تباہی ہے۔ لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے ہیں۔ میرے اردگرد آپ کو ٹوٹی پھوٹی دکانیں اور تباہ شدہ گاڑیاں نظر آرہی ہوں گی۔ ہر طرف قیامت کا سماں ہے۔ اس حادثے میں ایک اندازے کے مطابق سیکڑوں افراد جاں بحق ہوئے ہیں، لاتعداد زخمی بھی ہیں۔ ہر طرف آہ و بکا ہے۔ لوگ رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں۔''

''یوسف!'' نیوز کاسٹر کی آواز آئی۔ ''کیا آپ حادثے سے متاثر ہونے والے کسی فرد سے بات کر سکتے ہیں؟''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' یوسف نے کہا، پھر کیمرا بھاگتے دوڑتے اور چیختے چلاتے افراد کی طرف گھوم گیا۔

یوسف نے مائک بدحواس سے ایک آدمی کے سامنے کر دیا اور بولا۔ ''آپ بتا سکتے ہیں کہ حادثہ کب اور کیسے پیش آیا؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' بدحواس شخص نے جواب دیا۔

''آپ ہوٹل کے مالک ہیں، آپ کا ہوٹل اسٹیشن سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''میرا ہوٹل اسٹیشن سے تقریباً آدھا کلومیٹر دور ہوگا۔ میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا کہ اچانک کان پھاڑ دینے والے کئی دھماکے ہوئے۔ ہوٹل میں موجود گاہکوں کے ہاتھوں سے برتن چھوٹ گئے۔ لوگ اس بری طرح چیخ رہے تھے جیسے قیامت آگئی ہو۔ میں کاؤنٹر کے پاس سے اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ بھاری کاؤنٹر سے کوئی اڑتی ہوئی چیز ٹکرائی اور وہ چور چور ہوگیا۔ ہوٹل کے سامنے انسانی جسم کے کچھ ٹکڑے اور ایک سر آکر گرا۔ کوئی بھاری سی چیز ہوٹل کی چھت پہ بھی گری۔ گاہک چیختے ہوئے باہر بھاگے۔ پھر میں نے سڑک کی طرف دیکھا تو مجھے بدحواس اور وحشت زدہ افراد کا ایک ہجوم نظر آیا۔ وہ سب ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اس افراتفری میں بے شمار افراد بسوں، گاڑیوں اور رکشوں کے نیچے آکر کچلے گئے۔''

پھر اسکرین پر ایک رکشا ڈرائیور نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں تو جی سواری کو لے کر گزر رہا تھا، اسٹیشن سے تو کافی دور تھا۔ اچانک لرزہ خیز دھماکے کی آواز آئی اور میرا رکشا اچھل کر ایک گاڑی سے ٹکرا گیا۔ میں اچھل کر دوسری سمت باہر گرا۔ اچانک لوہے کی ایک بھاری چادر سواری پہ گری اور اس کی گردن اڑ گئی۔ میں وہاں کھڑی ہوئی ایک بس کی آڑ میں چلا گیا جو ایک دکان میں آدھی دھنسی ہوئی تھی۔''

چینل کا نمائندہ پھر اسکرین پر ظاہر ہوا اور بولا۔ ''ابھی تک یہاں ریسکیو کی گاڑیاں نہیں پہنچی ہیں البتہ ...... این جی اوز کے کارکن پہنچ گئے ہیں، جی شیرین!''

نیوز کاسٹر پھر اسکرین پر آئی اور بولی۔

''بہت شکریہ یوسف ...... آپ ہمارے ساتھ ہی رہیے گا ---- فی الحال کوئی ذمے دار شخصیت نہیں پہنچی ہے پورے شہر بلکہ دوسرے شہروں کی فائر بریگیڈ گاڑیاں موقع پر پہنچ گئی ہیں اور خوفناک آگ بجھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' پھر وہ اچانک بولی۔ ''ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ وزیر داخلہ نے حکومت کی جانب سے جاں بحق ہونے والے افراد کے ورثاء کو پانچ لاکھ روپے اور زخمیوں کو ایک ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔

پھر دوسری نیوز کاسٹر اسکرین پر آئی اور بولی۔ ''ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جاں بحق ہونے والوں کی تعداد پندرہ سو سے تجاوز کر گئی ہے۔ ہزاروں افراد زخمی ہیں جن میں سے بیشتر کی حالت نازک ہے۔ حکومت نے راولپنڈی، اسلام آباد کے تمام سرکاری اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔''

ارسلان نے بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا اور اپنے لیے دوبارہ کافی انڈیلنے لگا۔ اس حادثے نے اس کا ذہن مکدر کر دیا تھا۔ وہ کافی کا کپ لے کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر ٹیلی فون سیٹ کو گھورا اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو یور آنر!''

''شاید تم ٹی وی پر سب کچھ دیکھ چکے ہو؟''

''جی ہاں!'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور ہلاک شدگان اور زخمیوں کی امداد کا اعلان بھی سن چکا ہوں۔''

''میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں بیٹے!'' دوسری طرف سے بہت شفقت بھرے انداز میں کہا گیا۔ ''لیکن غصہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔''

''آپ کے حکم کا منتظر ہوں یور آنر۔'' ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سرکاری سطح پر تو رسمی کارروائی میں بہت وقت لگے گا۔ جب تک سرکاری مشینری حرکت میں آئے گی اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

''ارسلان بیٹا! جس گھر کی ذمے داریاں نااہل لوگوں پر ہوں، اس کا یہی حشر ہوتا ہے لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔''

''او کے یور آنر! میں اس حادثے کی تحقیقات شروع کر رہا ہوں۔ مجھے ابتدا کہاں سے کرنا ہے، میں نے یہ بھی سوچ لیا ہے۔''

''مجھے تمہاری ذہانت پر پورا بھروسا ہے ارسلان بیٹا!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''اور مجھے یقین ہے کہ کسی روز میں بھی پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا۔'' ارسلان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''شٹ اپ!'' دوسری طرف سے اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا گیا۔ ''کم سے کم میری زندگی میں تو یہ ناممکن

ہے۔'' پھر دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''اوکے بیسٹ آف لک!'' اور سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ارسلان تلخ انداز میں مسکرانے لگا اور اس کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا۔

وہ ملٹری اکیڈمی کاکول سے فارغ ہوا تو اسے آرٹلری میں بھیج دیا گیا۔ پھر جی ایچ کیو نے ایس ایس جی کے لیے کچھ ذہین افسروں کا انتخاب کیا تو ارسلان کو بھی ایس ایس جی کی ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہ دن ارسلان کی زندگی کے اذیت ناک ترین دن تھے۔ ایس ایس جی کی جان لیوا ٹریننگ میں کئی افسر اور جوان زخمی ہوئے تھے، کئی بیمار ہو گئے تھے لیکن ارسلان نہ صرف سختیاں جھیل گیا تھا بلکہ اس نے گروپ میں نمایاں پوزیشن بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ گروپ کا ذہین ترین اور مضبوط ترین رکن تھا۔ اسے بہ طورِ خاص کمانڈو ٹریننگ کے لیے برطانیہ اور امریکا بھیجا گیا۔ وہاں سے واپسی پر ارسلان کو آئرن مین کہا جانے لگا اور اسے انٹیلی جنس میں بھیج دیا گیا۔

ان ہی دنوں سیاچن میں جنگ شروع ہو گئی۔ یہ بہت کٹھن اور جان جوکھوں کا محاذ تھا۔ ارسلان کو سیاچن بھیج دیا گیا۔ اس کی رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر بہت نیچے مورچوں میں تھا۔ ارسلان کی کمپنی کو ہزاروں فٹ کی بلندی پر جا کر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا تھے۔ وہ اپنی کمپنی کا کمانڈر تھا۔ اس کی کمپنی میں کل ایک سو تیس آدمی تھے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی پچاس سینٹی گریڈ نیچے تھا یعنی مائنس ففٹی۔ رات میں سردی کی شدت مزید بڑھ جاتی تھی۔ ان کے مورچے بھی برف کھود کر بنائے گئے تھے۔

ارسلان اور اس کے ساتھیوں کو شدید سردی سے بچاؤ کے لیے ہر وقت خصوصی نوعیت کا ائر پروف اور واٹر پروف لباس پہننا پڑتا تھا۔ صبح جب سورج نکلتا تو برف میں ایسی زبردست چمک ہوتی تھی کہ انہیں مخصوص قسم کے چشمے استعمال کرنا پڑتے تھے۔

انہیں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے اس بلند و بالا چوٹی پر لایا گیا تھا۔ ہیلی کاپٹرز ہی کے ذریعے انہیں ایمونیشن سپلائی کیا جاتا تھا اور راشن بھی باربردار ہیلی کاپٹرز ہفتے میں ایک بار وہاں لے کر آتے تھے۔ ہیلی کاپٹر وہاں لینڈ بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان برف پوش پہاڑیوں میں کوئی ہیلی پیڈ نہیں تھا۔ دشمن کو یہاں اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کے مورچے بلندی پر تھے۔

ارسلان اسی سوچ میں گم رہتا تھا کہ دشمن کی اس چوکی پر قبضہ کیسے کیا جائے؟ وہ اگر اس چوکی پر قابض ہو جاتے تو انہیں پیچھے دھکیل دیتے۔ بلندی کی وجہ سے دشمن خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس چوکی پر قبضہ کرنے میں پاکستان کو شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ ارسلان کی کمپنی کے آدھے سے زیادہ جوان اور نان کمیشنڈ افسر شہید ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ارسلان نے ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین فیصلہ کیا۔

بھارتی چوکی کی پشت پر برف سے ڈھکے ہوئے عمودی پہاڑ تھے۔ اس طرف سے کسی کے آنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ ارسلان نے اس رات اپنے مورچے میں اپنے بااعتماد ساتھیوں کو بلایا اور ان سے کہا۔ ''میں دشمن کے عقب سے اس پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' نائب صوبیدار نے حیرت سے کہا۔ ''سوری سر! میں رینک میں آپ سے بہت جونیئر ہوں لیکن میرا تجربہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ......''

''پہلے آپ لوگ میری پوری بات سن لیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں نے اس علاقے میں کئی دن ریکی کی ہے۔ یہ چٹانیں بالکل عمودی نہیں ہیں۔ کئی جگہ سے یہ ساٹھ اور پینتالیس کے زاویے سے بھی اوپر جا رہی ہیں۔ ہم اسی طرف سے اوپر چڑھیں گے۔''

اس نے اپنے جوانوں کی ہمت بڑھائی تو وہ بھی اس مہم پر آمادہ ہو گئے۔ دوسری رات ارسلان سمیت چھ آدمیوں کی ٹیم اس مہم پر روانہ ہو گئی۔ ارسلان کے علاوہ نائیک فتح محمد کا تعلق بھی ایس ایس جی سے تھا۔

وہ چوٹی سر کرنے میں ارسلان کی ٹیم کے تین ارکان شہید ہو گئے۔ اب ٹیم میں صرف تین آدمی تھے۔ ارسلان، اظہر اور فتح محمد۔ یہ تینوں بھی زخمی تھے اور اس جان لیوا مہم کی وجہ سے نڈھال تھے لیکن ان کے حوصلے جوان تھے۔

آخر وہ دشمن کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور ان تین آدمیوں نے اس انداز سے حملہ کیا جیسے آرمی کی ایک پوری بٹالین نے ان پر حملہ کر دیا ہو۔

وہ اس بدحواسی میں وہاں سے بھاگے کہ کسی کے پیر میں جوتے نہیں تھے، کوئی شدید سردی سے بچاؤ کے مخصوص لباس میں نہیں تھا۔ عجیب بھگدڑ کا عالم تھا۔ اسی وقت ارسلان کو رجمنٹ ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس پر اطلاع ملی کہ سیز فائر ہو چکا ہے۔ فائرنگ بند کر دو۔

ارسلان سناٹے میں رہ گیا۔ وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان داؤ پر لگا کر یہاں تک پہنچا تھا، اس مہم میں

اس نے اپنے تین بہترین ساتھی گنوائے تھے۔ دشمن کے ہاتھوں جو جوان شہید ہوئے تھے، وہ اس کے علاوہ تھے۔ اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ''سر! مجھے صرف بیس منٹ دے دیں...... صرف بیس منٹ! دشمن کی انتہائی اہم پوسٹ ہمارے قبضے میں آنے والی ہے۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے سر! یہ بہت ہی......''

''کیپٹن!'' اس کے سی او نے درشت لہجے میں کہا۔ ''نو آرگیومنٹ...... آرڈر از آرڈر!''

''او کے سر!'' اس نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ پھر اپنے مورچے تک ارسلان اکیلا ہی پہنچا تھا۔

سیاچن سے واپسی پر ارسلان اتنا بددل ہوا کہ اس نے آرمی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

وہ اب یہ ملک ہی چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

وہ ملک چھوڑنے کے تمام انتظامات کر چکا تھا۔ روانگی میں دو دن باقی تھے۔ اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ سیل فون کی اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کال ریسیو ہی نہ کرے۔ اس قسم کی بے نام کالز وہ کبھی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ اس کے جاننے والے بھی اگر اسے کسی دوسرے نمبر سے کال کرتے تو اس سے پہلے ارسلان کو ایس ایم ایس کر دیتے تھے کہ اس نمبر سے فلاں کال کرے گا، پلیز کال ریسیو کر لینا۔

جانے کیا سوچ کر اس نے کال ریسیو کر لی اور بھاری آواز میں بولا۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام، بابا ارسلان صاحب؟'' کوئی جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ اس کا تعلق یقیناً اندرون سندھ سے تھا۔ اس کا لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا۔

''جی سائیں، بول رہا ہوں۔''

''سائیں، چودھری ایاز آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''آپ نے شاید چودھری صاحب کا نام سنا ہو؟''

ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو چودھری صاحب کا فین ہوں۔ میں تو انہیں جانتا ہوں لیکن وہ مجھے نہیں جانتے۔''

''سائیں، چودھری صاحب یہ چاہتے ہیں کہ آج ڈنر آپ ان کے ساتھ کریں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

وہ چودھری ایاز خان کا دل سے احترام کرتا تھا۔ چودھری صاحب دس سال پہلے کی حکومت میں وزیر داخلہ تھے۔ شدید اختلافات کی بنا پر انہوں نے سیاست سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر ان کی پارٹی کے علاوہ بے شمار لوگوں نے ان پر دباؤ ڈالا لیکن ان کا فیصلہ نہیں بدلا۔

چودھری صاحب کا سیاست سے اب دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے جاگیردار تھے اور ہزاروں ایکڑ زرعی زمین کے مالک تھے۔ اب ان کا زیادہ وقت رفاہ عامہ کے کاموں میں گزرتا تھا۔ انہوں نے اپنی ایک این جی او بھی بنا رکھی تھی۔ کچھ سوچ کر ارسلان نے چودھری صاحب کی دعوت قبول کر لی۔

وہ ان کی وسیع و عریض کوٹھی پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا تھا۔ گیٹ پر صرف ایک گارڈ موجود تھا۔ اسے شاید ارسلان کے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا تھا اس لیے اس نے فوراً ہی ارسلان کو اندر بھجوا دیا۔

کار پورچ میں چودھری صاحب کے ایک دوسرے ملازم نے اس کا استقبال کیا اور اسے چودھری صاحب کے آراستہ ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔

ارسلان ابھی ڈرائنگ روم کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اندرونی دروازے سے چودھری صاحب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ارسلان احتراماً کھڑا ہو گیا۔ چودھری صاحب نے اسے بہت اپنایت سے گلے لگا لیا اور اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا لیا۔ ارسلان نے کئی بار اخبارات میں ان کی تصاویر دیکھی تھیں، ٹی وی کے کئی پروگرامز میں دیکھا تھا لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ باوقار تھے جتنے ٹی وی پر نظر آتے تھے۔ اس عمر میں بھی ان کی صحت قابل رشک تھی اور وہ پچپن سال کے ہونے کے باوجود چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔

''ارسلان بیٹا! تمہاری بہت تعریف سنی تھی، آج دیکھ بھی لیا۔ تم تو فوجی کے بجائے بالی ووڈ کے ہیرو لگتے ہو۔ ویسا ہی دراز قد اور کسرتی جسم، سرخ و سفید رنگ، براؤن بال، اور بھاری آواز...... میں سوچتا ہوں کہ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو بالکل تمہارے جیسا ہوتا۔'' پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ ''تم کھانا ابھی کھاؤ گے یا کچھ ٹھہر کے؟''

''ابھی تو کوئی مہمان بھی نہیں آیا۔'' ارسلان نے کہا۔

''اس ڈنر کے مہمان صرف تم ہو بیٹا!'' چودھری صاحب نے کہا۔

''صرف میں؟'' ارسلان نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، میں اپنے خاص آدمیوں کو کھانے پر بلاتا ہوں تو کوئی فالتو آدمی میرا مہمان نہیں ہوتا۔ آؤ پہلے کھانا

کھالیں، پھر باتیں کریں گے۔''

ڈائننگ ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ اس نے حیرت سے سوچا، صرف میرے لیے اتنا اہتمام! یہ کھانا تو چالیس پچاس افراد کے لیے بھی کافی ہوگا۔

خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا پھر وہ ملازم کو کافی لانے کا حکم دے کر اپنی اسٹڈی میں آگئے۔ ان کے اسٹڈی روم میں بلاشبہ ہزاروں کتابیں تھیں اور سب کتابیں انتہائی نایاب۔ وہاں فرشی نشست تھی۔ ایک طرف ایک ڈائننگ ٹیبل، کرسی اور ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے لیکن تم بھی تو اندھوں کے دیس میں آئینے بیچنے چلے تھے۔''

''بجا فرمایا چودھری صاحب!'' ارسلان نے کہا۔ ''اس لیے میں نے اندھوں کا یہ دیس ہی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جب اس ملک کو میری ضرورت ہی نہیں ہے تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟''

''ارسلان بیٹا! گھر میں اگر کوئی چور گھس آئے تو گھر والے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں کیا؟'' چودھری صاحب مسکرا کر بولے۔ ''نہیں...... اس چور کو گھر سے نکالتے ہیں۔''

''لیکن......''

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی بیٹا!'' چودھری صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ بتاؤ، میں تم پر کس حد تک اعتماد کرسکتا ہوں؟''

''میں نے فوج کی ملازمت چھوڑی ضرور ہے لیکن میں اب بھی کمانڈو ہوں اور کسی بھی پاکستانی کمانڈو پر آپ اعتبار کرسکتے ہیں۔''

''تو پھر سنو۔'' چودھری صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ''تم پہلے آدمی ہو جسے میں یہ بات بتا رہا ہوں۔ میں اس ملک میں انقلاب لانا چاہتا ہوں۔ ان اندھوں اور بوڑھے گدھوں سے اقتدار چھین کر ذہین، نوجوان اور بینا لوگوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' ارسلان نے الجھ کر پوچھا۔

''میں نے اپنی ایک فورس بنائی ہے۔ اس فورس کے افراد اپنے فیصلے خود ہی کریں گے اور خود ہی مجرموں کو سزا دیں گے۔''

''لیکن یہ تو خلافِ قانون ہوگا چودھری صاحب!'' ارسلان نے کہا۔

''کس قانون کی بات کر رہے ہو بیٹا؟'' چودھری صاحب تلخ لہجے میں بولے۔ ''قانون یہاں صرف غریب آدمی کے لیے ہے۔ میں ہر اس ظالم کو سزا دینا چاہتا ہوں جو قانونی داؤ پیچ لگا کر سزا سے بچ نکلتا ہے۔ ایک دن میں ان سب کو اتنا مجبور کردوں گا کہ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہوجائیں گے۔''

ارسلان سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چودھری صاحب اس سے اس قسم کی بات کریں گے۔

''کیا سوچ رہے ہو ارسلان؟'' چودھری صاحب نے کہا۔ ''میرے آدمیوں نے ایسی ایک فورس بنالی ہے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم سب مل کر دشمنوں کا خاتمہ کریں گے، کرپشن اور لاقانونیت کا خاتمہ کریں گے۔ جسم کا کوئی حصہ ناکارہ ہوجائے اور اس سے جان کو خطرہ ہو تو اسے بھی جسم سے علیحدہ کرکے پھینک دیا جاتا ہے۔ تمہیں اپنا کام بظاہر غیر قانونی نظر آئے گا لیکن کبھی کبھی وطن کو بچانے کے لیے ایسے اقدامات بھی کرنا پڑتے ہیں۔ ایک بات اور...... تم واحد آدمی ہو جو میرے بارے میں اتنا جان گئے ہو ورنہ آج تک کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ میں یور آنر کے نام سے اپنی ایک انقلابی تنظیم چلا رہا ہوں۔ اس انقلابی تنظیم کا مقصد ملک سے ہر برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں اخراجات کے لیے رقم بھی میں مہیا کروں گا۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ مجھے خود بھی اس کا علم نہیں ہے۔ اس دولت کا بہترین مصرف یہی ہے کہ اسے ملک کے مفاد میں خرچ کیا جائے۔''

چودھری صاحب اسے دیر تک قائل کرتے رہے۔ ارسلان بھی اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ ظلم وزیادتی سے خوف زدہ ہو کر ملک چھوڑنا کوئی عقل مندی نہیں ہے بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی ان ہی لوگوں کے ساتھ رہ کر کی جائے۔ ان سے ہر زیادتی کا بدلہ لیا جائے۔ ظلم وزیادتی کے خلاف کڑھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اس کا خاتمہ کردیا جائے۔

ارسلان وہاں سے رخصت ہوا تو ایک نیا ارسلان تھا۔ اس نے چودھری صاحب کو جواب دینے کے لیے دو چار دن کی مہلت مانگی تھی۔

ان چار دنوں میں اس نے بہت کام کیا۔ اس نے چودھری صاحب کے بارے میں کافی معلومات کیں اور اس پر انکشاف ہوا کہ اصولوں کی بنیاد پر چودھری صاحب اس

سے قبل بھی دو مرتبہ اقتدار چھوڑ چکے ہیں۔ ان کا ماضی بے داغ ہے۔ اس نے چودھری صاحب کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب وہ گزشتہ پانچ سال سے ان کے ساتھ تھا۔ اس دوران میں اس نے ظلم کے خلاف کئی دفعہ قانون اپنے ہاتھ میں لیا۔ بے شمار مواقع ایسے آئے کہ ارسلان نے خود ہی ملزم کو سزا سنائی اور خود ہی اس پر عمل درآمد بھی کرادیا۔

اب تو اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کتنے مجرموں کو ماورائے عدالت سزا دی تھی۔ اسی لیے تو وہ کہتا تھا کہ میرا انجام پھانسی کا تختہ ہوگا۔

☆☆☆

فون کی کرخت گھنٹی بجی تو وہ ماضی سے باہر آگیا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا پھر ریسیور اٹھالیا۔ ”ہیلو ڈیئر!“ اس نے کہا۔ ”میں ابھی تمہیں ٹیلی فون کرنے ہی جارہا تھا۔“

”میں جانتی تھی۔“

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”شہر میں اتنا بڑا سانحہ ہوگیا ہے اور تم چپ سادھے بیٹھے ہو؟“

”میں چپ سادھ کر بیٹھ ہی نہیں سکتا سلویا!“ ارسلان نے کہا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”یہ چھوڑو کہ میں کہاں ہوں، تم کام بتاؤ۔“

”یار! یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ دھماکا گڈز شیڈ میں ہوا ہے۔ مجھے گڈز آفس کے تمام ملازمین کی فہرست چاہیے۔ یہ کام تم ہی کرسکتی ہو ڈارلنگ!“

”زیادہ بٹر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔ تم مجھے کہاں ملو گے؟“

”ابھی تو میں گھر ہی پر ہوں۔ اگر کہیں اور کا پروگرام ہوا تو تمہیں کال کردوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

سلویا کا اصلی نام تو صالحہ خاتون تھا لیکن اسے اپنا نام بالکل پسند نہیں تھا۔ کالج کے زمانے سے اسے لکھنے لکھانے کا شوق تھا، اس لیے اس نے خود ہی اپنا قلمی نام ”سلویا“ رکھ لیا، پھر یہ نام اس کی شناخت بن گیا۔

وہ ارسلان کے ساتھ ہی کالج میں پڑھتی تھی اور اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی لیکن یہ محبت یک طرفہ تھی۔ ارسلان اسے محض ایک اچھی دوست سمجھتا تھا۔ بعد میں سلویا نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا تو اسے ایک بڑے اخبار میں جاب مل گئی۔

ارسلان فوج سے واپس آیا تو سلویا ایک پولیٹیکل اور کرائم انویسٹی گیٹر کے طور پر خاصی معروف ہوچکی تھی۔ سلویا کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا، صرف ایک بڑا بھائی تھا جو برسوں پہلے امریکا میں سیٹل ہوچکا تھا۔ وہیں اس نے شادی کرلی تھی اور سلویا سے کبھی سال میں ایک دفعہ ٹیلی فون پر بات ہوجاتی تھی۔ یوں ایک طرح سے وہ تنہا ہی تھی۔

ارسلان میں اور اس میں ایک یہی بات مشترک تھی۔ ارسلان کے والدین کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ اس کا دور ونزدیک کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ بھی تنہا زندگی گزار رہا تھا۔

ارسلان نے دو تین جگہ ٹیلی فون کیا پھر کہیں جانے کے ارادے سے لباس تبدیل کیا پھر خود ہی اس نے اپنا خیال مسترد کردیا اور لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا لیکن ٹی وی کے ہر چینل پر دھماکے اور تباہی کی خبریں تھیں۔ ارسلان نے اکتا کر ٹی وی بند کردیا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”ہمارا میڈیا! ان لوگوں کو ابھی احساس نہیں کہ عوام کو کیا دکھانا چاہیے اور کیا نہیں دکھانا چاہیے۔“ ٹی وی کے ہر چینل پر تباہی اور بربادی کے ایسے مناظر دکھائے جارہے تھے کہ بچوں اور کمزور دل کے حضرات کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھے۔

اسی وقت ڈور بیل بجی تو ارسلان دروازے کی طرف مڑ گیا۔ کھڑکی سے دیکھنے پر اسے پورچ میں سلویا کی چھوٹی سی کورے کار نظر آگئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور کچھ کہے بغیر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھنے لگا۔

”گھڑی بعد میں دیکھتے رہنا، مجھے اندر آنے دو۔“ سلویا نے منہ بنا کر کہا۔

”ایک معمولی سا کام تم جیسی رپورٹر نے دو گھنٹے میں کیا ہے۔“ ارسلان اسے راستہ دیتے ہوئے بولا۔ ”اور پتا نہیں کیا ہے یا نہیں؟“

”تم ذرا باہر نکلو۔ سڑکوں پر ایسا ہجوم ہے کہ جگہ جگہ بدترین ٹریفک جام ہے۔ میں گاڑی اسٹیشن سے کافی دور چھوڑ کر پیدل ہی لوگوں کے دھکے کھاتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔ اس چکر میں میری کمر اور ہاتھوں میں خراشیں پڑگئیں۔“

”ارے یار! کام کے بارے میں بتاؤ۔“

”اس فائل میں سب کچھ ہے۔“ سلویا نے ایک فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں فریش ہونے جارہی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اور ہاں، اس وقت تو میں ایک انڈا بھی فرائی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اس کی تم فکر مت کرو، میں نے ہوٹل سے لنچ منگوالیا ہے۔“

سلویا فریش ہو کر نکلی تو تازہ گلاب کی طرح نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ ارسلان اس وقت اس فائل میں گم تھا جو سلویا لائی تھی۔

''یار پہلے کھانا کھالو۔ پھر کچھ کام کی بات کرنا۔'' سلویا نے کہا اور کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگاتی ہوں۔''

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے سلویا نے کہا۔ ''اس فائل میں ریلوے اسٹاف کی لسٹ موجود ہے۔''

''میں دیکھ چکا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''دھماکا مال گودام کے شیڈ میں ہوا تھا، اس لیے میں نے خاص طور پر وہاں کے اسٹاف کی لسٹ کو ہائی لائٹ کیا ہے۔ ویسے وہ لوگ بچ گئے ہیں جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔ گڈز آفس کا کلرک عبدالرحمان اس وقت کسی آدمی کے ساتھ مال گودام کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اطلاع مجھے ایک قلی سے ملی ہے جو اس وقت وہیں موجود تھا اور دھماکے سے چند منٹ پہلے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کا ایک دوست اسے بلانے آگیا تھا اور وہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے نکل گیا۔ وہ لوگ وہاں سے کئی کلومیٹر دور پہنچ گئے تھے اس کے باوجود دھماکے کی آواز سے موٹر سائیکل کا توازن بگڑ گیا اور وہ سڑک پر گر گئے۔ قلی نے مجھے بتایا کہ عبدالرحمان اس اجنبی کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ بھی تھا۔ ہاں حیرت انگیز طور پر گڈز آفس کا دوسرا کلرک سراج بھی چند منٹ پہلے وہاں سے چلا گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ دھماکے میں زخمی نہیں ہوا تھا بلکہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس قلی سے میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ صحت مند آدمی ہے۔ اسے کبھی دل کی تکلیف نہیں رہی۔''

''سلویا!'' ارسلان نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ کلرک سراج اس وقت کہاں ہے، میرا مطلب ہے کہ کس اسپتال میں ہے؟''

''وہ ریلوے اسپتال میں ہے۔'' سلویا نے بتایا پھر جلدی سے بولی۔ ''ارسلان! اس وقت میں کہیں جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''یار! صرف ریلوے اسپتال تک تو چلنا ہے۔ میں اس کلرک سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاید اس سے کوئی کلیو مل جائے۔''

''مجھے نہیں لگتا اس سے کچھ سراغ ملے گا۔'' سلویا نے کہا۔ ''لیکن تم ریلوے اسپتال جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔''

''تم نے تمام اسٹاف کے گھروں کے پتے بھی حاصل کر لیے ہیں۔ تمہاری یہی ذہانت تو مجھے پسند ہے۔ اب ہم پہلے اس کے گھر جائیں گے اور اس کے بارے میں معلومات کریں گے۔'' وہ فائل پر نظریں دوڑاتا رہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''وہ گڈز کلرک سراج اسلام آباد کے ایک بنگلے میں رہتا ہے؟''

''اس بات سے تو میں بھی چونکی تھی۔'' سلویا ہنس کر بولی۔

چند منٹ بعد ارسلان کی ہنڈا اسٹی تیز رفتاری سے اسلام آباد کے اسی سیکٹر کی طرف دوڑ رہی تھی جہاں وہ کلرک رہتا تھا۔ سلویا اور ارسلان اس وقت ایک ساتھ تھے۔ سلویا نے گھریلو بیگمات کی طرح شلوار قمیص پہن رکھا تھا.... بڑا سا ایک دوپٹا بھی لپیٹا ہوا تھا اور بالوں کی چوٹی اس کی کمر پر لہرا رہی تھی۔ اس کے برعکس سلویا کے بال بوائے کٹ تھے اور وہ ہمیشہ جینز اور ٹی شرٹ پہنتی تھی، ارسلان بھی شلوار قمیص میں تھا اور سر پر جناح کیپ لگائی ہوئی تھی۔

گڈز کلرک کا شاندار بنگلا دیکھ کر ارسلان حیران رہ گیا۔

''کون ہے؟'' اطلاعی گھنٹی کے جواب میں ایک لڑکا گیٹ پر آگیا۔

''بیٹا ہم ریلوے کے دفتر سے آئے ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ سراج کو دل کا دورہ پڑا ہے؟''

لڑکے نے ذیلی گیٹ کھول دیا اور انہیں اندر لے گیا۔ ''گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے، بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی دونوں اس وقت اسپتال میں ہیں۔''

''کیا سراج کی دو بیویاں ہیں؟''

لڑکا ہنس کر بولا۔ ''جی ہاں، بھائی جان کی دو بیویاں ہیں۔ ان کا بس چلے تو تیسری بھی کر لیں لیکن دونوں بھابیاں غصے کی بہت تیز ہیں۔''

''تمہارے بھائی جان کی گاڑی کہاں ہے؟'' سلویا نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

''بھائی جان کی دونوں گاڑیاں بھابیوں کے پاس ہیں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''تمہاری بھابیاں بہت دولت مند خاندانوں سے ہیں؟'' سلویا نے کہا۔

لڑکا طنزیہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''دولت مند خاندان...... بڑی بھابی کی فیملی راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے علاقے میں رہتی ہے اور چھوٹی بھابی کا خاندان پرانے لاہور کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ وہ لوگ تو

بہانے بہانے سے بھائی جان سے پیسے لے جاتے ہیں، اب وہ بیمار پڑے ہیں تو کوئی بھی نہیں آیا۔''

''میں دراصل ان کی بیگم کو ایک چیک دینے آیا تھا۔ وہ موجود نہیں ہیں تو... میں اسپتال جا کر ان کو دے دوں گا۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا، اب ہم چلتے ہیں۔''

''معذرت چاہتا ہوں، میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔'' لڑکے کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''آپ کی گاڑی دیکھ کر میں سمجھا تھا کہ ابرار صاحب آئے ہیں۔'' لڑکے نے کہا۔

''ابرار صاحب کون؟'' ارسلان چونک کر بولا۔

''ابرار صاحب اکثر بھائی جان کے پاس آتے رہتے ہیں۔''

''اچھا وہ ابرار صاحب کہاں رہتے ہیں۔'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''کیا بیٹا تمہارے پاس ان کا ایڈریس ہے؟''

''ہاں بھائی جان نے ان کے گھر سے کچھ منگوایا تھا تو مجھے ایڈریس بھی لکھوایا تھا۔ وہ بھی اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔'' لڑکا اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پرچی تھی۔

ارسلان نے شکریہ ادا کر کے وہ پرچی لڑکے سے لی اور سلویا کو لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اندرونی بلب آن کیا اور اس کی روشنی میں لڑکے کے دیے ہوئے ایڈریس پر نظر ڈال کر بولا۔

''یہ ایڈریس تو یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ چلو ایک نظر اس ایڈریس پر ڈال لیں۔'' پھر وہ سلویا سے بولا۔ ''یار! اس وقت مجھ سے ایک بھول ہوگئی۔ بھول کیا بلکہ اسے بلنڈر کہنا چاہیے۔ مجھے یہاں اپنی گاڑی نہیں لانا چاہیے تھی۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد سلویا نے کہا۔ ''ارسلان! شاید کوئی گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔''

''ہاں، میں بھی محسوس کر چکا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''کون ہو سکتا ہے یہ؟'' سلویا بڑبڑائی۔

''کوئی بھی ہو سکتا ہے۔'' ارسلان نے بیزاری سے کہا۔ ''میرے دشمنوں کی تعداد کم تو نہیں ہے۔''

''تم ذرا سی ٹینشن میں مرچیں کیوں چبانے لگتے ہو؟'' سلویا منہ بنا کر بولی۔

''ٹینشن!'' ارسلان مسکرایا۔ ''ٹینشن کا لفظ میری ڈکشنری میں نہیں ہے صالحہ خاتون!'' ارسلان نے اسے چڑانے کے لیے اس کا اصلی نام لیا۔

''گڈ!'' سلویا ہنس کر بولی۔ ''چلو ایک لفظ کا مزید اضافہ ہوگیا۔ میں وہ تمام الفاظ نوٹ کرتی جا رہی ہوں جو تمہاری ڈکشنری میں نہیں ہیں۔''

ارسلان نے بلامقصد ایک موڑ کاٹا اور گاڑی کو بہت تیزی سے سروس روڈ پر لے گیا پھر دوسرا موڑ کاٹا اور دوبارہ گاڑی مین روڈ پر چڑھا دی۔ اس کا تعاقب کرنے والی گاڑی مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

''یا تو تعاقب کرنے والے اناڑی ہیں یا پھر جان بوجھ کر مجھے جتانے کو ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔'' ارسلان نے کہا اور ایک اسٹریٹ پر مڑ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے گاڑی کی رفتار کچھ سست کی اور ایک شاندار بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلویا کو بتایا۔ ''یہ وہ بنگلا ہے جس کا ایڈریس اس لڑکے نے دیا تھا۔''

پھر اس نے گاڑی کی رفتار اچانک بڑھا دی اور بڑھاتا ہی چلا گیا۔ اسپیڈ میٹر کی سوئی سو اور ایک سو بیس کے درمیان گھومنے لگی۔ اس نے اچانک گاڑی دائیں طرف موڑ کے ایک بنگلے کے ساتھ خالی پلاٹ پر کھڑی کر دی اور خود تیزی سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ ہی سلویا بھی گاڑی سے باہر آگئی اور ان دونوں نے تیزی سے سڑک پار کی اور دوسری سمت جا کر اندھیرے میں کھڑے ہوگئے۔

ان کے پیچھے آنے والی گاڑی بھی تیزی سے اس طرف گھومی اور سیدھی چلی گئی۔ پھر ارسلان نے اس گاڑی کو رکتے دیکھا۔ تعاقب کرنے والا شاید اندازہ لگا رہا تھا کہ ارسلان کس طرف جا سکتا ہے؟ پھر اس نے گاڑی کو یوٹرن لیتے دیکھا اور وہ سست روی سے چلتی ہوئی عین اس جگہ آکر ٹھہر گئی جہاں اندھیرے میں ارسلان کی گاڑی کھڑی تھی۔

گاڑی میں سے دو افراد باہر نکلے، اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے اردگرد دیکھا تو ان کی نظر ارسلان کی گاڑی پر پڑی۔

''اس کی گاڑی تو یہاں کھڑی ہے۔ شاید وہ یہاں کسی بنگلے میں گیا ہے۔''

''تم اپنا کام کرو۔'' پہلے آدمی نے دوسرے سے کہا۔

وہ کہتا ہوا ارسلان کی گاڑی کی طرف گیا اور جیب سے پسٹل نکال کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ پسٹل پر یقینی طور پر سائلینسر لگا تھا کیونکہ فائر کی آواز نہیں آئی تھی، بس ہلکی سی ٹھک کی آواز نکلی تھی۔ وہ دونوں فوراً ہی گاڑی میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

''چلو چھٹی ہوئی۔'' ان کے جانے کے بعد ارسلان نے کہا۔ ''وہ کم بخت میری گاڑی کے دو ٹائر

فلیٹ کر گئے ہیں۔''

''گاڑی کو یہیں چھوڑو اور گھر چلو، میں آج بہت تھک گئی ہوں۔''

''تم ایسا کرو یہاں سے مین روڈ تک جاؤ، تمہیں کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔''

''ایک آئیڈیا ہے'' سلویا نے کہا۔''میں اپنے اخبار کے کرائم رپورٹر شاہد کو یہاں بلا لیتی ہوں۔اس کے پاس بھی ہنڈا سوک ہے۔اس کے پاس اسٹپنی بھی ہوگی۔دوسرا ٹائر تمہاری گاڑی میں ہوگا۔کیا کہتے ہو؟''

''یار! بعض اوقات تو تم بہت زیادہ ذہانت کی باتیں کرنے لگتی ہو صالحہ خاتون!'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔''اسے فوراً بلا لو۔''

سلویا نے سیل فون نکالا اور شاہد کو کال کرنے لگی۔پھر وہ دونوں شدید سردی میں اس روڈ پر چہل قدمی کرتے رہے۔دس منٹ بعد شاہد وہاں پہنچ گیا۔وہ ارسلان کو سلویا کے ایک دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔شاہد اور ارسلان نے مل کر گاڑی کے ٹائر بدلے اور دس منٹ بعد شاہد وہاں سے رخصت ہوگیا۔ارسلان بھی سلویا کے ساتھ اپنی گاڑی میں روانہ ہوگیا۔

''تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟'' ارسلان نے سلویا سے پوچھا۔

''کیا مطلب کہاں ڈراپ کروں؟'' سلویا نے آنکھیں نکالیں۔''میری گاڑی تمہارے بنگلے میں کھڑی ہے، یوں بھی اب بہت دیر ہوگئی ہے۔میں گھر نہیں جاؤں گی۔''

''گویا آج تم نے مجھے بور کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔'' ارسلان نے مرے مرے لہجے میں کہا۔سلویا نے کوئی جواب دیے بغیر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلے روز ارسلان حسب معمول علی الصباح بیدار ہوگیا۔معمول کی ایکسرسائز کے بعد اس نے ناشتا بنایا۔وہ جانتا تھا کہ سلویا کھانا پکانے میں بہت الجھتی ہے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں بدلے ہوئے حلیے میں ریلوے اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔سراج دل کے دورے کے بعد وہیں ایڈمٹ تھا۔

وہ چھوٹا سا اسپتال تھا۔وہاں پولیس کو دیکھ کر ارسلان حیران رہ گیا۔وہ دونوں ڈیوٹی ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور کہا۔''ہمیں سراج صاحب سے ملنا ہے۔''

''اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہم بہت دور سے آئے ہیں۔'' سلویا نے کہا۔''سراج بھائی میرے کزن ہیں۔''

''آپ بھی ان کے رشتے دار ہیں؟'' ڈاکٹر نے طنز سے پوچھا۔''مجھے حیرت ہے کہ کسی مریض کے اتنے رشتے دار کیسے ہوسکتے ہیں؟''

''میں سمجھی نہیں۔'' سلویا نے معصومیت سے پوچھا۔

''صبح سے اب تک چالیس سے زیادہ رشتے دار یہاں آچکے ہیں۔''

''دیکھیے، میرا ملنا بہت ضروری ہے۔'' سلویا نے کہا۔''میں سراج بھائی کو دیکھے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' سلویا نے روہانسی ہوکر کہا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ارسلان اس کی اداکاری پر اش اش کر رہا تھا۔

''سوری!'' ڈاکٹر نے اکھڑ لہجے میں کہا۔''میں نے کہا نا کہ کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ان کی بیوی بچوں کو بھی نہیں۔ان کی دونوں بیویاں ابھی کچھ دیر پہلے ان سے ملے بغیر یہاں سے چلی گئی ہیں۔''

''اچھا، آپ ہم میں سے صرف ایک آدمی کو اندر جانے دیں۔'' ارسلان نے کہا۔

''ایک تو کیا، آدھا بھی اندر نہیں جاسکتا۔'' ڈاکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

سلویا نے ارسلان کی طرف دیکھ کر کہا۔''کیا کر سکتے ہیں، مجبوری ہے۔ہم تو نہیں چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب مان ہی نہیں رہے ہیں۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے اچانک اعشاریہ دو دو کا چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

سلویا نے کہا۔''آرام سے بیٹھ جاؤ ڈاکٹر! یہ پسٹل چھوٹا ضرور ہے لیکن اس کی گولی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی ہے اور یہ بے آواز چلتا ہے۔''

اس دوران میں ارسلان تیزی سے سراج کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔سلویا نے پسٹل کچھ ایسے انداز سے پکڑا ہوا تھا کہ وہ کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ڈاکٹر اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ارسلان فوراً ہی واپس آگیا۔سلویا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ارسلان نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

سلویا اٹھتے ہوئے ڈاکٹر سے بولی۔''اگر تم پانچ منٹ سے پہلے اس کمرے سے باہر نکلے تو ہمارے ساتھی تمہاری کھوپڑی اڑا دیں گے۔''

وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے۔ان کے نکلتے ہی ڈاکٹر

نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کر کے بولا۔ ''ایم ایس صاحب سے بات کراؤ، جلدی کرو۔'' دوسرے ہی لمحے ایم ایس لائن پر تھا۔ ڈاکٹر نے اسے جلدی جلدی سارا واقعہ بتایا۔

ایم ایس نے بھنا کر کہا۔ ''میں پولیس کو اطلاع دیتا ہوں۔ آپ فوراً مریض کی خبر لیں۔''

ڈاکٹر ریسیور رکھ کر بہت تیزی سے سراج کے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ سراج بیڈ پر غیر فطری انداز میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

ارسلان اور سلویا وہاں سے باہر نکلے تو لفٹ سے اترتے ہی انہیں پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے روک لیا اور بولا۔ ''آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ انتہائی درشت تھا۔

''کیا تم یہاں آنے والے ہر وزیٹر سے یہی سوال کرتے ہو آفیسر؟'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میری بات کا جواب دیں۔'' سب انسپکٹر درشت لہجے میں بولا۔

اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا اور ڈیوٹی ڈاکٹر باہر نکلا۔ ارسلان کو دیکھ کر وہ چیخا۔ ''یہ ہی وہ دونوں ہیں، جانے نہ پائیں۔ اس آدمی نے سراج صاحب کا مرڈر کر دیا ہے۔''

سب انسپکٹر نے اپنا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھایا تو ارسلان نے کہا۔ ''نہیں آفیسر!'' اس کے ساتھ ہی ارسلان کا ریوالور نکل آیا۔

اس کی دھمکی کے باوجود سب انسپکٹر ریوالور نکال چکا تھا۔ ارسلان نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر زوردار لات ماری، ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔ ارسلان سلویا کا ہاتھ پکڑ کے تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔

وہ گیٹ تک پہنچا تو پیچھے سے سب انسپکٹر کی آواز آئی۔ ''رک جاؤ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔''

''وہ فائر کر بھی دے گا۔'' سلویا بوکھلا کر بولی۔

اس کے کہتے کہتے سب انسپکٹر نے ان پر فائر کر دیا لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔ ارسلان نے گھوم کر انسپکٹر پر فائر کیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی اور وہ چیخ کر وہیں گر گیا۔ ارسلان نے سلویا کا ہاتھ پکڑا اور گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ فائرنگ کی آواز سے وہاں اچھی خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ بہت سے لوگ وحشت زدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر سلویا اور ارسلان بھی نکل گئے۔

مین روڈ پر آنے کے بعد ارسلان نے نقلی بالوں کی وگ، مونچھیں اور چشمہ اتار کے عقبی سیٹ پر پھینک دیا۔ سلویا نے بھی اپنی وگ اتار دی، بڑے شیشوں کا چشمہ اتارا اور کوٹ بھی اتار کر پھینک دیا پھر کچھ سوچ کر اس نے ان سب چیزوں کا بنڈل بنایا اور اسے عقبی سیٹ کے پائیدان میں ٹھونس دیا۔

''یہ کھیل تو مجھے کچھ زیادہ ہی بڑا لگ رہا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''تم اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے؟'' سلویا نے کہا۔ ''تم تو سراج سے پوچھ گچھ کرنے گئے تھے؟''

''مردے بھی کسی سوال کا جواب نہیں دیتے ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔ سلویا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''جب میں وہاں پہنچا تو سراج مر چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کچھ دیر پہلے ہی قتل کیا گیا ہے۔ اسے کسی نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔''

''او مائی گاڈ!'' سلویا نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس کیس میں بہت بڑے بڑے لوگ ملوث ہیں۔'' ارسلان نے کہا پھر اس نے پان اور سگریٹ کی ایک دکان دیکھ کر گاڑی روک دی اور سلویا سے بولا۔ ''تم اسٹیئرنگ سیٹ پر آ جاؤ ورنہ فضول میں ٹریفک پولیس سے الجھنا پڑے گا۔ میں سگریٹ لے کر ابھی آتا ہوں۔''

''میرے لیے بھی ایک میٹھا پان لیتے آنا۔'' سلویا نے ذرا اترا کر کہا۔

ارسلان دکان کی طرف بڑھ گیا، اس نے سگریٹ کے دو پیکٹ لیے اور پان بنوانے لگا۔ اس دکان پر کافی رش تھا، راولپنڈی میں پان کی دکانیں یوں بھی کم ہیں۔

وہ سگریٹ اور پان لے کر واپس آیا تو گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔ سلویا بھی غائب تھی۔ اس نے سوچا۔ کیا ٹریفک پولیس والے سلویا سمیت گاڑی کو اٹھا کر لے گئے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر گنے کے جوس والا کھڑا تھا۔ ارسلان نے اس سے پوچھا۔ ''یہاں کچھ دیر پہلے میری گاڑی کھڑی تھی۔ کیا اسے پولیس والوں نے اٹھا لیا؟''

''نہیں صاحب!'' گنے کے رس والے نے کہا۔ ''آپ کی گاڑی شاید بلیک کلر کی ہنڈا سٹی تھی۔ اس میں تو کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ پھر اچانک دو تین بدمعاش قسم کے لوگ آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پھر گاڑی وہاں سے چلی گئی۔'' گنے والے نے توقف کے بعد کہا۔ ''اصل میں آج

کل موسم ٹھنڈا ہے اس لیے میرے پاس بھی رش بہت کم ہوتا ہے۔ اس وقت تو کوئی گاہک بھی موجود نہیں تھا اس لیے میں نے اس گاڑی کو تفصیل سے دیکھا تھا۔''

ارسلان اس کا شکریہ ادا کر کے پھر مین روڈ کے فٹ پاتھ پر آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سلویا کو کون لوگ لے جاسکتے ہیں۔

اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ چودھری صاحب کی کال تھی۔ اس نے بٹن آن کر کے سیل فون کان سے لگالیا۔ ''یس یور آنر!'' دوسروں کی طرح وہ بھی انہیں یور آنر کہتا تھا۔

''کیا خبریں ہیں ٹائیگر؟'' چودھری صاحب نے اسے ٹائیگر کا خطاب دے رکھا تھا۔

''خبر اچھی نہیں ہے...... ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے سلویا کو میری گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔''

''گاڑی سمیت!'' چودھری صاحب بولے۔ ''ممکن ہے، وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہو؟''

''نو سر! یہ ممکن نہیں ہے۔ سلویا بغیر کسی اطلاع کے غائب نہیں ہوسکتی۔''

''ویری سیڈ!'' چودھری صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''میں دیکھتا ہوں، تم فکر مت کرو۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اس نے فوری طور پر سلویا کے سیل نمبر پر کال کی لیکن دوسری طرف سے ریکارڈنگ آتی رہی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ ارسلان نے اردگرد دیکھا وہاں کوئی بھی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا۔

اچانک اس کے سیل فون پر ایس ایم ایس موصول ہونے کی ٹون بجی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا تو میسیج پڑھ کر حیران رہ گیا۔ وہ میسیج سلویا کی طرف سے تھا، اس نے لکھا تھا۔ ''ارسلان! مجھے دو غنڈوں نے اچانک ہی گن پوائنٹ پر اغوا کرلیا تھا۔ میں نے بہت مشکل سے اپنی جان بچائی ہے۔ ان بدمعاشوں میں سے ایک میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ میں خود بھی شدید زخمی ہوں، بہت مشکل سے اپنے فلیٹ تک پہنچی ہوں۔ تم فوراً یہاں آجاؤ۔''

سلویا کا میسیج پڑھ کر ارسلان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ سلویا کا فلیٹ یہاں سے کافی دور تھا۔ اس نے نزدیک سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا اور روانہ ہوگیا۔

وہ سلویا کے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں سناٹا تھا۔ اس نے ڈور بیل بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ارسلان نے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ارسلان نے محتاط انداز میں اندر جھانکا، پھر اپنا ریوالور نکال کر اندر داخل ہوگیا۔

اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''سلویا!'' اس کی آواز کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ ارسلان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ضرور کوئی خطرناک گڑبڑ ہے، وہ سلویا کے بیڈروم کے نزدیک پہنچا تو اس کا دروازہ بند تھا۔ وہ مزید آگے بڑھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ بیڈروم کے دروازے کے نیچے سے خون کی ایک لکیر بہتی ہوئی باہر آرہی تھی۔

خون دیکھ کر ارسلان پاگل ہوگیا اور تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر لمحے بھر کو تو وہ سکتے میں رہ گیا۔ فرش پر سلویا غیر فطری انداز میں پڑی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور جسم پر خراشیں تھیں۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور سلویا کی نبض ٹٹولی۔ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس کے سینے سے خون نکل نکل کر بہہ رہا تھا۔ ارسلان نے اس کی ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کے سانس محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی سانس بھی ساکت تھی۔ سلویا کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ دروازے کی طرف تک رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس کا جسم ابھی تک گرم تھا۔ گویا اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ ارسلان کا پورا جسم صدمے اور غصے سے کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سلویا اس کی بہترین دوست تھی اور بہت آڑے وقتوں میں اس کے کام آتی تھی۔ ارسلان سوچتا تھا کہ اگر سلویا کی مستقل مزاجی کا یہی عالم رہا تو میں اس سے شادی کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔

اچانک پھر اس کے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی اور وہ چیخ کر بولا۔ ''کتو، کمینو! میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اچانک دروازے کی طرف سے کوئی چیخ کر بولا۔ ''ہینڈز اپ۔''

ارسلان نے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں پولیس کا ایک ڈی ایس پی ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا۔ ارسلان کو اس کے پیچھے دو سپاہی بھی نظر آرہے تھے۔

''یو آر انڈر اریسٹ مسٹر ارسلان!'' ڈی ایس پی نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بھاگنے کی کوشش مت کرنا اور اپنی یہ گن پھینک دو۔''

ارسلان نے بے بسی سے دیکھا۔ وہ اس راشی ڈی ایس پی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا...... پیسے کی خاطر اس نے کئی بے گناہوں کو پھانسی پر چڑھوا دیا تھا۔ ارسلان اپنی عدالت میں بہت پہلے اسے موت کی سزا سنا چکا تھا، بس اس سزا پر عمل درآمد کے موقع کی تلاش میں تھا۔

ارسلان نے ریوالور پھینک دیا اور دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم کس سلسلے میں مجھے گرفتار کر رہے ہو مسٹر ڈی ایس پی؟''

''واہ!'' ڈی ایس پی تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔ ''ریوالور ہاتھ میں ہے، مقتولہ کی لاش سامنے پڑی ہے اور تم کس ڈھٹائی سے پوچھ رہے ہو کہ تمہیں گرفتار کیوں کیا جا رہا ہے؟'' پھر اس نے ایک کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ ''غلام رسول! اس کی اچھی طرح تلاشی لو اور ہتھکڑی لگا دو۔''

سپاہی نے اس کی بہت مہارت سے تلاشی لی اور اس کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کی ہلکی لیکن مضبوط ہتھکڑی ڈال دی۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا سپاہی نے اپنی بیلٹ سے باندھ لیا۔

''پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کرو کہ ڈیلکس اپارٹمنٹ کے فلیٹ نمبر 315 میں معروف جرنلسٹ سلویا کا مرڈر ہو گیا ہے۔ ڈی ایس پی نذیر نے قاتل ارسلان کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ وہاں سے ایمبولینس اور دوسرے عملے کو بلاؤ۔'' پھر وہ دوسرے سپاہی سے مخاطب ہوا۔ ''جب تک پولیس اسٹیشن سے متعلقہ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں، اس وقت تک تم یہیں رہو گے۔'' پھر وہ ارسلان کے پیٹ میں ریوالور کی نال لگا کر بولا...... ''اب چلو اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں گولی چلانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔''

سپاہی ارسلان کو کھینچتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسرا سپاہی وہیں رک گیا تھا۔

ڈی ایس پی ریوالور ارسلان پر تانے ہوئے لفٹ کی طرف بڑھا۔ ارسلان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے کہ ان حرام زادوں سے چھٹکارا ملے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک دفعہ لاک اپ تک پہنچ گیا تو پولیس والے اسے پھانسی پر لٹکوا کر ہی دم لیں گے۔

لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے ارسلان نے بڑی سرعت سے وہ خنجر نکالا جو ایسے ہی وقتوں کے لیے وہ اپنی آستین میں چھپا کر رکھتا تھا۔ سپاہی نے جس وقت اس کی تلاشی لی تھی، اس کے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے۔

ارسلان نے لات مار کے اس سپاہی کو گرا دیا جس کی کمر سے اس کی ہتھکڑی کی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خنجر پھرتی سے اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور گھوم کے وہ خنجر ڈی ایس پی کے سینے میں پیوست کر دیا۔ ڈی ایس پی کے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی، ارسلان نے خنجر کھینچا اور دوبارہ پوری قوت سے ڈی ایس پی کے سینے میں پیوست کر دیا۔ خنجر دستے تک ڈی ایس پی کے سینے میں دھنس گیا۔

سپاہی ابھی تک فرش پر پڑا تھا، اس کی وجہ سے ارسلان کو خاصا جھک کر اپنا کام کرنا پڑ رہا تھا۔

ارسلان کو جب یہ یقین ہو گیا کہ ڈی ایس پی کی سزائے موت پر عمل درآمد ہو چکا ہے تو وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔

سپاہی بری طرح گڑگڑانے لگا۔ ''ارسلان صاحب! میری آپ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے مت ماریں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''یار! یہ بچوں، بیوی اور والدین کی دہائی اب بہت پرانا ڈراما ہو گیا ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈی ایس پی کا سروس ریوالور اٹھا لیا پھر سپاہی سے ڈپٹ کر بولا۔ ''ہتھکڑی کی چابی نکالو۔''

سپاہی نے لرزتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہتھکڑی کی چابی نکال کر ارسلان کی طرف بڑھا دی۔ ارسلان نے ہتھکڑی کھولی، خنجر کو ڈی ایس پی کے کپڑوں سے صاف کیا اور اسے دوبارہ آستین میں رکھ لیا پھر اس نے بٹن دبا کر لفٹ چلا دی۔

اب سب سے بڑا مسئلہ خون کے ان دھبوں کا تھا جو ڈی ایس پی کا خون بہنے سے ارسلان کے کپڑوں پر لگے تھے، اس کا بایاں ہاتھ بھی خون میں تر تھا۔

اس نے سپاہی سے کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں کیونکہ میری نظر میں تم بے گناہ ہو لیکن میرے اترتے ہی لفٹ کو دوبارہ اوپر لے جانا ورنہ......''

''میں سمجھ گیا ارسلان صاحب!'' سپاہی جلدی سے بولا۔ اسے ارسلان نے نئی زندگی کی نوید سنائی تھی اس لیے وہ پہلے سے زیادہ فعال نظر آ رہا تھا۔

ارسلان گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے نکلا تو وہاں لفٹ کے انتظار میں کئی لوگ کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے ارسلان کو حیرت سے دیکھا، ارسلان کے لباس پر خاص طور پر اس کے بائیں حصے پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ ڈی ایس پی کا خون ابھی تک لفٹ کے فرش پہ بہہ رہا تھا۔

''یہ لفٹ خراب ہوگئی ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اسے ریپئرنگ کے لیے بند کیا جارہا ہے۔''

''لیکن لفٹ تو بالکل ٹھیک ہے صاحب!'' ایک شخص نے جھنجلا کر کہا۔

اس وقت تک لفٹ کا دروازہ بند ہوچکا تھا اور وہ واپس اوپر چلی گئی تھی۔ ارسلان لفٹ سے باہر نکل کر کمپلیکس کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو وہاں موجود لوگوں نے اس کے خون آلود لباس اور ہاتھ کو حیرت اور شبے کی نظر سے دیکھا۔

لیڈر قسم کے ایک صاحب نے بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے معاملہ کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔'' وہ ایک نوجوان سے مخاطب ہوئے۔ ''منور! پولیس کو ٹیلی فون کرو، یا دیکھو باہر پولیس موبائل موجود ہے تو انہی لوگوں کو بلالو۔''

''کسی نے اپنی جگہ سے حرکت بھی کی تو اس کی کھوپڑی اڑادوں گا۔'' ارسلان نے سفاک لہجے میں کہا اور اطمینان سے ٹہلتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

باہر واقعی پولیس کی ایک موبائل وین موجود تھی۔ اس میں بیٹھے سپاہی سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ایک سپاہی کولر سے پانی پی رہا تھا۔ انہوں نے ارسلان پر کوئی توجہ نہ دی۔ ارسلان ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسے فوری طور پر ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ اسی وقت وہاں ایک جدید ماڈل کی کرولا آکر رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان لڑکا اترا اور گاڑی کو ریموٹ سے لاک کر کے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ ارسلان نے اسے آواز دی۔ ''سنیے!''

نوجوان اس کی آواز پر رک گیا۔ ''جی فرمائیے۔''

''میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہوگیا ہوں۔ پلیز، آپ مجھے اسپتال تک پہنچادیں۔''

''آپ کی گاڑی کہاں ہے؟'' نوجوان نے اسے مشتبہ نظروں سے گھورا۔

''اس وقت میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ میں روڈ کراس کررہا تھا کہ موٹر سائیکل سوار ایک شخص نہ جانے کس جانب سے نکلا اور خاصی رفتار سے مجھے ہٹ کیا۔''

''میں آپ کو ہاسپٹل کے اندر تو نہیں، وہاں سے کچھ فاصلے پر ضرور ڈراپ کرسکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''چلیں یوں ہی سہی۔'' ارسلان نے کہا۔ ''مجھے ایسی جگہ ڈراپ کیجیے گا جہاں سے میں پیدل اسپتال تک جاسکوں۔''

نوجوان نے ریموٹ سے گاڑی کا لاک کھولا اور ارسلان کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ارسلان بری طرح لنگڑاتا ہوا پسنجر سیٹ کی طرف بڑھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ!''

''آپ کے پاس پیسے تو ہیں نا؟'' نوجوان نے ہمدردی سے پوچھا۔

''جی ہاں، میرے پاس پیسے ہیں، آپ کا ایک مرتبہ پھر شکریہ!'' ارسلان نے کراہنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

سلویا کا فلیٹ سیکٹر ایف الیون میں تھا اور آبادی سے خاصا دور تھا۔ نوجوان نے گاڑی سروس روڈ سے مین روڈ کی طرف موڑی اور انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ شاید وہ جلد از جلد ارسلان کو اسپتال پہنچانا چاہتا تھا۔

کچھ دور آنے کے بعد ارسلان بولا۔

''آپ تھک گئے ہوں گے۔ لائیے، اب اسٹیئرنگ مجھے دے دیں اور آپ اطمینان سے بیٹھیں۔''

''میری فکر مت کریں جناب!'' نوجوان نے کہا۔ ''میں اس وقت کسی لمبے سفر سے نہیں آیا ہوں۔ مجھے کوئی تھکن نہیں ہے۔'' نوجوان نے کہا۔ ''مجھے تو آپ کی فکر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کے زخموں سے اب بھی خون بہہ رہا ہے۔''

''عجیب بات ہے کہ آپ اتنی دیر سے میرے ساتھ ہیں، میں نے آپ کا نام تک نہیں پوچھا۔''

''تو میں نے بھی کب پوچھا ہے؟'' نوجوان مسکرایا۔ ''میرا نام ناصر ہے۔''

''میرا نام حسن ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''آپ انتہائی شریف آدمی ہیں لیکن اس وقت مجبوری ہے۔ گاڑی تو آپ کو میرے حوالے کرنا پڑے گی۔''

''جی؟'' ناصر نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔'' ارسلان نے اپنی جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی روکیں اور خاموشی سے اتر جائیں۔''

ناصر نے حیرت اور بے یقینی سے ارسلان کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا لیکن......''

''جلدی کریں۔'' اس مرتبہ ارسلان کا لہجہ درشت تھا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہاں، پولیس کے پاس مت جائیے گا۔ گاڑی آپ کو شام تک اسلام آباد ہوٹل کی پارکنگ سے مل جائے گی۔''

ناصر نے گاڑی روک دی اور اترتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی کے ڈیش بورڈ میں میرے کچھ ضروری ڈاکیومینٹس

ہیں۔وہ......"

"اپنی تمام ضروری چیزیں نکال لیں۔" ارسلان نے کہا۔ "میں ایک دفعہ پھر کہہ رہا ہوں کہ پولیس کے پاس مت جائیے گا ورنہ خوامخواہ مصیبت میں پڑجائیں گے۔"

ناصر نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکالا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

ارسلان گاڑی کے اندر ہی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ وہ فوری طور پر اس خون آلود لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بنگلے پر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ممکن ہے پولیس یا اس کے دشمن وہاں پہلے سے گھات لگائے بیٹھے ہوں۔

سوچتے سوچتے اسے سلویا کی ایک دوست نازو کا خیال آیا۔ وہ اس کی مدد کرسکتی تھی۔ بس شرط یہ تھی کہ وہ پاکستان میں موجود ہو۔ وہ قومی ائرلائن میں ائرہوسٹس تھی اور عموماً ملک سے باہر ہوتی تھی۔

ارسلان نے سیل فون نکال کر نازو کا نمبر ملایا تو دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نازو پاکستان میں موجود ہے ورنہ اس کا سیل فون آف ہوتا تھا۔ پھر نازو نے کال ریسیو کرلی۔ "ہیلو ارسلان! کیسے ہو اور کہاں ہو؟"

"میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں نازو۔" ارسلان نے کہا۔ "اس وقت تم ہی پر اعتبار کرسکتا ہوں۔"

"میں تو اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔" نازو نے کہا۔ "پندرہ، بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔ سلویا کیسی ہے؟" اس نے پوچھا۔ اس بے چاری کو کیسے علم ہوسکتا تھا کہ سلویا اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے، میں بیس منٹ بعد تمہارے گھر پہنچتا ہوں۔" ارسلان نے کہا اور گاڑی کا رخ سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف موڑ دیا۔ نازو وہیں ایک بنگلے میں رہتی تھی۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ناصر پولیس میں رپورٹ نہ کردے لیکن وہ اس گاڑی کو اس وقت تک چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا جب تک خون آلود لباس سے نجات حاصل نہ کرلیتا۔ اس نے گھڑی دیکھنے کی کوشش کی تو اسے ذہنی طور پر جھٹکا لگا۔ اس کی گھڑی پہ بھی خون کے دھبے تھے۔ اس نے اپنی شرٹ سے رگڑ کر گھڑی کا ڈائل صاف کیا اور گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا ہوا نازو کے گھر پہنچ گیا۔

پورچ میں نازو کی چھوٹی سی کورے موجود تھی۔ ارسلان نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا نازو گھر پہنچ چکی تھی۔ نازو اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ "یہ کیا ہوا...... تم زخمی کیسے ہوگئے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ میرا خون نہیں ہے بلکہ ایک حرام زادے ڈی ایس پی کا گندا خون ہے۔ مجھے فوری طور پر کپڑوں کی ضرورت ہے نازو!" ارسلان نے کہا۔ "میں اس وقت شدید خطرے میں ہوں اور میرے ساتھ ساتھ تم بھی خطرے میں ہو۔"

"اب میرے کپڑے تو تم پہننے سے رہے۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ تک جانا پڑے گا۔" نازو بولی۔ "تم نہالو، میں تمہارے لیے کپڑے لے کر آتی ہوں۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر نازو اس کے لیے ایک جینز، ٹی شرٹ اور جیکٹ لے آئی۔

ارسلان تیار ہوکر باتھ روم سے نکلا تو نازو نے کہا۔ "تم بیٹھو، میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔"

"میں کافی پھر کسی وقت پیوں گا.... ابھی ٹائم نہیں ہے۔" اس نے اپنے اتارے ہوئے کپڑوں کا بنڈل بنا کر ایک شاپر میں رکھ لیا تھا۔

"ہاں، یہ تو بتاؤ سلویا کیسی ہے؟ مجھ سے ملنے کا تو اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس کے پاس اب کسی سے بھی ملنے کا ٹائم نہیں ہے۔" ارسلان نے افسردگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" نازو نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سلویا...... اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے نازو!" ارسلان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نازو فوراً ہی صوفے پر بیٹھ نہ جاتی تو گر پڑتی۔

"کیا...... کہہ رہے ہو...... تم؟" وہ ہکلا کر بولی۔

"سلویا کو قتل کیا گیا ہے اور اس کا الزام مجھ پر ہے نازو!" ارسلان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا ٹی وی کھولو، معلوم تو ہو کہ ہو کیا رہا ہے؟"

نازو نے ریموٹ کا بٹن دبا کر ٹی وی آن کردیا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز آرہی تھی۔ "ملزم ارسلان بہت خطرناک دہشت گرد ہے۔ باخبر ذرائع کے مطابق اس کا تعلق "را" سے ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ معروف جرنلسٹ سلویا بھی اس کی ساتھی تھی۔ ان دونوں نے مل کر ریلوے کے گڈز کلرک کو ریلوے اسپتال میں گھس کر قتل کردیا۔ انہوں نے اس کے بعد پولیس کے ایک سب انسپکٹر کو شدید زخمی کردیا۔ پھر شاید سلویا اور ارسلان میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔ ارسلان نے سلویا کے فلیٹ میں ہی اسے قتل کردیا۔ پولیس نے جب اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تو اس نے

پولیس کے ڈی ایس پی راجا نواز کو خنجر کے وار کر کے بے دردی سے قتل کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔'' اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ارسلان کی ایک پرانی تصویر دکھائی گئی لیکن تصویر اتنی بھی پرانی نہیں تھی کہ پہچانی نہ جائے۔

''مائی گاڈ!'' نازو حیرت سے بولی۔

''کیا تم بھی مجھ سے خوف محسوس کر رہی ہو؟''

''حیرت تو مجھے پولیس اور میڈیا پر ہے۔'' نازو نے کہا۔ ''مجھے سلویا کی موت کا بہت صدمہ ہے، میں نے......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ دروازے پر بہت ہی غیر مہذب انداز میں دستک ہوئی تھی۔ ارسلان نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ دستک کا یہ انداز پولیس والوں کا ہے۔ وہ جھپٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نازو دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس کا ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نازو نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ لوگ میرے گھر میں کیسے داخل ہوئے اور کیوں؟''

''ارسلان کہاں ہے؟'' انسپکٹر نے اس کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

ارسلان نے باتھ روم کے دروازے میں خفیف سی جھری پیدا کر کے باہر جھانکا۔ وہ انسپکٹر باجوہ تھا۔ وہ کرپشن اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے پر پوری پولیس فورس میں بدنام تھا۔ اس کے ساتھ سب انسپکٹر محمود تھا۔ وہ پولیس کا بہت ذہین اور فرض شناس افسر تھا۔ انسپکٹر باجوہ اور سب انسپکٹر محمود دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھے۔

''میں نہیں جانتی کہ ارسلان کہاں ہے؟'' نازو نے ناگواری سے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ارسلان کو جانتی ہو؟'' باجوہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں جانتی ہوں۔'' نازو نے بے خوفی سے کہا۔

''تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنی گرل فرینڈ سلویا کا مرڈر کر دیا ہے؟''

''میں نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ خبر ٹی وی پر سنی ہے۔''

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ارسلان یہاں آیا ہے۔'' سب انسپکٹر محمود نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

''اگر آپ کو اطلاع ملی ہے تو آپ میرے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔'' نازو نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس سرچ وارنٹ نہیں ہو گا لیکن میں آپ سے کو آپریٹ کرنے کو تیار ہوں۔''

اچانک سب انسپکٹر محمود کی نظر اس شاپر پر پڑی جس میں ارسلان کے خون آلود کپڑے تھے۔ ارسلان نے وہ شاپر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے رکھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے سب انسپکٹر نے وہ شاپر اٹھا لیا۔ ارسلان کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ عجلت میں اس سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ اس بھول کا خمیازہ نازو کو بھگتنا پڑتا۔

باجوہ نے آگے بڑھ کے وہ شاپر اٹھا لیا اور نازو کے سامنے اسے الٹ دیا۔ اس میں سے ارسلان کی خون آلود شرٹ، بنیان اور پینٹ نکل کر فرش پر گر پڑی۔ انسپکٹر نے پہلے کپڑوں کا جائزہ لیا، پھر دہاڑ کر نازو سے بولا۔ ''یہ کیا ہے...... کس کے کپڑے ہیں یہ؟ تو کہتی ہے کہ ارسلان یہاں نہیں آیا۔''

''ارسلان یہاں آیا تھا۔'' نازو نے کہا۔ ''لیکن تم لوگوں کے آنے سے چند منٹ پہلے یہاں سے نکل گیا۔ میں نہیں جانتی کہ اب وہ کہاں ہے؟''

''تو اب بھی جھوٹ بول رہی ہے۔'' انسپکٹر دہاڑا۔ ''تو جانتی ہے کہ ارسلان کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' نازو نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔''

''اچھا!'' انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پھر تجھ سے کس لہجے میں بات کی جائے؟'' پھر وہ لہجہ بدل کر بولا۔ ''سیدھی طرح بتا دے، ارسلان کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' نازو نے سرد لہجے میں کہا۔

''خاتون آپ جانتی ہیں کہ کسی مجرم کو پناہ دینا یا اس کی مدد کرنا بھی قانونی طور پر جرم ہے۔'' سب انسپکٹر محمود نے مہذب لہجے میں کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' نازو نے کہا۔ ''لیکن میں نے ارسلان کو پناہ نہیں دی ہے۔ وہ یہاں آیا ضرور تھا اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے کپڑے بدلے، گن پوائنٹ پر مجھ سے رقم لی اور روانہ ہو گیا۔''

''آپ کو پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیے تھی۔'' سب انسپکٹر محمود نے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔'' نازو نے کہا۔ ''اس کے جاتے ہی تو آپ لوگ آ گئے۔''

''تو مسلسل بکواس کیے جا رہی ہے۔'' انسپکٹر باجوہ درشت لہجے میں بولا۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو تجھے سب سے

پہلے ہمیں یہ ہی بات بتانا چاہیے تھی۔ تو نے تو پہلے سرے سے انکار ہی کر دیا تھا کہ ارسلان یہاں نہیں آیا۔ پھر اس کے کپڑے ملتے ہی تو نے اپنا بیان بدل دیا۔ تو ہمیں بے وقوف سمجھتی ہے۔ سیدھی طرح بتا کہ ارسلان کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتی کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔'' نازو نے کہا لیکن اب اس کا لہجہ کھوکھلا اور اعتماد سے عاری تھا۔

''آپ ارسلان کو ٹیلی فون کریں اور اس سے کہیں کہ آپ کسی پریشانی میں ہیں، فوراً یہاں پہنچے۔'' سب انسپکٹر محمود نے کہا۔

ارسلان نے پھرتی سے اپنا سیل فون نکالا اور اس کا کور کھول کر بیٹری نکال کر دوبارہ اس میں لگا دی۔ سیل فون آف ہوگیا۔ اگر وہ بٹن دبا کر سیل فون آف کرتا تو پاور آف کی ٹون باہر تک جاتی۔ پولیس کو اب تک یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ ارسلان وہیں موجود ہے۔ شاید اس کی وجہ نازو کا پراعتماد لہجہ تھا جب اس نے پولیس والوں کو تلاشی لینے کے لیے کہا تھا۔

نازو نے اپنے سیل فون سے ارسلان کا نمبر ملایا۔ ظاہر ہے اسے فون بند ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دی ہوگی۔ اس نے کہا۔ ''ارسلان کا سیل فون آف ہے۔ آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ خود کال کرلیں، نمبر میں بتاتی ہوں۔''

انسپکٹر باجوہ نے سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کی اسکرین پر نمبر دیکھ کر بولا۔ ''میں تیرے سیل فون سے ٹرائی کروں گا۔'' اس نے ارسلان کا نمبر دوبارہ ملایا لیکن ارسلان کا نمبر کیسے مل سکتا تھا۔

''سیدھی طرح بتادے کہ ارسلان کہاں ہے؟'' انسپکٹر باجوہ دہاڑا۔

''میں نہیں جانتی۔'' نازو نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر نے مکروہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''ہم تجھے اپنے ساتھ تھانے لے جائیں گے۔ اگر ارسلان تیرا دوست ہے تو وہ خود ہی وہاں پہنچ جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نازو کے بال پکڑ لیے اور زوردار جھٹکا دیا۔

نازو کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ارسلان تلملا کر رہ گیا۔ انسپکٹر نے نازو کے گریبان پر ہاتھ مارا اور اس کی قمیص پھاڑ دی۔

نازو چیخ کر بولی۔ ''میں تم لوگوں کے خلاف کورٹ میں چلی جاؤں گی۔ نکلو میرے گھر سے ورنہ میں شور مچادوں گی۔''

''تو کورٹ میں جائے گی میرے خلاف...... انسپکٹر باجوہ کے خلاف۔'' انسپکٹر نے مزید کہا۔

''تجھ جیسی خوبصورت لڑکیاں کورٹ میں نہیں، میرے بیڈروم میں اچھی لگتی ہیں۔''

نازو نے انسپکٹر کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

انسپکٹر نے غضب ناک ہو کر نازو کے چہرے پر تھپڑ مارا اور اس کی قمیص پوری پھاڑ دی۔

ارسلان سے ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ بے چاری نرم و نازک لڑکی محض اس کی وجہ سے تشدد سہہ رہی تھی۔ اس نے ریوالور نکالا اور باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر ڈپٹ کر بولا۔ ''تم سب اپنی گنز پھینک کر سر پر ہاتھ رکھ لو ورنہ میں تمہیں چھلنی کر دوں گا۔''

انسپکٹر چونک کر یوں ساکت ہوگیا جیسے کسی چابی سے چلنے والے کھلونے کی چابی ختم ہوجائے۔

''جلدی کرو۔'' ارسلان پھر دہاڑا۔ ''اپنی گنز پھینک کر دونوں زمین پر لیٹ جاؤ۔''

سب انسپکٹر محمود نے اپنا ریوالور فرش پر پھینکا اور خود بھی اوندھے منہ لیٹ گیا۔ پھر اس نے برق سرعت سے اپنا ریوالور اٹھالیا اور قلابازی کھا کر ارسلان کی طرف فائر کر دیا۔ سب انسپکٹر نے یوں ہی اندازے سے فائر کیا تھا اس لیے گولی ارسلان کے سر سے اوپر دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوگئی۔ اس دوران میں دوسروں کو بھی موقع مل گیا۔ انسپکٹر باجوہ نے بھی ارسلان پر فائر کر دیا۔ گولی ارسلان کا بازو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

ارسلان ایک دم زمین پر لیٹ گیا۔ بازی اچانک پلٹ گئی تھی۔ ارسلان نے انسپکٹر باجوہ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی اور وہ چیخ مار کے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔

دونوں سپاہیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان دونوں نے بھی اپنی رائفلیں اٹھالی تھیں۔ وہ اندھادھند ارسلان کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ ارسلان کو اپنی جان سے زیادہ نازو کی فکر تھی۔ اندھادھند فائرنگ کی زد میں وہ بھی آسکتی تھی۔ ارسلان دیوار کی آڑ میں تھا اس لیے کسی حد تک اس فائرنگ سے محفوظ تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ریوالور کی گولیوں کا جائزہ لیا۔ اس میں اب صرف پانچ گولیاں تھیں۔ ارسلان کوئی گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں سپاہی سامنے ہی کھڑے فائرنگ کررہے تھے۔ ارسلان چاہتا تو انہیں بہت آسانی سے نشانہ بنالیتا لیکن کسی بے گناہ کی جان لینا اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ اس نے ایک سپاہی کے بازو کا نشانہ

لیا اور فائر کر دیا۔ وہ اذیت ناک انداز میں چیخا۔ اسی وقت ارسلان کی طرف سے دوسرا فائر ہوا اور دوسرا سپاہی چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

اس کے بعد ایک فائر ہوا اور گولی ارسلان کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ارسلان سینے کے بل کھسکتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا۔ اس کے دائیں بازو میں شدید جلن ہو رہی تھی۔

باہر اسے نازو بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ شاید کسی صوفے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اچانک ایک صوفے کے پیچھے اسے سب انسپکٹر محمود کا سر دکھائی دیا، اس نے محمود کا نشانہ لیا لیکن فائر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ محمود اس کی نظروں میں بے گناہ تھا۔ وہ دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر تھا۔ ارسلان اس پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اسے ایسا لگا جیسے کوئی باہر کی طرف بھاگا ہو۔ بھاگنے والی نازو تھی۔ اسی وقت محمود نے اس پر فائر کیا۔ نازو چیختی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ارسلان پاگل ہو گیا۔ محمود اس کے نشانے کی زد پر تھا، اب ارسلان کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی۔ اس نے محمود کا نشانہ لے کر فائر کیا لیکن محمود اچانک پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جھنجلا کر محمود پر دوسرا فائر کر دیا۔ محمود کی ہلکی سی چیخ سنائی دی اور ایسا لگا جیسے کوئی دھم سے گرا ہو۔ ارسلان تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر جھکا جھکا باہر کی طرف بھاگا۔ نازو پشت کے بل گری ہوئی تھی گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ اس میں بھی زندگی کی رمق نہیں رہی تھی۔

اچانک ارسلان کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔ وہ جھپٹ کر برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نازو اٹھ کر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ محمود نے اس پر فائر کیا تھا تو گولی اس کی پشت میں لگتی۔ سینے میں گولی لگنے کا مطلب یہ تھا کہ باہر بھی کوئی ایسا فرد موجود تھا جو ارسلان کا دشمن تھا۔ وہ پولیس والے نہیں ہو سکتے تھے ورنہ اتنے ہنگامے میں وہ بھی اندر آ جاتے۔

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ارسلان!'' اچانک محمود کی آواز سنائی دی۔

ارسلان پلٹا تو اسے محمود دکھائی دیا۔ اس کا دایاں بازو پہلو میں جھول رہا تھا۔ بائیں بازو میں ریوالور تھا اور اس کا رخ ارسلان کی طرف تھا۔

ارسلان نے چیخ کر کہا۔ ''یہاں باہر بھی کوئی موجود ہے جس کی گولی نازو کو لگی ہے۔''

''اپنی گن پھینک دو ارسلان!'' محمود نے خشک لہجے میں کہا۔

ارسلان نے اپنا ریوالور پھینک دیا اور بولا۔ ''میری بات کا یقین کرو آفیسر...... باہر کی طرف بھی کوئی موجود ہے۔''

محمود محتاط انداز میں آگے بڑھا اور ارسلان کی گن پیر کی ٹھوکر سے دور پھینک دی۔

''دیکھو آفیسر! میں دیانت دار اور فرض شناس لوگوں کا احترام کرتا ہوں۔ تم دو دفعہ میرے نشانے کی زد پر آئے لیکن دونوں مرتبہ میں نے تمہیں نشانہ نہیں بنایا۔ میری بات کا یقین کرو باہر کوئی موجود ہے۔''

''میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' محمود نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

ارسلان خنجر پھینک کر اسے آگے بڑھنے سے روک سکتا تھا۔ اس نے محمود کو زخمی کرنے کے ارادے سے خنجر نکالنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی باہر سے فائر ہوا اور گولی محمود کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ارسلان تیزی سے زمین پر گر گیا۔ اب سامنے والا راستہ مخدوش ہو گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے لوگ گھات لگائے بیٹھے تھے۔

ارسلان سینے کے بل بہت تیزی سے کھسکتا ہوا دوبارہ اندر پہنچا۔ اندر انسپکٹر باجوہ کی لاش پڑی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دونوں سپاہی زخمی حالت میں پڑے تھے۔ ارسلان نے ان کے پیروں کو نشانہ بنایا تھا اس لیے وہ چلنے سے معذور تھے۔ وہ دونوں ہوش میں تھے۔

ارسلان نے آگے بڑھ کر انسپکٹر باجوہ کا سروس ریوالور اٹھا لیا، پھر کچھ سوچ کر سپاہیوں کی رائفلیں اٹھائیں تو وہ گڑگڑانے لگے۔ ''تمہیں اللہ کا واسطہ ہمیں مت مارو۔ ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''تم لوگ اپنی یہ بکواس بند کرو۔ دشمنی نہیں تھی تو مجھ پر فائرنگ کیوں کی تھی؟''

''ہم انسپکٹر صاحب کے حکم کے آگے مجبور تھے۔'' ان میں سے ایک سپاہی بولا۔

''میں خوامخواہ تمہارے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا، بس خاموشی سے لیٹے رہو۔'' وہ دونوں رائفلیں اور ان کے فاضل راؤنڈ اٹھا کر دوبارہ برآمدے میں نکلا اور سینے کے بل کھسکتا ہوا اوپر جانے والے زینے تک پہنچا۔ زینہ فائرنگ کی رینج سے محفوظ تھا۔ ارسلان تیزی سے

چھت پر پہنچا اور اوپر سے باہر کا جائزہ لیا۔ باہر اسے کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ وہ واپسی کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ایک ڈبل کیبن پک اپ پر پڑی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف اس انداز سے کھڑی تھی کہ اس کا رخ بنگلے کے گیٹ کی طرف تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس میں سے ایک آدمی نکلا۔ ارسلان اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ ارسلان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

اس نے کان لگا کر ان کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔

''تم اپنا مشن بھول گئے۔'' پہلا آدمی بولا۔ ''باس نے کہا تھا کہ پولیس والوں سمیت وہاں کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔''

''فائرنگ کی آواز دور دور تک گئی ہوگی۔ ابھی کچھ دیر میں یہاں پولیس کی گاڑیاں موجود ہوں گی۔''

''پولیس؟'' پہلا استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''پولیس ہمارا کیا بگاڑے گی۔ ہم تو یہاں سے گزر رہے تھے، فائرنگ کی آواز سن کر رک گئے۔'' اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

ارسلان سوچنے لگا کہ یہ کس کے آدمی ہوسکتے ہیں؟ ان کا باس یہاں موجود ہر شخص کو کیوں مارنا چاہتا ہے۔

دوسرا آدمی بھی گاڑی سے باہر آگیا اور بولا۔ ''یار مجھے سگریٹ تو دے۔ میرے سگریٹ ختم ہوگئے ہیں۔''

ارسلان کے لیے اتنی ہی تصدیق کافی تھی کہ یہ لوگ سب انسپکٹر محمود اور نازو کے قاتل تھے۔ اس نے پہلے تو رائفل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، پھر ریوالور نکال لیا۔ اس کے پاس انسپکٹر باجوہ کا سروس ریوالور تھا۔ اس کی رینج بھی عام ریوالورز کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اس نے پہلے گاڑی کے نزدیک کھڑے ہوئے شخص کا نشانہ لیا، پھر فوراً ہی پہلے اترنے والے شخص کی کھوپڑی اڑادی۔ فائر کے زوردار دھماکوں میں ان دونوں کی خوفناک چیخیں بھی شامل تھیں۔

ارسلان تیزی سے نیچے اترا اور بھاگ کر اس ڈبل کیبن پک اپ میں سوار ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی۔ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے ارسلان کا ذہن کام کررہا تھا۔ وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔

آب پارہ پہنچ کر ارسلان نے پک اپ وہیں پارکنگ میں چھوڑ دی اور خود ٹہلتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ٹیکسی اسٹیشن کی طرف جارہی تھی۔

☆☆☆

اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا دوسرے درجے کا ایک اقامتی ہوٹل گلیکسی تھا۔ یہ ہوٹل ظہیر کی ملکیت تھا۔ ظہیر کسی زمانے میں انڈرورلڈ کا آدمی تھا۔ ارسلان نے ایک مرتبہ اس کے دشمنوں سے اس کی جان بچائی تھی۔ یوں وہ ارسلان کا احسان مند تھا۔ پھر اس نے انڈرورلڈ چھوڑ کر شریفانہ زندگی اختیار کرلی لیکن اس کے دشمنوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ارسلان نے اس کی ہر جگہ مدد کی اس کے بعد تو وہ ارسلان کا مرید ہوگیا تھا۔

ارسلان کبھی کبھار اس کی طرف چلا جاتا تھا لیکن گزشتہ ایک سال سے وہ ظہیر سے نہیں مل سکا تھا۔ اب اسے اچانک ہی ظہیر کا خیال آیا تھا۔ اس کے پاس وہ سکون سے ایک دو دن گزار سکتا تھا۔

وہ ظہیر کے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی سے اتر گیا اور پیدل ہی اس طرف چل دیا۔ ہوٹل کی حالت دیکھ کر ارسلان کو خوشی ہوئی۔ گویا ظہیر خاصی کامیابی سے ہوٹل چلا رہا تھا۔ ہوٹل کے بیرونی دروازے پر ایک باوردی دربان بھی موجود تھا اور شیشے کا بڑا سا دروازہ بھی لگ گیا تھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو دربان نے جلدی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ ارسلان اندر داخل ہوا تو اسے ہوٹل کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ سامنے ہی ہوٹل کا بہت خوبصورت ریسپشن بنا ہوا تھا۔ اس پر اس سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔

ارسلان ریسپشن پر پہنچا تو لڑکی نے بہت مہذب انداز میں پوچھا۔ ''سر! میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

ارسلان کو یہ خدشہ تھا کہ لڑکی اسے پہچان نہ لے۔ میڈیا کے ذریعے اس کی خاصی تشہیر ہوچکی تھی اور اسے خوفناک اور سفاک دہشت گرد قرار دیا جاچکا تھا۔ اس نے مسکرا کر لڑکی سے کہا۔ ''اس وقت تم میری اتنی مدد کردو کہ مجھے ظہیر صاحب سے ملوادو۔''

لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی۔ ''سر! باس اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

''او کے بے بی!'' ارسلان نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں انتظار کرلوں گا۔''

''سر! آپ کا نام؟'' لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ان سے کہنا کہ پیر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ارسلان نے جواب دیا۔ ظہیر اسے پیر صاحب کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔

''پیر صاحب؟'' لڑکی نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، میرا یہی نام ہے۔'' ارسلان نے کہا اور

لاؤنج میں پڑے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

لڑکی نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی سے کوئی بات کی، بوکھلا کر ارسلان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''سر! باس آپ کو بلا رہے ہیں۔''

ارسلان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اب اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ باس کا آفس کس طرف ہے۔

اچانک سیڑھیوں پر اسے ظہیر دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ ارسلان کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ ''ارے سر! آپ کہاں ہیں۔'' وہ بولا۔ ''آج ہم غریبوں کی یاد کیسے آ گئی؟''

''کیا یہیں کھڑے کھڑے بات کرو گے؟'' ارسلان نے کہا۔

''اوہ، سوری!'' ظہیر جلدی سے بولا۔ ''آیئے میرے آفس میں چلیے۔''

ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی حیرت سے اس ماڈرن پیر کو دیکھ رہی تھی وہ کسی بھی زاویے سے پیر نہیں لگ رہا تھا لیکن اس کا باس اس کے آگے کسی مرید کی طرح بچھا جا رہا تھا۔

وہ ارسلان کو لے کر اپنے دفتر میں داخل ہوا تو ارسلان کو مزید خوشی ہوئی۔ ظہیر کا دفتر ہر طرح سے آراستہ تھا۔ کمرے میں بہترین فرنیچر تھا۔ جہازی سائز آفس ٹیبل تھی اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی آفس چیئر تھی۔

''ویری نائس!'' ارسلان نے اس کے آفس کا جائزہ لے کر کہا۔ ''تم نے تو ماشاء اللہ بہت ترقی کر لی ہے۔''

''سب اللہ کا ہی...... کرم ہے سر!'' ظہیر نے کہا۔

ارسلان میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے لگا تو ظہیر نے کہا۔ ''یہاں نہیں سر! آپ کی جگہ وہ ہے۔'' اس نے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر بہت اصرار کر کے ارسلان کو اس کرسی پر بٹھا دیا اور بولا۔ ''اب بتایئے سر کیا لیں گے، کھانا یا......''

''ابھی کچھ نہیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں تمہارے ہوٹل میں کچھ دن قیام کروں گا۔'' ارسلان نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں پیر صاحب!'' ظہیر منہ بنا کر بولا۔ ''آپ کے یہاں رہنے سے مجھے خوشی ہوگی۔''

''تم شاید ٹی وی نہیں دیکھتے، اخبار بھی نہیں پڑھتے۔'' ارسلان نے کہا۔

''میں ٹی وی بھی دیکھتا ہوں اور اخبار بھی پڑھتا ہوں۔ میں نے آپ کے خلاف ساری خبریں سنی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے خلاف سازش ہے، آپ کو پھنسایا جا رہا ہے۔''

''کیوں بھئی، تمہیں یقین کیوں ہے؟'' ارسلان مسکرایا۔

''میں آپ کی عادت اور مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ کو جب تک کسی کے مجرم ہونے کا ثبوت نہ مل جائے، اس وقت تک آپ اس پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ میری اپنی مثال آپ کے سامنے ہے۔ میرا تعلق انڈرورلڈ سے تھا، تب بھی آپ نے مجھے رعایت دی کہ آپ کے پاس میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔''

''اچھا باس! اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟'' ارسلان مسکرا کر بولا۔ ''اس مرتبہ تو میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ مجھ پر پے در پے کئی افراد کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ ان میں سے کچھ قتل تو واقعی میں نے کیے ہیں لیکن سلویا، نازو اور ریلوے کلرک کا قتل زبردستی مجھ پر ٹھونس دیا گیا ہے۔''

''آپ جتنے روز چاہیں یہاں آرام کریں۔ یہاں کوئی آپ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ میں نے انڈرورلڈ چھوڑ دی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔''

''اچھا مرے ہوئے ہاتھی!'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''اس وقت تو میں واقعی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔''

''نو پرابلم پیر صاحب!'' ظہیر نے کہا اور انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی سے کہا۔ ''وحید کو میرے کمرے میں بھیجو۔''

فوراً ہی ہوٹل کا ایک ویٹر دستک دے کر اندر آ گیا۔ اس نے حیرت سے ارسلان کو دیکھا جو ظہیر کی کرسی پر بیٹھا تھا، پھر ظہیر سے بولا۔ ''یس سر!''

''وحید! یہ میرے پیر صاحب ہیں۔'' ظہیر نے کہا۔ ''ان کے لیے روم نمبر دو سو پانچ کی سیٹنگ کرا دو۔''

''اوکے سر!'' وحید نے بہت مؤدب انداز میں کہا۔

ارسلان کھڑا ہو گیا۔ ظہیر نے کہا۔ ''آپ چلیں سر! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

وہ کمرا واقعی بہترین تھا۔ آرام دہ بیڈ، کمرے میں دبیز اور قیمتی پردے، ایک طرف بہت قیمتی صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی بیڈروم فریج بھی تھا۔ کمرے میں ہیٹر کی خوش گوار حرارت پھیلی ہوئی تھی۔

ارسلان سیدھا باتھ روم میں گیا گرم پانی سے نہا کر اس کے جسم میں گویا نئی زندگی دوڑ گئی وہ گاؤن لپیٹ کر باہر

نکل آیا پھر اسے چودھری صاحب کا خیال آیا۔ اس نے سوچا انہیں اپنی خیریت سے مطلع کر دوں۔ وہ میری طرف سے پریشان ہوں گے۔ اس کا سیل فون پینٹ کی جیب میں تھا وہ دوبارہ باتھ روم میں گیا تاکہ پینٹ اور شرٹ کی جیبوں سے اپنی ضروری چیزیں نکال سکے۔ اس کا پرس اور گھر کی چابیاں اور دیگر تمام چیزیں موجود تھیں لیکن سیل فون موجود نہیں تھا۔ وہ شاید بھاگ دوڑ میں کہیں گر گیا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کی سم اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھی اور اس میں اہم لوگوں کے نمبر فرضی ناموں سے محفوظ کیے گئے تھے۔ چودھری صاحب کا نمبر بھی چاچو کے نام سے سیو تھا۔ اسے چودھری صاحب کا سیل نمبر اور لینڈ لائن نمبر زبانی یاد تھا۔ نہ صرف ان کے نمبرز بلکہ تمام ضروری سیل نمبرز ارسلان کے ذہنی کمپیوٹر میں محفوظ تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو ارسلان نے جھپٹ کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل دراز سے اپنا ریوالور نکالا اور اسے گاؤن میں چھپا کر بولا۔ ''ہواز دیئر!''

دروازہ کھول کر ظہیر اندر داخل ہوا اور مسکرا کر بولا۔ ''اب اپنا ریوالور رکھ دیجیے۔''

ارسلان نے مسکرا کر ریوالور دوبارہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ ظہیر کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے شاپرز تھے۔ اس میں دو شلوار سوٹ، دو جینز، شرٹس اور قیمتی لیدر جیکٹ تھی۔

''یار، تم نے تو چراغ کے جن کی طرح کام کیا ہے۔'' ارسلان مسکرا کر بولا۔

''مارکیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' ظہیر مسکرایا۔ ''پہلے آپ کپڑے بدل لیں پھر میں آپ کے لیے کھانا منگواتا ہوں۔''

ارسلان نے شاپر سے شلوار سوٹ نکال کر پہن لیا۔

☆☆☆

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ظہیر نے کہا۔ ''اب آپ آرام کریں، میں چلتا ہوں۔''

''تم جانتے ہو کہ مجھے ایسی تھکن کبھی نہیں ہوئی جس کے لیے مجھے آرام کا اہتمام کرنا پڑے۔ میں اب بالکل فریش ہوں۔ تم بیٹھو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

ظہیر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''باتیں تو مجھے بھی کرنی ہیں۔''

''یہ جو دھماکے ہوئے ہیں تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔ ظہیر انڈر ورلڈ کا آدمی تھا۔ وہ اس بارے میں کوئی ایسی بات بتا سکتا تھا جو ارسلان کے لیے کارآمد ہو۔

''مجھے یہ تو یقین ہے کہ یہ دھماکے کسی بہت ہلاکت خیز آتش گیر مادے سے ہوئے ہیں۔''

اچانک ارسلان کو کئی دن پہلے کی چھپی ہوئی ایک خبر یاد آئی۔ کول پور کے آؤٹر سگنل پر مال گاڑی کو کسی نے رکوایا تھا لیکن اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ مال گاڑی کو کیوں رکوایا گیا تھا؟ اگر یہ وہی مال گاڑی تھی جس میں دھماکے ہوئے تھے تو اس کا سبب بھی سمجھ میں آتا تھا۔ ارسلان نے ظہیر کو اس خبر کے بارے میں بتایا تو وہ بھی چونک اٹھا۔

''تم کسی طرح یہ معلوم کر سکتے ہو کہ وہ کون سی مال گاڑی تھی جو حادثے میں دھماکے سے اڑ گئی؟'' ارسلان نے ظہیر سے کہا۔

''بالکل معلوم کر سکتا ہوں۔'' ظہیر نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''میں ایک زمانے میں.... اسمگلنگ کرتا تھا۔ اس زمانے میں اکثر میرا واسطہ لاہور، کراچی اور پنڈی کے گڈز آفس سے رہتا تھا۔ ریلوے کے گڈز آفس میں اب بھی میرے تعلقات ہیں، پر سب سے بڑا تعلق تو پیسا ہے۔ میں دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کو بتا دوں گا کہ تباہ ہونے والی مال گاڑی کون سی تھی؟''

''ہاں، اگر تمہارے تعلقات ہیں تو یہ کام بہت آسان ہے۔ حادثے میں مال گاڑی تباہ ہوئی ہے۔ اس کا ریکارڈ تو کوئٹہ، کول پور اور سبی کے اسٹیشنوں پر موجود ہوگا۔''

''اب تو سب کچھ کمپیوٹرائزڈ ہو گیا ہے۔'' ظہیر نے کہا۔ ''ریکارڈ حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔''

''ہاں، مجھے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے بھی کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔'' ارسلان نے کہا۔

''آپ مجھے بتا دیں، میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔''

''تمہارے ویٹرز اور استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھے دیکھا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''ان کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ لڑکی نے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں ہوگا۔ وحید نے البتہ پہچان لیا ہوگا لیکن وہ مر کے بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔'' پھر ظہیر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ چاہیں تو کچھ دیر سو لیں۔ میں رات تک آپ کو مال گاڑی کے بارے میں بتا دوں گا۔''

''یار! میرا سیل فون کہیں گر گیا ہے۔ مجھے ایک سیل فون کی بھی ضرورت ہے اور سم کی بھی۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ایسی سم کا بندوبست ہو سکتا ہے جو رجسٹرڈ نہ ہو؟''

''بالکل ہو سکتا ہے۔'' ظہیر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وحید اس کے لیے ایک پیکٹ لے آیا۔ اس میں ایک سیل فون تھا جس میں سم موجود تھی۔ ارسلان نے سب سے پہلے چودھری صاحب کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''السلام علیکم یور آنر!''

''ارسلان؟'' چودھری صاحب جلدی سے بولے۔ ''تم کہاں ہو، خیریت سے تو ہو؟ اور تم نے سیل فون آف کیوں کر رکھا ہے؟''

''میرا سیل فون بھاگ دوڑ میں کہیں گر گیا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اس لیے میں آپ کو اس نئے نمبر سے کال کر رہا ہوں۔''

''تم ہو کہاں؟'' چودھری صاحب نے پوچھا۔ ''میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند تھا۔''

''میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

''یہ نمبر تو لاہور کا ہے۔'' چودھری صاحب بولے۔ ''کیا تم لاہور میں ہو؟''

''آپ جانتے تو ہیں یور آنر کہ میں کس وقت کہاں ہوتا ہوں۔ بس میں ان لوگوں کی تلاش میں ہوں جو اس ٹرین دھماکے کے ذمے دار ہیں۔''

''کیا تمہیں کوئی سراغ ملا ہے؟'' چودھری صاحب نے کہا۔ ''تم فوراً مجھ سے ملو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں، وہ باتیں میں فون پر نہیں کر سکتا۔''

''آپ جانتے ہیں کہ راولپنڈی اور اسلام آباد کی پولیس کتوں کی طرح میری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''ہاں، اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں آگ کا دریا عبور کرنے کے بعد بھی آپ سے مل سکتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ اتنی ایمرجنسی نہیں ہے۔'' چودھری صاحب نے کہا۔ ''بس تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ ملک کے حالات بہت خراب ہیں بیٹے...... یہ سیاست دان شاید اس ملک کو ڈبونے کا تہیہ کر چکے ہیں لیکن کم سے کم میری زندگی میں تو یہ نہیں ہوگا۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر چودھری صاحب نے لائن کاٹ دی۔

ارسلان نے ٹی وی آن کر لیا۔ ایک چینل پر کوئی ٹاک شو آرہا تھا۔ وہ پروگرام نشر مکرر تھا۔ اس میں موجودہ حکومت اور اپوزیشن لیڈرز آپس میں مرغوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ ارسلان چینل تبدیل کرنے ہی والا تھا کہ اپوزیشن کے ایک لیڈر کی بات سن کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''آپ کون سی گڈ گورننس کی بات کرتے ہیں؟ وہ خطرناک دہشت گرد ارسلان تو ابھی تک آزاد گھوم رہا ہے۔ آپ نے اس کی گرفتاری کے لیے کیا کیا ہے؟''

''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جلد ہی وہ دہشت گرد سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔'' حکومت کی ایک اہم شخصیت نے کہا۔

''آپ لوگ ایک آدمی کو نہیں پکڑ سکتے۔ کیا اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟''

''وہ بہت چالاک ہے، بھیس بدلنے کا ماہر ہے لیکن ملک سے باہر نہیں جا سکتا۔ ہمیں یہ بھی اطلاعات ملی ہیں کہ اس کا تعلق را سے ہے۔'' حکومتی نمائندے نے کہا۔

''آپ تو ہر آدمی کا تعلق را سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس نے سیاچن میں دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ کیا ''را'' ایسے آدمی کو قبول کر سکتی ہے اور کیا خود ارسلان را سے مل سکتا ہے؟'' اپوزیشن کے نمائندے نے تلخ انداز میں کہا۔

''آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ارسلان محب وطن ہے؟ آپ ایک سفاک قاتل اور دہشت گرد کو محبِ وطن ثابت کر رہے ہیں؟'' حکومتی نمائندہ جوش کے عالم میں بولا۔

اپوزیشن نمائندے نے کہا۔ ''ارسلان کو تو چھوڑیں آپ کو تو اب تک اس ٹرین دھماکے کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ یہ دھماکا کیسے ہوا۔ اس کے پیچھے کون لوگ ہیں؟''

''یہ باتیں ٹی وی پر بیٹھ کر نہیں کی جا سکتیں۔'' سرکاری نمائندے نے منہ بنا کر کہا۔

ارسلان نے چینل بدل دیا۔ اس وقت ٹی وی سے نیوز بلیٹن نشر نہیں ہو رہا تھا۔ ارسلان نے جھنجلا کر ٹی وی ہی آف کر دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ارسلان کی آنکھ کھلی تو وال کلاک میں آٹھ بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گویا وہ تین گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ اس نے انٹرکام پر روم سروس کو کال کر کے کافی منگوائی اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔

سردی کی شدت میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ فریش ہو کر باتھ روم سے نکلا تو دروازے پر دستک دے کر وحید کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی اور کچھ لائٹ ریفریشمنٹ کی اشیا تھیں۔ وحید کے پیچھے ظہیر بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کافی نکال کر ارسلان کو دی اور ایک کپ خود لے کر بیٹھ گیا، پھر وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ''آپ کا اندازہ درست تھا پیر صاحب! وہ مال گاڑی وہی تھی جسے کول پور کے آؤٹر سگنل پر

روکا گیا تھا۔" پھر اس نے ارسلان کو مال گاڑی رکنے اور اس کی تلاشی کی تمام تفصیل بتادی۔

"کول پور!" ارسلان پرخیال انداز میں بولا۔ "وہ چھوٹا سا ایک علاقہ ہے۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ کوئٹہ جانے والی ٹرین میں وہاں سے دوسرا انجن لگتا ہے کیونکہ چڑھائی بہت زیادہ ہے اور ایک انجن گاڑی کو گھسیٹ نہیں سکتا۔ واپسی میں بھی ٹرین دو انجنوں کے ذریعے کول پور تک آتی ہے، پھر وہاں سے دوسرا انجن نکال لیا جاتا ہے۔"

"ان لوگوں نے کول پور ہی کا انتخاب کیوں کیا؟" ظہیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" ارسلان نے پرخیال انداز میں کہا۔ "کول پور کا آؤٹر سگنل اور پھر بی کا اسٹیشن!" ارسلان خود کلامی کے انداز میں بولا، پھر چونک کر بولا۔ "مجھے جمال یاد آرہا ہے۔ اس کا تعلق بھی کول پور سے ہے۔"

"جمال!" ظہیر زیرلب بولا۔ "وہ جمال جو آتش گیر مادے اور بم بنانے کا ماہر ہے؟" ظہیر پرجوش لہجے میں بولا۔

"ماہر تھا۔" ارسلان نے کہا۔ "اب وہ بم بنانے کے قابل نہیں رہا۔ ایک مہلک بم بناتے ہوئے اس کی غلطی سے بم اس کے ہاتھ میں پھٹ گیا۔ اس حادثے میں اس کا دایاں ہاتھ اور ایک آنکھ ضائع ہوگئی۔ حادثے میں اس کی ایک ٹانگ بھی متاثر ہوئی تھی۔ اب وہ بم بنانے کے قابل نہیں ہے۔" پھر ارسلان کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن وہ بم بنوا تو سکتا ہے۔ اس کی ہدایات اور نگرانی میں کوئی بھی آدمی اسی مہارت سے بم بنا سکتا ہے۔ مجھے جمال سے ملنا پڑے گا۔"

"وہ آپ کو اتنی آسانی سے تو نہیں ملے گا۔" ظہیر نے کہا۔

"آسانی سے تو کچھ بھی نہیں ملتا یار۔" ارسلان نے کہا۔ "اور پھر ابھی تو معلوم کرنا پڑے گا کہ جمال آج کل کہاں ہے؟"

"یہ تو ابھی معلوم ہوجائے گا۔" ظہیر مسکرا کر بولا۔ "اتنے تعلقات تو میرے بھی ہیں۔"

"تو پھر معلوم کرلو۔" ارسلان نے کہا۔

"ہاں، یہ آپ کی چیزیں۔" ظہیر نے ایک شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

اس شاپر میں حلیہ بدلنے کے لیے مطلوبہ اشیا موجود تھیں۔ ظہیر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ ارسلان ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ اس وقت مختلف چینلز سے نیوز بلیٹن نشر ہو رہے تھے۔ اس میں کوئی خاص خبر نہیں تھی۔ چند منٹ بعد ظہیر واپس آیا اور دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ "جمال کا پتا مل گیا ہے۔ وہ اس وقت کراچی میں موجود ہے۔"

"کراچی میں......" ارسلان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے کراچی جانا پڑے گا۔"

"آپ کہیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں؟" ظہیر نے پوچھا۔

"نہیں یار۔" ارسلان نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں تنہا کام کرنے کا عادی ہوں۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ میں پسند نہیں کرتا ہوں۔"

☆☆☆

ہوٹل میں ایک غیرملکی داخل ہوا۔ اس کے بال براؤن اور آنکھیں نیلی تھیں۔ نفیس فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی اور وہ کچھ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہ سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا اور رواں انگلش میں بولا۔ "مجھے مسٹر ظہیر سے ملنا ہے۔"

"آپ کا نام سر!"

"ہیرالڈ۔" غیرملکی نے جواب دیا۔

استقبالیہ کلرک نے انٹرکام پر ظہیر کو بتایا کہ کوئی مسٹر ہیرالڈ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

"باس آرہے ہیں۔" کلرک مسکرا کر بولا۔ "آپ پلیز تشریف رکھیں۔"

تھوڑی دیر بعد ظہیر الجھن آمیز انداز میں نیچے آیا تو غیرملکی کھڑا ہوگیا۔ "مسٹر ظہیر! میں ہیرالڈ ہوں، ہیرالڈ فرام نیوجرسی!"

"میں آپ کو پہچانا نہیں۔" ظہیر نے الجھ کر کہا اور سوچا۔ "شاید اس کا تعلق انڈرورلڈ سے ہے۔ کسی نے اسے میرا حوالہ دیا ہوگا۔"

"آپ مجھے پہچان بھی نہیں سکتے۔" ہیرالڈ نے کہا۔ "میرے پاس آپ کے لیے کچھ معلومات ہیں۔"

"میرے لیے؟" ظہیر چونکا۔

"یس مسٹر ظہیر!" ہیرالڈ نے کہا۔ "میں آپ کا بہی خواہ ہوں۔ آپ ارسلان کو فوراً یہاں سے نکال دیں، اس کی وجہ سے آپ بھی خطرے میں ہیں۔"

ظہیر نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اوکے، آپ میرے ساتھ آئیں۔"

ہیرالڈ ہلکا سا لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے دفتر میں پہنچ کر ظہیر نے اچانک ریوالور نکال کر ہیرالڈ کی کنپٹی پر رکھ دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"ارے ارے...... کیا کر رہے ہو۔ یہ چل جائے گا۔" ظہیر بری طرح اچھل پڑا، وہ آواز ارسلان کی تھی

اور وہ اردو میں بولا تھا۔ ''سر...... آپ......''

''کیسی رہی؟'' ارسلان ہنس کر بولا۔ ''کیسا میک اپ ہے؟''

''زبردست سر!'' ظہیر ہنس کر بولا۔ ''میں دعوے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو کوئی بھی نہیں پہچان سکتا۔''

''اب جلدی سے میرے لیے کراچی جانے والی فلائٹ میں سیٹ بک کراؤ۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں آج ہی جانا چاہتا ہوں۔''

''اب آپ کو دوسرے کمرے میں قیام کرنا پڑے گا۔'' ظہیر نے کہا۔

''کمرے کی کیا ضرورت ہے؟'' ارسلان نے کہا۔ ''میں تمہارے آفس میں وقت گزار لوں گا۔''

☆☆☆

ارسلان کراچی پہنچا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ اس نے صدر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا لیا اور کچھ دیر بعد باہر نکل گیا۔ اس کے پاس جمال خان کا پتا تھا۔ وہ سہراب گوٹھ کے علاقے میں ٹھہرا ہوا تھا۔

ارسلان ٹیکسی پکڑ کر سہراب گوٹھ پہنچا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے غیر ملکی سمجھ کر اس سے سہراب گوٹھ تک ایک ہزار روپے لے لیے۔ ارسلان نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

وہاں پہنچ کر وہ پیدل ہی الآصف اسکوائر کی طرف چل دیا۔ اس نے محسوس کرلیا کہ ایک افغانی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ کچھ دور چل کر وہ شخص اس کے نزدیک آگیا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''مسٹر یو وانٹ...... پاؤڈر؟''

ارسلان جانتا تھا کہ پاؤڈر سے اس کی مراد ہیروئن ہے۔

''نو...... آئی وانٹ...... ماؤزر...... ٹی ٹی......''

''او کے...... کم آن۔'' افغانی جلدی سے بولا۔

پھر وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ ارسلان اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں پر لوگ غیر ملکیوں کو لوٹ بھی لیتے تھے۔ ارسلان تو اس وقت بالکل تنہا تھا۔ اس کے پاس تو وہ خنجر بھی نہیں تھا جو وہ اپنی آستین میں چھپا کر رکھتا تھا۔

افغان باشندہ اسے چھوٹے سے ایک کیبن پر لے گیا اور کہا کہ اسے اسلحہ چاہیے۔

دکان دار نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ کیبن ایک گھر کے آگے بنا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک تھیلا تھا۔

''او کے!'' ارسلان نے کہا اور جیب سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''ایکسٹرا میگزین۔''

''یس!'' اس نے دو میگزین اور گولیوں کا ڈبا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''فورٹی تھاؤزنڈ۔''

ارسلان نے اسے.... چالیس ہزار دیے اور گولیاں اور میگزین بھی اٹھا لیے۔

کراچی کا موسم اتنا سرد نہیں تھا۔ اس کے باوجود ارسلان نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے جیکٹ اتار کر ہولسٹر لگایا اور اس میں پسٹل رکھ کر دوبارہ جیکٹ پہن لی۔ پھر اس نے افغان باشندے سے پوچھا۔ ''یہاں کوئی ایسا شخص ہے جو انگلش جانتا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس شخص سے مخاطب ہوا جو ارسلان کو وہاں لایا تھا۔ ''اسے غازی خان سے ملوادو۔''

اس نے اسے اشارہ کیا اور دونوں ایک مرتبہ پھر..... چلتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔

تھوڑی دیر بعد ارسلان غازی خان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے غازی خان سے پوچھا۔ ''مجھے جمال خان سے ملنا ہے۔ کیا تم اس سے ملوا سکتے ہو؟''

غازی خان نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ ''تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' غازی خان نے پوچھا۔

''میں اسے نہیں جانتا، میرا باس اسے جانتا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔''

''جمال خان یہاں نہیں ہے۔'' غازی خان نے کہا۔ ''......وہ یہاں سے چلا گیا۔''

''کہاں؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔''

ارسلان مایوس ہو کر واپس آگیا۔ اس کی ساری بھاگ دوڑ ضائع ہوگئی۔ اس نے سوچا، ظہیر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ جمال خان آسانی سے نہیں ملے گا۔

ارسلان سوچ رہا تھا کہ میں نے یہاں غیر ملکی کے بھیس میں آکر غلطی کی ہے۔ مجھے یہاں کسی افغان کے حلیے میں آنا چاہیے تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ غیر ملکی سمجھ کر لوگ اسے جمال خان تک پہنچا دیں گے۔

وہ الآصف اسکوائر سے پیدل ہی سہراب گوٹھ کی طرف چل دیا۔ اچانک اس کی نظر ایک گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھا۔ وہ جمشید تھا۔ اسلحے کا اسمگلر اور انسانوں کا تاجر...... وہ پیسے لے کر لوگوں کو دبئی، مسقط اور بحرین اسمگل کرتا تھا۔ اس

کوشش میں بیشتر لوگ مارے جاتے تھے، جو بچ جاتے تھے انہیں خلیجی ممالک کی پولیس گرفتار کر لیتی تھی۔ وہ کافی عرصے سے ارسلان کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ ارسلان نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ گاڑی تیز رفتاری سے ارسلان کی مخالف سمت میں جارہی تھی۔

ارسلان جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا، گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ بائیں طرف کچے راستے میں اتر گئی تو ارسلان ایک مرتبہ پھر چونکا۔ وہ گاڑی الآصف اسکوائر کی طرف جارہی تھی۔ پھر اس نے سوچا، جمشید اسلحے کا اسمگلر ہے۔ اس کا تعلق ان لوگوں سے تو رہتا ہی ہوگا۔ اس سے بعد میں نمٹوں گا۔ اس وقت تو مجھے جمال خان کا پتا لگانا ہے۔ اس نے سوچا تھوڑی دور جاکر اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ دوبارہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جمال خان تک کیسے پہنچے۔ کراچی میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا تھا اور ہمیشہ تنہا کام کرتا تھا۔ ظہیر جیسے کچھ لوگ اس کے احسان مند ضرور تھے لیکن کراچی میں ایسا... کوئی نہیں تھا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ نہایا، کپڑے بدلے اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ اب اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ غیر مسلح نہیں تھا۔ وہ یوں ہی صدر کے علاقے میں گھومتا رہا۔ جب وہ کسی موقع پر الجھ جاتا تھا تو یوں ہی بلا مقصد گھومتا رہتا تھا۔ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا یا سلویا کو بلا لیتا۔ سلویا یاد آئی تو اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ شاید وہ بھی سلویا کا عادی ہوگیا تھا۔

آدھے گھنٹے تک سڑکیں ناپنے کے بعد اس نے سوچا، ڈپریس ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے وقت ملا ہے تو اسے تفریح میں گزارنا چاہیے۔ کراچی کے کچھ علاقوں میں امن و امان کی صورت حال بہت خراب تھی۔ شہر میں بھی وہ رونق نہیں تھی لیکن وہاں کے فائیو اسٹار ہوٹلز اور بڑے بڑے ریسٹورنٹس اب بھی زندگی سے بھرپور تھے۔

اس نے ٹیکسی پکڑی اور شیرٹن کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے منیجر یاسین بیگ کے بارے میں معلوم کیا۔ کاؤنٹر کلرک نے اسے بتایا کہ مسٹر یاسین یہاں سے جاب چھوڑ کر جاچکے ہیں۔

وہ کاؤنٹر سے ہٹ گیا، اچانک اسے پھر اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ اس وقت بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔ یاسین اسے ارسلان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ وہاں سے ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گیا اور ویٹر کو بلیک کافی کا آرڈر دے کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اس کی پشت سے کوئی بلند آواز میں بولا۔ ”ہیلو ظفر! تم یہاں بیٹھے ہو۔ میں تمہیں روم میں تلاش کر رہا تھا۔ تم روم نمبر 512 میں ہی ٹھہرے ہو نا؟“

”ہاں لیکن تمہیں تو میں نے نو بجے کا ٹائم دیا تھا۔“ ظفر نے کہا۔

”میں کچھ پہلے آگیا۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”ہاں، پیمنٹ تو کررہے ہو نا آج؟“

”سوری یار!“ ظفر کی آواز آئی۔ ”ابھی تک بندوبست نہیں ہوسکا۔“

”کیا مطلب ہے یار! تم نے ایک ہفتے کے وعدے پر مجھ سے پیسے لیے تھے۔ اب تو دوسرا ہفتہ بھی گزر چکا ہے۔“

”ہاں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔“ ظفر نے کہا۔ ”کیا اس سے پہلے میں نے تمہیں رقم کی ادائیگی نہیں کی ہے؟“

”اسی لیے تو میں نے تمہیں پیسے دے بھی دیے تھے۔ رقم بھی اتنی بڑی نہیں ہے، صرف دس لاکھ ہی تو ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو، دس لاکھ میرے لیے کوئی بڑی رقم نہیں ہے لیکن اس وقت بہت بڑی ہے۔ پارٹی نے پیمنٹ روک دی ہے۔“

”یار! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں... میں نے پیسے پارٹی کو نہیں، تمہیں دیے تھے۔“

”یار! میری مجبوری کو سمجھو۔“ ظفر نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ پارٹی جب تک تمہیں پیمنٹ نہیں کرے گی، تم مجھے پیسے نہیں دوگے۔“ دوسرا آدمی جھنجلا کر بولا۔

”آہستہ بولو۔“ ظفر نے خشک لہجے میں کہا۔ ”یہ کوئی ملیاری کا ہوٹل نہیں ہے۔“

”پارٹی پیمنٹ کیوں نہیں کررہی ہے؟“ دوسرے آدمی کے لہجے میں اب بھی جھنجلاہٹ تھی لیکن آواز بلند نہیں تھی۔

”تم نے پنڈی کے دھماکے کے بارے میں سنا ہے؟“ ظفر نے آہستہ سے کہا۔ ارسلان بری طرح چونک گیا۔ اگر وہ ان کے بالکل نزدیک نہ بیٹھا ہوتا تو ان کی باتیں سن بھی نہیں سکتا تھا۔

”ہاں، وہ جو مال گاڑی میں دھماکا ہوا ہے؟“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔

”ہاں، وہی۔“ ظفر نے کہا۔ ”اس ٹرین میں ہمارا مال بھی تھا۔ وہ بھی تباہ ہوگیا۔ پارٹی کو ڈلیوری دے چکے تھے لیکن مال تباہ ہونے کے بعد پارٹی نے پیسے دینے سے انکار کردیا۔“

ارسلان کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ظفر کا تعلق ضرور اس بم دھماکے سے تھا۔

''یار! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔'' دوسرا آدمی الجھ کر بولا۔''جب تم ڈلیوری دے چکے تھے تو پھر......''

''بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں تمہاری رقم دو تین دن میں ادا کر دوں گا۔''

''کل تم لاہور چلے جاؤ گے، پھر......''

''میں نے کہا نا، میں تمہاری رقم تین دن بعد ادا کر دوں گا۔''

''او کے۔'' دوسرے آدمی نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔''تین دن بعد ہی سہی۔''

''کچھ کھاؤ گے؟'' ظفر نے پوچھا۔

''نہیں یار! میں نے ایک کلائنٹ کو ٹائم دے رکھا ہے۔ مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ میں تین دن بعد تمہیں کال کروں گا۔''

''تمہیں فون کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' ظفر نے خشک لہجے میں کہا۔

پھر وہ آدمی شاید اٹھ گیا تھا۔ ارسلان نے ویٹر کو بلا کر کافی کا بل ادا کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کی پشت والی ٹیبل پر وہ آدمی بیٹھا تھا جسے دوسرے آدمی نے ظفر کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ ارسلان نے اس پر سرسری سی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ وہ درمیانے قد اور ٹھوس جسم کا مالک تھا۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ لباس سے وہ شخص خاصا خوش حال لگ رہا تھا۔

ارسلان وہاں سے اٹھ کر لاؤنج میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے ظفر کے کمرے کا نمبر تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔ ارسلان وہاں سے شیرٹن کے دوسرے ریسٹورنٹ میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر وقت گزارتا رہا۔ اس نے وہیں ڈنر بھی کر لیا، پھر کافی پینے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ظفر اب تک اپنے کمرے میں پہنچ چکا ہوگا۔ وہ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچا اور کوریڈور میں کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ کمرا نمبر پانچ سو بارہ دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

''یس!'' اندر سے ظفر کی آواز آئی۔ ارسلان نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ظفر نے چونک کر اسے دیکھا اور پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ ارسلان اس سے پہلے ہی پسٹل نکال چکا تھا۔

وہ سرد لہجے میں بولا۔''ڈونٹ ٹرائی ٹو موو!''

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' ظفر نے رواں انگریزی میں پوچھا۔

ارسلان نے ہاتھ پشت کی طرف لے جا کر دروازہ بولٹ کیا پھر اردو میں بولا۔''تم سے کچھ باتیں پوچھنا ہیں۔''

اس کی زبان سے اردو سن کر ظفر اچھل پڑا۔''کون ہو تم؟''

''گھبراؤ مت۔'' ارسلان نے کہا۔''ہم دوستانہ ماحول میں بات کریں گے۔ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب سچ سچ دے دیا تو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ دوسری صورت میں......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیسے سوال؟'' ظفر نے پوچھا۔''اور تم ہو کون؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ ہم دوستانہ ماحول میں بات کریں گے۔'' ارسلان نے کہا۔''مجھے مجبور مت کرو کہ میں سختی پر اتر آؤں۔''

''پھر پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔ اسے شبہ تھا کہ ظفر اس کا اصل نام نہیں ہے۔

''میرا......نام......ظفر ہے۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''دیکھو، جھوٹ بول کر تم مجھے غصہ دلا رہے ہو۔'' ارسلان نے کہا۔''میں نے تمہارا اصل نام پوچھا ہے۔''

اس نے طویل سانس لی اور بولا۔''میرا نام موسیٰ ہے۔''

ارسلان چونک پڑا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے یہ نام کہیں سنا ضرور ہے۔

''تم نے مال کی ڈلیوری کسے دی تھی؟'' ارسلان نے اچانک پوچھا۔

''کون سے مال کی ڈلیوری؟'' موسیٰ یا ظفر نے کہا۔

''اس مال کی ڈلیوری جس کی وجہ سے مال گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک مسافر ٹرین بھی اڑ گئی۔ سیکڑوں آدمی اس حادثے میں مارے گئے ہیں۔'' ارسلان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میں نے ایسے کسی مال کی ڈلیوری نہیں دی۔'' موسیٰ نے ڈھٹائی سے کہا۔

ارسلان نے اچانک اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ موسیٰ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ارسلان نے آگے بڑھ کر اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور پسٹل کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں گھسا دی اور سفاک لہجے میں بولا۔''میں نے کہا تھا نا کہ مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ بتاؤ تم نے مال کی ڈلیوری کسے دی تھی؟''

موسیٰ نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس کے منہ میں پسٹل کی

نال گھسی ہوئی تھی اس لیے وہ صرف غوں غوں کر کے رہ گیا۔

ارسلان نے پسٹل کی نال اس کے منہ سے نکال لی۔

''تم کس مال کی بات کر رہے ہو اور تم...... ہو کون؟''
موسیٰ ابھی تک ڈھٹائی دکھا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ارسلان اس بھرے ہوئے ہوٹل میں فائر کرے گا تو خود بھی نہ بچ سکے گا۔

''تم جاننا چاہتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' ارسلان نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں ارسلان ہوں...... تمہاری موت!''

''ار...... سلان......'' موسیٰ ہکلا کر بولا۔ ''تم...... ارسلان...... ہو؟''

''ہاں، میں ارسلان ہوں۔'' ارسلان نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نام بتاؤ یا نہ بتاؤ۔ میں ہر صورت میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ سچ بولے تو تمہارے ساتھ رعایت کر سکتا ہوں۔''

موسیٰ خوف کے مارے کانپنے لگا۔ شاید اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔

''اگر میں نام بتا دوں تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟'' موسیٰ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''ہاں، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے سچ بولا تو میں تم پر گولی نہیں چلاؤں گا۔'' پھر وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ''اب بتاؤ، تم نے مال کی ڈلیوری کسے اور کہاں دی تھی؟''

موسیٰ چند لمحے تک ہانپتا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس شخص کا نام میں نے تمہیں بتایا ہے ورنہ تم نے چھوڑ بھی دیا تو وہ لوگ مجھے مار دیں گے۔''

''جیتے جی یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔'' ارسلان نے کہا۔

موسیٰ نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ''مال کی ڈلیوری میں نے بس میں کامریڈ کو دی تھی۔''

کامریڈ کے نام پر ارسلان بری طرح چونکا لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا اور بولا۔ ''کامریڈ کون؟''

''تم ارسلان نہیں ہو سکتے۔'' موسیٰ نے کہا۔ ''ارسلان کو کامریڈ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، یہ تو ناممکن ہے؟''

''مجھے معلوم ہے، میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''کامریڈ بہت بڑا اسمگلر ہے، اس کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہیں اس لیے وہ ابھی تک قانون سے بچا ہوا ہے۔ وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔''

''تم یہ آتش گیر مواد کہاں سے لاتے ہو؟''

''میں اکیلا یہ کام نہیں کرتا ہوں۔'' موسیٰ نے کہا۔ ''میرا کام صرف مال کی ڈلیوری دینا ہے اور ریکوری کرنا ہے۔''

''کامریڈ کے دوسرے ساتھیوں کے نام بتاؤ۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں اس کے کسی ساتھی کو نہیں جانتا۔ ہاں، ڈلیوری کے وقت اس کے تین چار لوگ موجود ہوتے ہیں۔''

''کامریڈ کس کے لیے کام کرتا ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ وہ آج تک کبھی میرے سامنے نہیں آیا، کبھی ٹیلی فون پر بھی بات نہیں ہوئی۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ حکومت کا کوئی بہت بڑا عہدے دار ہے۔''

ارسلان سوچنے لگا کہ حکومت کا وہ کون سا عہدے دار ہو سکتا ہے؟ وہ کچھ دیر کے لیے موسیٰ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر موسیٰ نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر لات ماری اور اچھل کر اسے دبوچ لیا۔

ارسلان اس حملے کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا اس لیے مار کھا گیا۔ موسیٰ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گر گیا۔ موسیٰ نے پلک جھپکتے میں اپنی جیب سے مشین پسٹل نکال لیا اور بولا۔ ''تم خود کو بہت بڑا دہشت گرد سمجھتے ہو، لوگ تمہارے نام سے کانپتے ہیں۔ آج تمہارا کھیل ختم ہو جائے گا!'' ظفر وحشیانہ انداز میں ہنسا۔ ''اب تم بتاؤ، تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''تمہاری طرح جھوٹ بولوں یا سچ بتاؤں؟'' ارسلان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں جھوٹ ہی تو نہیں بول سکا۔'' موسیٰ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے نام کی دہشت ہی اتنی ہے۔''

''اچھا، تو تم مانتے ہو کہ میرے نام کی دہشت ہے؟''

''گن تو کسی بچے کے ہاتھ میں بھی ہو، اس کی بھی دہشت ہوتی ہے۔'' موسیٰ نے ناگواری سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' ارسلان نے گرتے ہی وہاں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے پیروں کے نزدیک ایک تپائی رکھی تھی جس پر پانی کا جگ گلاس اور شراب کی ایک بوتل رکھی تھی لیکن موسیٰ کو وہ بوتل کھولنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''میں اپنے لیے کام کرتا ہوں۔'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔

''میں تمہیں زندہ تو کسی بھی صورت میں نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے تم نام بتاؤ یا نہ بتاؤ۔'' اس نے ارسلان کا جملہ اسی

پرالٹ دیا۔

''تو پھر مجھے ماردو۔'' ارسلان بہت غیرمحسوس انداز میں تھوڑا سا آگے کھسک گیا۔

موسیٰ نے مشین پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں کہ......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا' ارسلان نے وہ تپائی اس پر اچھال دی تھی۔ پانی کا جگ اور گلاس اس کے پیر پر گرا اور تپائی اس کے پسٹل والے ہاتھ پر لگی۔ ارسلان تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور موسیٰ کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ موسیٰ کا پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اچھل کر پیچھے میز پر گرا۔ ارسلان نے موسیٰ کا پسٹل اٹھالیا اور اس کے بال پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا اور پسٹل اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

''دیکھو، تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔'' موسیٰ موت کو سامنے دیکھ کر گڑگڑایا۔

''میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔'' ارسلان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں تم پر گولی نہیں چلاؤں گا۔'' اس نے پسٹل ایک طرف پھینک دیا۔ ''میں تم پر گولی نہیں چلاؤں گا بلکہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔'' ارسلان نے اچانک بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی، پھر وہ اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ موسیٰ بری طرح مچلا اس نے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی لیکن ارسلان کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی زبان باہر نکل آئی، آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں اور اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے اور ناک سے خون کی پتلی سی دھار نکل کر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔

اسے چھوڑ کر ارسلان نے اس کے سامان کا جائزہ لیا۔ اس میں کام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ارسلان نے اس کا بریف کیس اٹھالیا اور محتاط انداز میں باہر نکل کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن پر ایک پراڈو آکر رکی۔ اسے ایک باوردی شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ شوفر تیزی سے نیچے اترا اور اس نے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

گاڑی سے اترنے والی لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ اسے دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ دراز قد سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، سپید رنگت، براؤن بال جو اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہ بہت اسٹائلش سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی خوبصورت براؤن آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ تھوڑی کے خوبصورت ابھار اور ابھری ہوئی ناک اس کے پرغرور ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ اسکن ٹائٹ جینز میں وہ کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ خراماں خراماں یوں چل رہی تھی جیسے ریمپ پر کیٹ واک کر رہی ہو۔ ڈرائیور اس کا سوٹ کیس، شولڈر بیگ اور ایک باسکٹ اٹھائے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

وہ رمشا تھی۔ پولیس کے ایک بہت بڑے افسر کی اکلوتی بیٹی! لگتا تھا اسے اپنے حسن کا کچھ زیادہ ہی غرور ہے۔ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

اسٹیشن پہ کھڑے ہوئے ایک انسپکٹر نے اس کا استقبال کیا اور اسے وی آئی پی ویٹنگ روم کی طرف لے گیا، پھر وہ اس سے بولا۔ ''میڈم! ابھی گاڑی آنے میں کچھ دیر ہے۔ آپ ویٹنگ روم میں تشریف رکھیں۔ یہاں کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم جاؤ، ہاں ڈرائیور سے کہنا کہ وہ گاڑی آنے پر میرا سامان کوپے میں رکھ دے۔''

''او کے میڈم!'' انسپکٹر نے یوں کہا جیسے وہ پولیس کا کوئی افسر نہیں بلکہ اس حسینہ کا غلام ہو۔ ''میڈم! آپ کا ریزرویشن اور کوپے نمبر ڈرائیور کے پاس ہے۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''جب تک آپ کی ٹرین روانہ نہیں ہوجاتی، میں یہیں اسٹیشن پر موجود ہوں۔''

''کیوں؟'' رمشا نے بہت ادا سے ابرو کو خم دے کر پوچھا۔

''صاحب نے کہا تھا کہ......''

''میں اب کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں آفیسر!'' وہ درشت لہجے میں بولی۔ اس کا لہجہ درشت ضرور تھا لیکن اس کے باوجود آواز میں نغمگی اور کھنک تھی۔ ''یو مے گو آفیسر!'' رمشا نے نخوت سے کہا۔ ''مجھے کسی کیئر ٹیکر کی ضرورت نہیں ہے۔''

''او کے میڈم!'' انسپکٹر مؤدب انداز میں بولا اور سر جھکا کر ویٹنگ روم سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی اس کی نظر انسپکٹر راشد پر پڑی۔ وہ خوش دلی سے مسکرایا اور بولا۔ ''راشد صاحب! کہاں کا ارادہ ہے؟''

''کہیں کا نہیں۔'' انسپکٹر راشد نے کہا۔ ''میں اپنے ایک دوست کو ریسیو کرنے آیا تھا لیکن آپ یہاں کیسے انسپکٹر خالق؟''

''میں ہمدانی صاحب کی صاحبزادی کو سی آف کرنے

آیا تھا۔'' انسپکٹر خالق نظریں چرا کر بولا۔
''سی آف کرنے یا......'' اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''حمدانی صاحب نے میری ڈیوٹی یہاں لگائی تھی، بیٹی کہتی ہے کہ آپ جائیں۔ مجھے کسی کیئر ٹیکر کی ضرورت نہیں ہے۔''
''یہ صاحب کی بیٹی ٹرین میں کیوں جارہی ہے؟''
''یار! یہ بھی ان بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔'' انسپکٹر خالق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''صاحب زادی نے پورا کوپے بک کرایا ہے۔''
''یار ایک کوپے میں دو ہی تو سیٹیں ہوتی ہیں۔'' انسپکٹر راشد اس کی بدمزگی سے محظوظ ہورہا تھا۔
''وہ کوئی عام کوپے نہیں ہے۔'' انسپکٹر خالق نے کہا۔ ''وہ لگژری کوپے ہے جو اکثر منسٹرز اور بیوروکریٹس کے لیے خصوصی طور پر ٹرین کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔''
''اوکے یار! جاؤ تم ڈیوٹی کرو۔'' راشد نے ہنس کر کہا۔
انسپکٹر خالق اس طرف بڑھ گیا جہاں رمشا کا ڈرائیور بیٹھا تھا۔
رمشا نے ویٹنگ روم کا جائزہ لیا اور منہ بنا کر رہ گئی۔ پھر اس نے ہینڈ بیگ سے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کر کے کان سے لگالیا۔ لائن ملنے پر وہ بولی۔ ''ہیلو سہیل! کہاں ہو تم؟''
''میں اسٹیشن کے نزدیک ہی ہوں۔''
''نزدیک ہوں کیا مطلب؟'' رمشا ناک چڑا کر بولی۔ ''فوراً اسٹیشن پہنچو۔ گاڑی آنے والی ہے۔''
''میں نے بتایا نا کہ میں اسٹیشن کے نزدیک ہی ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''سمجھو اسٹیشن کے باہر کھڑا ہوں۔''
''تو پھر اندر آؤ۔ میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔''
''یار! مجھے تمہارے ڈیڈی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ انہیں اگر معلوم ہوگیا تو وہ مجھے پولیس مقابلے میں مروادیں گے۔''
''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' رمشا دانت پیس کر بولی۔
''پھر آج نہیں تو کل ڈیڈی کو معلوم ہونا ہی ہے۔ تم ڈیڈی سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟''
''مجھے تمہارے ڈیڈی کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔'' سہیل نے کہا۔ ''دیکھا نہیں تھا، انہوں نے افتخار کا کیا حشر کیا تھا؟''
''کم آن سہیل!'' رمشا بھنا کر بولی۔ ''افتخار چھچھورا لڑکا ہے۔ اس کی شکایت تو خود میں نے کی تھی۔''
''اچھا، میں آتا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''بلکہ تم ایسا کرو، مجھے اپنا کوپے نمبر بتادو۔ میں ٹرین کی روانگی کے دس منٹ بعد کوپے میں آجاؤں گا۔''
''اور اگر نہ آئے تو؟'' رمشا نے غصے سے کہا۔
''تو جو سزا تم تجویز کروگی، مجھے قبول ہوگی۔''
''تو پھر سن لو۔'' رمشا نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''اگر تم نہ آئے تو تمہارا حشر بھی افتخار سے مختلف نہیں ہوگا۔''
''یار! ڈراؤ تو مت۔'' سہیل ہنس کر بولا۔ ''افتخار بے چارہ آج بھی کوٹ لکھ پت جیل میں بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہوگا۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''گاڑی چلتے وقت میں گاڑی میں سوار ہوجاؤں گا لیکن تمہارے کوپے میں دس بارہ منٹ بعد آؤں گا۔''
''اتنا کیوں ڈر رہے ہو؟'' رمشا نے کہا۔
''تمہارے ڈیڈی نے اسٹیشن پر تمہاری حفاظت کے لیے اپنے آدمی ضرور کھڑے کیے ہوں گے۔'' سہیل نے کہا۔ ''میں ان کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا۔''
''اوکے، چلو یوں ہی سہی۔'' رمشا نے کہا۔ ''میں تمہارا ویٹ کروں گی۔'' اس نے رابطہ منقطع کردیا۔
اسی وقت اسے پلیٹ فارم پہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ باہر مسافروں کا شور مچ گیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ ویٹنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے کہا۔ ''یس!''
دوسرے ہی لمحے ڈرائیور اندر آگیا اور بولا۔ ''میڈم! ٹرین آچکی ہے۔ میں نے آپ کا سامان کوپے میں رکھوادیا ہے۔''
''کوپے نمبر کیا ہے؟'' رمشا نے پوچھا۔
''ٹرین میں صرف ایک ہی کوپے ہے میڈم! لگژری سیلون کے نام سے۔'' ڈرائیور نے کہا۔
''اوکے چلو۔'' رمشا اٹھتے ہوئے بولی۔
پلیٹ فارم پہ لوگوں کا جم غفیر تھا۔ چلنا دوبھر ہورہا تھا۔ رمشا لوگوں کی بھیڑ سے بچتی ہوئی کوپے کی طرف بڑھی۔ راستہ بنانے میں زیادہ ہاتھ اس کے ڈرائیور کا تھا۔ وہ پولیس کی وردی میں تھا اور بلند آواز میں لوگوں سے ایک طرف ہٹنے کو کہہ رہا تھا۔
رمشا اک شانِ بے نیازی سے کوپے میں داخل ہوئی تو وہاں گارڈ کنڈیکٹر نے اس کا استقبال کیا۔ ''ویلکم میڈم!'' گارڈ زبردستی دانت نکال کر بولا۔ ''آپ کے کوپے کا ہیٹر آن کردیا گیا ہے۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ ریڈ بٹن پش کردیجیے گا۔ ایک منٹ کے اندر اندر ویٹر آپ کے پاس

پہنچ جائے گا۔''

''اوکے تھینکس!'' رمشا نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے اس کا سامان بہت سلیقے سے اوپر کی برتھ پر رکھ دیا تھا۔ رمشا نے پرس سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ڈرائیور کو دے کر بولی۔ ''ٹھیک ہے غفور...... اب تم جاؤ۔''

''اوکے میڈم!'' غفور نے سعادت مندی سے کہا اور کوپے سے باہر نکل گیا۔

رمشا نے گارڈ کنڈیکٹر سے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں میرا ایک فرینڈ بھی آنے والا ہے۔''

''میڈم! کیا ان کا ویٹ کیا جائے؟'' گارڈ نے کہا۔ ''میں گاڑی کو روکے رکھوں گا۔''

''نو، اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس گاڑی میں موجود ہے اور کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔ میں ڈنر اس کے ساتھ ہی کروں گی۔''

''نو پرابلم میڈم!'' گارڈ نے کہا۔ ''آپ کو جس وقت ڈنر کی ضرورت ہو، آپ ویٹر سے منگوا سکتی ہیں۔''

''اوکے، تھینکس!'' رمشا نے کہا۔ گارڈ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ رمشا کوپے کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کوپے واقعی لگژری تھا۔ اس کی سیٹیں اتنی نرم اور دبیز تھیں کہ ان پر بیٹھ کر ہی آرام وسکون کا احساس ہوتا تھا۔ کوپے کا ہیٹر آن تھا، وہاں خوش گوار حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ باہر کے یخ بستہ موسم کے برعکس یہ کوپے گویا جنت بنا ہوا تھا۔ رمشا نے اپنا کوٹ اتار کر ٹانگ دیا اور جوتے اتار کے آرام سے سیٹ پر نیم دراز ہوگئی۔

☆☆☆

ارسلان واپس پنڈی پہنچا تو دن کے دس بج رہے تھے۔ وہ سیدھا ظہیر کے پاس پہنچا اور اس سے مل کر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے سیل فون نکالا اور چودھری صاحب سے رابطہ کیا، چودھری صاحب جھنجلا کر بولے۔ ''ارسلان، تم کیا کرتے پھر رہے ہو...... کیا تم ابھی تک لاہور میں ہی ہو؟''

''نہیں یور آنر! میں اسلام آباد پہنچ چکا ہوں، شام کو آپ کی طرف آؤں گا۔''

''شام کو کیوں، ابھی کیوں نہیں؟'' چودھری صاحب نے کہا۔

''اوکے یور آنر! میں آدھے گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' چودھری صاحب نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ارسلان نے پہلے سوچا کہ اپنے اصلی حلیے میں چودھری صاحب سے ملے پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ چودھری صاحب اسے آواز سے پہچان سکتے تھے۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ چودھری صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''فی الحال تو میں خود کو پولیس سے بچا رہا ہوں یور آنر۔'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم نے اس کیس پر کچھ کام کیا؟'' چودھری صاحب نے پوچھا۔

''یور آنر، میں اس کیس پر ہی کام کر رہا ہوں، مجھے کچھ سراغ ملا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ......''

''تم ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے بھی کچھ نہیں بتاتے ہو۔'' چودھری صاحب نے مسکرا کر اس کا جملہ پورا کردیا۔

''آپ فرمائیں، مجھے کیسے یاد کیا؟''

''کیا تم سے ملنے کے لیے بھی مجھے کسی وجہ کی ضرورت پڑے گی؟'' چودھری صاحب نے خفگی سے کہا۔

''نہیں، وہ تو میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

''پولیس کے ایک بڑے افسر کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔'' چودھری صاحب نے کہا۔ پریشانی کے آثار ان کے چہرے پر بھی تھے۔ ''وہ پولیس افسر میرے کام میں روڑے اٹکا رہا ہے، میری این جی او کے کام میں دشواریاں پیدا کررہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ انتہائی کرپٹ ہے۔ مجرموں کی پشت پناہی کرتا ہے اور بے گناہوں کو پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔'' چودھری صاحب کے چہرے پر نفرت تھی۔ ''اس کا نام ہے ایچ اے ہمدانی!''

''مجھے صرف دو دن دے دیں، میں......''

''میں جانتا ہوں، اس کا فیصلہ تم اپنی عدالت میں کرو گے پھر اس پر عمل درآمد کرو گے۔'' چودھری صاحب مسکرائے۔ ''ٹھیک ہے، تم دو دن کے بجائے ایک ہفتہ لے لو۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''ہاں، میں نے تمہارے لیے سیل فون کا بندوبست کردیا ہے۔'' انہوں نے اٹھ کر الماری سے ایک ڈبا نکالا اور ارسلان کی طرف بڑھا دیا۔ ''ویسی ہی مخصوص سم ہے اس میں۔''

ارسلان نے شکریہ ادا کرکے سیل فون کا ڈبا لے لیا۔ پھر چودھری صاحب اس سے ملکی حالات پر بات کرتے رہے۔ وہ ان حالات پر بہت زیادہ افسردہ تھے۔

''سر! آپ دوبارہ سیاست میں آجائیں۔'' ارسلان

نے کہا۔

''پورا سسٹم کرپٹ ہے بیٹا!'' چودھری صاحب نے کہا۔ ''میں سیاست میں آ بھی گیا تو یہ سسٹم مجھے بھی کرپٹ کردے گا۔ میں اپنی عزت بچائے بیٹھا ہوں۔ اللہ کا لاکھ احسان ہے کہ مجھ پر کرپشن کا کوئی الزام نہیں ہے۔ میں کئی دفعہ منسٹر رہا لیکن اللہ نے میرا دامن صاف ہی رکھا۔''

''میں جانتا ہوں یور آنر!'' ارسلان نے کہا۔ ''پھر میڈیا تو آج کل ہر شخص کی پگڑی اتار رہا ہے، اس نے بھی اب تک آپ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔''

اسی وقت چودھری صاحب کا منیجر وہاں آگیا تو ارسلان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ارسلان مسلسل پولیس کے ڈائریکٹر جنرل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کی ہٹ لسٹ پر نہیں تھا اس لیے ارسلان نے ابھی اس پر کام نہیں کیا تھا۔ چودھری صاحب نے اسے ایک ہفتے کا وقت دیا تھا۔ اتنا وقت بہت تھا۔ ویسے ابھی تک اس نے حمدانی کے خلاف کچھ سنا بھی نہیں تھا اگر ارسلان کی عدالت میں وہ مجرم ثابت ہوجاتا تو ارسلان پاتال میں گھس کر بھی اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرتا۔ فی الحال تو اسے کامریڈ کی فکر تھی۔ کامریڈ خاصا بدنام آدمی تھا، پھر وہ وزیروں اور سفیروں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ اسے سب پہچانتے تھے۔ ارسلان کو اس کا ایڈریس بھی معلوم تھا۔ وہ پہلے ایک دفعہ کامریڈ سے ملنا چاہتا تھا، اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا ورنہ تو اسے ٹھکانے لگانا ارسلان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چودھری صاحب نے اس کے لیے گاڑی کا بندوبست بھی کردیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی میں کامریڈ کے گھر پہنچ گیا۔ گیٹ پر کسی سیکیورٹی ایجنسی کے دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ اس نے کامریڈ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو گارڈ نے اسے بتایا کہ صاحب تو لاہور میں ہیں۔ ''آج کل وہ زیادہ وقت لاہور میں ہی گزارتے ہیں۔''

ارسلان وہاں سے رخصت ہوکر ظہیر کے ہوٹل پہنچا اور وہاں پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا حلیہ تبدیل کرلیا۔ اب وہ یونیورسٹی کا کوئی پڑھاکو قسم کا اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ اس نے جینز، جیکٹ اور جاگرز پہن رکھے تھے اور کندھے سے ایک بیگ لٹک رہا تھا۔ اس نے لاہور روانگی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے کامریڈ کا ایڈریس حاصل کرلیا تھا۔ اس قسم کے مشہور لوگوں کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کے ایڈریس آسانی سے مل جاتے ہیں۔ کامریڈ لاہور کے سیٹلائٹ ٹاؤن میں مقیم تھا۔ ارسلان نے سوچا، لاہور جاکر وہ حمدانی کے خلاف بھی معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

وہ اپنی گاڑی کے ذریعے لاہور روانہ ہوگیا اور منہ اندھیرے لاہور پہنچ گیا۔ اس وقت سڑکوں پر اخباری ہاکر اور دودھ فروش ہی تھے۔ اکادکا گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔

وہ کامریڈ کے بنگلے کے سامنے سے گزرا تو اسے وہاں سیکیورٹی کے غیر معمولی انتظامات نظر آئے۔ اس نے وہاں سے کافی فاصلے پر جاکر ایک محفوظ جگہ اپنی گاڑی پارک کردی اور پیدل ہی کامریڈ کے بنگلے کی طرف چل دیا۔

اسی وقت بنگلے سے ایک گاڑی نکلی۔ کامریڈ اس میں سوار تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ڈبل کیبن پک اپ بھی باہر نکلی۔ پک اپ کے پچھلے حصے میں چار مسلح گارڈز کھڑے تھے۔ اب بنگلے کے گیٹ پر صرف دو گارڈز نظر آرہے تھے۔ شاید بنگلے میں ملازمین کے علاوہ کوئی نہیں تھا ورنہ وہاں صرف دو گارڈز نہ ہوتے۔ ارسلان بنگلے کی پشت کی طرف گیا۔ وہاں سے بھی داخلے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دیوار پہ لوہے کی گرل لگی تھی جس میں اوپر کی طرف نوک دار سلاخیں تھیں۔ اردگرد کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والا بنگلا ویران پڑا تھا۔ ممکن تھا اس میں کوئی رہتا بھی ہو۔ ارسلان نے اس بنگلے کا جائزہ لیا کہ ممکن ہے وہاں سے کامریڈ کے بنگلے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل سکے۔

پھر ارسلان نے اسی بنگلے کے ذریعے کوشش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ارسلان اسے آسانی سے عبور کرسکتا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ اس لیے وہاں کے تقریباً ہر بنگلے میں سناٹا تھا۔ وہاں کے مکین ابھی تک گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ارسلان نے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر کچھ فاصلے پر جاکر وہ دوڑا اور ایک جست میں بنگلے کی دیوار پر پہنچ گیا اندر بھی بالکل ویرانی تھی۔ ارسلان آہستگی سے اندر کود گیا۔ وہ چند لمحے تک ساکت بیٹھا کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا، پھر مطمئن ہوکر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف بڑھا اور بنگلے کی چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ کامریڈ کے بنگلے کی دیوار اس چھت سے بھی تقریباً چوبیس فٹ اونچی تھی۔ اس پہ بھی اوپر کی جانب تیز دھار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ارسلان نے چھت پر... اردگرد دیکھا، الیکٹرک وائر کا ایک رول نظر آیا۔ چھت کے اس حصے میں الیکٹرک کا دوسرا سامان سوئچ بورڈ، پلگ وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ رول میں الیکٹرک کا موٹا وائر تھا۔ وہ

اتنا مضبوط تو یقیناً تھا کہ ارسلان کا وزن اٹھا سکتا تھا۔ اس نے پھرتی سے رول کھول لیا اور وائر کو دہرا کر کے کامریڈ کی دیوار پر پھینکا۔ وائر ایک نوکیلی سلاخ میں پھنس گئی۔ ارسلان نے وائر کے دونوں سروں کو نیچے کی طرف باندھ دیا اور اس وائر کے ذریعے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ اگر وہ یہ کرتب باہر کی طرف اور دن چڑھے دکھاتا تو دیکھنے والے اس سے بہت محظوظ ہوتے۔ وہ اوپر پہنچا تو اس نے ایک نوکیلی سلاخ پکڑی اور دیوار پہ بہت تھوڑی سی جگہ میں پیر جما کر چڑھ گیا۔ اگر اس کے پیروں میں جوگرز نہ ہوتے تو اسے بہت پریشانی ہوتی۔ اس نے دیوار کی دوسری طرف جھانکا۔ اس طرف زینے کی سیڑھیاں تھیں۔ دیوار سے دوفٹ کے فاصلے سے جو سیڑھی گزر رہی تھی، ارسلان نے اس طرف سے بنگلے میں کودنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ سلاخیں پکڑ کر معمولی سی جگہ پر آگے بڑھا اور مطلوبہ سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے جست لگائی اور سیڑھی پر پہنچ گیا۔

سردی کے باوجود وہاں تک پہنچنے میں اسے پسینا آگیا۔ وہ بہت آہستگی سے دبے پاؤں نیچے کی طرف بڑھا۔ اوپر اگر کوئی گارڈ ہوتا بھی ہوگا تو اس وقت نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے بنگلے میں داخل ہوگیا...... کامریڈ کے بنگلے میں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ گھریلو ملازم تک نظر نہیں آرہے تھے۔ کامریڈ کے جانے کے بعد شاید ملازم بھی اپنے اپنے کوارٹرز میں جا کر لیٹ گئے تھے۔

ارسلان دبے پاؤں کوریڈور میں داخل ہوا۔ جہاں آمنے سامنے چار کمرے تھے۔ ہر کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دائیں سے دوسرے کمرے کے دروازے کے نیچے سے اسے ڈور میٹ نظر آرہا تھا۔ ارسلان نے سوچا کہ یہی کمرا کامریڈ کا بیڈروم ہوسکتا ہے۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔ ارسلان دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ کامریڈ کا بیڈروم ہی تھا۔ اب اسے صرف کامریڈ کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ بیڈ کے سائڈ ریک پر لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ ارسلان نے یوں ہی وقت گزاری کے لیے لیپ ٹاپ آن کرلیا، لیپ ٹاپ کھلتے ہی اس کے سامنے کسی لڑکی کی خوبصورت سی تصویر آگئی۔ تصویر کے بائیں جانب آئی کون (icon) نظر آرہے تھے۔ ایک آئی کون پر fact and figure لکھا ہوا تھا۔ ارسلان نے اس پر کلک کردیا۔ پیج کھلتے ہی ارسلان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس پر اربوں روپے کا حساب تھا۔ کامریڈ اب تک اربوں روپے کا آتش گیر مادہ خرید چکا تھا۔ اسے کامریڈ نے ملک کے جن شہروں میں پھیلایا تھا، ان کی تفصیل بھی تھی۔

اچانک اسے باہر گاڑیوں کے انجن کی آواز سنائی دی۔ اس نے پھرتی سے لیپ ٹاپ بند کیا اور بیڈ کے نیچے خالی جگہ میں چھپ گیا۔ اس نے اپنا پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اپنا سیل فون آف کردیا تھا کہ اچانک اس کی بیل نہ بجنے لگے۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور کامریڈ اندر داخل ہوا۔ اس کے آتے ہی بنگلے میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ کامریڈ نے بلند آواز میں کہا۔ ”شکور! میرا ناشتا یہیں لے آ۔“ شکور ناشتا رکھ کر چلا گیا۔ اب کامریڈ کے خلاف اسے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کر دیکھا، کامریڈ ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی پشت ارسلان کی جانب تھی۔ وہ اچانک کھڑا ہوگیا اور چیخ کر بولا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا کامریڈ ورنہ میں تیری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

کامریڈ گویا سکتے میں رہ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر ارسلان کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ”اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔“ ارسلان نے اسے دوبارہ حکم دیا۔

کامریڈ نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ ارسلان نے جھپٹ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور کامریڈ کے سامنے آگیا۔ کامریڈ نے حیرت سے اسے دیکھا تو ارسلان نے کہا۔ ”مجھے پہچاننے کی کوشش کررہے ہو تو پہچانو۔“ اس نے سر پر لگی ہوئی بالوں کی وگ اتار دی اور پتلی پتلی مونچھیں بھی ہونٹ پر سے ہٹا دیں اور چشمہ بھی اتار کے ایک طرف پھینک دیا۔

”ارسلان!“ کامریڈ نے حیرت سے کہا۔

”اب مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔“ ارسلان نے نفرت سے کہا۔ ”تمہارے جرائم کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ اگر تمہیں دس بار بھی ذبح کیا جائے تب بھی تمہاری سزا پوری نہیں ہوسکتی۔ ارسلان کی عدالت تمہیں سزائے موت دے چکی ہے۔“

”کیا بکواس ہے؟“ کامریڈ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

اچانک کامریڈ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ارسلان نے آگے بڑھ کر اس کا سیل فون اٹھالیا، پہلے تو اس نے کال منقطع کرنا چاہی، پھر کچھ سوچ کر اس کا گرین بٹن دبا کر کان سے لگالیا۔

دوسری طرف سے کوئی جھنجلا کر بولا۔ ”کامریڈ! کیا

سو رہے ہو؟'' وہ آواز سن کر ارسلان سناٹے میں رہ گیا۔ اسے در و دیوار ڈولتے ہوئے سے لگے۔ زندگی بھر جو شخص اس کا آئیڈیل رہا، اس کے لیے سب سے زیادہ محترم رہا، وہ کامریڈ سے یوں بات کر رہا تھا جیسے اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو۔

''بولتے کیوں نہیں؟'' دوسری طرف سے جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

''بول تو رہا ہوں'' ارسلان نے حیرت انگیز طور پہ کامریڈ کی طرح پھنسی پھنسی آواز نکالی۔

''ارسلان تمہیں مارنے کے لیے تمہارے گھر کی طرف آ رہا ہے یا شاید پہنچ چکا ہوگا۔ وہ اب ہمارے لیے بہت خطرناک ہوگیا تھا۔ میری بھی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے والا تھا۔ پالتو کتا جب پاگل ہوجائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہیں۔ ارسلان کو حمدانی کے پیچھے لگا دیا ہے۔ حمدانی پر بھی ابھی فرض شناسی کا بھوت چڑھا ہوا ہے۔ ارسلان کے ہاتھوں حمدانی مارا جائے گا، پھر پولیس ارسلان کو بھی گرفتار کرلے گی اور پھانسی کا پھندا تو اس کا مقدر ہے ہی۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گا۔'' ارسلان نے پھر کامریڈ کی طرح پھنسی پھنسی آواز نکالی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے کانوں میں ابھی تک چودھری کا وہی جملہ گونج رہا تھا، پالتو کتا اگر پاگل ہوجائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔

''میں چودھری کا پالتو کتا تھا؟ وہ مجھے اپنے پلے ہوئے غنڈے کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اس کے اصول، نظریات سب ڈھونگ تھے۔ کامریڈ کا تعلق را سے ہے اور کیا چودھری کا تعلق بھی ''را'' سے ہے؟''

صدمے کے باعث ارسلان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کامریڈ نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر جھپٹ کر اس کا پسٹل چھین لیا اور بولا۔ ''حرام زادے! تو مجھے مارنے آیا تھا، کامریڈ کو مارنے آیا تھا؟ اب تو یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔ بہت کرلی تو نے بدمعاشی!''

''میں زندہ کب ہوں کامریڈ!'' ارسلان نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''میں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے مر چکا ہوں۔''

''تو پاگل تو نہیں ہوگیا۔ ابھی مجھے موت کی سزا سنا رہا تھا اور اب خود مر چکا ہے؟''

''میں واقعی پاگل ہو چکا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''لیکن تمہاری موت کی سزا پر عمل درآمد ضرور کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ارسلان نے جھٹکے سے کلائی میں چھپا۔ باریک پھل کا تیز دھار خنجر نکالا اور اسے کامریڈ کی طرف پھینک دیا۔ ارسلان نے خنجر اتنی زور سے پھینکا تھا کہ دستے تک کامریڈ کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ارسلان کو دیکھنے لگا۔ ارسلان کی تسلی ایک وار سے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خنجر گھسیٹ کر دوسرا وار کیا، پھر تیسرا وار کامریڈ کے عین دل کے مقام پر کیا۔ کامریڈ بری طرح تڑپا، پھر ساکت ہوگیا۔ ارسلان نے جلدی سے کامریڈ کا لیپ ٹاپ اٹھایا اسے کور میں رکھ کر کندھے سے لٹکایا اور باہر نکلنے کے ارادے سے دروازہ کھولا۔ اسی وقت کامریڈ کا ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ارسلان کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ ارسلان نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا اور زینے کی طرف بھاگا۔ ملازم نے اچانک شور مچا دیا۔ کامریڈ کی لاش پہ نظر پڑتے ہی ملازم بدحواس ہوگیا تھا۔

ارسلان کو اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے انہیں روکنے کے لیے عقب میں پسٹل کے دو تین فائر کر دیے۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ایک دم رک گئیں۔

ارسلان اوپر والی سیڑھی پر پہنچا اور پہلے کی طرح نوکیلی سلاخیں پار کر کے الیکٹرک وائر میں لٹک گیا۔ نیچے پھسلتے ہوئے اس کی ہتھیلیاں زخمی ہوگئیں لیکن وہ تیزی سے برابر والے مکان کی سیڑھیاں اتر گیا۔

اسے کامریڈ کے بنگلے سے دوبارہ شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت تک وہ اس بنگلے کی دیوار پھاند کر گلی میں بھاگ رہا تھا۔ اس کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ جھپٹ کر گاڑی میں بیٹھا اور اس کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے بہت تیزی سے مین روڈ پر لے آیا۔

مین روڈ پر پہنچتے ہی اس کی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ کامریڈ کے گارڈز کو بھی علم ہوگیا تھا کہ ارسلان بنگلے کی عقبی سمت کودا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ارسلان بھی اندھا دھند گاڑی کو بھگا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر ان لوگوں کی پہنچ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کی کوئی منزل نہیں تھی، بس وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

اسے جدھر راستہ مل رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔ کامریڈ کے گارڈز مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ شاید ان کی گاڑی کا

انجن زیادہ طاقت ور تھا اس لیے وہ ارسلان کے نزدیک ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے ارسلان کی گاڑی پر فائر بھی کیے تھے جو گاڑی کی چھت سے اچٹتے ہوئے گزر گئے۔

اچانک ارسلان کو علم ہوا کہ وہ لاہور اسٹیشن کے سامنے ہے۔ اس نے گاڑی پارکنگ میں چھوڑی اور بھاگتا ہوا پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ اسی وقت کوئی گاڑی روانہ ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ ارسلان اچھل کر گاڑی میں سوار ہوگیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کامریڈ کے گارڈز اس وقت تک اسٹیشن پر نہیں پہنچے تھے۔ وہ اطمینان سے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اچانک ارسلان کو دوسرے ڈبے میں دو تین پولیس والے اور کامریڈ کا ایک گارڈ نظر آیا۔ وہ ڈبے کا درمیانی حصہ عبور کر کے ارسلان کے ڈبے میں آرہے تھے۔ ارسلان اپنی جگہ سے اٹھا اور مخالف سمت میں تیزی سے چل دیا۔ اس نے دو تین ڈبے عبور کیے تو وہ کوریڈور میں جانکلا۔ وہ کسی کوپے کا کوریڈور تھا۔ وہ اس کوپے کے پسنجر کو یرغمال بنا کر فوری طور پر محفوظ ہوسکتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑ کر دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ''آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔''

ارسلان اندر داخل ہوگیا۔ لڑکی اسے دیکھ کر اچھل پڑی اور خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ''کون ہو تم؟''

''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' ارسلان نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بس فوری طور پر مجھے پناہ کی ضرورت ہے۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔''

اس کے نرم لہجے سے لڑکی کا خوف کچھ کم ہوا۔ اس نے غور سے ارسلان کو دیکھا، پھر چونک کر بولی۔ ''آ...... آپ...... ارسلان ہیں؟''

''ہاں، میں ارسلان ہوں۔'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''دہشت گرد اور سفاک قاتل!''

''نہیں، میرے ڈیڈی کہتے ہیں کہ آپ ایسے نہیں ہیں بلکہ آپ کو پھنسایا گیا ہے۔''

''تمہارے ڈیڈی؟'' ارسلان نے اسے گھورا۔ ''کون ہیں تمہارے ڈیڈی۔''

''میرے ڈیڈی پولیس کے بہت بڑے آفیسر ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

ارسلان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پولیس کا ایسا کون سا افسر ہے جو مجھے بے گناہ سمجھتا ہے؟''

''آپ نے ڈی جی پولیس حمدانی کا نام سنا ہے؟'' لڑکی نے کہا۔

ارسلان بری طرح اچھل پڑا۔ چودھری نے اسے ڈی جی کے خلاف اکسایا تھا اور اسے ختم کرنے کا حکم دیا تھا۔ ارسلان نے اس سے مہلت مانگی تھی۔ وہ جب تک اپنے طور پر معلومات حاصل نہیں کرلیتا تھا، کام نہیں کرتا تھا۔ حمدانی صاحب کے بارے میں چودھری نے خود ہی سیل فون پر بتایا تھا کہ حمدانی پر بھی فرض شناسی کا بھوت سوار ہوگیا ہے۔ میں اسے ارسلان سے ختم کرا کے ایک تیر سے دو شکار کھیلوں گا۔ وہ اپنے خیال میں کامریڈ سے بات کررہا تھا لیکن سننے والا کامریڈ نہیں بلکہ ارسلان خود تھا۔ پھر اس کے کانوں میں وہی آواز گونجی۔ ''کتا جب پاگل ہوجاتا ہے تو اسے گولی ماردیتے ہیں۔'' یہ سوچ کر اس کی ہڈیاں تک سلگ اٹھی تھیں۔

''آپ کن خیالوں میں کھو گئے؟'' لڑکی نے کہا۔ ''میرا نام رمشا ہے اور میں حمدانی صاحب کی بیٹی ہوں۔''

''اچھا تمہارا نام رمشا ہے۔'' ارسلان کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' رمشا نے پوچھا۔

''کہیں بھی نہیں، میں تو پولیس سے بچ کر بھاگ رہا ہوں اور بھاگتے بھاگتے بہت تھک گیا ہوں۔ بس ایک آخری کام رہ گیا ہے...... بس...... اسے پورا کرلوں۔ یہ گاڑی کہاں جارہی ہے؟''

رمشا نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر بولی۔ ''یہ ٹرین تو راولپنڈی جارہی ہے۔''

ارسلان نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ رمشا سے بولا۔ ''تم ڈرو مت، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''آپ مجھے نقصان پہنچا بھی نہیں سکتے۔'' رمشا نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''ڈیڈی کہتے ہیں کہ آپ کسی بے قصور کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ کاش ارسلان آرمی چھوڑنے کے بعد پولیس جوائن کرلیتا۔''

''مجھے اگر موقع ملا تو میں تمہارے ڈیڈی سے ملاقات ضرور کروں گا۔ وہ......''

دستک کی آواز سے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ رمشا نے ارسلان کو باتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔ ارسلان جلدی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ رمشا نے دروازہ کھولا اور ناگواری سے بولی۔ ''کیا پرابلم ہے؟''

''میڈم، ہم......''

"شٹ اپ! یہ دستک دینے کا کون سا انداز ہے؟"

"ہم لوگ دراصل ایک خطرناک قاتل کو تلاش کررہے ہیں۔" پولیس کے ایک انسپکٹر نے کہا۔

"تو جا کر اسے تلاش کرو، یہاں کیا کررہے ہو؟" رمشا بلند آواز میں بولی۔ پھر اس نے انسپکٹر کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پر نظر دوڑائی اور بولی۔ "راجا نواز احمد...... ٹھیک ہے انسپکٹر، میں ابھی ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔"

"سوری میڈم...... وہ میں اپنی...... ڈیوٹی......"

"میں جانتی ہوں کہ تم لوگ ڈیوٹی کیسے کرتے ہو۔ ناؤ گیٹ لاسٹ!"

"سوری میڈم!" ایک نوجوان اے ایس آئی آگے بڑھ کر بولا۔ "ہمیں اپنی ڈیوٹی کرنے دیں۔"

"تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں ایڈیٹ!" رمشا دہاڑی۔ "میں ڈی جی حمدانی کی بیٹی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" اے ایس آئی سرد لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ کو ہمارے ساتھ تعاون تو کرنا پڑے گا۔"

"کیا تعاون چاہتے ہو؟" رمشا پھر چیخی۔

"ہمیں اس کوپے کی تلاشی لینے دیں۔" اے ایس آئی نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"آؤ، لو تلاشی۔" رمشا نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اس قاتل کو چھپا رکھا ہے؟"

"میرا یہ مقصد نہیں تھا۔" اے ایس آئی رمشا کے اعتماد سے گڑبڑا گیا۔ پھر اس کی نظر اس لیپ ٹاپ پر پڑی جو ارسلان وہیں سیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ اے ایس آئی چونک کر بولا۔ "یہ لیپ ٹاپ آپ کا ہے؟"

"تمہارے خیال میں یہ کس کا ہوسکتا ہے؟" رمشا نے منہ بنا کر کہا۔

"اس پر یہ خون کے دھبے کیسے ہیں؟"

"خون کے دھبے؟" رمشا نے حیرت سے کہا اور لیپ ٹاپ کی طرف دیکھا، پھر ارسلان اس کی حاضر دماغی پر اش اش کر اٹھا۔ رمشا نے کہا۔ "یہ تمہیں خون کے دھبے نظر آرہے ہیں۔ میرے ہاتھ سے لپ اسٹک پھسل کر اس پر گرگئی تھی۔ یہ اسی کے دھبے ہیں۔"

اے ایس آئی الجھن آمیز لہجے میں لیپ ٹاپ کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "اوکے میڈم، ہوشیار رہیے گا۔" وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

رمشا نے دروازہ بند کردیا۔ ارسلان باتھ روم سے نکل آیا اور بولا۔ "مجھے پولیس کا یہ افسر بہت نڈر اور ذہین لگ رہا ہے۔ یہ پھر آئے گا اور اس مرتبہ کوپے کی تلاشی بھی لے گا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" رمشا نے کہا۔

"وہ تم سے مرعوب نہیں ہوا۔ حمدانی صاحب کے حوالے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ گاڑی اب کسی اسٹیشن پر رکے گی تو وہ پولیس کی مزید نفری کے ساتھ آئے گا اور کوپے کی تلاشی ضرور لے گا۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "گاڑی اس وقت کہاں سے گزر رہی ہے؟"

"ٹرین کچھ دیر بعد جہلم پہنچ جائے گی۔" رمشا نے کہا۔

"تو کیا مجھے ٹرین میں سوار ہوئے اتنا وقت گزر گیا؟" ارسلان نے حیرت سے کہا۔ "جہلم تو لاہور سے کافی فاصلے پر ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں ابھی ٹرین کی زنجیر کھینچوں گا اور اتر جاؤں گا ورنہ جہلم پر تو میں کسی چوہے کی طرح بے بس ہوکر رہ جاؤں گا۔"

"گاڑی رکتے ہی ان لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ کسی بوگی سے زنجیر کھینچی گئی ہے۔ آپ تو خطرے میں پڑیں گے ہی، مجھے بھی آپ کا شریک کار سمجھا جائے گا۔"

ارسلان کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ "پھر ایک طریقہ اور ہے۔ میں آپ کو اغوا کرلوں اور اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"آپ مجھے کیوں اغوا کریں گے؟"

"میں یہاں ایک پرچہ لکھ کر چھوڑ دوں گا کہ میں ڈی جی کی بیٹی کو اغوا کرکے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ کوئی میرے پیچھے آیا تو اس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے چند گھنٹے کی مہلت چاہیے...... مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے، پھر چاہے، مجھے موت ہی آجائے۔"

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" رمشا نے کہا۔

ارسلان نے بیگ میں لیپ ٹاپ رکھ کے اسے کندھے سے لٹکالیا، پھر رمشا سے کاغذ مانگا۔ رمشا کے پاس کاغذ نہیں تھا۔

"لاؤ، اپنی لپ اسٹک دو۔" ارسلان نے کہا۔

رمشا نے اپنی لپ اسٹک نکال کر ارسلان کو دے دی۔ ارسلان نے کوپے کی دیوار پر جلی حروف میں لکھا۔

"میں ڈی جی کی بیٹی کو اغوا کرکے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ اگر کسی نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو میں اس لڑکی کو گولی ماردوں گا۔"

پھر اس نے رمشا کا ایک دوپٹا نکال کر اس سے رمشا کے ہاتھ باندھے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر زنجیر کھینچ

لی۔ ٹرین کی رگڑ سے پٹریاں چیخیں اور گاڑی آہستہ آہستہ رک گئی۔ ارسلان نے رمشا کو کندھے پر اٹھایا اور باہر کود گیا۔ اس کے پیروں میں اگر جوگر نہ ہوتے تو اس کے پاؤں زخمی ہو جاتے۔ اندھیرے میں وہ رمشا کو کندھے پر اٹھائے دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

"بس مجھے اتار دیں، میں اب خود بھاگ سکتی ہوں۔"

"تم اندھیرے میں دو قدم بھی نہیں چل سکو گی۔" ارسلان نے بھاگتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی آواز سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اتنی دور سے کسی کو کندھے پر ڈالے ہوئے بھاگ رہا ہے۔

ارسلان مزید آدھا گھنٹا دوڑتا رہا۔ رمشا نے چیخ کر کہا۔ "میری کمر میں جھٹکا آ گیا ہے، پلیز کچھ دیر رک جائیں۔"

ارسلان ایک ٹیلے کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ رمشا وہاں بیٹھ کر یوں ہانپنے لگی جیسے وہ دوڑتی رہی ہو۔

اچانک رمشا کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو رمشا اور ارسلان دونوں بری طرح چونک اٹھے۔

ارسلان نے کہا۔ "فون مت اٹھانا رمشا!"

"ڈیڈی کی کال ہے۔" رمشا نے اسکرین دیکھتے ہوئے کہا۔

"لاؤ مجھے دو، میں بات کرتا ہوں۔" رمشا نے سیل فون اسے دے دیا۔ ارسلان نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "ہیلو!"

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں کون ہوں، اس بات کو چھوڑیں۔ میں نے آپ کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ مجھے بھی پنڈی تک محفوظ راستہ چاہیے۔ پنڈی پہنچ کر میں اسے چھوڑ دوں گا۔ اس سے پہلے کسی نے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی تو میں رمشا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں کیسے مان لوں کہ رمشا تمہارے قبضے میں ہے؟" ڈی جی نے کہا۔

"لیں اپنی بیٹی سے بات کریں۔" ارسلان نے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

"ہیلو ڈیڈی......" رمشا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ارسلان نے مجھے ٹرین سے اغوا کر لیا ہے۔ اسے پنڈی تک پہنچنے دیں ڈیڈی ورنہ وہ مجھے مار دے گا۔"

ارسلان نے سیل لے کر کرخت لہجے میں کہا۔ "سن لیا آپ نے، اب آپ اپنے آدمیوں کو میرے پیچھے آنے سے روکیں ورنہ......" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سیل فون آف کر دیا۔

پھر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور بولا۔ "بس اب روڈ یہاں سے دور نہیں ہے۔ چلو آؤ۔" اس نے رمشا کو پھر کندھے پر اٹھانا چاہا۔

"نہیں، میں خود چلوں گی۔" رمشا نے کہا۔ "بس میرے ہاتھ کھول دیں۔"

ارسلان نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ پھر وہ مسلسل دو گھنٹے تک چلتے رہے۔ رمشا کا برا حال ہو گیا تھا۔ ارسلان نے اسے کئی بار اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ دو گھنٹے بعد افق پہ اجالے کے آثار نمایاں ہوئے تو ارسلان کو کچھ فاصلے پر جی ٹی روڈ بھی نظر آ گئی۔ وہ لوگ بہت پہلے جی ٹی روڈ تک پہنچ جاتے لیکن ارسلان رمشا کو اٹھا کر اس کی مخالف سمت میں بھاگا تھا۔ مین روڈ پر پہنچ کر رمشا نے سکون کا سانس لیا۔

"لگتا ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے پولیس کو ہمارا پیچھا کرنے سے روک دیا ورنہ اب تک تو وہ ہمیں پکڑ چکے ہوتے۔"

"اور آپ مجھے گولی مار چکے ہوتے۔" رمشا کھلکھلا کر ہنسی۔

ارسلان سنجیدہ ہو کر بولا۔ "پہلے ایک ضروری بات سن لو۔ میرے پاس جو لیپ ٹاپ ہے، اس میں ان تمام لوگوں کی تفصیل ہے جو اس ٹرین دھماکے کے ذمے دار ہیں۔ ان میں سے کچھ بڑے بڑے مگرمچھوں کو تو میں سزا دے چکا ہوں، سزائے موت!" ارسلان کے لہجے میں نفرت تھی۔ "اب ایک سب سے بڑا مگرمچھ باقی ہے جسے میں سزا دینے جا رہا ہوں۔ تم یہ لیپ ٹاپ اپنے ڈیڈی کے حوالے کر دینا۔"

"آپ خود ہی انہیں دے دیجیے گا۔" رمشا نے کہا۔

"مجھے شاید اس کا موقع نہ ملے۔" ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ممکن ہے یہ سفر میری زندگی کا آخری سفر ہو۔ اس کے بعد مجھے ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا پڑے۔"

"آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟" رمشا نے کہا۔ "آپ نے تو مجھے گمراہی سے بچایا ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"تم نے......" ارسلان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں، میں صرف آپ کی وجہ سے بے عزت ہونے سے بچ گئی۔ سہیل شاید پولیس کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ آپ اسٹیشن پر نہ آتے تو پولیس بھی نہ ہوتی یا اگر سہیل ہمت کر کے آ بھی جاتا تو آپ کو دیکھ کر میرے پاس آنے کی

جرأت نہ کرتا۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے رمشا۔" ارسلان نے کہا۔ "یہ محض اتفاق ہے۔"

"اور بہت حسین اتفاق ہے۔" رمشا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

وہ اب جی ٹی روڈ تک پہنچ گئے تھے۔ ارسلان نے کہا۔ "میں کوئی گاڑی روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ کچھ آگے بڑھ گیا اور روڈ پر دور تک دیکھنے لگا۔ اسے ایک ویگن دکھائی دی۔ ارسلان نے اسے رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ بغیر رکے گزر گئی، پھر ایک ٹرک اور ایک کار ان پہ دھول اڑاتی کچھ آگے بڑھ گئی۔

رمشا ہنس کر بولی۔ "اب ذرا مجھے کوشش کرنے دیں۔"

اس وقت دور سے انہیں ایک کار آتی دکھائی دی۔ رمشا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو گاڑی کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی۔ پھر ریورس ہو کر ان کے نزدیک پہنچ گئی۔

"ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے اور ہمارا فوری طور پر اسلام آباد پہنچنا بہت ضروری ہے۔" رمشا نے کہا۔

ڈرائیور نے سر ہلایا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ رمشا اور ارسلان گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا۔ باہر کی سردی کے مقابلے میں گاڑی میں خاصی خوش گوار حرارت تھی۔

ارسلان کو حیرت تھی کہ گاڑی والے نے کچھ پوچھے بغیر انہیں سوار کیسے کر لیا۔ وہ یہ تو پوچھتا کہ آپ کی گاڑی کہاں ہے اور خراب ہوگئی ہے تو اسے چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟ پھر اس کا دونوں کو عقبی نشست پر بٹھانا۔ ارسلان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی اور رمشا کسی معصوم بچے کی طرح اس کے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ بے چاری رات بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ اتنا پیدل تو وہ زندگی میں کبھی نہیں چلی ہوگی۔ ارسلان نے اسے سونے دیا۔

سورج نکل آیا تھا اور ہر طرف دھوپ پھیل گئی تھی جب ان کی گاڑی راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوئی، پھر.... پنڈی سے اسلام آباد کی طرف مڑتے ہوئے گاڑی والے نے ان سے پوچھا۔ "اسلام آباد میں کہاں جائیں گے آپ؟"

"جی آپ کسی ایسی جگہ اتار دیں جہاں سے ہمیں ٹیکسی مل جائے۔" ارسلان نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں صاحب!" گاڑی والے نے کہا۔ "میں اب یہاں تک آ گیا ہوں تو آپ کو منزل پر پہنچا کر ہی جاؤں گا۔"

"آپ کو خوامخواہ زحمت ہوگی۔" ارسلان نے کہا۔

"زحمت کیسی صاحب! مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔"

ان کی بات چیت سے رمشا بھی جاگ گئی اور اب آنکھیں مل کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ارسلان گاڑی والے کو چودھری کے گھر کا راستہ بتا رہا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ لوگ چودھری کے بنگلے تک پہنچ گئے۔

"بس جناب!" ارسلان نے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ!"

"شرمندہ مت کریں صاحب!" گاڑی والے نے مسکرا کر کہا۔ پھر رمشا کو اترتے دیکھ کر وہ بے اختیار بولا۔ "رمشا میڈم، کیا آپ بھی ان کے ساتھ جائیں گی؟"

رمشا اور ارسلان دونوں بری طرح چونک اٹھے۔ رمشا نے منہ بنا کر کہا۔ "آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"

"مجھے آپ کے ڈیڈی نے ہی بھیجا تھا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "میرا نام انسپکٹر عبدالصمد ہے۔"

"او مائی گاڈ!" رمشا نے حیرت سے کہا۔ "آپ کو ڈیڈی نے بھیجا تھا۔"

"میں یہیں باہر موجود ہوں ارسلان صاحب!" انسپکٹر نے کہا۔ "میری ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے بلا لیجیے گا۔"

ارسلان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر گارڈ موجود تھا، اس نے ارسلان کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا اور اسے سلام کیا۔

ارسلان اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ رمشا اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

ارسلان جانتا تھا کہ چودھری اس وقت ناشتے کی میز پر ہوگا۔ وہ علی الصباح اٹھنے کا عادی تھا۔ ارسلان سیدھا ڈائننگ روم کی طرف بڑھا۔ چودھری حسب توقع ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ وہ ارسلان کو دیکھ کر چونکا، پھر مسکرا کر بولا۔ "ارے بیٹا، تم بغیر اطلاع دیے اس وقت کیسے؟"

"چودھری صاحب۔" ارسلان نے کہا۔ "میں بہت مصیبت میں ہوں۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔ مجھے پولیس سے بچا لیں۔"

"میں تمہیں پولیس سے فوری طور پر تو بچا لوں گا۔" چودھری نے کہا۔ "لیکن بیٹا میں آخر کب تک تمہیں بچاؤں گا؟ تمہارے جرائم کی فہرست تو بہت طویل ہے بیٹا۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں یور آنر؟" ارسلان نے

کہا۔ ''آپ تو کہتے تھے کہ میرے جیتے جی کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

''لیکن اب میں مجبور ہوں بیٹا، بہت مجبور!'' چودھری عیاری سے بولا۔

''لیکن میں مجبور نہیں ہوں۔'' ارسلان نے اچانک گن نکال کر چودھری پر تان لی۔ ''نہیں چودھری صاحب! اپنی جگہ سے حرکت مت کیجیے گا۔''

چودھری ساکت رہ گیا، پھر ہنس کر بولا۔ ''کیوں مذاق کررہے ہو بیٹا!''

''مت کہو مجھے بیٹا!'' ارسلان چیخ کر بولا۔ ''تو نے میری زندگی تباہ کردی حرام زادے...... میں تجھے محترم اور سچا جان کر تیرے اشاروں پر چلتا رہا اور تو مجھے ایک تیسرے درجے کے غنڈے اور قاتل کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ میرے جرائم کی فہرست اگر طویل ہے تو اس میں تو بھی برابر کا شریک ہے گھٹیا انسان بلکہ تجھے تو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ تو جانوروں سے بھی بدتر ہے۔''

''ارسلان بیٹا!'' چودھری کراہا۔ ''تم ایسی باتیں کیوں کررہے ہو؟''

''اس لیے کہ تو اسی قابل ہے ننگِ انسانیت! تیری وجہ سے سیکڑوں بے گناہ ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ سیکڑوں انسان معذور ہوگئے۔ کیا وہ انسان نہیں تھے کیڑے مکوڑے تھے؟ کامریڈ نے مرنے سے پہلے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ اب تو بتائے گا کہ اس دھماکا خیز مادے کا تو کیا کرتا تھا؟''

''تمہیں کامریڈ نے ورغلایا ہے ارسلان بیٹا!'' چودھری نے کہا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ وہ میرا کتنا بڑا دشمن ہے۔''

''وہ ہے نہیں تھا۔ میں نے اسے سزائے موت دے دی ہے۔''

ارسلان نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تو نے تو میرے ہاتھوں حمدانی صاحب جیسے ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر کو بھی قتل کرانا چاہا تھا۔ اس لڑکی کو غور سے دیکھ، یہ حمدانی صاحب کی بیٹی ہے اور آج اس کی بدولت میں یہاں پہنچا ہوں...... تجھے تیرے انجام تک پہنچانے۔ میں تو راندۂ درگاہ ہوں حرام زادے لیکن میں تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''ارسلان!'' چودھری نے چیخ کر کہا۔ ''تم مسلسل میری توہین کررہے ہو، تم ہوش میں تو ہو۔ پاگل تو نہیں ہوگئے؟''

''ہاں، میں پاگل ہوگیا ہوں۔'' ارسلان کا چہرہ نفرت اور غصے کی زیادتی سے سرخ ہوگیا۔ ''میں پاگل ہوں، پاگل کتا! کتا جب پاگل ہوجائے تو اسے گولی ماردیتے ہیں۔ یہی کہا تھا نا تو نے۔ میری عدالت نے تجھے سزائے موت سنادی ہے، سزائے موت...... اور اب تیری موت کا وقت آگیا ہے۔''

''ارسلان میری بات سنو۔'' چودھری خوفزدہ ہوکر چیخا۔

''سزائے موت تیرا مقدر ہے کتے!'' یہ کہتے ہوئے اس نے گولی چلادی جو چودھری کی پیشانی میں لگی...... وہ الٹ کر پیچھے کی طرف گرا اور کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ ارسلان نے دوسری گولی اس کے سینے میں پیوست کردی۔ چودھری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارسلان کو دیکھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چودھری کے گارڈز تھے جو فائرنگ کی آواز سن کر دوڑے تھے۔ چودھری کی لاش دیکھ کر انہوں نے ارسلان پر فائر کھول دیا۔ پہلی گولی ارسلان کے سینے میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔

رمشا پوری قوت سے چیخی۔ ''ارسلان!''

ارسلان نے مسکرانے کی کوشش کی، بیک وقت دو گولیاں اس کے سر اور سینے میں پیوست ہوگئیں۔ وہ الٹ کر گرا تو رمشا نے بڑھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور روتے ہوئے بولی۔ ''ارسلان! آنکھیں کھولیں...... آپ نے تو آج تک کسی سے ہار نہیں مانی، پھر موت سے کیسے ہار سکتے ہیں۔''

ارسلان نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے خون نکل کر اس کی ٹھوڑی پر پھیل گیا۔ اس نے رمشا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں نے اپنا آخری کام بھی پورا کردیا...... میں نے وطن کے سب سے بڑے غدار...... کو...... سزائے...... موت......'' اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ رمشا بلک بلک کر رونے لگی۔ اسی وقت باہر سے بھاگتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی اور اچانک بہت سے پولیس والے اندر آگئے۔ ان میں سب سے آگے حمدانی تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کے ارسلان کو تعظیم دی۔ رمشا نے آگے بڑھ کر ارسلان کی آنکھیں بند کیں اور اس کے شانے سے وہ شولڈر بیگ اتار لیا جس میں کامریڈ کا لیپ ٹاپ تھا...... حمدانی نے بے اختیار رمشا کو سینے سے لگالیا۔

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

امیگریشن مل جائے

○ ہم لوگ کئی سالوں سے اپنے والدین کی امیگریشن کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے ہیں مگر کوئی نتیجہ نہیں آتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے کوئی بندش کی ہوئی ہے، جبکہ امیگریشن کے قواعد وضوابط کے عین مطابق پورے اترتے ہیں مگر پھر بھی کوئی بات نہیں بنتی ہے والدین خصوصاً والد صاحب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس آجائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خدمت کی سعادت عطا فرمائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی روحانی رکاوٹ ہے تو وہ بھی دور کر دیجیے۔ سلیم اختر۔ بروکلین امریکا

☆ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یا رافع یا فتاح'' پڑھ کر دعا کر لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کے لیے لوح ونقوش ارسال کیے جا رہے ہیں امید ہے کہ اسی سال والدین آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ انشاء اللہ

بیٹے کی آرزو

○ آپ سے غائبانہ تعارف آپ کی ویب سائٹ www.khanqahh.com پر ہوا تھا پھر آپ کا فیس بک qadrisarkar@hotmail.com پر آپ کی سرگرمیاں دیکھیں ماشاء اللہ آپ بہت کام کر رہے ہیں، ہمیں بھی اپنی دعاؤں سے نوازیں، میری تین بیٹیاں ہیں بیٹے کی آرزو ہے آپ کے روحانی علاج کا بہت سنا ہے آپ ہمیں بھی اپنی محبت سے کچھ عنایت کریں بہت دعا گو رہیں گے۔ سیما شاہین۔ یو کے

☆ عزیز بیٹی! آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یا وارث یا باقی یا قوی'' پڑھ کر دعا کریں روحانی علاج کے لیے نقش علاج در عقیم ارسال کیا جا رہا ہے حسب ہدایت استعمال کیجئے گا مراد پوری ہو گی۔ انشاء اللہ

جادو کا نتیجہ

○ عجیب سے معاملات میں گرفتار ہیں زبان کبھی خشک رہتی ہے کبھی چھالے پڑ جاتے ہیں، چند دن پیٹ ٹھیک رہتا ہے پھر پھول جاتا ہے صبح اٹھتے ہیں تو منہ کا ذائقہ تلخ اور تھوک بے حد زرد رنگ اور گاڑھا ہوتا ہے بعض اوقات منہ کا ذائقہ پھیکا ہو جاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ جگر خراب ہے کوئی کہتا ہے معدے میں السر ہے، ڈاکٹر حکیم سب کا علاج کروا لیا مگر چند دنوں بعد دوبارہ مسئلہ ہو جاتا ہے۔ دوائیں کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں' یہ کیفیت گھر کے تمام افراد کی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وجہ کیا ہے، اگر بیماری نہیں تو کیا ہے؟ ہم لوگ وہمی نہیں ہیں مگر اب تو یقین آنے لگا ہے کہ یہ سب جادو کا نتیجہ ہے، آپ اس کے لیے ہمیں روحانی علاج دیجیے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مہینے میں چند دن کراچی بھی تشریف لائیں کیونکہ ہم جیسے بہت سے ضرورت مند ہیں جو کراچی سے لاہور نہیں آسکتے ہیں ان سب کا بھلا ہو جائے گا۔ رخشندہ بتول۔ کراچی

☆ آپ کے معاملے میں فقط صحت خرابی کا مسئلہ نہیں ہیں اس میں بد عملیات بھی شامل ہیں آپ سورۂ مبارکہ ''الممتحنہ'' صبح شام پانی پر دم کر کے پی لیا کریں۔ لوح، نقش زعفرانی ارسال ہیں، حسب ہدایت استعمال کیجئے۔ فی الحال مصروفیات اس قدر ہیں کہ وقت نکالنا مشکل ہے، جونہی مصروفیات نے اجازت دی کراچی کے پروگرام کے متعلق

ان ہی صفحات میں مطلع کر دیا جائے گا۔

ادھاری بزنس

○ میرا کنسٹرکشن کا بزنس ہے، مختلف قسم کے ٹھیکے لیتا ہوں، پچھلے دنوں ایک سپروائزر کو گھپلے کے باعث نکال دیا تھا، مجھے تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن مجھے کمپنی کے اسٹاف نے بتایا کہ وہ بڑی دھمکیاں وغیرہ دے رہا تھا، میں نے کوئی پروا نہیں کی، مگر جب سے وہ گیا ہے میرا کام متاثر ہو رہا ہے، دو تین ایسے ٹینڈر جن کے متعلق مجھے سو فیصد یقین تھا کہ مجھے ہی ملیں گے وہ میرے ہاتھ سے نکل گئے، کنسٹرکشن مشنری میں کوئی نا کوئی مسئلہ نکل آتا ہے اور اچھی خاصی مشین کھڑی ہو جاتی ہے، آپ کے علم میں تو ہے کہ یہاں پر سارا بزنس ادھار پر ہی ہوتا ہے، بنک گاڑیاں، مشینری سب لیز کر دیتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ قسطیں بر وقت ادا ہوتی رہیں، مگر حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہر جگہ پیسا پھنس گیا ہے، لاکھوں کی ٹرانزیکشن، لاکھ سوا لاکھ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے سخت پریشان ہوں اس کا کوئی روحانی تدارک کیجیے آپ اکثر دوبئی، ابوظہبی آتے رہتے ہیں ایک بار میرے لیے آ جائیں جو کہیں گے خدمت کے لیے حاضر ہیں، بس ایک بار ان چیزوں سے جان چھڑا دیں۔ یوسف نسیم۔ ابوظہبی یو اے ای

☆ عزیزم! مشکل حالات ہماری صلاحیتوں کا امتحان ہوتے ہیں ہر گز نہ گھبرائیں انشاء اللہ سب بہتر ہوگا، ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یا رافع یا قوی یا وہاب'' پڑھا کریں آپ کے معاملات میں جادو کا عنصر ہے ایک بات یاد رکھیے کہ کبھی کسی کی دل آزاری نا کیجیے کیونکہ دل آزاری کے باعث غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں فرد کوئی بھی قدم اٹھا لیتا ہے، جہاں تک ابوظہبی آنے کا سوال ہے تو آپ رابطے میں رہیں جب بھی پروگرام ہوگا آپ کو بذریعہ فون مطلع کر دیا جائے گا۔ آپ کے لیے لوح تسخیر خاص، نقش فتح نامہ نقش زعفران ارسال کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مشکلات آسان فرمائیں۔ (آمین)

مجھے بدل دیں گے؟

○ آپ کے اکثر سوال جواب پڑھتا رہتا ہوں، سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھتا تھا یہ سب گھڑے گھڑائے قصے فرضی ہوتے ہیں، لیکن جب اپنے ایک عزیز کو دیکھا کہ وہ چند ہفتے پہلے مرجھایا، اداس اور خاموش رہتا تھا، بالکل بدل گیا، تو اس نے بتایا کہ وہ آپ کے زیر توجہ تھا، پہلے جو کسی چیز کو نہیں مانتا تھا پیری فقیری کو ڈھکوسلا کہتا تھا وہ دن رات آپ کے ہی گن گاتا ہے، آپ کی تصویر ہمہ وقت اس کے پرس میں ہوتی ہے تو بے حد حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص کسی پر اتنا اثر انداز ہو سکتا ہے کہ ہر لمحہ اس کی تعریف کرتا رہے، جبکہ اس کی صرف آپ سے خط کتابت ہے۔ آپ کی تمام ڈاک وہ نہایت عقیدت سے سنبھال کر رکھتا ہے، دنیا میں دلچسپی اور گھریلو کاموں میں حصہ لینے لگا ہے، ہر ایک سے خوش مزاجی سے بات کرنا، پھر والدین کا بے حد ادب کرنا اس نے سیکھ لیا، اگر پیر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں تو مجھے بھی اپنا مرید بنا لیں، دنیا سے اکتایا اور بیزار ہوں، محبت نا ملی، والدین صرف تنخواہ سے علاقہ رکھتے ہیں شادی ہوئی تو بیوی اپنی دنیا میں مگن یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی فالتو شے ہوں کیا آپ مجھے بدل سکتے ہیں؟ عبدالحئی۔ میر پور خاص

☆ عزیزم! پیر مثل باپ راہنما اور دوست ہوتے ہیں دکھ، سکھ، محبت، نفرت، بے یقینی، ناکامی، غصہ، بیزاری سب اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں، جب ہی پیروں کے پاس ناکام، نامراد آتے ہیں اور شاد کام واپس جاتے ہیں، وجہ۔۔۔؟ وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا و محبوب کے راستے محبت کے مسافر ہوتے ہیں، نرمی، محبت، درگزری، تحمل یہ سنت ہے اور جب اس سنت پر عامل ہو جاتے ہیں تو پھر آپ ایک مقناطیس بن جاتے ہیں، جس کی طرف سب کھنچے چلے آتے ہیں، آپ بھی محبت کو اپنایئے، غصہ، نفرت، حسد، بیزاری کو طلاق دے دیجیے اور رحمت و محبت کو اپنا شعار بنا لیں، ہنستے مسکراتے رہیں، کامیاب ہو جائیں، یقین نا آئے تو بیعت کر کے دیکھ لیجیے۔ دعا گو!

دل بہت بے چین ہے

○ میری پہلی منگنی میرے خالہ زاد سے ہوئی تھی، کسی وجہ سے وہ منگنی ختم ہو گئی اور مجھے میرے ماموں نے مانگ لیا، پہلی منگنی کے وقت میری عمر بھی کوئی بارہ چودہ برس تھی جبکہ دوسری منگنی کے وقت میری عمر بائیس سال تھی، اب دسمبر میں شادی ہے مگر نجانے کیا ہوا ہے کہ مجھے اپنا پہلا منگیتر بہت یاد آتا ہے، بچپن میں ہم لوگ ساتھ ہی رہتے تھے، بہت شرارت کرتے تھے، لڑنا، مارنا، ساتھ ساتھ سکول جانا، منگنی ٹوٹ گئی کوئی احساس نا ہوا، مگر جب سے میری شادی کی بات پکی ہوگئی، زندگی بے حد الجھن کا شکار ہوگئی ہے وہ یاد آتا ہے، بے تحاشا یاد آتا ہے، کیا کروں دل چاہتا ہے کہ انکار کردوں۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ کس وجہ سے کس کے بھروسے پر، پتا نہیں دل بہت بے چین ہے، دنیا میں معجزے بھی ہوتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا وہ مجھے مل جائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے، آپ روحانی حل بتائیں۔ عندلیب گلزار۔ حیدر آباد

☆ زندگی میں ہونی انہونی چلتی رہتی ہے، اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یا رافع یا فتاح یا لطیف یا قوی'' پڑھ کر دعا کرو۔ لوح تسخیر خاص اور نقوش ارسال کیے جا رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ بیٹی کب مٹھائی کا وعدہ پورا کرتی ہے۔

عورت کی چھٹی حس

O میری شادی کے پہلے چار سال تو بہت پُرسکون گزرے، پھر میرے شوہر کے دفتر میں انتظامیہ نے کچھ تبدیلیاں کر دیں جس میں میرے شوہر کا عہدہ بڑھ گیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایک سیکریٹری کی سہولت میسر آ گئی، بس اس کے چند ہی دنوں کے بعد میری حیثیت ثانوی ہو گئی، ہر بات میں حنا کی مثالیں، وہ کافی ایسے بناتی ہے، وہ چائے ایسے سرو کرتی ہے، گفتگو یہ ہے، کلر ایسے پہنتی ہے، سلیقہ اور آراستگی بس اس پر ختم ہے، آپ تو جانتے ہیں کہ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اب میرے میاں اس سے شادی کے چکر میں ہیں، جبکہ میرا پہلے برس ایک لڑکا ہوا، اب اللہ کے فضل سے پانچواں مہینا ہے، مگر ان کو میری کسی کیفیت کسی تکلیف کی فکر ہی نہیں ہے، پچھلے دنوں یو کے میں ان کی فیلڈ کے حوالے سے ایک کانفرنس ہوئی تو اس میں حنا کو لے کر چلے گئے، میرا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے، میرا گھر تباہ ہو رہا ہے ان مہینوں میں تو سکون کی ضرورت ہوتی ہے مگر میرے لیے جیسے چاروں طرف دوزخ ہی دوزخ ہے، خدا کے لیے اپنے روحانی عمل سے میرا گھر بچا لیجیے۔ یہ ایک بہن ایک بیٹی کی التجا ہے۔ شاہدہ سلمان۔ شارجہ یو اے ای

☆ عزیز بیٹی! سب سے پہلے اپنی صحت کے معاملات پر توجہ دیجیے اور مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔ آپ ہر نماز کے بعد "یا جامع یا قوی" 190 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف، آپ کی فرمائش پر روحانی عمل لوح اور نقوش ارسال ہیں گیارہویں شریف میں آپ کے لیے خصوصی دعا کی گئی ہے، رمضان المبارک میں راشن کی فراہمی کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں۔ 0302-5555967

انکار کے پردے میں

O بڑا بیٹا عمر 36 سال ہو گئی ہے مگر شادی کے لئے بالکل بھی نہیں مانتا، خوش شکل، خوش مزاج، اونچا لمبا قد ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے نوکری بھی بہت اچھی دی ہے، گاڑی بھی ہے مگر شادی کے لئے نہیں مانتا، کہتا ہے کہ باقی لوگوں کی شادی کر دیں میری رہنے دیں وجہ کچھ نہیں ہے، اللہ جانے کیا وجہ ہے کون ہے اس انکار کے پردے میں، ہم تو سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئے ہیں، چھوٹے بیٹے اور بیٹی کی شادی پچھلے برس کر دی، ماشاء اللہ دونوں ہی صاحبِ اولاد ہو گئے ہیں مگر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بڑے بیٹے کی شادی اور اولاد کا والدین کو کس قدر انتظار ہوتا ہے، اس کا کوئی روحانی علاج کیجیے، رمضان المبارک کے حوالے سے کچھ ہدیہ ارسال ہے آپ اپنے ہاتھوں سے کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا، آپ کے جواب کے شدت سے منتظر ہیں۔ پرویز اختر۔ دمام سعودی عرب

☆ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں، بعض اوقات بچپن کے کچھ تجربات زندگی کے بعض معاملات سے دور کر دیتے ہیں آپ کے صاحبزادے ضرور شادی کریں گے۔ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔

نادیدہ ہاتھ

O ہم یہاں گزشتہ 15 سالوں سے مقیم ہیں، بیٹا جوان ہو گیا ہے تمام کاغذات مکمل ہیں مگر پھر بھی پیپرز میں پرابلم آ جاتی ہے، میرے ساتھ کی تقریباً تمام ہی فیملیز کو پیپرز مل چکے ہیں مگر میرا مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ میری فائل اٹھا کر، پیچھے پھینک دیتا ہے، کبھی کبھی شدید مایوس ہو جاتی ہوں، جی چاہتا ہے کہ سرنڈر کر کے وطن واپس چلی جاؤں پھر سوچتی ہوں اب میرا وہاں پر ہے کون جس کے لئے جاؤں وطن بہت یاد آتا ہے مگر پھر مسائل گھیر لیتے ہیں صبح 8 بجے سے رات 11 بجے تک مسلسل کام کرتی ہوں، طویل ڈرائیونگ سے کمر اور ایڑیوں میں تکلیف رہنے لگی ہے، 38 برس کی عمر میں 70 برس کی لگنے لگی ہوں آپ سے روحانی امداد کی توقع ہے آپ نے میرے کزن کو جو ڈنمارک میں رہتے ہیں لوح بنا کر دی تھی اور اسماء الحسنیٰ کی تلقین کی تھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور آپ کی روحانی مدد سے ان کا مسئلہ بہت جلد حل ہو گیا تھا، میری بھی مدد کیجیے۔ سویرا ملک۔ ناروے

☆ عزیز بیٹی! اچھا وقت دور نہیں، آپ گزشتہ 8 برسوں سے ایک نحوست کے دور سے گزر رہی تھیں اب حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھ کر دعا کیا کریں۔ آپ کی فرمائش پر لوح ارسال ہے۔ دعاؤں اور تحفے کا شکریہ

نانا جان کی عنایتیں

O بہت ہی اچھا لگا آپ کے ہاں حاضر ہو کر، خصوصاً یہ اطلاع اور ماجرا بے حد باعث مسرت ہوا کہ حضور سرکار نانا جان کی محبت اور ان کا دستِ کرم آپ کے سر پر ہے، ہمارا پورا خاندان ہی حضور نانا جان کی محبت میں سرشار ہے، اس لیے اپنا قریبی . . .

اشتہار

جان کر اپنے سلسلے کے حوالے سے ہم پر بھی کرم فرمائیے، میری بیٹی کے سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کیا ہوا ہے، ہر بات میں ہر معاملے میں اس کو بے حد تنگ کرتے ہیں، خصوصاً جب سے بیٹا پیدا ہوا ہے زندگی اور زیادہ پریشانیوں میں گھر گئی ہے، کہتے ہیں کہ بیٹا پیدا کر کے یہ نا سمجھ لینا کہ تم یہاں کی ملکہ بن گئی ہو، جب بھی چاہیں چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کریں گے، حالانکہ اولاد کے بعد تو بہو کو اہمیت مل جاتی ہے، داماد ہے کہ کان دبا کر چپکا رہتا ہے مجال ہے جو پلٹ کر کسی زیادتی پر ساتھ ہی دے سکے، بس خاموش رہتا ہے، بیٹی سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے، عجیب ہی قسم کی پریشانی نے گھیر رکھا ہے۔ کیا اس کے لیے کوئی روحانی عمل عنایت کریں گے، ہمارا تو آپ سے سلسلے کے باعث حق بھی ہے، سلیم الدین تاجی۔ بدین سندھ

☆ یہ سب اللہ کا فضل اور حضور نانا جان کا کرم اور عنایت ہے، ان کی محبتیں اور عنایتیں ہیں جو سلسلے والوں کی محبت ہے آپ ہرگز فکر نا کریں ہر نماز کے بعد ''سورۂ کوثر'' 41 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیں۔ آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص، نقوش اور صاحبزادے کے لیے نظر بد کا تعویز ارسال کیا جارہا ہے۔ محبتوں کا بے حد شکریہ

مقدمہ کردیا دیور نے

O میرے شوہر گزشتہ طویل عرصے سے بیمار ہیں، ہماری جائیداد ہے جس کے کرائے سے گزر بسر ہو جاتی ہے، مگر اب اس جائداد پر دیور نے مقدمہ کر دیا ہے، حالانکہ اٹھارہ سال قبل مرحوم سسر نے سب کو باقاعدہ جائداد میں قانونی طور پر حصہ دے دیا تھا، تاکہ کسی قسم کے اختلافات پیدا نا ہوں، مگر دیور نے تمام کاغذات کو جعلی قرار دے کر مقدمہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی کرائے پراسٹے آرڈر لے کر کرایا بھی رکوا دیا ہے، اب کرایا کوٹ میں جمع ہو رہا ہے دیور خوشحال کاروباری آدمی ہیں مگر اس کے باوجود لالچ پیچھا نہیں چھوڑتا، جبکہ ہمارے بچے پڑھ رہے ہیں، سارا پیسا بچوں کی تعلیم پر لگا دیا ہے جب سے کرایا رکا ہے مصیبتیں کھڑی ہوگئی ہیں، پچھلے سمیسٹر کی فیس اپنا زیور بیچ کر جمع کروائی، دیور سے بات کی تو وہ کہتا ہے کہ آپ بڑی ہیں چونکہ اب کیس کورٹ میں ہے تو جو فیصلہ کورٹ کرے گی وہ ہی بہتر ہوگا، کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا ہے، اچھے بھلے دن گزر رہے تھے۔ بدر النساء۔ ملتان

☆ عزیز بہن! اللہ پاک دلوں کے الٹ پھیر سے ہمیں آزماتے ہیں۔ آپ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۂ لہب پڑھ کر دعا کیا کریں مقدمے میں کامیابی کے لیے نقش فتح نامہ ارسال ہے، مقدمہ آپ کے حق میں ہوگا۔ انشاء اللہ